http://www.rehanahmed.com

۵

http://www.rehanahmed.com

http://www.rehanahmed.com

دوپہر کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ حسن دفتر میں بیٹھا میز پر پھیلے ہوئے کاغذات کو انہماک سے دیکھ رہا تھا۔ ابھی ابھی اس کا ایس ڈی او رحمت علی یہ کاغذات اسے دے گیا تھا۔ تین میل لمبی بننے والی سڑک کا نقشہ اور اس پر اٹھنے والے خرچ کا تخمینہ، سب کاغذات اس کے سامنے پھیلے ہوئے تھے۔ وہ پی ڈبلیو ڈی کا ایک دیانت دار انجینئر تھا۔ جب تک پوری دلچسپی سے کاغذات کی جانچ پڑتال کر کے تسلی نہ کر لیتا۔ دستخط نہ کرتا۔ ایس ڈی او اس کی عادت سے واقف تھا اس لئے کاغذات دے کر خود چلا گیا تھا۔ حسن کام میں مصروف تھا۔ ایک ایک مد کی جانچ کر رہا تھا۔ کہ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ اس نے میز پر جھکے جھکے گردن موڑی۔

دروازے میں اس کا عزیز ترین دوست کیپٹن حمید کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"السلام علیکم"۔ حمید نے ہاتھ قدرے اونچا کر کے خالص فوجی انداز میں سلام کیا۔ گرم جوشی سے جواب دیتے ہوئے حسن اٹھا اور حمید کا مصافحے کے لئے بڑھا ہوا ہاتھ تپاک سے تھام لیا۔

"بڑے دنوں بعد آئے"۔ حسن نے حمید کو کرسی پیش کرتے ہوئے کہا۔

"کراچی گیا ہوا تھا"۔ حمید بے تکلفی سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"خیریت تو؟" حسن بھی اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"کچھ سرکاری کام تھا"۔ حمید نے جیب سے لائٹر نکالا۔ "سگریٹ!"

"ہمیشہ ادھاری ہوتے ہو" ہنس کر حسن نے دائیں ہاتھ رکھی سگریٹ کی ڈبیہ اس کی طرف بڑھا دی۔

"خون اپنا پیتے ہیں۔ سگریٹ دوسروں کا۔" حمید نے سگریٹ ہونٹوں میں دباتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔

"الٹ کام کرتے ہو نا" حسن نے کاغذات سمیٹتے ہوئے جواب دیا "خون دوسروں کا پیا کرو سگریٹ اپنا۔ مجھے۔ اس دنیا کی یہی ریت ہے"۔

http://www.rehanahmed.com

"چھوڑو یار ان باتوں کو" حمید نے لمبا سا کش لیتے ہوئے اپنا جسم کرسی میں ڈھیلا چھوڑ دیا"۔ کہو کیا فیصلہ کیا؟"

"کس بات کا؟" حسن نے اپنی خوبصورت آنکھوں کو حیرانگی سے گھمایا۔

"بھئی اسی گاڑی کا"۔ حمید سگریٹ کی راکھ چٹکی سے جھاڑتے ہوئے بولا۔

"اچھا"۔ حسن نے اچھا کو لمبا کھینچتے ہوئے کہا۔

"کیا صلاح ہے؟"

"ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر پایا"۔

"اماں نہیں مانتیں"۔

"سودا برا نہیں تھا"۔

"وہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ لیکن اماں"۔

"وہ کیا کہتی ہیں"۔

"تم جانتے تو ہو۔ اس دن تمہارے سامنے بھی تو کہہ رہی تھیں"۔

"تمہارے پاس کل پیسہ کتنا ہے؟"

"یہی پانچ چھ ہزار"۔

"گاڑی کا سودا چار تک ہو جائے گا۔ خدا قسم بڑی اچھی حالت میں ہے۔ او۔ سی کو چار سال کے لئے باہر جانا نہ ہوتا تو بھلا بیچنے والا تھا۔ اپنے پاس فالتو پیسہ ہوتا تو ضرور خرید لی ہوتی"۔

"مال دار آدمی ہو چار ہزار کی کیا وقعت"۔

"دو بہنوں کی شادی اور بھائی کی ڈاکٹری کی تعلیم کا مسئلہ نہ ہوتا تو یقیناً میں مال دار آدمی تھا۔ سیکنڈ ہینڈ کیا نئی گاڑی لے لی ہوتی۔ خیر۔"

حسن سوچنے لگا۔ گاڑی اس نے دیکھی تھی۔ ظاہرا حالت تو بہت اچھی تھی۔ خریدنا بھی چاہتا تھا۔ لیکن اماں کا بھی احترام تھا۔ ان کی مرضی کے بغیر کیسے خرید لیتا۔

"اماں کو راضی کر لو نا۔ یہ موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا"۔ حمید نے دوسرا سگریٹ سلگایا۔

"حمید جب بھی نام لیتا ہوں۔ شادی کا ذکر شروع کر دیتی ہیں۔ یہ پیسہ وہ میری شادی کے لئے رکھنا چاہتی ہیں۔ حسن نے سگریٹ سلگایا"۔ میری شادی کی آس اماں نے اب تک نہیں توڑی"۔

"تو پھر شادی ہی کر ڈالو"۔ حمید نے سنجیدگی سے کہا۔ "خالہ جان کی خواہش ہی پوری کر دو"

"شادی!" حسن نے ایک لمبی گہری سانس چھوڑتے ہوئے سر کرسی کی پشت سے لگا دیا۔ اس کے چہرے پر

۷

اضطراب کی پرچھائیاں نظر آنے لگیں۔ اپنی بے چین نظریں اس نے کمرے کی سامنے والی دیوار پر لگی قائداعظم کی تصویر پر گاڑ دیں۔

حمید نے کن انکھیوں سے حسن کے سوگوار چہرے کا جائزہ لیا۔ بات جب بھی یہاں تک پہنچتی سنجیدگی میں اضافہ ہو جاتی تھی۔ وہ حسن کے حالات سے بخوبی واقف تھا۔ دونوں کی دوستی اس وقت سے تھی۔ جب حسن حیدرآباد سے انجینئرنگ کالج میں داخلہ لینے لاہور آیا تھا۔ یہ دوستی اب تک بڑے خلوص سے نبھے جا رہی تھی۔

حمید حسن کو دل گیر دیکھ کر ہمیشہ بے چین ہو جایا کرتا تھا۔ اس کی تسلی و تشفی کے لئے کبھی ہنسی مذاق کا سہارا لیا کرتا۔ کبھی سنجیدہ سی تقریر کا۔ اور حسن نے بھی اپنے زخموں پر حمید کی باتوں سے مرہم کی ٹھنڈک کا احساس کیا تھا۔ لیکن آج حمید نے حسن سے کھل کر بات کرنے اور اسے کسی آخری فیصلے تک پہنچانے کا تہیہ کر لیا۔ حسن کی ناگوار خاموشی چند منٹ تو گوارا کی۔ لیکن رہ نہ سکا۔ میز پر زور سے مکا مارتے ہوئے بولا "۔ اے میاں! ہم بھی یہاں ہیں"۔

حسن نے اس کی طرف دیکھا۔ جبراً مسکرایا۔ اور پھر خاموشی سے سامنے پھیلے ہوئے فائل سمیٹنے لگا"۔ بھئی یہ یہ باقاعدہ مقاطعہ ہے۔" حمید نے تیسرا سگریٹ سلگایا۔

حسن نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"چلو آج میں خود خالہ جان کے پاس چلتا ہوں۔"

"کس لئے؟"

"ہر بات کے آخری فیصلے کے لئے"۔

"یعنی"

"یعنی یہ کہ گاڑی خرید لی جائے۔ یعنی تمہاری شادی کا آخری فیصلہ کر دیا جائے۔ یوں ہوا میں کب تک معلق رہو گے۔"

"سچ کہتے ہو"۔ حسن نے فائل ایک طرف کر کے کہنیاں میز پر ٹکاتے ہوئے ہاتھوں کے پیالے میں ٹھوڑی رکھتے ہوئے کہا۔ وہ بےحد سنجیدہ نظر آنے لگا تھا "۔ اماں بھی تھک گئی ہیں۔ گھر گرہستی کا بار اب ان کی ہمت سے باہر ہے۔ سوچتا ہوں اپنے لئے نہ سہی اماں کے لئے ہی سہی۔ شادی کر ہی لوں"۔ حمید کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ قدرے حیران بھی ہوا۔ حسن کے منہ سے شادی کر لینے کا اقرار۔ گو متذبذب سہی۔ یہی بات تو آج وہ جھگڑ کر رعب ڈال کر اس سے منوانے کا تہیہ کر رہا تھا۔

"تمہیں ضرور شادی کر لینا چاہئے حسن" وہ جلدی میں اور کچھ بھی نہ سوچ سکا۔ حسن مسکرایا یوں جیسے کسی

پرانے زخم کا منہ پھر سے کھل گیا ہو۔

"سوچتا ہوں۔ لیکن عملی قدم اٹھانے کی جرأت نہیں ہوتی حمید"۔ اس نے گہری آہ بھری۔

"اس سوچ ہی سے جرم کا سا احساس ہونے لگتا ہے"۔

"تمہاری سوچ کا پھیر ہے۔ حسن ورنہ یہ کوئی جرم نہیں"۔

"تم کیا جانو"۔ پرانے زخم کا منہ پھر سے کھلا۔

حمید حسن کے خوبصورت چہرے کو دیکھنے لگا۔ خوبصورت چہرہ! جس پر ہر وقت منجمد سی اداسی کی کہر چھائی رہتی تھی۔ اس اداسی کی کہر نے حسن کی وجیہہ شخصیت کو پر وقار بنا رکھا تھا۔ چند لمحے خاموشی میں گزر گئے۔ پھر حسن کو جیسے گرد و پیش کا احساس ہوا۔ گھڑی پر نظر ڈالی۔ اور پھر متبسم آنکھوں سے حمید کو دیکھتے ہوئے بولا"۔ اتنے دنوں بعد آئے ہو کوئی اچھی بات سناؤ۔ کہو کراچی کتنے دن رہے۔ یہ چکر کیسا رہا"۔

"مجھے چکر دینے کی کوشش نہ کرو"۔ حمید نے سگریٹ پھینکتے ہوئے کہا"۔ چلو گھر نہیں چلتے۔ چھٹی کا وقت تو ہو رہا ہے"۔

"تھوڑا سا کام باقی ہے۔ تم چند منٹ خاموش بیٹھے رہو۔ میں یہ فائل دیکھ لوں"۔

"اخبار ہے"

"منگوا دیتا ہوں تم

حسن نے گھنٹی بجائی۔ چپڑاسی اندر آکر مئودبانہ کھڑا ہو گیا۔

"چائے پیو گے" حسن نے حمید سے پوچھا۔ حمید نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کیوں" حسن نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں یار چائے پی لی۔ تو کھانے کی گنجائش نہیں رہے گی۔ کھانا گھر چل کر ہی کھائیں گے"۔

"اچھا حسن نے کہا اور چپڑاسی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا" دوسرے کمرے سے اخبار لے آؤ"

"بہتر صاحب"۔ چپڑاسی چلا گیا۔ حسن نے فائل کھولی۔ اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ چپڑاسی کے آنے تک حمید کبھی گنگناتا کبھی اٹھ کر کمرے میں ٹہلتا اور کبھی دیوار پر لگی قائداعظم کی تصویر کو عقیدت سے دیکھتا۔

حسن نے پندرہ بیس منٹ میں اپنا کام ختم کر لیا۔ فائل بند کرتے ہوئے اس نے حمید کی طرف دیکھا۔ جو ایک کرسی پر ٹانگیں رکھے اطمینان سے اخبار دیکھ رہا تھا۔

"چلو اٹھو"۔ حسن کرسی ہٹاتے ہوئے بولا۔

"میں تمہارے ہاں چلوں گا"۔ حمید نے اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"ضرور ضرور۔ اماں بہت خوش ہوں گی"۔

"آج میں انہیں ضرورت سے زیادہ ہی خوش کروں گا"۔

"کیا مطلب؟"

"تمہاری شادی کا آخری فیصلہ انہیں سنا دوں گا"۔

"ابھی نہیں حمید"۔ مجھے اچھی طرح سوچ لینے دو۔ اماں سے تم نے کہہ دیا تو دن رات"۔

"سوچنے کی کوئی بات نہیں۔ تمہیں خالہ جان کی خاطر شادی کرنا ہو گی"۔

"کہہ چکا نا۔ ان کی خاطر ہی سوچتا ہوں۔ لیکن جب عملی قدم اٹھانے کا خیال آتا ہے تو روح لرز جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے۔ جیسے میں بانو سے غداری کا سوچ رہا ہوں"۔

"یہ تمہاری محبت کی انتہا ہے۔ جو وہم بن چکی ہے۔ ورنہ......" اس نے گہرے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے گھمبیر آواز میں کہا "بانو۔ خدا مغفرت کرے۔ پانچ سال ہو رہے ہیں انہیں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ محبت میں وفاداری اور غداری تو زندگی کی باتیں ہیں۔ حسن۔ موت کے بعد سب کچھ ساکت و جامد ہو جاتا ہے"۔

"شاید تم سچ کہتے ہو۔ لیکن میں اس دل کا کیا کروں حمید۔ اس کی موت کے باوجود ہر احساس زندہ ہے"۔

"کہہ چکا ہوں۔ کہ یہ محبت کی انتہا ہے۔ جو اب وہم بن چکی ہے"۔ حمید نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر گمبھیر لہجے میں کہا "تم عملی قدم اٹھانے کی ہمت کرو۔ وقت بہت بڑا حکیم ہے۔ ہر زخم پر پھاہا رکھ دیتا ہے"۔

"لیکن کچھ زخم ایسے بھی ہوتے ہیں حمید جو پھاہے سے بھی دکھ جاتے ہیں"۔

حمید سے حسن کی بات کا کوئی جواب نہ بن پڑا۔ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے ہونٹ کاٹنے لگا۔

"چلو" حسن نے اس کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا۔

"اماں انتظار کر رہی ہوں گی"۔

"چلو" حمید نے قدم اٹھایا۔

دفتر سے نکل کر دونوں موٹر سائیکل پر بیٹھے اور گھر کی طرف چل دیئے۔ دوپہر کے باوجود دسمبر کی ہوا بڑی یخ بستہ تھی۔

http://www.rehanahmed.com

کراچی کے ایک خوبصورت اور پر فضا گوشے میں سبزے میں گھری ہوئی سرخ پتھروں والی کوٹھی کا نام ان دنوں "بسیرا" تھا تقسیم ملک سے پہلے یہاں کراچی کے لکھ پتی ساہوکار سیٹھ دینا ناتھ رہتا تھا۔ لیکن تقسیم کے بعد اس پر خواجہ عبدالرحیم نے قبضہ کر لیا تھا۔ خواجہ عبدالرحیم لدھیانہ کے رہنے والے تھے۔ جالندھر میں کپڑے کی معمولی سی دکان تھی۔ ایک چھوٹا سا مکان بھی خرید لیا تھا۔ اپنے بیوی بچوں سمیت بخیریت پاکستان پہنچے تھے۔ فسادات کی آگ کی لپک ان کے دامن تک پہنچنے کو تھی۔ کہ ایک ہندو دوست کی وساطت سے جانیں بچا کر سرحد پار کر لی۔ چند ماہ لاہور میں قیام کرنے کے بعد قافلے کے ساتھ کراچی آ گئے ان دنوں افراتفری کا عالم تھا۔ جسے جہاں جگہ ملی سر چھپا لیا۔ جو تیز طرار تھے۔ اچھی جگہوں پر قابض ہو گئے۔ جو روادار تھے رواداری میں مارے گئے۔

خواجہ عبدالرحیم کے کئی عزیز فسادات کی نذر ہو گئے تھے۔ لیکن وہ خود بال بچوں سمیت صحیح و سالم پاکستان پہنچ گئے تھے۔ اس لئے حواس بھی بجا تھے اور ذہن بھی بیدار۔ سیٹھ دینا ناتھ کی سولہ کنالوں میں بنی سرخ کوٹھی میں پناہ لی۔ سیٹھ کی رکھی رکھائی ہاتھ لگی تو حوصلہ بلند ہوا۔ کاغذات کچھ ساتھ لائے تھے۔ کچھ ادھر ادھر سے بنوا لئے۔ کوٹھی اپنے نام الاٹ کروالی۔ کپڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ لہٰذا کپڑے کی ایک بہت بڑی دکان کا قبضہ لینے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ بندر روڈ کی دو دکانوں کا مختار نامہ بھی لے لیا۔ دماغی اور جسمانی محنت سے کام کو ترقی دی۔

اور اب پانچ سال کے قلیل عرصہ میں وہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں ان کا شمار شہر کے امیر آدمیوں میں ہونے لگا۔

لدھیانے کا کوئی عزیز یا جالندھر کا کوئی واقف کار ملتا۔ تو خواجہ عبدالرحیم کو پہچاننا مشکل ہو جاتا۔ دبلے پتلے گندمی رنگت کے خواجہ صاحب اب موٹے تازے سرخ و سپید آدمی تھے۔ یہی حال ان کی بیگم سلطانہ کا تھا۔ ڈھیلے ڈھالے جسم والی سلطانہ اب اچھی خاصی سمارٹ عورت تھی۔ خوش شکل پہلے ہی تھی۔ اب دولت کی فراوانی اور پر سکون زندگی سے چہرے پر خوب نکھار آ گیا تھا۔ خوش گفتار بھی تھی۔ اپنے حلقے میں بڑی مقبول تھی۔ سماجی کاموں میں خوب دلچسپی لیتی تھی۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ اس لئے چندہ دینے میں بھی بہت مشہور تھی۔

ایک لڑکی اور دو لڑکے صاف ستھری اولاد تھی۔ رابعہ نے اسی سال بی اے کیا تھا خالد ایف اے کے آخری سال میں تھا۔ اور راشد ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔

سلطانہ قابلِ رشک زندگی گزار رہی تھی۔ کوئی فکر کوئی غم نہ تھا۔ اگر کوئی خیال ذہن پر تھا تو وہ رابعہ کی شادی کا۔

رابعہ اچھے نقش و نگار کی صحت مند لڑکی تھی۔ انیسواں سال پورا کر چکی تھی۔ بی اے کے بعد تعلیم ترک کر دی تھی۔ ان دنوں اس کا شغل گھر کی سجاوٹ تھا۔ کبھی ڈرائینگ روم کی ترتیب بدل رہی ہے۔ تو کبھی ڈائننگ روم کی۔ کبھی امی ابا کے کمرے کی شامت آئی ہے تو کبھی بھائیوں کے کمروں کی۔ پھول سجا رہی ہے۔ پردے بدل رہی ہے۔ قالین اس کمرے سے اس کمرے میں ڈلوا رہی ہے۔ صوفوں کے نئے نئے ڈیزائنوں کے کشن بنا رہی ہے۔ سلطانہ بیٹی کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی۔ لاڈ پیار اپنی جگہ۔ پرائے گھر کی اس امانت کو ہر کام میں طاق دیکھنا چاہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ رابعہ خانساماں کے ہوتے ہوئے بھی اکثر باورچی خانہ میں دکھائی دیتی۔ اور اعلیٰ درجہ کی حیثیت ہوتے ہوئے بھی اکثر مشین پر جھکی اپنی قمیصیں سیا کرتی۔

ہر ماں کی طرح سلطانہ بھی اپنی بچی کے لئے اچھے بر کی خواہش مند تھی۔ رشتوں کی اسے کمی نہ تھی۔ ایک خوش شکل تعلیم یافتہ لڑکی جس کے لئے والدین کی اونچی مالی حیثیت کا کشش انگیز سہارا بھی ہو۔ رشتوں کی کمی کا سوال نہیں ہوتا۔ خواجہ صاحب کے کئی ملنے والے اور سلطانہ کی سہیلیوں کے کئی بھائی بھتیجے موجود تھے۔ پھر بھی نہ جانے کیوں سلطانہ کا دل کہیں حامی بھرنے کو نہیں چاہتا تھا۔ خواجہ صاحب سے جب بھی اس سلسلے میں بات ہوتی۔ وہ ان لوگوں کا نام گنوانے لگتے۔ جو انہیں اس سلسلہ میں پوچھ چکے تھے۔

وہ دسمبر کی خنک شام تھی۔ آج خواجہ صاحب گھر پہ ہی تھے۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے۔ سلطانہ ابھی ابھی بیگم رؤف کے ہاں سے آئی تھی۔ آج بیگم رؤف نے رابعہ کا ہاتھ اپنے چھوٹے بھائی کے لئے مانگا تھا۔ بات پہلے سے ہو رہی تھی لیکن آج بیگم رؤف نے بڑے اصرار سے رشتہ کی بات کی تھی۔

سلطانہ بھی ڈرائنگ روم میں آبیٹھی۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد بیگم رؤف کا ذکر چھیڑ دیا۔ اور پھر خواجہ صاحب سے رشتہ کی بات کرنے لگی۔

"گھرانہ تو اچھا ہے"۔ خواجہ صاحب نے اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں گھر بار تو اچھا ہے"۔ سلطانہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "لڑکا بھی میں نے دیکھا ہے۔ خاصا خوبصورت ہے۔ لیکن"۔

"لیکن میرا دل نہیں مانتا۔ خواجہ صاحب نے سلطانہ کی بات زنانہ آواز میں دھرائی۔

"یہ بات تو ہے"۔ سلطانہ ہنس پڑی۔

"سمجھ نہیں آتا بیگم" خواجہ صاحب سنجیدگی سے بولے "۔ تمہارا مطلب کیا ہے۔ اچھے سے اچھا رشتہ دل نہیں مانتا' کہہ کر رد کر دیتی ہو۔ آخر کیا سوچ کر ایسا کرتی ہو"۔

"بس تسلی نہیں ہوتی۔ جانے کہاں سے آئے ہوئے لوگ ہیں۔ کیسے کیسے خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ کسی کے آگے کا پتہ ہے تو پیچھے کا نہیں۔ بس یہی سوچتی رہتی ہوں۔ اپنی ایک ہی تو بیٹی ہے۔ کشمیری خاندان سے باہر تو میں کرنے کی نہیں"۔

خواجہ صاحب چند لمحے خاموش رہے پھر آہستگی سے بولے۔ لڑکا شریف اور باصلاحیت ہونا چاہئے۔ خاندان خود ہی بن جاتا ہے۔

سلطانہ نے سر کو نفی کے انداز میں جنبش دی۔

"اچھا بھئی! جیسے تمہاری مرضی" خواجہ صاحب نے جیسے ہتھیار ڈال دیئے" خاندان ہی پر کھتی رہنا"۔

"اپنے خاندان میں ہو جائے تو کیا برا ہے"۔ سلطانہ نے چند لمحے کے تذبذب کے بعد کہا۔

"اپنے خاندان میں ؟ خواجہ صاحب نئے سرے سے دلچسپی لیتے ہوئے بولے" کون ہے تمہاری نظر میں"۔

"اپنا حسن جو ہے"۔ سلطانہ نے جلدی سے کہا"۔ خوبصورت 'لائق۔ شریف اور پھر اکیلا"۔

خواجہ صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ حسن ان کی بڑی بہن کا ایک اکلوتا بیٹا تھا۔ خوبصورت بھی تھا۔ لائق بھی۔ شرافت میں بھی کوئی شک' نہ تھا۔ لیکن انہیں اس حادثے کا علم تھا۔ جو حسن پر گزر چکا تھا۔

"میں نے تو پچھلے سال سے اسے دیکھا تھا۔ ماشاءاللہ کیا شکل و صورت نکالی ہے سارا باپ کی طرح نکل آیا ہے"۔ سلطانہ کے لہجے میں بڑا پیار تھا۔

"لیکن۔ وہ تو۔ بانو" خواجہ ہچکچائے۔

"چھوڑئے جی۔ سلطانہ جیسے اس بات کا جواب تیار کر چکی تھی"۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ مرنے والوں کے ساتھ کوئی مر نہیں جاتا۔ اور زندہ ہوتے ہوئے زندگی کا ساتھ بھی نہیں چھوٹ سکتا۔ بانو بیچاری فسادوں ہی میں شہید ہو گئی"۔

"نیا نیا صدمہ تھا نا۔ اب تو اس بات کو پانچ سال گزر چکے ہیں اس کے نام پر بیٹھا تھوڑا ہی رہے گا۔ رشیدہ آپا تو سنا ہے لڑکی تلاش کر رہی ہیں"۔

"تمہیں کس نے کہا"۔

"پچھلے دنوں صفیہ آپا جو لاہور سے آئی تھیں"۔

"پھر؟"

"پھر ہم کوشش کیوں نہ کریں۔ غیر تھوڑا ہی ہے۔ اپنا ہی بچہ ہے"۔

یہ بات ہو جائے تو میرے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی ہو سکتی ہے۔ لیکن پہلے آپا کا عندیہ معلوم کر لینا چاہئے"۔

"وہ تو کر ہی لوں گی۔ دسمبر کی چھٹیوں میں لاہور جانے کا پروگرام تو ہے ہی"۔

بات چیت کا سلسلہ یہیں رک گیا۔ کیونکہ ساتھ والے کمرے سے رابعہ اندر آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سلائیاں اور اون کا گولہ تھا۔ ہلکے سلیٹی رنگ کی سویٹر وہ اپنے ابو کے لئے بن رہی تھی۔

خواجہ صاحب کی مرضی پا کر سلطانہ نے لاہور جانے کا پروگرام طے کر لیا۔ دونوں بچوں کو چھٹیاں تھیں۔ رابعہ بھی فارغ تھی۔ دس پندرہ دن کے لئے جانا تھا۔ یوں بھی زیادہ عزیز لاہور ہی میں آ کر آباد ہوئے تھے۔ سال میں ایک بار ان سے ملنے جایا ہی کرتی تھی۔ لیکن اس بار جانا تو ایک خاص مقصد کا حامل تھا۔ پہلے اکیلی جایا کرتی تھیں۔ اب رابعہ کو بھی ساتھ لے جانا چاہتی تھیں۔ لیکن رابعہ لاہور جانے پر رضامند نہ تھی۔

"آپ ناصر اور راشد کے ساتھ چلی جائیں۔ میں گھر پہ ہی رہوں گی۔" رابعہ نے اس دن امی کے اصرار کا بڑی شائستگی سے جواب دیا۔

"تم کیوں نہیں جاتیں"۔

"کیا کروں گی جا کر"۔

"لاہور دیکھ لینا۔ جب سے آئی ہو کراچی سے باہر نکلی ہی نہیں۔ تمہاری پھوپھو پچھلی گرمیوں میں آئیں تو کتنا اصرار کرتی تھیں"۔ رابعہ نے پھر بھی حامی نہ بھری۔

لیکن جب جانے میں صرف تین دن باقی تھے تو وہ ایک دم ساتھ چلنے کو تیار ہو گئی۔ سلطانہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ نہ ہی اس نے پوچھنے کی ضرورت سمجھی۔ بیٹی کو اتنی چاہت سے تیاری کرتے دیکھ کر خوش ہو گئی۔

بات دراصل یہ تھی۔ کہ اس دن رابعہ امی کے کمرے میں جانے کو تھی۔ کہ ابو اور امی کی باتیں سن کر باہر رک گئی۔ حسن اور رابعہ کے بندھن کا ذکر ہو رہا تھا۔ سلطانہ حسن کی شخصیت اور وقار کی باتیں کر رہی تھی۔ خواجہ صاحب بھی مدح سرا تھے۔ پھر اپنی ہی بہن کا بیٹا تھا۔ بڑے خوش خوش باتوں میں مصروف تھے۔

رابعہ عمر کے اس دور سے گزر رہی تھی۔ جہاں مبہم مبہم خاکوں میں آپوں آپ رنگ بھرنا شروع ہو جاتے ہیں۔ جہاں سپنوں میں طلسماتی حسن بکھرنے لگتا ہے۔ جہاں خیالات پر پابندی کی کوئی قید نہیں رہتی۔ اٹھتے بیٹھتے بھاری بھاری قدموں کی دل نشین آواز کانوں میں اترتی ہے۔ گرم گرم سانسوں کا لمس ہیجان پیدا کرتا اور رسیلی باتوں کی جانفزا کھنک بے مزہ سی زندگی میں رس گھولنا شروع کر دیتی ہے۔

ہر جوان لڑکی کی طرح رابعہ کے خوابوں کا حسن بھی نکھر رہا تھا۔ اور ایک ہیولہ جو لاشعور میں دبکا تھا۔ ابھر ابھر کر شعور کی حدوں سے ٹکرا رہا تھا۔ مبہم خاکے میں رنگ بھرتے جا رہے تھے۔ یہ مبہم خاکہ کس کا تھا۔ حسن کا؟ یا کسی

اور کا؟ رابعہ لاشعوری طور پر ان سوالوں کا جواب پانے کی متمنی تھی۔ اور اس کے اچانک لاہور جانے کے لئے آمادگی کے پس پردہ ان سوالوں کا جواب پانے کی تمنا ہی تھی۔

حسن کوئی اجنبی نہیں تھا۔ اس کی سگی پھپھو رشیدہ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ رشیدہ پھپھو لدھیانہ میں اس کی دادی اماں کے پاس ہی رہا کرتی تھیں۔ رابعہ کے ابو جالندھر میں کام کرتے تھے لیکن جب بھی جالندھر سے لدھیانہ ددھیال جانا ہوتا۔ حسن کو دیکھا کرتی تھی۔ حسن اور اس کی عمر میں تقریباً دس سال کا فرق تھا۔ اسی لئے لدھیانہ جب بھی گئی۔ اس کی قربت کا کوئی موقعہ نہ ہوا۔

بچی ہی تو تھی ان دنوں۔ تقسیم ملک کے بعد جب پاکستان بنا۔ تو وہ کچھ دن لاہور حسن کے ہاں رہی تھی۔

لیکن

وہ دور بھی کیا دور تھا۔ ذہنوں پر موت اسی طرح مسلط تھی۔ کہ زندگی کی باتیں ہی یاد نہ رہی تھیں۔ ثریا پھپھو کا پورا خاندان شہید ہو گیا تھا۔ حسن کو تو دین دنیا کی جیسے ہوش نہ رہی تھی۔ کبھی والٹن کیمپ، کبھی واہگہ، کبھی ریلوے سٹیشن مارا مارا پھرتا تھا۔ ان دنوں بھی وہ محض حسن بھائی تھا۔

لیکن اب!

امی اور ابو کی باتیں سننے کے بعد اس کے دل میں اس حسن کو قریب سے دیکھنے کی خواہش بری طرح جاگ اٹھی جس کے دامن کے ساتھ اسے وابستہ کرنے کے منصوبے بن رہے تھے۔

درزی سے اپنی گرے پتلون اور چیک کوٹ لے کر گھر پہنچا۔ تو اماں صحن میں غسل خانے کی دیوار کے ساتھ ایک لگے ہوئے تلی کی چارپائی پر بیٹھی تھیں۔ قریب ہی برکتے بیٹھی لوہے کے ہون دستے سے نمک کوٹ رہی تھی۔ ہنڈیا کا پورا مسالہ گھر پہ کوٹ چھان کر بنوانے کی عادی تھیں۔

سانولے رنگ کی دبلی پتلی برکتے بڑے زور زور سے ہاتھ چلا رہی تھی۔ ارد گرد نمک کے ٹکڑے بکھرے تھے۔ سامنے تھال میں کوٹی ہوئی ہلدی تھی۔ ثابت دھنیئے کا لفافہ دائیں ہاتھ رکھا تھا۔ اماں کشمیری سفید شال کی بکل مارے دھوپ تاپ رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک خط تھا۔ جسے اٹک اٹک کر قدرے اونچی آواز میں پڑھ رہی تھیں۔

"کس کا خط ہے اماں" حسن نے کپڑوں کا خالی لفافہ اماں کے قریب چارپائی پر رکھ دیا۔

"سلطانہ کا" اماں نے خوش ہو کر بیٹے کو دیکھا "سلطانہ آ رہی ہے"۔

"سلطانہ ممانی"

"ہاں"

"بائیس کی شام کو پہنچیں گے"۔

"اور کون ساتھ آئے گا"۔

"رابعہ' ناصر' راشد۔

"ماموں جان بھی"۔

"ان کا تو نہیں لکھا۔ لو خود ہی پڑھ لو"

"بس ٹھیک ہے اماں" حسن نے خط لینے کی بجائے لفافے سے نیا سلا ہوا کوٹ اور پتلون نکالا۔

"تیار ہو گئے"۔

"جی"

"ہمراؤ نے کئی مہینے لگا دیے۔ درزیوں کے بھی اب تو اتنے نخرے ہو نے لگے۔"

"شکر ہے آج بھی مل گئے۔ اس کے پاس کام بھی بہت ہوتا ہے نا۔ سلائی بھی بہت اچھی کرتا ہے۔ پیسے بھی تو اسی حساب سے لیتا ہے"۔

"ہاں اماں پیسے بھی لیتا ہے۔ لیکن کام ایمانداری کا کرتا ہے۔ مزہ آجاتا ہے اس کے سلے کپڑے پہن کر۔ جان ڈال دیتا ہے کپڑے میں"۔

حسن کپڑے اٹھا کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے نئے کپڑے پہن کر باہر جانے کو صحن میں آیا۔ تو اماں نے اس کی بلائیں لے کر نئے کپڑوں کی مبارک دی۔ حسن کا دل ماں کی محبت اور عقیدت سے لبریز ہو گیا۔

اماں کی دیکھا دیکھی برکتے نے بھی دعاؤں سے نوازا۔ حسن نے جیب سے دو روپے نکال کر اس کی مٹھی میں تھما دیے۔ دعاؤں کا سلسلہ اور طویل ہو گیا۔

"بس خالہ جی بس دعاؤں کا کوٹا یوں ایک دم ختم نہ کر دینا"۔ حسن نے مسکراتے ہوئے برکتے کی طرف دیکھا۔

برکتے نے جھولی پھیلا کر دعائیں دینا شروع کر دیں۔ غریب عورت تھی۔ جب سے پاکستان بنا خدمت کیا کرتی۔ اور جب گھر میں مہمان آجائے۔ اپنی بہو اور بیٹی کو بھی کام کے لئے لے آیا کرتی۔ انہی کی وجہ سے اماں کو مہمانوں کے آجانے سے ذرہ بھر تکلیف نہ ہوتی تھی۔

"اماں میں شام کو واپس آؤں گا" حسن نے باہر جاتے جاتے کہا۔ "ذرا دیر ہو جائے تو فکر نہ کیجئے گا"۔

"کہاں جا رہے ہو"۔

"حمید نے بلایا ہے"۔

"کیوں"

"آپ جانتی تو ہیں اماں"۔ حسن مڑ کر اماں کے قریب آگیا۔

"بڑے ضدی ہو"۔ اماں پیار سے بولیں۔

"آپ بڑی اچھی ہیں"۔ ہنستے ہوئے وہ ان کے قریب بیٹھ کر بولا۔

"کتنے تک سودا ہو گا"۔

"چار۔ شاید کچھ کم بھی ہو جائے۔ اماں بڑی اچھی گاڑی ہے۔ خوب خوب سیر کرایا کروں گا آپ کو"۔

"چل ہٹ۔ ابھی موٹر سائیکل کام دے ہی رہا تھا۔ ایسی بھی کیا ضرورت تھی گاڑی کی۔ چار پیسے پاس رہتے

http://www.rehanahmed.com

لا پھاس تھا۔
"اماں۔ دو ہزار میں موٹر سائیکل جا رہا ہے۔ اس کے تو اب کل پرزے ڈھیلے ہو گئے۔ دو ہزار میں اچھا بک
جائے گا۔ ہیں نا اماں" حسن نے بڑے لاڈ سے اماں کے گھٹنے پکڑ لئے۔
"چل ہٹ۔" ماں نے پیار سے کہا۔
"کل گاڑی آجائے گی اماں"۔
"خدا مبارک کرے"۔
"آپا۔ آپ رضامند ہیں نا"۔
"تیری ضد کا کیا کروں"۔
"دیکھیں نا اماں" حسن نے رخ بدلا"۔ گاڑی کے بڑے فائدے ہیں۔ اور ہاں۔ وہ سلطانہ ممانی بھی آ
رہی ہیں نا۔ کس شان سے لینے جائیں گے ہم انہیں اسٹیشن سے۔ خوب سیر کرائیں گے ان کے بچوں کو گاڑی
میں"۔ اماں مسکراتی رہیں۔
دیکھیں نا۔ کتنی بری بات ہوگی۔ وہ لوگ تو اب گاڑی کے عادی ہیں۔ ٹیکسیوں اور تانگوں میں انہیں گھمانا
کیا اچھا لگتا بھلا؟"
اماں کی کمزوری کو حسن نے خوب پکڑا۔ رحیم ماموں اور سلطانہ ممانی سے وہ بڑی مرعوب تھیں۔ پچھلی
گرمیوں میں کراچی ہو آئی تھیں۔ کئی ہفتے ان کی امارت کے تذکرے کرتی رہیں حسن سن سن کر مسکراتا رہا۔ کبھی
کبھی اماں کو چھیڑنے کی خاطر کہتا "اللہ کی شان رحیم ماموں کٹر کانگرسی تھے۔ پاکستان کی جتنی مخالفت کی۔ اتنا
ہی پاکستان نے انہیں نوازا۔ مولا کی دین ہے۔ مولا کی"۔
اماں کبھی تو اس کی بات پر مسکرا دیتیں۔ اور کبھی برا مان جاتیں "تو کیا گڑے مردے اکھیڑنے بیٹھ جاتا
ہے۔ اللہ کا دیا ہی ہے نا۔ میرا تو دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ کیا شان شوکت اور ٹھاٹھ باٹھ ہیں۔ جا کر دیکھو تو
سہی"۔

اماں کو تو رابعہ بھی بڑی پسند آئی تھی۔ چار سال میں لڑکپن جوانی سے متصادم ہو کر اپنا نیا رنگ نکال چکا تھا۔
عادات بھی عادات کی اچھی تھی۔ گھریلو قسم کی لڑکی ہی تو ان کی کسوٹی پر پورا اترتی تھی۔ لیکن پسند اور خواہش کو دل ہی میں
دبا رکھا تھا۔ ایک تو حسن شادی کے نام ہی سے بدکتا تھا۔ بانو کی یاد کو متاع حیات بنائے بیٹھا تھا۔ دوسرا بھائی کی مالی
حالت دیکھ کر بھی خاموش ہو گئی تھیں۔ سولہ کنال کی خوبصورت آراستہ کوٹھی کے سامنے ان کے دس مرلے کے
مکان کی کیا وقعت تھی۔ یہ مکان بھی حمید کی کوشش سے الاٹ ہو گیا تھا ورنہ حسن پر ہوتا۔ تو اب تک کرائے کے
مکانوں ہی میں گزر بسر ہوتی۔ خدا جانے رابعہ کے لئے انہیں کس لکھ پتی کا رشتہ مطلوب ہو؟ یہی سوچ کر خاموشی

کا سہارا لے لیا تھا۔

سلطانہ کے ساتھ رابعہ بھی آ رہی تھی۔ اماں کے دل کے کسی خفیہ گوشے میں پسند اور خواہش خوشی بن کر بیدار ہو رہی تھی۔ کیا عجب حسن رابعہ کو پسند کر لے؟ گو یہ بات مشکوک سی تھی۔ حسن کا انتخاب بانو تھی۔ اور اماں کو اعتراف تھا۔ کہ بانو جیسی بیٹیاں مائیں روز بروز نہیں جنتیں۔ تاہم رابعہ بھی اچھی لڑکی تھی۔ بانو موت تھی اور رابعہ زندگی۔ زندگی زندگی کو اپنا سکتی تھی۔

اماں نے رابعہ کے لاہور آنے سے پہلے ہی شعوری اور لاشعوری طور پر تمہیدیں باندھنا شروع کر دیں۔ یہ دوسری بات ہے۔ کہ حسن ان کے اشارے کو ایک بار بھی نہ سمجھا۔

کراچی سے آنے والی ایکسپریس پون گھنٹہ لیٹ تھی۔ اسے خاصی جھنجھلاہٹ ہوئی۔ اماں نے بھی تو گھر سے اتنی دیر پہلے نکال دیا تھا سلطانہ ممانی جو آ رہی تھیں۔ اماں بڑی جذباتی ہو رہی تھیں۔ سارا گھر برکتے اور اس کی ہوناجان سے الٹ پلٹ کروایا تھا۔ ہر کونے کھدرے کی صفائی ہوئی تھی۔ الماریوں میں رکھے ہوئے برتن دھلوائے گئے تھے۔ دو کمرے مہمانوں کے لئے مخصوص ہوئے تھے۔ ایک میں ناصر اور راشد کے لئے بستر لگوائے تھے، دوسرے میں رابعہ اور ممانی کے لئے۔ نئی رضائیاں جنہیں اماں خاص خاص موقعوں پر ہی نکالا کرتی تھیں، ان کیلئے نکلوائی گئیں۔ ضرورت اور آرام کی ہر چیز اماں نے جیسے بن پڑا مہیا کی۔ کھانے کا کمرہ کھلوا کر صاف کروایا اور برکتے کو خاص ہدایات دی گئیں کہ جتنے دن مہمان ٹھہریں گے کھانا چائے باورچی خانے میں نہیں کھانے کے کمرے میں لگایا جائے گا۔ وہ ماں بیٹا تو باورچی خانے ہی میں کھانا لیا کرتے تھے لیکن سلو ممانی اور ان کے بچوں کے اعزاز میں کھانا پینا ڈائننگ روم میں ہی ہونے کا اہتمام ہوا تھا۔ ان سب تیاریوں کے باوجود اماں کے اعصاب پر کچھ گھبراہٹ سی مسلط تھی۔

سلطانہ ممانی پچھلے سال بھی آئی تھیں لیکن ان دنوں شاید اماں کو ان کی مالی حیثیت کا پورے طور پر اندازہ ہوا تھا۔ اس گھبراہٹ اور بے چینی سے اہتمام اب کے کر رہی تھیں۔ اس دفعہ نہ کیا تھا۔ ممانی کا بستر اماں کے کمرے ہی میں لگوا دیا گیا تھا اور وہ اماں کے ساتھ باورچی خانے ہی میں بیٹھ کر کھانا لیتی تھیں لیکن گرمیوں میں اماں کراچی ہو آئی تھیں ان کا گھر بار رہن سہن دیکھ آئی تھیں۔ بیچاری جیسے احساس کمتری میں مبتلا تھیں اسی لئے تو ان کی تیاری کے باوجود تسلی نہ ہو رہی تھی۔

حسن کے لبوں پر مسکراہٹ سی پھیل گئی۔ وہ اماں کی سادگی پر مسکرا رہا تھا۔ اسے برسوں پہلے کی سلطانہ ممانی یاد آ رہی تھی۔ ان دنوں انہیں سب سلو کہتے تھے۔ سلو ممانی رہتی تو جالندھر تھیں۔ لیکن خوشی غمی کے موقع پر ضرور یہاں آئی رہتی تھیں۔ اڑی اڑی رنگت والا کالا برقعہ اسے اب بھی یاد تھا۔ گرمیوں میں چھینٹ کے کپڑے

اور سردیوں میں فلالین کی کالے چھاپے کی چادر۔ کس کر بندھے بال اور سپید رنگت کے باوجود چھائیوں اور مہاسوں سے دھندلایا چہرہ۔ وہ کئی بار جالندھر بھی ان کے ہاں گیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی وہ کوٹھڑیوں کے سامنے سب اس کے ذہن میں محفوظ تھے۔

ایک لمبے والان والا گھر جس میں دن کے وقت بھی تاریکی کا تسلط ہوتا انھی کا تھا۔ مٹی کے چولہے کے سامنے ممانی پیڑھی پر بیٹھی کبھی سلور کی دیگچی میں چائے بناتی ہوتیں اور کبھی کالی سی مٹی کی ہنڈیا سے تانبے کے بے قلعی سے کٹوروں میں سالن انڈیلا کرتیں۔ سلو ممانی کی مالی حالت ان دنوں اچھی نہ تھی۔ دکان سے بھی کوئی خاص آمدنی نہ تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنے بیاہ کا تھوڑا بہت زیور بیچ کر یہ مکان خرید لیا تھا۔ ماہانہ کرائے سے بچت ہو گئی تھی۔ اس تاریک اور چھوٹے سے مکان کے ساتھ حسن کے دماغ میں سولہ کنال کی کوٹھی کا نقشہ جو اماں نے ازبر کر رکھا تھا اور اسے اٹھتے بیٹھتے ہتلاتی رہتی تھیں گھوم گیا۔ سلو ممانی اب سلطانہ ممانی تھیں۔ اماں بیچاری کا کیا قصور۔ ممانی میں فرق بھی تو زمین آسمان کا آ گیا تھا۔ پچھلے سال بھی وہ انہیں سٹیشن پر لینے آیا تھا۔ اسے ان کے ہونٹ اور ناک کے درمیان والا کالا مسّہ یاد نہ ہوتا تو شاید وہ انہیں پہچان ہی نہ سکتا۔ ممانی تو ایک دم سمارٹ سی بیگم صاحبہ لگ رہی تھیں۔ چہرے کی رنگت دمک رہی تھی۔ چھائیوں اور مہاسوں کے داغ بڑے غیر واضح سے تھے۔ بال اچھے سے جوڑے کی شکل میں نفاست سے بندھے تھے۔ برقعہ نام کی کوئی شے ان کے ساتھ نہ تھی۔ پتلا سا دوپٹہ کندھوں پر پڑا تھا۔ ہاتھ میں بڑا سا بٹوہ جھول رہا تھا اور سب سے بڑی تبدیلی جو حسن نے محسوس کی تھی۔ ان کی خوش کلامی تھی۔ بات بات پر قہقہے لگاتی تھیں۔ اعصابی جھنجھلاہٹ نام کو نہ تھی جس سے ان کے چہرے پر ہر وقت تناؤ سا رہتا تھا۔

سوچ کے دھارے حسن کو کہیں سے کہیں لے جا رہے تھے۔ اسے وہ وقت یاد آ رہا تھا جب پاکستان بننے پر سلو ممانی رحیم ماموں اور ان کے تینوں بچے یہاں آئے تھے ان کے پاس صرف دو پوٹلیاں تھیں۔ حالت ایسی خستہ تھی کہ گداگروں کا گمان ہوتا تھا۔ وہ ڈیڑھ دو ماہ ان کے یہاں رہے تھے۔ کچھ زیادہ یادیں تو اس کے ذہن میں نہ تھیں ان دنوں تو اسے اپنا بھی ہوش نہ تھا۔ دیوانوں کی طرح والٹن کیمپ، واہگہ اور لاہور ریلوے سٹیشن کی خاک چھان رہا تھا۔ بانو..... وہ بانو کو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔

تلازمِ خیال اسے سلو ممانی سے بانو کی طرف لے گیا۔ اس کے سینے سے اک دردیلی آہ نکلی۔ آنکھوں میں جلن سی ہونے لگی اور دم یوں گھٹنے لگا جیسے وہ کڑوے کسیلے دھوئیں سے بھرے کسی بند کمرے میں کھڑا ہو۔

یہ خیال ذہن سے ہٹانے کو اس نے سر کو جھٹکا دیا۔ گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ ہنوز بیس منٹ باقی تھے۔ توجہ بٹنے کی بجائے ذہن پر ماضی کے انگاروں کی یلغار ہونے لگی۔ کئی واقعات نظروں میں گھوم گئے۔

اس کی طبیعت خراب ہونے لگی۔ جی چاہا گھر لوٹ جائے لیکن یہ بھی ممکن نہ تھا۔ وہ بے چینی سے پلیٹ فارم گھومتا رہا۔ اس کے روئیں روئیں سے بانو کی پکار اٹھنے لگی۔ اس نے ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھنے سے ہمیشہ سے گریز کیا تھا۔ لاحاصل اور بے سُود ہی تو تھا پلٹ کر دیکھنا۔ بانو کو شہید ہوئے پانچ سال گزر چکے تھے۔ اسے وقت پر اختیار نہیں تھا۔ گزرتے وقت کے پاؤں کی زنجیر بن سکتا تھا نہ گزرے لمحوں کو لوٹانے کا مجاز تھا۔ پھر ان لمحوں سے پلٹ پلٹ کر تڑپنے کا فائدہ؟ وقت گزر چکا تھا۔ حسن کے زخموں کی زمانے نے رفوگری بھی کر دی تھی۔ اب نہ وہ ان کی دھجیاں بکھیرتا تھا نہ دیوانگی کے دورے غم کا کھلا اظہار کرتے تھے۔ اب بانو صرف یاد تھی تصور تھا اور اس نے زندگی سے سمجھوتہ کر لیا تھا لیکن اس سمجھوتے کے باوجود اس نے بانو کی یاد اور تصور سے غداری نہیں کی تھی۔ اس یاد کا تقدس اور اس تصور کی پاکیزگی ہی تھی جو وہ اپنی بھرپور جوانی کے تقاضوں کو نظر انداز کئے جا رہا تھا اور اماں کے اصرار کے باوجود اس بندھن میں بندھنے سے انکاری تھا جسے شادی کا نام دیا جاتا ہے۔

اماں تھک چکی تھیں۔ بہو لانا ان کی خواہش ہی نہیں ضرورت بھی تھی۔ بیوگی سے ٹوٹے کندھوں پر اک وہ بوجھ اٹھائے چلی آ رہی تھیں اب اٹھانے کی ہمت نہ رہی تھی۔ حسن جانتا تھا اماں کی تھکن کا بھی اسے احساس تھا۔ خود اس کی فطری خواہشیں بھی مچل جایا کرتی تھیں لیکن وہ بے بس تھا۔ جب بھی اس سلسلے میں کبھی عملی قدم اٹھانے کا سوچا بانو نے درمیان میں آ کر سلسلہ درہم برہم کر دیا۔ حسن سوچوں میں گم پلیٹ فارم پر ٹہل رہا تھا۔ گاڑی پہنچنے کے اعلان سے سوچوں کا رابطہ ٹوٹ گیا۔

کراچی سے آ کر راولپنڈی اور پشاور جانے والی ایکسپریس پلیٹ فارم نمبر پانچ پر سات بج کر بارہ منٹ پر پہنچ رہی ہے۔ لاؤڈ سپیکر پر اعلان متعدد بار گونجا حسن نے کوٹ کی آستین کھینچ کر گھڑی پر نگاہ ڈالی سات بج کر پانچ منٹ ہو چکے تھے۔ پانچ سات منٹ میں گاڑی آیا ہی چاہتی تھی۔ سٹیشن پر ہلچل سی مچ گئی مسافر اپنا اپنا سامان درست کرنے لگے۔ قلی ادھر سے ادھر بھاگنے لگے۔ کوئی پگڑی سر پر ٹھیک طرح سے جما کر سامان اٹھانے کو تیار ہو رہا تھا کوئی دوڑ کر اپنی جگہ لے رہا تھا تاکہ گاڑی سے اترنے والے مسافروں پر جھپٹا جا سکے۔ بچے بڑے سبھی حرکت میں تھے۔ مائیں بچوں کا ہاتھ پکڑ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ کوئی کسی کو آوازیں دے رہا تھا۔ ٹھیلے والے سامان لادنے کو پلیٹ فارم پر لا رہے تھے ریلوے کا عملہ بھی حرکت میں تھا۔ ریڑھیوں اور خوانچے والوں نے بھی آوازیں لگا رکھی تھی۔ اخبار فروش بھی اخبار اور رسالوں کا بنڈل اٹھائے گاڑی کے آنے سے پہلے چاک و چوبند نظر آنے لگے تھے۔ اک افراتفری مچی تھی۔ حسن کا خیال کچھ ہٹ گیا اس نے تو مہمانوں کا استقبال ہی کرنا تھا اس لئے وہ سیڑھیوں کی ریلنگ کے قریب کھڑے ہو کر اطمینان سے سگریٹ کے کش لیتے ہوئے سٹیشن کی گہما گہمی کو دیکھتا رہا۔

لوگوں کی گھبراہٹ سے محظوظ بھی ہو رہا تھا۔ سب جانتے تھے کہ لاہور گاڑی کم از کم آدھ گھنٹہ رکے گی لیکن اس حقیقت کے باوجود یہی ہوتا تھا کہ گاڑی کے سٹیشن پر پوری طرح رکنے سے پہلے ہی مسافر پل پڑتے تھے۔ اب اندر سے باہر آنے والے زور لگا رہے ہیں اور باہر سے اندر جانے والے اسی وجہ سے آپس میں تلخ کلامی بھی ہو رہی ہے اور وقت کا ضیاع بھی۔

"خدا جانے اس قوم کو وقت کی قدر و قیمت کا کب احساس ہو گا" حسن نے پاؤں سے سگریٹ مسل کر بجھاتے ہوئے سوچا۔

"صاحب وقت کیا ہے" کسی دیہاتی نے اس سے پوچھا

"سات بج کر دس منٹ ہو چکے ہیں" حسن نے شائستگی سے جواب دیا

"ایکسپریس آ رہی ہے نا" دیہاتی نے گٹھڑی کندھے سے اتارتے ہوئے کہا

"ہاں بس دو منٹ میں پہنچ رہی ہے۔ تمہیں کہاں جانا ہے" حسن نے ازراہ اخلاق پوچھا۔ "جہلم" اس نے جواب دیا۔

دور سے گاڑی کا انجن دھواں اڑاتا نظر آیا۔ ہلچل افراتفری میں بدل گئی۔ حسن بھی چند قدم بڑھا کر ذرا آگے آ گیا۔ اس کے مہمان آ رہے تھے۔ مہمانوں میں جانے کیوں سب سے پہلے اسے رابعہ کا خیال آیا۔

اس خیال کے ساتھ ہی اسے آٹھ دس سال کی وہ لڑکی یاد آ گئی جو جالندھر سے سلو ممانی کے ساتھ آیا کرتی تھی۔ موٹی سی سخت گندھی ہوئی ایک چٹیا چھپکلی کی دم کی طرح اس کے کرتے پر پڑی رہتی۔ گوری رنگت والی یہ لڑکی شاید دائمی زکام کی مریض تھی۔ حسن کو اس کی ناک ہمیشہ بہتی دکھائی دیتی تھی۔ اس کی بغل میں ممانی کا چھوٹا بچہ ہمیشہ ہوتا جسے بمشکل کولہے پر سنبھالتے ہوئے وہ گھر بھر میں گھومتی پھرتی تھی اس کی چوٹی کھینچ کر حسن کو بڑا مزہ آتا تھا۔

یہی لڑکی اس نے چودہ پندرہ برس کی عمر میں اس وقت دیکھی جب وہ پاکستان آئی۔ حسن کو اس وقت کا کچھ اتنا ہی احساس تھا کہ اب اس کی ناک نہیں بہتی تھی اور نہ ہی کولہے پر راشد چڑھا رہتا تھا ہاں اتنا یاد تھا کہ یہ لڑکی جتنے دن بھی ان کے ہاں رہی ٹخنوں سے اوپر شلوار کسے فرش دھوتی رہتی یا کپڑے دھو دھو کر صحن میں بندھی رسیوں پر ڈالا کرتی۔

اب خدا جانے وہ کیسی ہو گی! حسن کے ذہن میں کوندا سا لپکا لیکن اپنے اس خیال پر اپنے آپ کو خود ہی ملامت کرنے لگا جیسی بھی ہو گی اسے کیا؟

گاڑی اب پلیٹ فارم پر رینگتی چلی آ رہی تھی۔ شور و غل دوڑ دھوپ میں ایک دم اضافہ ہو گیا حسن نے کھسکنے والے ڈبوں پر نگاہیں دوڑائیں اور پھر لمبی سی گاڑی کے پیچھے ڈبوں کی طرف منہ موڑ دیا۔ جو ایک کمپارٹمنٹ میں

http://www.rehanahmed.com

اسے سلطانہ ممانی کا چہرہ نظر آیا۔ وہ شاید اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے اس نے اپنی آمد سے سلطانہ ممانی کو مطلع کیا۔ گاڑی رک گئی تھی۔ پل پڑنے والی بھیڑ کو چیرتا حسن فرسٹ کلاس کے اس ڈبے کی طرف لپکا جس کی کھڑکی سے سر نکالے سلطانہ ممانی مسکرا رہی تھیں۔ حسن نے مسؤدبانہ سلام کیا ممانی نے کھڑکی سے ہاتھ نکال کر اس کے سر پر پھیرا "جیتے رہو عمر دراز۔ گاڑی لیٹ ہو گئی تمہیں انتظار کرنا پڑا ہو گا"

"کوئی بات نہیں۔ کہئے سفر اچھی طرح کٹ گیا"

"بالکل۔ بالکل" ممانی کھڑکی سے ہٹتے ہوئے بولیں "قلی"

حسن نے قریب کھڑے قلی کو اشارہ کیا جو پہلے ہی اندر جانے کو پر تول رہا تھا۔ اس ڈبے کے سامنے بھیڑ نہ تھی۔ صرف انہیں ہی اترنا تھا حسن قلی کے ساتھ خود بھی کمپارٹمنٹ میں داخل ہو گیا۔

"ناصر راشد ساتھ والے ڈبے میں ہیں" ممانی بھی مسافروں کی سی گھبراہٹ میں مبتلا تھیں"

"ہم آ گئے امی" کھڑکی سے ناصر نے جھانکا"

"اسباب اتروا لیا" ممانی نے پوچھا

"جی"

ممانی اطمینان سے حسن کی طرف پلٹیں جو ایک کٹے بالوں والی جوان لڑکی کو سیٹ پر جھکے رسالے اٹھاتے دیکھ رہا تھا کٹے بال سپید گردن پر دھوپ چھاؤں کا امتزاج دکھائی دے رہے تھے۔ ممانی اماں کا حال پوچھتے اپنے سفر کی سرگزشت سناتے سامان اتروانے لگیں "یہ بیگ مجھے دے دو رابعہ" ممانی نے خوبصورت بیگ کی طرف اشارہ کیا۔

رابعہ نے بیگ اٹھایا اور پلٹ کر ماں کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس کی نظریں حسن کی جامد سی نظروں سے ملیں پلکیں لرزیں اور جھک گئیں۔ گالوں پر شہابی رنگ دوڑ گیا۔ حسن کو وہ پہلے ہی پلیٹ فارم پر دیکھ چکی تھی۔ پہلی ہی نظر میں یہ تصویر اس چوکھٹے میں فٹ ہو گئی تھی جو کتنی مدت سے وجود میں آنے کے باوجود خالی پڑا تھا۔ اب حسن سے نظر ملی تو گھبراہٹ سی محسوس ہوئی اس دھڑکے کی گھبراہٹ کہ دل کا راز افشانہ ہو جائے۔

قلی نے سارا سامان اتار لیا تھا۔ رابعہ نے اپنے رسالے اٹھائے۔ سلطانہ ممانی نے بیگ سنبھالا "چلو" حسن خود فراموشی کے عالم میں کھڑا تھا۔ ممانی کی آواز پر چونکا "چلئے" حسن نے اسی طرح کھڑے کھڑے کہا

رابعہ ماں کے پیچھے "صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں" کی تفسیر بنی کھڑی تھی۔

ممانی اپنے سفر کی سرگزشت سناتے ہوئے کمپارٹمنٹ سے باہر آ گئیں ان کے پیچھے اک ادائے دلربائی سے

کتراتی رابعہ۔ حسن دونوں کے باہر آنے کے بعد بوکھلایا سا باہر آیا۔ رابعہ کو دیکھ کر تو وہ کچھ خوف زدہ سا ہو گیا تھا۔ رابعہ نے اس کی طرف دیکھا بھی تو کچھ اسطرح تھا کہ اس کی جوانی کا حصار لرز گیا تھا۔

والی سڑک سے دائیں ہاتھ نیچے اتر کر چند فرلانگ سیدھا جا کر پہلے گھماؤ پر وہ چوڑی گلی تھی جس میں حسن کا مکان تھا۔ پیلی لال اینٹوں والی یہ کشادہ گلی صاف ستھری بھی تھی۔

تقسیم ملک سے پہلے یہاں ہندو آبادی تھی۔ اکثر مکان کوٹھی نما بنے تھے۔ اب یہاں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ہجرت کر کے آئے ہوئے مسلمان خاندان آباد تھے۔ کچھ مقامی لوگوں نے بھی حالات کی دھکم پیل سے فائدہ اٹھایا تھا اور ان مکانوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ مہاجر خاندانوں میں کئی ایسے بھی تھے جو بڑی خوبصورت حویلیاں چھوڑ کر آئے تھے اور اب دس دس پندرہ پندرہ مرلے کے مکانوں میں مقیم ہو کر بھی اللہ کے شکر گذار تھے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو جھونپڑیوں میں رہتے ہوئے بھی پچھتا رہے تھے کہ قبضہ ہی کرنا تھا تو کسی ساہوکار کسی سیٹھ کی بھری بھرائی کوٹھی پر کیا ہوتا۔

حسن تقسیم ملک سے قبل ہی یہاں تھا چند ماہ پہلے اماں کو بھی لدھیانے سے لے آیا تھا۔ فسادات کی آگ مکمل طور پر بھڑکی ہوئی تھی جب وہ پنڈی سے لاہور تبدیل ہوا تھا۔

اماں اپنی جائیداد کے کاغذات لے آئی تھیں حسن کو تو ان دنوں کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ حمید نے ہی دوڑ دھوپ کر کے یہ مکان انہیں دلایا تھا گو یہ مکان اتنی مالیت کا نہیں تھا جتنی مالیت کے کاغذات تھے پھر بھی غنیمت تھا کہ اماں چپ ہو رہی تھیں۔ اس مکان سے سامان بھی برآمد ہوا تھا۔ اماں نے اپنی ضرورت کا رکھ کر باقی برتنے والا اسی طرح کی ایک گورداس پور کی ایسی مہاجر عورت کو دے دیا تھا جو اپنا پورا خاندان پاکستان کے نام پر کٹوا آئی تھی۔

حسن اور اماں کی ضرورت کے لئے یہ مکان کافی سے زیادہ تھا پتھر کی سلوں والا کھلا صحن، چھ کشادہ کمرے نچلی منزل میں اور ایک اوپر والی منزل پر تھا۔ باورچی خانہ خاصہ بڑا تھا۔ ساتھ گودام بھی تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مکان کے ساتھ گیراج بھی تھا۔ ڈیوڑھی میں داخل ہوتے دائیں ہاتھ بہت بڑی بیٹھک تھی اور بائیں ہاتھ

"حسن بھی ہنس دیا" میں ناصر سے مذاق کر رہا تھا" رابعہ نے چائے بنا کر امی اور پھپھو کو پیش کی۔

"امی بھی ... لوں گی پہلے ناصر راشد کو دو"

"... آپا" سلطانہ نے بے تکلفی سے کہا" آپ تکلف نہ کریں اپنا گھر ہے کوئی مہمان تو نہیں ہیں"

اماں اور سلطانہ باتیں کرنے لگیں۔ رابعہ نے چائے کی پیالی حسن کی طرف بڑھائی۔ حسن نے قدرے ... پیالی تھام لی۔ رابعہ کا ہاتھ لرز گیا۔ حسن کو الجھن سی ہونے لگی۔ چائے خاموشی سے حلق میں انڈیل کر ... سلطانہ ممانی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ اپنے ذہن کو اس طرف سے ہٹانا چاہتا تھا جس طرف وہ اڑیل گھوڑے کی طرح بدک بدک کر جا رہا تھا۔ سلطانہ ممانی سے باتیں کرتے ہوئے بھی توجہ رابعہ کی طرف مبذول ... وہ جھک جھک کر اماں سے باتیں کر رہی تھی۔ خوا مخواہ سرخ ہو رہی تھی اس کی پلکیں لرز لرز کر گالوں پر ... رہی تھیں۔ یہ ایسے وار تھے جس سے حسن اپنے آپ کو بچانا چاہتا تھا شاید اسی لئے وہ اٹھ کر کمرے سے ... گیا۔

اپنے کمرے میں آ کر وہ اسی طرح پلنگ پر چت لیٹ گیا اس پر کچھ گھبراہٹ سی مسلط تھی کچھ خوف کا احساس ... اس ... مسافر کی طرح تھا جو اپنی سیدھی راہ جاتے جاتے اچانک لیٹروں میں گھر گیا ہو اور اب لٹ جانے کا ... پورا یقین ہو گیا ہو۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا وہ کیوں رابعہ کے متعلق سوچ رہا تھا لڑکی ہی ... معمولی شکل و صورت کی لڑکی کوئی مہ لقا تھی نہ حور۔ بہر نہج اس نے اپنے دل کو ایک اتالیق کی طرح سمجھایا ... پوری قوت مدافعت سے رابعہ کا سامنا کرنے کا عہد کر لیا۔ کھانا کمرے میں لگ گیا تھا حسن کے سوا سبھی میز ... بیٹھے تھے۔

"... کہاں ہے؟" سلطانہ نے اپنے سامنے پلیٹ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"... کہیں ہو گا۔ برکتے جا حسن کو بلا لا سب کھانے پہ اس کا انتظار کر رہے ہیں" اماں نے پاس کھڑی برکتے ... کہا" اپنے کمرے میں ہو گا"

"... نہیں بی۔ باہر برآمدے میں کھڑے ہیں" تاجاں گرم گرم چاولوں کی ڈش لے کر اندر آتے ہوئے بولی۔

"... برآمدے میں کیا کر رہا ہے اسے بلاؤ کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا" اماں نے اس کے ہاتھ سے ڈش لے کر میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"... سگریٹ پی رہے ہیں" تاجاں نے واپس مڑتے ہوئے کہا۔

اماں ... مسکرائیں" میرے سامنے سگریٹ نہیں پیتا جب ضرورت پڑے اٹھ کر باہر چلا جاتا ہے"

"... " سلطانہ نے جی کھول کر داد دی" ایسا فرماں بردار بیٹا آپا آپ کی خوش نصیبی ہے ورنہ آجکل کے

والی جگہ پر گیراج بنا تھا جس میں پہلے ٹوٹے پھوٹے سامان کے علاوہ حسن موٹر سائیکل رکھا کرتا تھا لیکن اب گاڑی خرید لینے کے بعد اسے صاف کروا کے پوری طرح استعمال میں لایا گیا تھا۔

صحن میں سامنے والے کمروں کے آگے لمبا برآمدہ تھا جس میں جگہ جگہ پھولوں کے گملے پڑے تھے۔ اماں کو پھولوں سے بڑا لگاؤ تھا۔ ان گملوں کی دیکھ بھال بڑی پریت سے کیا کرتیں۔ مہمانوں کا سامان برکتے اس کے بیٹے گامی اور بہو تاجاں نے مل کر ان کے کمروں میں پہنچا دیا۔

اماں دروازے میں کھڑی مہمانوں کی راہ دیکھ رہی تھیں۔ سلطانہ ممانی سے اس تپاک سے گلے ملیں کہ سب کے چہرے مسکرا اٹھے۔ ناصر اور راشد کو پیار کیا لیکن رابعہ کو تو یوں سینے سے چمٹایا جیسے اب الگ کریں گی ہی نہیں سر چوما اور بار بار چوما اماں کے والہانہ پیار نے خوف کی غیر محسوس سی کپکپی حسن پر طاری کر دی۔

چائے کا پانی تیار تھا۔ برکتے فوراً چائے تیار کر کے لے آئی۔ مہمان ڈرائنگ روم میں تھے۔ اماں اور سلطانہ ممانی زمانے بھر کی باتیں کر رہی تھیں۔ ناصر اور راشد بھی حسن سے خوب گھل مل کر اپنے سفر کا حال سنا رہے تھے۔ رابعہ تھی جو چپ چاپ اماں کے دائیں ہاتھ بیٹھی تھی کبھی انگلیاں مسلنے لگتی کبھی گردوپیش نگاہیں دوڑاتی حسن ناصر اور راشد سے باتیں کرتے ہوئے بھی رابعہ کی ایک ایک حرکت سے آگاہ تھا اور یہی آگہی اس کی جھنجھلاہٹ کا باعث بن رہی تھی۔

"رحیم بھی آ جاتا تو کتنی خوشی ہوتی" اماں نے بھائی کو یاد کرتے ہوئے کہا

"توبہ آپا۔ انہیں فرصت کہاں؟" سلطانہ ممانی نے ہنس کر کہا "آجکل تو مصروفیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے"

"کیوں؟"

"کپڑے کی فیکٹری لگوانے کی کوشش کر رہے ہیں" سلطانہ ممانی کے لہجے میں فخر کا عنصر نمایاں تھا برکتے نے چائے درمیانی میز پر لا کر رکھ دی تھی

"چائے بناؤ بیٹی" سلطانہ ممانی نے رابعہ سے کہا

"میں بنا دیتی ہوں" اماں نے انکسار سے کہا "اتنے لمبے سفر سے آئی ہے تھکی ہو گی میری بچی"

"تھکنا کیسا پھپھو جان سارا راستہ باجی سیٹ پر لیٹی آئی ہیں" راشد نے اپنی ہانکی۔ رابعہ نے بھائی کو پیار سے گھورا "میں چائے بناتی ہوں پھپھو جان آپ رہنے دیں" رابعہ نے شائستگی سے کہا اور میز کھسکا کر اپنے سامنے کر لی اس آواز کی نقرئی کھنک کا احساس نہ چاہنے کے باوجود حسن کو ہونے لگا۔

"بھائی جان آپ کبھی کراچی آتے ہی نہیں" ناصر نے شاکی لہجے میں کہا۔

"بیکار آدمی تھوڑا ہی ہوں" حسن نے شگفتگی سے جواب دیا

"بیکار تو ہم ہوئے" سلطانہ ممانی نے قہقہہ لگایا "کیوں حسن بیٹے"

دور میں یہ جذبہ بچوں کی سرشت سے ہی خارج ہوتا جا رہا ہے۔ ناصر، راشد اور رابعہ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔

"ہاں سلطانہ میں تو اللہ تعالیٰ کی لاکھوں بار شکر گذار ہوں۔ بڑا ہی سعادت مند بچہ ہے پچھلے دنوں گاڑی کیلئے تمہیں کیا بتاؤں۔ اس نے کس کس طرح میری رضامندی چاہی لیکن آفرین ہے اس وقت تک سودا نہیں کیا جب تک میں نے حامی نہیں بھری۔ حالانکہ پیسہ اس کے پاس تھا۔ اپنی کمائی تھی جو جی میں آتا کرتا۔

"ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ سلطانہ نے اپنے دونوں بچوں کی طرف دیکھ کر کہا" سن لو بچو دیکھا نا کتنے بڑے ہیں تمہارے بھائی جان۔ انجینئر بن چکے ہیں اپنے پاؤں پر کھڑے بھی ہو گئے ہیں پھر بھی کتنے فرماں بردار ہیں اپنی اماں کے"

"امی میں بھی جب انجینئر بنوں گا تو بھائی جان کی طرح آپ کا فرماں بردار بیٹا بنوں گا" راشد نے بڑے جذبے سے کہا سب اس کی معصومیت پر ہنس پڑے۔ انجینئر بننے سے پہلے فرماں برداری شرط نہیں کیا؟ رابعہ نے اس کا کان اینٹھا۔

"نہیں باجی میرا یہ مطلب تو نہیں تھا"

"کیا تھا مطلب پھر"

"کان چھوڑیئے پھر بتاؤں گا"

سب ہنس پڑے۔ ممانی کے قہقہے شگفتہ تھے لیکن برآمدے میں کھڑے حسن کو کچھ نقرئی گھنٹیوں کی کھنک ممانی کے قہقہوں سے زیادہ سنائی دے رہی تھی۔ یقیناً یہ رابعہ کی خوبصورت اور جاندار ہنسی تھی۔

http://www.rehanahmed.com

[illegible] میں کھڑا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ ایک نہیں چار سگریٹ کھڑے کھڑے ختم کر ڈالے تھے۔
[illegible] سامنے سگریٹ پینے کا عادی نہیں تھا لیکن اس وقت وہ اماں کے سامنے سے نہیں رابعہ کے سامنے سے
[illegible] یہاں کھڑا تھا۔ تاجاں باورچی خانے سے ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم سے باورچی خانے تک آجا رہی
[illegible] کھانے کا آج خاص اہتمام ہوا تھا۔ پلاؤ مرغ۔ شامی کباب اور میٹھا گوشت اماں نے سب چیزیں اپنے ہاتھ
[illegible] تھیں۔

[illegible] انہماک سے تاجاں کو آتے جاتے دیکھ رہا تھا لیکن اس کا ظاہری انہماک اس کی باطنی کیفیت سے
[illegible] رہا تھا۔ باطنی سوچ کے تسلسل کے لئے خارجی عنصر پر حواس خمسہ کو مرکوز کرنا ہی پڑتا ہے۔ وہ بھی خارجی
[illegible] داخلی کیفیت کے زیر و بم دیکھ رہا تھا۔ رابعہ کی جان دار ہنسی کے دلربا لوچ کا اعتراف اس کی ذہنی
[illegible] اسی لئے وہ ڈائننگ روم میں جانے سے کچھ کترا رہا تھا لیکن تا بہ کے اسے اندر جانا ہی تھا۔ ایک بار پھر اس
[illegible] نے ہمت کا شرارہ بھرا جو کچھ ہی دیر پہلے اپنے بستر پر لیٹے لیٹے کیا تھا۔ تاجاں کے مخاطب کرنے سے
[illegible] نے ادھ جلا سگریٹ فرش پر پھینک کر بوٹ سے مسل دیا۔

"[illegible] آتا ہوں" کہتے ہوئے اک وقار سے چلتا کھانے کے کمرے میں آ گیا سلطانہ ممانی کے دائیں ہاتھ
[illegible] بیٹھتے ہوئے آواز میں ساختہ پر اعتماد پیدا کیا "بسم اللہ کیجئے"

"[illegible] پہلے"

"[illegible] سلطانہ"

"[illegible] میں کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا ممانی۔ آپ شروع کیجئے" حسن نے چاولوں کی ڈش ممانی کی طرف
[illegible] ناصر اور راشد کی بھوک خوب چمک رہی تھی جب ڈش اماں اور رابعہ کے بعد ان کے سامنے آئی تو وہ بے
[illegible] حسن مسکرانے لگا۔ رابعہ نیچی نظروں سے بھائیوں کو گھور رہی تھی۔ حسن کا جی چاہا رابعہ سے

بے تکلفی سے بات کرے لیکن بات تو یہ تھی کہ کوئی بات ہی ذہن میں نہ آ رہی تھی۔

کھانا ممانی کی دل نشین باتوں، راشد کی معصوم حماقتوں، ناصر کے مزاحیہ چٹکلوں اور رابعہ کی پراسرار خاموشیوں کے درمیان خاصہ پر لطف رہا حسن کے ذہن پر چھایا ہوا خوف بھی کسی حد تک زائل ہو گیا۔

"بھائی جان" ! راشد نے کھیر چمچ سے پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا

"ہوں" حسن کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

"کتنی فلمیں دکھائیں گے ہمیں" وہ جلدی سے بولا۔

"اوہو۔ فلموں کے بڑے شوقین ہیں جناب" حسن نے کہا۔

رابعہ نے اسے گھورا اور ناصر نے اسے ٹھوکا دیا۔ سلطانہ پیار سے اسے دیکھ کر بولی "اور تو کوئی بات اسے آتی نہیں"

وہ کچھ کھسیانہ سا ہو گیا۔ اماں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا جتنی فلمیں میرا بیٹا چاہے گا دکھا دیں گے"

"اچھا بھئی۔ آپ کی فرمائش نوٹ ہو گئی" حسن نے خوش دلی سے کہا "اماں نے آپ کی سفارش کر دی ہے"

پھر وہ ناصر کی طرف دیکھ کر مسکرایا "آپ کی فرمائش؟"

"پورا لاہور گھومیں گے" ناصر بولا "بادشاہی مسجد، شاہی قلعہ، جہانگیر کا مقبرہ"

"بس بس ہو گئی نوٹ آپ کی فرمائش بھی"

دونوں بھائی خوشی سے اچھلنے لگے۔ حسن نے اسی موڈ میں رابعہ کی طرف دیکھا "آپ بھی اپنی فرمائش نوٹ کروا دیں"

رابعہ کا چہرہ کانوں کی لوؤں تک سرخ ہو گیا۔ سلطانہ اور اماں اپنی ہی کسی بات میں مگن تھیں اس کی طرف کسی نے دیکھا ہی نہیں ورنہ بڑے بڑے راز سطح پر آئے ہوئے تھے۔

"باجی آپ بھی بتائیں نا" راشد نے کہا

"ہاں باجی پورا پروگرام بنا لیں بھائی جان کو سہولت رہے گی" ناصر بولا

"مجھے سہولت ہی سہولت ہے" حسن نے بے تکا سا جواب دیا۔

رابعہ کچھ نہیں بولی سرخ سرخ گالوں پر پلکوں کے سائے لرزتے رہے۔

"ہمارے تو کان کھا جاتی ہیں" ناصر نے بڑے بزرگانہ انداز میں کہا آپ سے شرما رہی ہیں بھائی جان"

"ناصر!" رابعہ کو ناصر کی سادہ سی بات پر غصہ آ گیا حسن رابعہ کی اس ادا سے مسحور ہونے کی بجائے جھنجھلا گیا۔

"میں نے کیا کہا ہے باجی آپ تو یونہی بگڑ رہی ہیں" ناصر نے منہ بنایا۔ رابعہ نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔
"کیا ہوا؟" سلطانہ نے دونوں بہن بھائیوں کو یوں منہ بناتے دیکھ کر پوچھا۔
"کچھ نہیں امی میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا" ناصر نے سادگی سے کہا "آ گئے اپنے لچھنوں پر" سلطانہ نے پیار سے
"ان دونوں کی تو ایک منٹ نہیں بنتی"
"اور تکے کے جو ہیں" اماں نے ہنس کر کہا۔
اس رات حسن کتنی ہی دیر جاگتا رہا جس طرف کروٹ بدلتا رابعہ کا ہیولا دکھائی دیتا۔ آنکھیں بند کرتا تو رابعہ کا احساس ہوتا اسے سخت جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی۔ ایسی بھی کیا کمزوری۔ لڑکی نہ ہوئی قیامت ہو گئی۔ یہ اوچھا پن انتیس سالہ نوجوان کو زیب نہیں دیتا تھا اس نے خیال ہٹانے کو کتنی ہی دیر ریڈیو چالو رکھا جانے کس دیس کی دھن بجتی رہی۔ کتابوں کا سہارا لیا لیکن طبیعت اچاٹ ہو گئی۔ مضطرب ہو کر کمرے میں ٹہلتا رہا اسے کیا ہو رہا تھا کیوں ہو رہا تھا سب جانتے ہوئے بھی انجان بن کر اپنے آپ سے سوال کر رہا تھا۔

ٹہلتے ٹہلتے وہ الماری کے قریب رک گیا پٹ میں لگے لمبوترے آئینے میں اس نے اپنا سراپا دیکھا ڈھیلے شب خوابی کے لباس میں بکھرے بالوں اور سرخ آنکھوں کے باوجود وہ بڑا وجیہہ لگ رہا تھا جوانی کا نکھار اس کے چہرے کو اور بھی خوبصورت بنا رہا تھا اس نے آئینے میں غور سے اپنی خوبصورت اور جھیل کے سے ٹھہراؤ والی آنکھوں میں جھانکا وہ ان آنکھوں کو دیکھتا رہا غور سے دیکھتا رہا
معاً اسے یوں محسوس ہوا جیسے ان آنکھوں میں وہ حسن بیدار ہو رہا ہے جو جوان مرد ہے جس کے کچھ فطری تقاضے ہیں جس کی کچھ جسمانی ضرورتیں ہیں گھبرا کر اس نے منہ موڑ لیا "نہیں۔ نہیں۔ وہ حسن بانو کے ساتھ ہی مر گیا تھا ان فطری تقاضوں کو ان جسمانی ضرورتوں کو اس نے کفنا دیا تھا ایسا نہیں ہو سکتا ایسا نہیں ہونا چاہئے" بے بس ہو کر اس نے چہرہ ہاتھوں پر گرا لیا۔
بانو! ...... بانو! ...... اس رات اس نے شدت کے ساتھ بانو کو دیکھا اپنی آرزوؤں' خواہشوں اور چاہتوں کے چہروں کے سرکتے کفن درست کرتا رہا اس نے نئے سرے سے اپنے ارمانوں کی قبریں کھودیں۔ وہ انہیں اتنا گہرا دفن کرنا چاہتا تھا کہ پھر کبھی کیسی ہی تحریک کیوں نہ ملے یہ ارمان اٹھ ہی نہ سکیں۔ لیکن یہ اس کی بھول تھی۔ بانو اس کا عشق ضرور تھی لیکن قضا کے ہاتھوں پانچ سال پہلے فنا ہو چکی تھی۔ پانچ سال ہو چکے تھے۔
حسن اب بھی اپنے عشق کی بلندی پر تھا یخ بستہ موت سے محبت کئے جا رہا تھا اپنا عہد نبھا رہا تھا بانو کی ذات کو اس نے اپنے آپ پر کچھ اس طرح مسلط کر رکھا تھا کہ موت اور زندگی کے فاصلے بے معنی ہو کر رہ گئے تھے۔
وہ پلنگ تھا اور بانو دور۔

پتنگ اور ڈور کا توازن لازمی ساتھ ہے۔

لیکن کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ڈور کٹ جاتی ہے۔

اور جب ڈور کٹ جاتی ہے تو بھی جانتے ہیں کہ پتنگ کا توازن بگڑ جاتا ہے وہی فضا وہی بلندی وہی ہوا ہوتی ہے لیکن پتنگ ڈولتی چلی جاتی ہے ڈولتی چلی جاتی ہے اور بالآخر کسی چھت پر گر جاتی ہے۔ کسی کھمبے سے الجھ جاتی ہے کسی ہاتھ میں پڑ جاتی ہے۔

حسن پتنگ تھا اور بانو ڈور

حالات کے وار سے ڈور کٹ چکی تھی پتنگ ڈانواں ڈول تھی۔

حسن چاہتا یا نہ چاہتا رابعہ کا ہاتھ اس ڈولتی پتنگ کو پکڑنے کے لئے بڑھ چکا تھا۔

رابعہ کا ذہن اس گھنے جنگل کی طرح تھا جس میں وحشی آندھیوں کا شور ہوتا ہے۔وہ کراچی سے لاہور آئی تھی۔ یہ کا ارادی تھا۔ امی اور ابو کی باتوں نے اس کے کنوارے من کے کئی پٹ کھول دیئے تھے۔ وہ یہاں اپنے تخیل کا پیکر دیکھنے آئی تھی اپنے خوابوں کے حسن کی تلاش میں یہاں آگئی تھی۔ اس گھمبیر آواز کو سننے آئی تھی جو اس کے کانوں میں اک عرصے سے سرگوشیاں کر رہی تھی۔ ان بھاری ہاتھوں سے چھو جانے کو مچلی تھی جن کا لمس اس کے بدن میں گدگدی پیدا کیا کرتا تھا۔ ان مردانہ بازوؤں کی قوت آزمانے آئی تھی جن کی لپیٹ میں اس کا وجود خیالی دنیا میں کئی بار آچکا تھا۔ اس وجیہہ پیکر کو دیکھنے آئی تھی جو مستی بھرے انداز میں تخیل کی دنیا میں اس سے چھیڑ چھاڑ کرنے کا عادی تھا۔

حسن کو پہلی نظر اس نے گاڑی کی کھڑکی سے دیکھا تھا گاڑی جوں جوں لاہور کے قریب آرہی تھی اس کے دل کی دھک میں اضافہ ہو رہا تھا اس کی حالت اس طالب علم کی سی تھی جو پاس اور فیل ہونے کے بین بین پرچے کر کے نتیجہ سننے کو کھڑا ہو۔

حسن کو وہ آج پہلی بار تو دیکھنے والی نہیں تھی ہاں جس نظر سے دیکھنا تھا۔ وہ یقیناً پہلی تھی اس نے حسن کو دیکھا اک لمحہ کو دیکھا لیکن اس لمحے نے اسے کیف و سرور کی اک دنیا بخش دی اسے یوں لگا جیسے اسے دامن کی وسعتوں سے کہیں بڑھ کر مل گیا ہے اس کی خوشیوں کی انتہا نہ رہی۔ رات اس کے خوابوں میں قوس و قزح کے رنگ بکھرے تھے صبح ناشتے کی میز پر حسن سے سامنا ہوا خدا جانے کیوں وہ چاہنے کے باوجود اس سے ایک بات بھی نہ کر سکی حسن کچھ الجھا الجھا سا بیٹھا تھا چہرے پر تفکر اور مایوسی کی ہلکی سی تہہ تھی۔ رابعہ کو حسن کے حُسن کا یہ انداز بے حد طرح بھایا۔ دردیدہ نظروں سے اس کی طرف کئی بار دیکھا پھر سارا دن وہ خوشی خوشی گھر میں گھومتی پھری اماں اور سلطانہ تو خدا جانے کس کس زمانے کی باتوں کے پلندے کھول بیٹھی تھیں۔ ناصر اور راشد بھی باہر گئے ہوئے تھے۔ رابعہ مترنم نغمے کی طرح گنگنا رہی تھی۔

وہ ڈرائنگ روم میں لگی حسن کی تصویر اتنے ندیدے پن سے دیکھتی رہی کہ خود شرمسار بھی ہو گئی۔ بیکار وقت گذارنا مشکل تھا۔ اماں سے پتہ چلا تھا حسن دو اڑھائی بجے گھر آئے گا۔ رابعہ نے ڈرائنگ روم کی ترتیب بدلنے کا سوچا

اماں نئے زمانے کی نہ تھیں اور حسن مرد تھا گھر میں جو بھی سامان تھا ٹھونسا پڑا تھا۔ رابعہ نے بیٹھک کو نفاست سے سجانے کا سوچا وہ باہر آئی دھوپ کی زد میں چارپائی پر بھاری بھر کم گوری چٹی اماں بیٹھی شلغم کاٹ رہی تھی۔ قریب ہی دوسری چارپائی پر سلطانہ لیٹی تھی چارپائی پر کالے غلافوں والا تکیہ پڑا تھا تکیے کے قریب سلطانہ کی سلائیاں اور اون پڑی تھی "پھپھو جان" رابعہ نے محبت سے پکارا۔

"جی بیٹا" جواب بھی اتنی محبت سے ملا

"آپ کی ملازمہ کہاں ہے؟"

"باورچی خانے میں"

"کھانا بنا رہی ہے"

"ہاں کچھ کر رہی ہوگی کیوں؟"

"دوسری عورت بھی تو تھی"

"کیا کام ہے رابی" سلطانہ نے پوچھا

"کچھ ہے نا" رابعہ مسکرائی۔ ویسے مسکراتو اس کا انگ انگ رہا تھا۔

"پھر بھی"

"امی! پھپھو جان کی بیٹھک ٹھیک کرنا ہے" رابعہ ہنس پڑی "مجھ سے صوفے اکیلے ہٹائے نہیں جاتے ذرا"

"اے ہے بٹی" اماں کا ہاتھ شلغم چھیلتے رک گیا "تم آرام کرو رہنے دو بیٹھک کو ایسے ہی"

"نہیں پھپھو میں اسے آج ٹھیک کروں گی۔ ہر چیز سے سجا کر رکھوں گی۔ آپ ذرا ملازمہ کو تھوڑی دیر کیلئے بلا دیں" اماں پیار سے منع کرتی رہیں۔

"کرنے دو آپا گھر بھی اس کا ہی کام ہے۔ نکلا تو بیٹھا نہیں جاتا۔ اچھا ہے اکیلے بیٹھے بیٹھے بور ہو جائے گی" سلطانہ نے فخر سے کہا "میں نے تو بٹی کو ہر کام کی عادت ڈالی ہے۔ سوئی سلائی، کھانا پکانا، گھر آراستہ کرنا ہر کام جانتی ہے یہ"

"ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ" اماں نے نظروں ہی نظروں میں رابعہ کی بلائیں لے ڈالیں۔ اماں نے تاجاں کو بلوا بھیجا۔ رابعہ اسے ساتھ لے کر بیٹھک میں جا گھسی اور دو گھنٹے بعد جب وہ کمرے سے باہر نکلی تو کمرے کی سج دھج ہی نرالی تھی۔ ہر چیز نفاست کا نشان دکھائی دے رہی تھی۔ فالتو سامان رابعہ نے اٹھوا کے خالی کمرے میں بھجوا دیا تھا۔

ںوؤں کی جگہ بدلی تھی۔ تصویروں کی ترتیب مختلف کی تھی کتابوں والی شیشے کی خوبصورت الماری کا رخ بدلا تھا۔ آرائش کی چیزوں کی بھرمار تھی اس نے چند نفیس چیزیں رکھ کر باقی سب اٹھوالی تھیں ایک کونے میں پڑے گلدان میں سوکھی ٹہنیوں پر پھول اسطرح لگائے تھے کہ کمرے میں داخل ہوتے ہی نظر ان پر پڑتی اور شاداں لوٹتی۔

اماں نے رابعہ کا ماتھا چوم کر داد دی۔ سلطانہ جس مقصد کیلئے آئی تھی۔ وہ پہلے ہی مرحلہ پر کامیابی سے ہوتا نظر آگیا تھا۔ شام حسن کے سامنے اماں نے رابعہ کے کام کی تعریف شروع کر دی حسن نے کسی قسم کی داد کا اظہار نہیں کیا گو ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی تبدیلی کا خوش گوار تاثر اس نے دلی طور پر قبول کیا تھا لیکن رابعہ کو اپنے سے دور رکھنے اور خود رابعہ سے دور رہنے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا اس کی تعریف و توصیف کیوں کر کرتا۔ یہ تو قربت کی بڑی مضبوط کڑی ہوتی۔

شام وہ ناصر اور راشد کو باہر لے گیا۔ رابعہ نے اس بات کو بری طرح محسوس کیا حسن نے اسے ایک بار بھی ساتھ چلنے کو نہیں کہا تھا۔ پوری شام اس نے اکیلے کمرے میں بور ہوتے گذار دی تھی۔

رات وہ فلم کا آخری شو دیکھ کر آئے۔ سلطانہ سو چکی تھی لیکن رابعہ جاگ رہی تھی اس کے سپنوں کا حسین رنگ اڑا جا رہا تھا حسن ناصر اور راشد کو برکتے نے کھانا دیا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے تینوں کی مسرور آوازیں رابعہ کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ دکھ کا گہرا احساس اسے بے چین کرنے لگا۔

دن حسن نے گھر سے باہر گذارا۔ رات گئے وہ گھر لوٹا دفتر کے کام کا کہہ دیا لیکن یہ فرار کا محض ایک بہانہ تھا۔ رابعہ نے اس کی گھر سے غیر حاضری شدت سے محسوس کی اور پھر دوسرے دن بھی حسن صبح ہی صبح گھر سے نکل گیا دفتر کا ایک جیپ ڈرائیور اس نے گاڑی کے ساتھ گھر بھیج دیا تاکہ مہمانوں کو شہر گھما پھرا لائے آج کا دن قوم کیلئے بڑا اہم تھا۔ بابائے ملت حضرت قائد اعظم کا یوم پیدائش تھا شہر میں بڑی گہما گہمی تھی جلسے جلوس تھے۔ لوگ اپنے قائد کو خراج عقیدت پیش کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے اس تقریب کی خوشی میں جگہ جگہ پارٹیاں دی جا رہی تھیں دکانیں سجائی گئی تھیں چراغاں کرنے کا اہتمام ہو رہا تھا۔ سرکاری عمارتوں پر ہلالی پرچم لہرائے گئے تھے۔

حسن گھر سے مصروفیات کے بہانے نکلا تھا۔ ناصر نے بھی اس کے ساتھ جانا چاہا لیکن وہ بڑی خوبصورتی سے اسے بہلا گیا۔ یہ سارا دن اس نے حمید کے ساتھ گذارا۔

ناصر، راشد، سلطانہ اور اماں شام گاڑی پر شہر بھر میں گھومتے پھرے۔ رابعہ نے خرابی طبع کا بہانہ کر دیا کسی حد تک یہ بات درست بھی تھی اس کی طبیعت الجھن اور پژمردگی کا شکار تھی۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ حسن اس کا سامنا کرنے سے کتراتا ہے کیوں؟ اس کا جواب اسے نہیں مل رہا تھا۔ کیا وہ اتنی بری تھی۔ کیا اس میں ذرہ بھر کشش نہ تھی کتنی کتنی دیر وہ آئینے کے سامنے کھڑی ان سوالوں کے جواب پوچھا کرتی۔

ان سوالوں کا جواب کبھی بھی نئی کی صورت آئینے سے نہ ملتا۔

توپھر۔ پھر۔ کیوں وہ اس چھپتا پھرتا ہے۔ ناصر راشد سے اس کے تعلقات اتنے دوستانہ ہو گئے تھے کہ وہ اس کے کلمے پڑھنے لگے تھے۔ امی کا دل اس نے الگ موہ لیا تھا کس سعادت مندی سے ان کی ضروری اور غیر ضروری باتیں سنتا رہتا تھا لیکن جہاں وہ اس کے سامنے آئی اس نے غائب ہو جانے کی تیاری شروع کر دی اس فرار کی وجہ کیا تھی؟ اس چھپنے پھرنے کا اسرار کیا تھا؟

لیکن رابعہ کو کون بتاتا کہ حسن اس سے نہیں اپنے آپ سے چھپتا پھر رہا ہے۔ اس حسن سے چھپتا پھر رہا ہے جس نے بانو سے ٹوٹ کر محبت کی تھی۔ مٹ کر عشق کیا تھا جو پانچ سال سے اس کی مقدس یاد اور پاکیزہ تصور کو سینے سے لگائے زندگی کی راہوں پر گامزن تھا جو پوری نیک نیتی اور دلی خلوص سے بانو کو اب بھی اسی شدت سے چاہے چلا جا رہا تھا۔ لیکن اب۔ لیکن اب۔ رابعہ کو کون بتاتا کہ وہ کیا سے کیا سوچنے لگا ہے رابعہ خود بھی تو نا تجربہ کار تھی۔ اسے کیا پتہ تھا کہ حسن برساتی نالہ نہیں جو ذرا سی بارش سے دھواں دھار بہنے لگے وہ تو صدیوں کا ٹھہرا ہوا پانی ہے اس میں ہلچل پیدا کرنے کیلئے تو مسلسل کنکر پھینکنے کی ضرورت تھی۔

دن گزر رہے تھے۔ حسن کی حالت رسہ کشی کے کھیل میں استعمال ہونے والے اس رسے کی سی تھی جسے دونوں ٹیمیں پورے زور سے اپنی اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ رسہ کبھی ایک طرف چلا جاتا ہے تو کبھی دوسری طرف اور کوئی وقت ایسا بھی آتا ہے کہ دونوں ٹیموں کے برابر زور سے رسہ ایک ہی جگہ تن سا جاتا ہے ادھر ہوتا ہے نہ ادھر تناؤ کا یہ نقطہ عروج ہی سب سے اہم ہوتا ہے یہی وقت ہوتا ہے کہ ایک ٹیم کی ذرہ بھر کمزوری دوسری ٹیم کی جیت بن جاتی ہے۔

رابعہ کے آنے سے پہلے وہ رسے کا ایسا سرا تھا جسے بانو اپنے لافانی ہاتھوں سے کھینچے چلی جارہی تھی۔ تناؤ کا سوال ہی نہ تھا اور اب تو اس کھنچے چلے جانے پر بھی جمود کی ایسی تہہ جم گئی تھی کہ اسے احساس ہی نہ رہا تھا کہ وہ رسے کا ایسا ٹکڑا ہے جس کے دو سرے ہوتے ہیں۔ ایک سرا بانو کے ہاتھ میں تھا جو ماضی کی تاریکیوں میں گم ہو کر ٹھنڈے اندھیروں کے وجود کا ایک حصہ بن چکی تھی۔

لیکن دوسرا سرا۔ دوسرا سرا ابھی تو تھا اسے تھامنے کو کوئی ہاتھ بھی بڑھ سکتا تھا ان پانچ سالوں میں کئی ہاتھ اس طرح بڑھے بھی تھے لیکن اسے اتنا شعور ضرور رہا تھا کہ بڑھتے ہاتھوں اور رسے کے سرے کے درمیان ایک حد فاصل ضرور رکھی۔

لیکن اب رابعہ کے آجانے کے بعد اسے یہ حد فاصل کہیں دکھائی نہ دے رہی تھی۔ رابعہ نے رسے کا دوسرا سرا مضبوطی سے تھام لیا تھا اسے یہ احساس تھا کہ کھینچا تانی شروع تھی اور اتنے دنوں کی کھینچا تانی کے بعد تو تناؤ کا مرحلہ آچکا تھا ذرا سے جھٹکے کی ضرورت ہی تھی۔

آخر یہ جھٹکا لگ ہی گیا حسن غسل خانے میں دیوار سے لگے چھوٹے سے بیضوی آئینے کے سامنے کھڑا شیو بنا رہا تھا آج وہ پھر اپنی آنکھوں میں جھانک رہا تھا پھر اس حسن کو دیکھ رہا تھا جو جوان تھا خوبصورت تھا اور زندگی سے لپٹ جانے کا آرزومند تھا آج اسے گھبراہٹ نہیں ہو رہی تھی بلکہ وہ بڑے اطمینان سے آنکھوں میں پیدا ہونے

والے حسن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا رہا تھا۔

"امی" ساتھ والے کمرے سے رابعہ کی آواز آئی حسن کا ہاتھ ایک لمحہ کو رک گیا۔

"جی" یہ سلطانہ ممانی تھیں

"امی واپس چلئے"

"کہاں ؟"

"کراچی"

"کیوں"

"بس"

"پگلی"

"نہیں امی واپس چلئے آج ہی سیٹیں بک کروا لیں"

"اے ہے لڑکی۔ باؤلی لڑکی ہے کیا چار دن ہی میں تنگ آ گئی"

"بس آ گئی ہوں"

حسن کا برش چلتے چلتے رک گیا تھا اور وہ ہمہ تن گوش بنا ماں بیٹی کی باتیں سن رہا تھا رابعہ کی آواز پگلی پگلائی اور شکست خوردہ تھی اس نے واپس چلنے کا اصرار ہی نہیں کیا بلکہ ضد کرنے لگی سلطانہ ممانی پہلے تو ہنس ہنس کر پوچھتی رہیں پھر ان کی آواز تیکھی آ گئی۔

"آخر ہوا کیا ہے تجھے کوئی غیروں کے ہاں تو نہیں آئی ہوئی"

"غیروں کے ہاں میں آئی ہوئی ہوں" حسن کو یوں لگا جیسے رابعہ نے ماں سے نہیں

"بے وقوف" سلطانہ نے کہا "پھپھو سن لیں تو انہیں کتنا برا لگے۔ بیچاری صدقے واری ہو ہو جاتی ہیں تمہارے"

"میں کیا کروں" رابعہ نے بچوں کی طرح مچل کر کہا "سارا دن اکیلے اکیلے بیٹھے بیٹھے جی بھی اکتا جاتا ہے"

"باہر گھومنے چلی جایا کر بچے جاتے ہیں تو خود ہی نہیں جاتی"

"لے جانا کو نسا ہے" رابعہ کے آنسو حلق میں اتر گئے۔

سلطانہ ہنس پڑیں "اتنی بڑی ہو گئی عادتیں بچوں کی سی ہی رہیں تیری تقریباً روز ناصر راشد حسن کے ساتھ گھومنے جاتے ہیں تم بھی چلی جایا کرو"

"بس رہنے دیں امی" یہ رابعہ کا چیخ نما احتجاج تھا "میں واپس گھر جانا چاہتی ہوں"

"اکیلی تو جانے سے رہی جب سب جائیں گے تم بھی جاؤ گی۔ میرا تو خیال تھا چھٹیاں ختم ہوتے ناصر اور راشد کو بھیج دوں گی اور تمہارے ساتھ خود آٹھ دس دن اور رک جاؤں گی۔ اتفاق سے ہی آئے ہوئے ہیں جہاں آرا کی بیٹی کی شادی میں شریک ہوتے جائیں"

"آپ جتنا عرصہ دل چاہے رہیں۔ میں واپس جاؤں گی"

"تیری مرضی لیکن جائے گی تو بھائیوں کے ساتھ ہی اکیلی تو جانے سے رہی۔ رابعہ نے کوئی جواب نہیں دیا

"گھر سے تو خود ہی باہر نہیں نکلتی" سلطانہ نے شاکی لہجہ اختیار کیا "چل تیار ہو میں اور تیری پھپھو ماموں حامد کے ہاں جا رہے ہیں۔ سارا دن اچھا گزر جائے گا ان کی بیٹی بھی تمہارے برابر کی ہے ناصر اور راشد تو آج صفیہ خالہ کے ہاں جا رہے ہیں چلو تیار ہو جاؤ"

"میں نہیں جاؤں گی"

"اکیلی کیا کرے گی گھر میں پھر کہے گی وقت گزرتا نہیں۔ تیار ہو جا ہمارے ساتھ چلنے کو"

"میں نہیں جاؤں گی۔ امی میں نہیں جاؤں گی" وہ شاید رو رہی تھی۔

"اے ہے تجھے ہوا کیا ہے ناصر سے لڑائی تو نہیں کی۔ یہ رونا کس بات پہ آ گیا"

رابعہ کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ سلطانہ نے پہلے تو ملائمت سے سمجھایا پھر مادرانہ حقوق استعمال کرتے ہوئے ڈانٹا بھی لیکن رابعہ آج ان کے ساتھ جانے پر تیار نہ ہوئی سلطانہ بڑبڑ کرتی کمرے سے باہر نکل گئی۔

اب دوسری طرف بالکل خاموشی تھی لیکن حسن کے ذہن میں شور مچ رہا تھا اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے رابعہ نے ماں سے نہیں خود اس سے اس کے نامعقول رویے پر احتجاج کیا ہو اس کی سرد مہری کی شکایت کی ہو رابعہ کی رندھی ہوئی آواز اس کے سینے میں ہلچل مچا رہی تھی۔

جھٹکا لگ چکا تھا اور اسے احساس ہو رہا تھا کہ رابعہ رے کو اب بڑی آسانی سے اپنی طرف کھینچ سکتی ہے ٹھوڑی پر لگے بلیڈ کے کٹ سے رستا خون پونچھتا وہ اپنے کمرے میں آ بیٹھا اس کی حالت اس وقت زمین کی سی تھی جو بیک وقت محور کے گرد بھی گھومتی ہے اور مدار پر بھی کھسکتی چلی جاتی ہے مدار اور محور میں رابعہ کون تھی اور بانو کون۔ یہ وہ ابھی تک فیصلہ نہ کر سکا تھا سینے میں ہونے والی کسک کو دبائے وہ دفتر جانے کیلئے تیار ہونے لگا۔

ناشتہ آج بڑی بے ترتیبی سے ہوا ناصر اور راشد کو جانے کی جلدی تھی۔ دو چار لقمے توڑے اور اٹھ گئے اماں نے آج قیمے کے قتلمے مہمانوں کے لئے بڑے شوق سے منگوائے تھے۔ حسن نے بھی کچھ خاص رغبت نہیں دکھائی الجھا الجھا پریشان پریشان سا نظر آ رہا تھا۔ رابعہ الگ پژمردہ تھی۔ آنکھوں میں اب تک نمی تھی یہ نمی حسن کے لئے قاتل بنی جا رہی تھی۔ اماں ہر ایک کو اصرار سے کھلانے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن کمرے کی فضا اتنی بوجھل تھی کہ زیادہ اصرار بھی مناسب معلوم نہ ہوتا تھا۔

"حسن بیٹے" اماں نے اس کے میز سے اٹھتے ہی کہا۔

"جی" حسن نے فرماں برداری سے کہا۔

"ہمیں ذرا حامد کے ہاں تو چھوڑ آؤ" اماں بولیں "تم بھی چلو گی رابعہ بیٹی"

"جی نہیں"

"اس کے سر میں واپسی کا سودا سمایا ہے آپا" سلطانہ نے بظاہر ہنس کر لیکن دبی پردہ خفگی سے بیٹی کو دیکھا جو منہ بنائے سر جھکائے بیٹھی تھی۔

"کیوں" اماں ایک دم بولیں۔

"یہاں ان کا دل نہیں لگا اماں" حسن نے سلطانہ کے کسی جواب سے پہلے ہی کہا رابعہ نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اس کی بات پر غصہ آ گیا لیکن اس کے چہرے پر افسردگی اور الجھاؤ اتنے واضح تھے کہ مجبور ہو کر پھر سر جھکا لیا

"سیر کو جاتے ہو تو اسے بھی ساتھ لے جایا کرو" سلطانہ ہنستے ہوئے بولی "گھر پہ اکیلی بور ہوتی رہتی ہے"

"ہاں حسن بیٹے تم بھی تو اسے کہیں گھمانے پھرانے نہیں لے گئے دو دفعہ میرے ساتھ ہی باہر گئی ہے جب سے آئی ہے گھر میں ہی بیٹھی ہے میری بچی"

حسن دزدیدہ نظروں سے رابعہ کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہا تھا جو کسی طور شگفتہ نہیں تھے سلطانہ اور اماں تیار ہی تھیں حسن انہیں دس منٹ میں اچھرے ماموں حامد کے ہاں چھوڑ آیا۔ ماموں حامد نے اسے بھی رکنے کو کہا لیکن اسے دفتر جانا تھا جلد ہی لوٹ آیا وہ دفتر جانے کی بجائے گھر آ گیا۔

رابعہ ایک بازو پر استری کئے ہوئے نارنجی کپڑے ڈالے اور دوسرے ہاتھ میں تولیہ اور شیمپو لئے نہانے کو غسل خانے کی طرف جا رہی تھی۔ حسن کو دیکھا اور بے اعتنائی سے منہ پھیر لیا اسے وہ گھبراہٹ بھی چھپانا تھی جو حسن کے آ جانے سے اس پر طاری ہو گئی تھی۔

حسن اپنے کمرے میں جانے کی بجائے اس کی طرف بڑھا اور بلا تمہید بولا "آج شام تیار رہئے گا میں آپ کو گھمانے"

"جی شکریہ"

وہ خونخوار سی آواز میں پلٹ کر غرائی۔

"مجھے کہیں نہیں جانا"

تیز تیز قدم اٹھاتی وہ آگے بڑھ گئی اور تڑاخ سے غسل خانے کا دروازہ بند کر لیا حسن وہیں کھڑا آگ کے اس شعلے کے متعلق سوچتا رہ گیا جس نے بچانے کے باوجود لپک کر دامن پکڑ لیا تھا۔

http://www.rehanahmed.com

بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے۔ کہ چوٹ آتی ہے نہ زخم لگتا ہے۔ پھر بھی درد اٹھتا ہے۔ کسک ہوتی ہے۔ اس درد میں شدت نہ بھی ہو۔ اس کسک میں تندی بھی شرط نہیں۔ پھر بھی یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے سکون کے سینے میں بے چینی کا نشتر اتر رہا ہو۔ قرار آتا ہے نہ بے قراری تسلیم کی جا سکتی ہے۔ بس قرار اور بے قراری کے بین بین کسی پژمردہ سی کیفیت کا احساس ہوتا رہتا ہے۔

رابعہ نہا دھو کر غسل خانے سے باہر آئی۔ تو اسی کیفیت سے دوچار تھی۔ برکتے نے کرسی دھوپ میں بچھا رکھی تھی۔ آج بڑا نکھرا ہوا دن تھا۔ زرد زرد دھوپ بڑی شگفتہ تھی۔ رابعہ بڑا سا سفید تولیہ پشت پر ڈالے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے تراشے ہوئے بالوں کے سرے پانی کے موتیوں سے جھلملا رہے تھے۔

غسل خانے کی دیوار کے ساتھ بڑی بان کی چارپائی پر برکتے نے برتن دھو کر اوندھے ڈال رکھے تھے۔ اس کی بہو تاجاں سبزی گوشت ٹوکری میں لئے باورچی خانے کی طرف جا رہی تھی۔ گھر کی پالتو بلی چھچھڑوں کے لئے اس کے پاؤں سے لپٹ رہی تھی۔ تاجاں نے چھچھڑے ٹوکری سے نکالے اور برآمدے میں رکھی مٹی کی پلیٹ میں بلی کے سامنے ڈال دیئے۔ فرفر کرتی بلی پلیٹ پر جھپٹ پڑی۔

رابعہ اسے چھچھڑوں سے نپٹتے کئی لمحے دیکھتی رہی۔ گو اس کی داخلی سوچ کو ان خارجی عوامل سے قطعاً کوئی نسبت نہ تھی۔ تاہم وہ اسے دیکھتے جا رہی تھی۔

"چھوٹی بی بی"۔

"ہوں" رابعہ نے گردن گھما کر دیکھا۔ جمعدارنی لمبے سے بانس والا جھاڑو لئے کھڑی تھی۔ کمروں کی صفائی کے بعد اب صحن صاف کرنا تھا۔

"کمرے کر لئے صاف" رابعہ نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"جی بی بی جی"۔ سانولی سی کھڑے بدن کی طرحدار جمعدارنی نے کہا۔

"میرے کپڑے کہاں رکھے"۔

"برکتے کو دھونے کے لئے دے دیئے ہیں"۔

"امی کے بھی"۔

"جی ان کا جوڑا بھی"۔

برکتے برآمدے سے غسل خانے کی طرف کپڑے اٹھائے جا رہی تھی۔

"رنگ دار کپڑے الگ دھونا برکتے"۔ رابعہ نے کہا۔

"بہت اچھا چھوٹی بی بی...... " برکتے نے جلدی سے کہا۔ ان دنوں وہ ان مہمانوں کا کام بڑی تندہی سے کر رہی تھی۔ جانتی تھی۔ موٹی اسامی ہیں۔ جاتے جاتے اتنی بخششیں ضرور دے جائیں گی۔ کہ گامی کی سائیکل کے لئے نئے ٹائر خریدے جاسکیں گے۔

رابعہ کے بال سوکھ چکے تھے۔ اس نے تولیہ صحن میں ایک طرف بندھی رسی پر ڈال دیا اور خود دوپٹہ کندھوں پر ڈالتی کمرے کی طرف چل دی۔

"چائے آپ بھی پئیں گی چھوٹی بی بی"۔ باورچی خانے کی کھڑکی سے سر نکال کر تاجاں نے پوچھا۔

"پلا دو"۔ رابعہ اس کے الفاظ پر غور کئے بغیر بولی۔

"کمرے ہی میں لے آؤں"۔

"لے آنا"۔

رابعہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بالوں کو برش کیا۔ ہاتھوں پر لوشن لگایا۔ سردی کی وجہ سے ہاتھ کھردرے سے ہو رہے تھے۔

کچھ دیر کمرے کی چیزوں کو درست کرتی رہی۔ تاجاں چائے دے گئی۔ اس نے گرم گرم چائے کی پیالی غنیمت جانی۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود طبیعت کی بے کلی نہ گئی۔ نہانے سے طبیعت شگفتہ ہوئی نہ چائے پینے سے۔ رسالہ میز سے اٹھا کر دیکھنے لگی۔ بے کاری کے ان دنوں میں رسالوں کے مضامین' افسانوں اور نظموں کے علاوہ وہ اشتہار تک پڑھ چکی تھی۔ رسالہ میز پر پھینکتے ہوئے اس نے اخبار کا سوچا۔

اخبار روز وہ حسن صاحب کے کمرے سے لے آتی تھی۔ اور پھر پڑھنے کے بعد وہیں رکھ آیا کرتی تھی۔

اخبار لینے وہ حسن کے کمرے کی طرف چل دی۔ اور بے دھڑک اندر داخل ہو گئی۔ لیکن میز تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کی نظر دائیں ہاتھ بچھے پلنگ پر پڑی۔

"اوہ!" گھبراہٹ میں اس کے منہ سے نکلا۔

"آپ" حسن پلنگ پر آڑا لیٹا تھا۔ سر کے نیچے دونوں ہاتھ رکھے چھت کو دیکھتے سوچوں میں گم تھا۔

اچانک رابعہ کو کمرے میں آتے دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔

"جی" ۔ رابعہ گھبرائی۔ "میں..... اخبار" ۔

"اخبار لینے آئی ہیں؟" حسن نے میز سے اخبار سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

رابعہ نے دیکھا میز پر اس کی چائے بھری پیالی پڑی تھی۔ چائے پر آنے والی جھلی بتا رہی تھی کہ پیالی چھوئے بغیر بڑی دیر سے پڑی ہے۔ اس نے کتراتی ہوئی نظروں سے اخبار کی طرف دیکھا۔

"اخبار چاہئے" حسن اخبار لئے اس کے قریب آ گیا۔

"جی" ۔ اس کی آواز میں بے اعتنائی جھلک آئی۔ وقتی گھبراہٹ پر وہ قابو پا چکی تھی۔

"ریڈیو آپ کے کمرے میں پہنچا دوں؟" حسن نے اخبار تہہ کر کے ہاتھ میں پکڑ لی۔

"کیوں" ۔ رابعہ نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔

"آپ اکیلے میں بور ہوتی رہتی ہیں" ۔ حسن نے گہری گہری آنکھوں سے اسے دیکھا۔ "کچھ وقت تو اچھا گزرے گا" ۔

"اخبار دے دیجئے" ۔ رابعہ نے دکھی دکھی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ یہ دکھی نظریں شاکی بھی تھیں۔

"رابعہ" حسن کی آواز میں شکست تھی۔ رابعہ رخ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔

"آپ مجھ سے کیوں ناراض ہیں" ۔ وہ اس کی پشت پر کھڑے بولا۔

"جی نہیں" رابعہ نے پلٹ کر جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ناراضگی کسی واسطے سے ہوتی ہے۔ میرا آپ کا کیا واسطہ؟" ۔

"میرا آپ کا کوئی واسطہ نہ سہی۔ حسن کی آواز میں دکھ تھا۔ لیکن معذرت خواہ ہوں۔ آپ ہماری مہمان ہیں۔ مجھے آپ کی دلچسپیوں کا خیال رکھنا چاہئے تھا" ۔

"شکر ہے آپ کو احساس تو ہوا" ۔ رابعہ نے منہ پھیر کر آہستگی سے کہا۔

"آئندہ شکایات کا موقعہ نہیں دوں گا" ۔ وہ سر جھکائے مجرموں کی طرح کھڑا تھا۔

"اس کی اب ضرورت نہیں۔ دو تین دن کی بات ہے۔ بن بلائی آفتیں چلی جائیں گی۔ رابعہ کے لہجے میں بلا کا طنز تھا۔ اس کی آواز گھٹ گئی۔ آنکھوں میں نمی سی آ گئی۔ حسن تڑپ گیا۔ بے اختیار ہو گیا۔ بیکل ہو گیا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہتا۔ تیر کی سی تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

حسن تہہ کیا ہوا اخبار ہاتھ میں پکڑے کمرے کے وسط میں کھڑا رہ گیا۔ خدا جانے وہ کتنی دیر اسی انداز میں کھڑا خیالات کے مدوجزر میں گم رہا۔ برکتے چائے کی خالی پیالی لینے کمرے میں آئی۔ تو حسن کو اپنے آپ کا

احساس ہوا۔

"صاحب جی چائے تو پڑی پڑی ٹھنڈی ہو گئی۔ خاص طور پہ بنوائی اور پی بھی نہیں۔ تازہ بنا لاؤں"۔

"تم جاؤ" حسن نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ چہرہ پریشان تھا۔ اور افکار بھٹک رہے تھے۔

برکتے کے جانے کے بعد وہ بستر پر گر گیا۔ وہ کس مخمصے میں پھنس گیا تھا۔ نجات کی صورت ہی نظر نہ آتی تھی۔ تکئے میں سر دیئے وہ یہی سوچ رہا تھا۔ یہ اس کی کھلی شکست تھی۔ وہ ہار مان گیا تھا۔ رابعہ اس کی ادھوری زندگی کی تکمیل تھی۔ رابعہ بھی مقناطیسی کشش رکھتی تھی؟۔ یا وہ ہی لوہے کا ٹکڑا تھا۔ جو اپنی طرف کھنچ گیا تھا۔ وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ اب اسے صرف اتنا احساس تھا۔ کہ وہ اپنے جذبوں کی والہانہ شدت سے رابعہ کو چاہنے لگا ہے۔

دکھ بھی تو اسی بات کا تھا۔ بانو کے سوا اس نے کسی لڑکی کے متعلق سوچنے کا کبھی واہم و گمان میں بھی نہ سوچا تھا۔ لیکن اس کی نیک نیتی اور خلوص لغزش کھا گئے تھے۔ رابعہ کی چند دنوں کی قربت یہ نوبت لے آئی تھی۔

چند دنوں کی قربت کا بھی وہ غلط سوچ رہا تھا۔ رابعہ کو پہلی بار دیکھ کر ہی اس کا ایمان متزلزل ہو گیا تھا۔ اتنے دنوں سے تو وہ اپنے آپ کو جبراً بانو سے وابستہ رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ محرومیوں کو کفنا رہا تھا۔ ورنہ وہ جانتا تھا۔ اس کی حسرتیں، خواہشیں اور چاہتیں تو رابعہ کو دیکھتے ہی زندہ ہو گئی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا۔ سوچتا چلا گیا۔ بانو اور رابعہ...... رابعہ اور بانو...... اسے اپنا وجود اس خط مستقیم کی طرح لگ رہا تھا۔ جو ایک نقطے سے شروع ہو کر دوسرے نقطے پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے وجود کی تکمیل ان دو نقطوں کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ ایک ابتدا۔ دوسرا انتہا۔ بانو اس کی ابتدا تھی۔ ہستی کا ادراک اور عشق آگہی اس نے یہیں سے پائی تھی۔ رابعہ انتہا تھی۔ یہاں اس کی جسمانی ضرورتوں اور اس کے فطری تقاضوں کی تکمیل ہوتی تھی۔ بانو ابتدا تھی اور رابعہ انتہا۔ اس کی حیات کے لئے یہ دونوں ہی لازمی تھیں۔ سوچ کے اس پہلو نے اس کے بے کل اور بے چین ذہن کو بہت حد تک تسکین دی۔ انسان ابتدا سے انتہا کی طرف ہی جاتا ہے۔ اس نے بھی رابعہ کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔

کھانا تیار ہو گیا ہے صاحب جی، برکتے نے دروازے میں کھڑے ہو کر حسن سے کہا۔ وہ ابھی تک تکئے میں منہ دیئے پڑا تھا۔ پرانے بندھنوں کے ٹوٹ جانے کا شاید ماتم کر رہا تھا۔ بانو کی روح کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ کئی سہانی یادیں ذہن میں بکھر گئی تھیں۔ اس کے باوجود اس نے رابعہ سے دل لگانے کی ہار مان لی تھی۔

"صاحب جی" برکتے نے اسے سوتا سمجھ کر قریب آ کر پکارا۔

"ہوں"۔

"کھانا تیار ہے جی"۔

"مجھے بھوک نہیں"۔

"اے ہے صاحب جی، بی بی جی نے بھی انکار کر دیا۔ آپ بھی نہیں کھا رہے۔ کھانا خواہ مخواہ ہی پکایا تھا میں نے"۔

حسن نے آہستہ آہستہ تکئے سے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔

"چھوٹی بی بی سے آپ ہی کہئے۔ صبح انہوں نے ناشتہ بھی اچھی طرح نہیں کیا تھا"۔

"کہاں ہیں وہ"۔

"اپنے کمرے میں"۔

"ایک بار پھر پوچھ لو"۔

"دو بار جا چکی ہوں صاحب جی۔ اب گئی تو غصے ہوں گی"۔

"تم کھانا لگاؤ"۔

"اچھا جی۔ جلدی آ جایئے۔ موئی سردی بھی تو بہت ہے۔ کھانا نکالتے نکالتے جم جاتا ہے"۔

"تم جاؤ"۔ حسن نے زور سے کہا۔ برکتے ڈر گئی۔ اچھا جی۔ کہتے ہوئے پلٹ گئی۔ اپنے اتنے برسوں کی نوکری میں غالباً یہ پہلی بار تھی۔ جو حسن اس سے اس درشتگی سے پیش آیا تھا۔

رابعہ نے کھانے سے انکار کیا تھا۔ حسن اس کی وجہ جانتا تھا۔ اسے یہ بھی احساس تھا کہ رابعہ اس کے کمرے سے جانے کے بعد ضرور روتی رہی ہو گی۔ گلے میں پھندہ تو یہیں پڑ گیا تھا۔ آنکھوں کی نمی بھی اس سے مستور نہ رہی تھی۔ اسے کیا کرنا چاہئے۔ کیا کرنا چاہئے"۔

سوچتے سوچتے وہ کمرے سے نکلا۔ اور جیسے بے خبری کے عالم میں رابعہ کے کمرے میں جا پہنچا۔ رابعہ کرسی پر بیٹھی سلائیاں بن رہی تھی۔ دروازے کی طرف اس کی پشت تھی۔ قریب ہی میز پر مختلف رسائل پڑے تھے۔ سامنے ہی دیوار کے ساتھ اس کا اور امی کا پلنگ تھا۔ جس پر صفائی سے بیڈ کور ڈالے گئے تھے۔

حسن چند لمحے دروازے میں رکا۔ لیکن اٹھتے قدموں کو روک لینے کی اس میں سکت نہ رہی تھی۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا وہ رابعہ کی کرسی کی پشت پر آ کھڑا ہوا۔ گہرے نیلے سوٹ میں اس کا پژمردگی کی کہر میں لپٹا خوبصورت چہرہ بڑا حسین لگ رہا تھا۔

"رابعہ"۔ اس کی بھاری آواز گونجی۔

رابعہ نے چونک کر گردن موڑی۔ حسن کو دیکھ کر متعجب ہوئی۔ زبان سے تو کچھ نہیں بولی۔ ہاں اس کے ہاتھوں کی تیز حرکت اس کے ذہن کے انتشار کی غماز بن گئی۔

"رابعہ"۔ ایک بار پھر اسی بوجھل آواز نے رابعہ کے من میں ہلچل مچا دی۔ لیکن اس نے جلد ہی اپنی اس

کیفیت پر قابو پالیا۔ مونگے کی اس چٹان کو جو پگھلتے پانیوں میں بے حسی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اس نے اپنی انا کی شوریدہ سر موجوں سے پاش پاش کرنے کا تہیہ کر لیا۔ کھانا تیار ہے۔ آئیے چلیں۔ "حسن کوٹ پیچھے ہٹاتے پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے میز کی طرف جاتے ہوئے بولا"۔

حسن نے آواز میں شگفتگی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"ضروری تو نہیں"۔ رابعہ کا لہجہ کڑوا تھا۔

"اگر میں ضد کروں کہ ضروری ہے"۔ حسن کی آواز مسکرائی۔ رابعہ نے محسوس کیا کہ حسن اس سے بے تکلف ہو کر اس سرد مہری کا ازالہ کرنا چاہتا ہے۔ جو وہ اب تک اس سے برتتا رہا ہے۔

مونگے کی چٹان پگھل رہی تھی۔ خوشی اس کی ذات کی جھیل میں چشمے کی طرح پھوٹنے لگی۔ پھر بھی اس نے اپنے رویے اور آواز میں کھچاؤ اور تناؤ کو غالب رکھا۔

"رابعہ" حسن نے اس سے کوئی جواب نہ پا کر اس کے دائیں ہاتھ آکر پھر پکارا۔

"جی"۔ رابعہ نے جرات سے جواب دیا۔ وہ سلائیاں اب بھی تیزی سے بنے جا رہی تھی۔ حسن نے دوبارہ کھانے کے لئے اصرار کیا۔ رابعہ نفی میں سر ہلاتی رہی۔ بیزاری کا اظہار بھی کیا۔ سرد مہری کا بھی۔

"یہ بھوک ہڑتال کس خوشی میں"۔ وہ بڑے لگاؤ سے بولا۔ بیزاری اور سرد مہری کو نظر انداز کر گیا۔

"احتجاج" رابعہ کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ حسن کے لبوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی"۔ قدرے جھکتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

"احتجاج تو کسی ناروا زیادتی کے خلاف کیا جاتا ہے"۔

"بالکل"۔ بے دھڑک سا جواب ملا۔

حسن شہد پا کر پھر مسکرا دیا۔ اس کے عین سامنے آتے ہوئے مسرور سی آواز میں بولا۔ "پوچھ سکتا ہوں آپ پر کیا زیادتی ہوئی"۔

رابعہ کی جھکی جھکی نظریں اس کے چمکتے بوٹوں پر پڑیں پھر ہولے ہولے یہ نظریں اس کے اونچے لانبے قد پر اٹھتی گئیں۔ اور اس کے خوبصورت چہرے پر آکر رک گئیں۔ ان نظروں نے حسن قاتلانہ انداز میں شکایت کی۔ حسن کا دم رکنے لگا۔ لیکن آج اس نے رابعہ سے نظریں چرائیں نہیں۔ وہ بڑی جرات مندی سے بڑی بے باکی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا دیا۔

رابعہ نے گھبرا کر سر جھکا لیا۔ حسن آگے بڑھا۔ عین اسی وقت تاجاں کھانے کی یاددہانی کے لئے نہ آجاتی۔ تو شاید وہ سرد سی جنگ۔ جو دونوں کے درمیان اتنے دنوں سے جاری تھی کسی اٹل نتیجے پر پہنچ جاتی۔

شام تک حسن سمندر کی اچھلتی لہروں کی طرح کئی بار رابعہ کی طرف بڑھا۔ لیکن رابعہ نے بے رخی کے

ملاطم پرے سے ہر بار ان لہروں کو بغیر آسودہ لوٹا دیا گویا وہ خود سوکھا ساحل تھا البتہ ان لہروں کو جذب کر لینا چاہتی تھی۔ لیکن حسن کو ستا کر وہ اپنے من کی تسکین چاہتی تھی۔

وہ رات دسمبر کی سرد ترین رات تھی۔ شام تک جنوبی ہواؤں کے جھکڑ چلتے رہے تھے۔ کچھ بدلیاں بھی سینہ چرخ پر پریشان تھیں۔

ناصر راشد دن بھر کی آوارہ گردی کے بعد بستروں پر لیٹتے ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گئے تھے۔ اماں بھی سو چکی تھیں۔ اور سلطانہ بھی رابعہ کو دن بھر کی کارروائی سناتے سناتے خراٹے بھرنے لگی تھی۔ رابعہ کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ آج حسن سے اس کی جھڑپ ہوئی تھی۔ اس کا ردعمل سہانا تھا۔ حسن کا رویہ ایک دم بدل گیا تھا۔ مروت کے اظہار کی وہ دانستہ کوشش کر رہا تھا۔ یہ اس کی جھڑپ کا نتیجہ تھا یا حسن اپنے ہی نہاں جذبوں سے مجبور ہو کر اس کی جانب بڑھنے لگا تھا۔ رابعہ اس کا فیصلہ نہ کر پائی۔ اس کا دل چاہنے لگا کہ حسن اپنے نہاں جذبوں سے مجبور ہو کر اس کی جانب بڑھے۔ جوں جوں وہ سوچتی گئی اس پر گھبراہٹ مسلط ہوتی گئی۔ بستر میں اس نے کبھی دائیں کروٹ لی کبھی بائیں۔ قرار آنا تھا نہ آیا۔ وہ حیران تھی۔ اپنے آپ پر۔ اتنی جلدی وہ اسے اس طرح ٹوٹ کر چاہنے لگی تھی۔ گھبراہٹ بڑھتی گئی۔ اس کا دم کمرے کی فضا میں گھٹنے لگا۔ رضائی الگ پھینک کر اس نے شال اوڑھی۔ اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

حسن کے کمرے کی بتی بند تھی۔ وہ غالباً گہری نیند سو رہا تھا۔ اسے غصہ بھی آیا۔ وہ تو نیند سے کوسوں دور تھی۔ اور یہ بیدردی گہری نیند کے مزے لے رہا تھا۔ کڑھتی الجھتی وہ آگے بڑھ گئی۔

صحن میں کسی کے قدموں کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ چیخنے کو تھی۔ اندھیرے میں کوئی سایہ ادھر آیا تھا۔ ہاتھ میں پکڑا سگریٹ اندھیرے میں خونی آنکھ کی طرح چمک رہا تھا وہ ڈر گئی۔ لیکن اس کے چیخنے اور لوٹ جانے سے پہلے ہی حسن اس کے قریب آ گیا۔

"کون؟" اس نے بتی جلا دی۔ رابعہ کو دیکھ کر وہ حیران سا ہوا۔

"آپ اس وقت یہاں؟" اس نے کالی شال میں لپٹے سرخ و سپید چہرے کو دیکھا۔

"جی۔ میں" وہ کچھ گھبرائی۔

"وہ تو میں دیکھ ہی رہا ہوں"۔ حسن کی آنکھوں میں شوخی سی آ گئی۔

"میں..... وہاں سے کتاب لینے جا رہی تھی"۔ اس نے بیٹھک کی طرف اشارہ کیا۔

"اس وقت کتاب؟" بارہ بج رہے ہیں۔ حسن نے پھر حیرانگی سے کہا۔

"نیند نہیں آ رہی تھی"۔ رابعہ کے منہ سے بڑا معصوم سا جواب نکلا۔

"ضمیر کی چبھن سونے نہ دیتی ہو گی" حسن نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔

"جی؟" ۔ وہ گھبرا گئی۔

"آیئے اندر چلیں۔ باہر بڑی سردی ہے" ۔ حسن اس کی ادا سے محظوظ ہو کر بولا۔ رابعہ اس وقت تک نہیں رہی تھی۔ بڑی لجاجت اور حلیمی سے پیش آ رہی تھی۔

حسن نے بتی بجھا کر قدم جانے کو اٹھایا۔ رابعہ کا دل دہل سا گیا۔ حسن کے ساتھ ساتھ چلتے اسے کچھ خوف سا آنے لگا۔ اس نے تیز تیز قدم اٹھا کر اپنے کمرے تک پہنچنا چاہا۔ حسن بھی اس کے برابر آ گیا۔

اپنے کمرے کے اندر جانے کو وہ مڑی۔ لیکن حسن نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنی طرف اس طرح کھینچا۔ کہ وہ بے سہارا ستون کی طرح اس کے کندھے سے آ لگی۔ بجلیاں سی لپکیں۔ دونوں مدہوش ہو گئے۔ رابعہ میں تو قدم اٹھانے کی سکت بھی نہ رہی تھی۔ حسن اسے سہارا دے کر اپنے کمرے میں لے آیا۔ اسے ایک کرسی پر بٹھاتے ہوئے اس نے بتی جلا دی۔ رابعہ پر گھبراہٹ مسلط تھی۔ حسن نے اپنا کمبل اس پر ڈال دیا۔ وہ بڑا پر اعتماد اور پر سکون نظر آ رہا تھا۔

دونوں خاموش تھے۔ جذبات بہک رہے تھے۔ خاموشی دونوں کو ایک دوسرے کے بہت قریب لے آئی تھی۔ دل کی دھڑکن ایک ہی لمحے کی لے پر رقصاں تھی۔ اور وہ نغمہ تھا محبت کا...... عشق کا...... پیار کا۔

حسن کی نظریں بار بار رابعہ کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ وہ سگریٹ کے اطمینان بخش کش لیتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔

"رابعہ" اس کے لبوں کو جنبش ہوئی۔

رابعہ نے سر جھکا لیا۔ اس کے لبوں پر حیات افروز تبسم تھا۔

"رابعہ" ۔ حسن نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ رابعہ کسمسائی۔

"رابعہ" ۔ حسن نے اس کا ہاتھ شدت جذبات سے دبا دیا۔ اس کی نظریں کہہ رہی تھیں۔ "رابعہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ ایک ایک کام پر تمہاری ضرورت ہے۔ مجھے سہارا دے دو۔ مجھے تھام لو۔ مجھے اپنا لو" ۔

رابعہ کی اٹھتی جھکتی نگاہیں پورے خلوص سے اس پیغام کو قبول کر رہی تھیں۔ اس کا ٹھنڈا ہاتھ حسن کے مضبوط ہاتھ میں تھا۔

مضبوط ہاتھ جو جذبات کی حدت سے تپ رہا تھا۔

رابعہ کے لئے یہ راہ نئی تھی۔ اس لئے اس کے قدم خود اعتمادی سے نہ اٹھتے تھے۔ لیکن حسن ان راستوں سے آشنا تھا۔ ان دشوار گزار گھاٹیوں کے پیچ و خم جانتا تھا۔ اس لئے رابعہ کا ہاتھ تھامے تیزی سے ان راستوں پر گامزن ہو گیا۔ بانو کے ساتھ جن راستوں کو صدیوں کی مسافت کے احساس سے کاٹا تھا۔ رابعہ کی سنگت میں منٹوں میں کٹ گئے۔ ان کے دن اکٹھے گزرنے لگے۔ ان کی راتوں کے بیشتر حصے ایک دوسرے کی قربت میں بسر ہونے لگے۔ سلطانہ نے چھٹیاں ختم ہوتے ہی ناصر راشد کو واپس بھیج دیا تھا۔ خود جہاں آرا کی بیٹی کی شادی کی شرکت کے لئے رک گئی تھی۔ اتنی دور سے آنا پھر ممکن نہ تھا۔ اب آئی ہوئی تھی۔ تو شادی کے لئے چند دن اور نہ رکنا آئین رشتہ داری کے منافی تھا۔ رابعہ کے تو جانے کا سوال ہی نہ تھا۔ اس کی زندگی تو اب حسن سے وابستہ ہو چکی تھی۔

اب تک حسن ایک ایسا دائرہ تھا۔ جس کا مرکزی نقطہ بانو تھی اور وہ کولہو کے اس بیل کی طرح تھا۔ جس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوتی ہے اور جو منزل پر پہنچنے کی خوشی میں رواں رواں چلتا رہتا ہے۔ یہ جانے بغیر کہ وہ ایک ہی مرکز کے گرد گھومے چلا جا رہا ہے۔ ایسی راہ پر بار بار رواں ہے۔ جس کی ابتدا ہے نہ انتہا۔ بس چکر پہ چکر کاٹے چلا جاتا ہے۔

لیکن اب اس نے اپنے چلنے کی سمت مقرر کر لی تھی۔ وہ آنکھوں پر پٹی بندھے بیل کی طرح ایک ہی راہ پر مسلسل نہیں چل سکتا تھا۔ اب وہ اس بے جان نقطے کے گرد نہیں گھوم سکتا تھا۔ اس کی ابتدا تو پہلے ہو چکی تھی۔ اب وہ انتہا کو پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس نے گھنٹوں راجہ کی قربت میں گزارے۔ وہ اسے لئے لاہور کی سڑکوں کے فاصلے ماپتا رہا۔ لاہور کے مضافاتی علاقوں میں گھومتا رہا۔ فلمیں دکھائیں۔ پرانی عمارتوں کے چکر کاٹے۔

زندگی رنگین سے رنگین تر ہوتی چلی گئی۔ اس دن موسم بڑا سہانا تھا۔ بارش ہو جانے سے خنک سردی ختم ہو

چکی تھی۔ نمناک سردی بڑی خوشگوار تھی۔ حسن کو چھٹی تھی۔ دونوں نے ایک رات پہلے ہی شالامار جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ اماں اور سلطانہ کو بھی دعوت دی۔ لیکن انہیں آج میو ہسپتال اپنی ایک عزیز کی خبر گیری کو جانا تھا۔ جو کل ایک ایکسیڈنٹ میں بری طرح زخمی ہوئی تھی۔

دونوں نے غنیمت جانا۔ تنہائی اور قربت آج کل دونوں کا نصب العین تھا۔ شاداں اور فرحاں دونوں تیار ہو کر چل دیئے۔ حسن کی اماں کو کوئی اعتراض نہ تھا نہ سلطانہ کو۔ بلکہ وہ دونوں تو خوش تھیں۔ اماں اس لئے کہ ان کے تارک الدنیا بیٹے نے زندگی سے لو لگائی تھی اور سلطانہ اس لئے کہ جو مقصد لے کر وہ اٹھی تھی وہ پورا ہو رہا تھا۔

"شکر ہے اللہ کا" اماں نے دونوں کو صحن سے باہر کی طرف جاتے دیکھ کر کہا۔ "رابعہ کے آنے سے اسے بھی کچھ ڈھنگ سے جینے کا ہوش آیا"۔

سلطانہ مسکرا کر اسے دیکھنے لگی۔

"سچ سلطانہ"۔ حسن اور کسی لڑکی کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھے توبہ۔ اس کے سر پہ تو بانو ہی سوار تھی...... بانو"۔

"بانو اچھی لڑکی تھی۔ سلطانہ نے آہ بھری۔ صورت اور سیرت دونوں میں یکتا تھی۔ کتنی اچھی تھی"۔

"اچھی تو تھی۔ اس میں کیا شک لیکن بی بی۔ مرنے والوں کے ساتھ کوئی مرتا ہے۔ ہم بھی تو جی رہے ہیں۔ ثریا کی عمر تھی مرنے کی بھلا میں نے تو اسے، بس بچہ کر تمہیں بیٹی سمجھ کر پالا پوسا تھا"۔

"آہ"۔ سلطانہ کے لبوں سے نکلا۔ ہاتھوں کی مہندی بھی نہ اتری تھی ابھی۔ آپا کن کن کو یاد کیا جائے سلیم فہیم۔ اور آپ صالحہ...... کیا خوبیاں تھیں ان میں۔ ظالموں نے پورے کا پورا گھرانہ ہی ختم کر دیا۔

اماں افسردہ ہو گئیں۔ آنکھوں میں آنسو ڈھل آئے۔ دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔ "کوئی ایک دو ہو تو انسان روئے بھی۔ لاکھوں کٹ گئے تھے۔ سینکڑوں خاندان تباہ ہوئے تھے۔ لیکن زندگی کی گاڑی تو رکنے سے رہی سلطانہ۔ سب کچھ ہو رہا ہے، ہم کھاتے بھی ہیں پیتے بھی ہیں۔ ہنستے بھی ہیں۔ خوشیاں بھی مناتے ہیں۔ کہتی ہوں نا مرنے والوں کے ساتھ کوئی نہیں مرتا۔ دنیا کا یہی قاعدہ ہے۔ لیکن اس...... میرے بچے نے تو تمہیں کیا بتاؤں بانو کے لئے کیا کچھ کیا"۔

"وقت وقت کی بات ہوتی ہے آپا۔ جوانی میں ایسے دور آتے ہی ہیں۔ شکر کرو اب تو سنبھل گیا ہے۔ سلطانہ نے فخر سے کہا

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہوں۔ میری بچی میرے لئے تو رحمت کا فرشتہ ہے"۔

سلطانہ کی گردن فخر سے تن گئی۔ اماں نے اس کی طرف دیکھا۔ مسکرائیں۔ کچھ کہنا چاہا مگر رک گئیں۔ پھر

اس کی طرف دیکھا۔ تھوڑے سے تذبذب کے بعد آہستگی سے بولیں۔ "سلطانہ منہ چھوٹا بات بڑی والی ہے۔ رابعہ...... کو میری...... بیٹی بنا دو"۔

سلطانہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ کیسی باتیں کرتی ہیں آپا۔ رابعہ میری بہن آپ ہی کی تو بچی ہے"۔

اظہار تشکر کے طور پر اماں کی آنکھیں چھلک گئیں۔ دوپٹے کے کونے سے آنکھیں پونچھتے ہوئے گلوگیر آواز میں بولیں۔ "تم جانتی ہو سلطانہ میں نے زندگی کی کوئی خوشی اب تک نہیں دیکھی۔ شادی ہوئی۔ سال بھر کا عرصہ خواب سا لگتا ہے۔ اس کے بعد بیوگی کی تاریکیوں میں حسن ہی اجالے کی کرن تھا"۔

سلطانہ بڑی ہمدردی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"میں تو اس کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئی تھی۔ جب کبھی بھی شادی کا نام لیتی۔ دنوں پریشان رہتا۔ جہاں آراء نے اپنی بیٹی کے رشتے کے لئے کہلوایا۔ میں تو حسن سے بات کرنے کی چور ہو گئی۔ شعلے کی طرح بھڑک اٹھا"۔

سلطانہ ہنسنے لگی۔ "کہیں اب بھی شادی کی بات پر شعلے کی طرح نہ بھڑک اٹھے"۔

"نہیں"۔ اماں جلدی سے بولیں۔ اب تو اس میں جو تبدیلی تمہارے آنے کے بعد آگئی ہے۔ میں خود حیران ہوں۔

تھوڑی دیر بعد دونوں باتیں کرتی رہیں۔ طے پایا کہ فروری یا مارچ میں جب موسم ذرا کھل جائے گا۔ حسن کو ساتھ لے کر اماں کراچی آئیں گی اور رحیم بھائی سے باقاعدہ رشتہ طلب کریں گی۔ سلطانہ کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ تھا۔

یہی حال حسن اور رابعہ کا تھا۔ دونوں شالامار کے آخری تختے میں سیڑھیوں سے ہٹ کر ایک حسین سی کنج میں بیٹھے تھے۔ شالامار آنے کا مقصد یہ نہیں تھا۔ کہ مغلوں کے عظیم فن کو پرکھ کر داد دی جائے۔ نہ ہی منشا سبزہ وگل کی سیر تھی۔ یہاں آنا تو ایک ہی مقصد کا حاصل تھا۔ تنہائی......

یہاں تنہائی کے ساتھ گردو پیش قدرت کا حسن بھی بکھرا ہوا تھا۔ جس سے یہ تنہائی مہک کر جاندار ہو گئی تھی۔ سبزے کے سبز نرم نرم فرش پر پھولوں سے لدی کنج میں حسن نیم دراز تھا۔ اس کے قریب ہی رابعہ بیٹھی تھی۔ اس کا انداز بڑا قاتلانہ تھا۔ حسن پر مستی کی سی کیفیت طاری تھی۔ جذبات بہک رہے تھے۔ وہ رابعہ کو اپنے بازوؤں میں دبوچ کر اس طرح پیار کرنا چاہتا تھا۔ کہ اس کی ساری تشنگی مٹ جائے۔

یہ عجیب بات ہے کہ جذبات کی ایسی آندھی بانو کے لئے اس کے دل میں کبھی نہ امنڈی تھی۔ شاید اس لئے کہ بانو اس کے اندر کی کسی شدید پکار کا تقاضا تھی۔ اور رابعہ اس کی جسمانی ضرورتوں اور جنسی خواہشوں کا دوسرا نام

تھا

رابعہ اس کی سرخ سرخ ہوتی آنکھوں سے ڈر گئی۔ وہ کتنی ہی دیر سے بغیر کوئی بات کئے ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہیں"۔ رابعہ نے اس کی نگاہوں کی گرمی سے بچنے کو بات چھیڑی۔

"تمہیں دیکھ رہا ہوں"۔ اس کی آواز جذبات سے بوجھل تھی۔

"کیوں؟" رابعہ ادائے دلربائی سے سر کو جنبش دے کر مسکرائی۔ "پہلے نہیں دیکھا کبھی؟"

"تمہیں جب بھی دیکھتا ہوں۔ تم نئی نظر آتی ہو"۔ حسن بہکنے لگا۔

"اوہو"۔ شاعری رہنے دیجئے۔ اٹھئے۔ چائے پی لیں حواس بجا ہو جائیں گے۔ رابعہ نے ہنسی کی نقرئی کھنک میں تھرمس سے چائے انڈیلی۔

"حواس بجا ہونے سے رہے"۔ حسن مسکرا کر بولا۔ "تم کیا ہو رابعہ؟ تمہیں دیکھتے ہی مجنونانہ سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ جی چاہتا ہے۔ جی چاہتا ہے"۔

وہ کچھ کہے بغیر خاموش ہو گیا۔ وہ اٹھ بیٹھا تھا۔ چائے کی پیالی میں بلا ارادہ چمچ ہلانے لگا۔

"کیا جی چاہتا ہے؟" رابعہ نے دلفریب ادا سے پوچھا۔

حسن نے بلا کسی توقف رابعہ کا کندھا پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ اس نے عملاً جواب دیا۔

"چھوڑیئے۔ ہائے اللہ مجھے چھوڑیئے نا"۔ رابعہ نے دو ایک بار لطیف سی مزاحمت کی۔ لیکن حسن کے جنون کے سامنے بے بس ہو گئی۔ وہ اس کے بازوؤں میں تھی۔

"رابعہ..... تم میری ہو رابعہ۔ تم میری ہو"۔ اس کے بازوؤں کی گرفت جارحانہ سی ہوتی جا رہی تھی۔

رابعہ کا دم گھٹنے لگا۔ بمشکل اس نے اپنے آپ کو اس کی مضبوط گرفت سے آزاد کیا۔ وہ سرخ ہو گئی تھی۔ نگاہوں میں حیا کے ڈورے تھے۔ پیار سے اسے گھور کر سرزنش کی۔

حسن کی آنکھوں میں خمار ٹوٹ رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو رابعہ کو سینے کی ہڈیاں توڑ کر سمو لیتا۔ کتنا سکون کتنی ٹھنڈک کا احساس ہوا تھا۔ اس کے وجود سے۔ ہر طرف اسے رابعہ ہی رابعہ نظر آ رہی تھی۔ رابعہ جو اس کی تسکین تھی۔ جو اس کا حال تھی۔ جو اس کا مستقبل تھی۔ اسے اور سب کچھ بھول چکا تھا۔ ماضی بھلا دینے ہی کو تو ہوتا ہے۔

انسان اس وقت تو نہیں مرتا۔ جس وقت عزرائیل اس کی روح قبض کر لیتا ہے اور متحرک زندگی ساکت لاشے میں بدل جاتی ہے اور لوگ اس لاشے کو اٹھا کر مٹی کے ڈھیر کی شکل دے دیتے ہیں۔

نہیں..... موت اس وقت واقع ہوتی ہے۔ جب ہم ان ساکت لاشوں کی یادوں کو اپنے ذہنوں سے کھرچ ڈالتے ہیں۔ اپنے ذہنی چوکھٹوں میں نئی تصویروں کے فریم لگا کر پرانی تصویریں اکھیڑ ڈالتے ہیں۔ اور اپنے ذہن کو

http://www.rehanahmed.com

الٹ پلٹ کر دیتے ہیں۔ جیسے پرانی مٹی میں ہل چلا کر کسان نئی فصل کے لئے زمین ہموار کرتا ہے۔
انسان اس وقت مرتا ہے۔
موت اس وقت واقع ہوتی ہے۔
آج
بانو بھی مر گئی تھی۔

"آج کیا دن ہے"۔ سلطانہ بولی۔ "ہاں جمعرات ہے شاید"۔ جمعرات ہے بیگم صاحب جی۔ بر
نل کے نیچے بیٹھی دوپہر کے کھانے کے برتن دھو رہی تھی۔ سلطانہ اور اماں چارپائی آدھی دھوپ آدھی چھاؤں
میں کئے بیٹھی تھی۔ کل جہاں آراء کی بیٹی کی شادی ہوئی تھی۔ دونوں اسی شادی کا تذکرہ کر رہی تھیں۔ سلطانہ
پر تنقید کر چکی تو اس نے آج کے دن کا پوچھا۔

"جمعرات ہی ہے"۔ اماں نے بر کتے کے ساتھ ہی کہا۔

"توبہ یہاں آ کر تو مجھے دن یاد رہے نہ تاریخ۔ اتنی گہما گہمی رہی۔ کراچی جا کر کئی دن تو دل ہی نہ
گا"۔ سلطانہ نے چارپائی پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔

اماں نے جلدی سے تکیہ اس کے سر کے نیچے رکھ دیا۔ "تم ماشاءاللہ بچوں میں لگی ہو گی۔ لیکن ہم ماں
تمہارے جانے کے بعد اکیلے ہو جائیں گے۔ کتنی رونق رہی...... پچھلے دنوں۔ تم نے ناصر راشد کو ناحق ہی بھیج
دیا"۔

"لو آپا۔ انہیں سکول کالج نہیں جانا تھا۔ پھر کافی دن رہ لیا انہوں نے۔ اب آپ آیئے گا نا"۔

"ضرور آؤں گی۔ حسن بھی آئے گا"۔

پانچ دس دن کے لئے نہ آیئے گا"۔

"یہ تو حسن کی چھٹی پر منحصر ہے جتنی ملے گی"۔

"مہینے بھر کی تو لے۔ اتنی دور آ کر اتنی جلدی واپسی نہ ہو گی"۔

"کہوں گی مہینے کی چھٹی لے لے"۔

"میرا دل چاہتا تھا۔ آپ میرے ساتھ ہی چلتیں"۔

"تم کہاں جانے لگیں۔ ابھی کچھ دن اور رہو نا"۔

سلطانہ ہنس پڑی۔ "اتنے دن رہ لیا۔ پیچھے خدا جانے گھر بار کا کیا حال ہو گا۔ باپ بیٹوں نے کباڑ خانہ بنا دیا ہو گا۔ میرا خیال اتوار کو جانے کا ہے۔ حسن آج آئے تو اسے سیٹیں بک کروانے کا کہہ دوں۔ اسی لیے میں نے پوچھا تھا آج کیا دن ہے۔ جمعرات کل جمعہ۔ پرسوں ہفتہ۔ بس اتوار ٹھیک رہے گی"۔

"نہ سلطانہ" اماں نے پیار سے اصرار کیا۔ "اللہ قسم۔ تمہارے چلے جانے کے خیال سے ہول آ رہا ہے۔ حسن بھی بہلا ہوا ہے۔ تم دونوں چلی گئیں۔ تو گھر سونا ہو جائے گا"۔

"اب ہم مستقلاً یہاں رہنے سے تو رہے"۔ سلطانہ نے قہقہہ لگایا۔

"حسن بیٹے کی شادی کر کے گھر میں بہو کی رونق لے آئیے۔ بڑی بی بی"۔ برکتے نے چاپلوسی سے کہا۔

"انشاءاللہ' انشاءاللہ!" اماں نے کہا "بس اب شادی ہو جائے گی۔ اگلی سردیوں سے پہلے پہلے۔ ہے نا سلطانہ"۔ سلطانہ مسکرانے لگی۔

اماں کے اصرار کے باوجود سلطانہ نے اتوار کو جانے کا پروگرام بنا لیا۔ گھر بار کی بھی تو خبر لینا تھی۔ اسے رحیم کو خوشخبری بھی تو سنانا تھی۔

شام حسن حمید سے گھنٹوں رابعہ کی باتیں کرنے کے بعد گھر میں داخل ہوا۔ تو سلطانہ اماں کے پاس باورچی خانے ہی میں بیٹھی راشد کا سویٹر بن رہی تھی۔ اماں نے ساگ پکایا تھا۔ وہ اسے بھون رہی تھیں۔ کھانے کی جو لذت اماں کے ہاتھوں پکنے پر ہوتی۔ تاجاں یا برکتے کے ہاتھوں نہ ہوتی۔ کچھ مہمانوں کی عزت افزائی کچھ اپنا شوق اماں کھانا خود ہی پکا رہی تھیں۔

"حسن بیٹے۔" سلطانہ نے برآمدے میں حسن کو دیکھ کر آواز دی۔

"جی آپا۔" حسن بڑا مسرور نظر آ رہا تھا۔ ترجہ نے اسے رابعہ کو بہت جلد اپنا لینے کی رائے دی تھی۔ وہ باورچی خانے ہی میں چلا آیا۔ سلام کرنے کے بعد ممانی سے مخاطب ہو کر بولا۔ آپ نے مجھے یاد کیا۔

"ہاں۔"

"فرمائیے۔"

"اب فارغ ہو۔"

"جی۔"

"میرا ایک کام کرو۔"

"فرمائیے۔"

"اتوار کی رات سیٹیں بک کروا دو۔"

"جی۔"

"واپس جانا ہے نہ ہمیں۔ سیٹیں آج ہی بک کروالو۔ اتوار کی رات۔"

حسن کا سانس اوپر کا اوپر، تلے کا تلے رہ گیا۔ بے اختیار سر کو نفی انداز میں جنبش دی۔ ممانی اس کی حرکت پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"میں نے بہتیرا اصرار کیا۔ رکتی نہیں سلطانہ۔" اماں نے شاکی نظروں سے بھاوج کو دیکھا۔

"کیسے نہیں رکیں گی۔ حسن کھویا کھویا بولا۔

"جانا ہی تھا تو آئی کیوں تھیں۔" حسن کی بے چارگی کو کوئی نہ سمجھا۔ اماں اور سلطانہ دونوں ہنس پڑیں۔

حسن چپ چاپ پلٹا اور باورچی خانے سے نکل گیا۔

"آج ضرور سیٹیں بک کروانا ہیں۔ سلطانہ ممانی نے پیچھے سے آواز دی۔ حسن بغیر کوئی جواب دیے آگے بڑھ گیا۔

حمید کے ہاں باتوں اور اس کی حوصلہ افزائی سے اسے جتنی خوشی ہوئی تھی۔ ممانی کے ایک ہی جملے سے ہوا ہو گئی۔ وہ اپنے کمرے میں آ کر کتنی ہی دیر بے مقصد ٹہلتا رہا۔

"آنے والوں کو جانا بھی تو ہوتا ہے۔" وہ دل کو بہلاوے دے رہا تھا۔ "پھر ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بہت جلد رابعہ کو اپنا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہاں لے آؤں گا۔ یہ گھر خوشیوں اور مسرتوں کا گہوارہ بن جائے گا۔"

لیکن دل تھا کہ مچلے ہی جا رہا تھا۔ کسی بہلاوے میں آنے کا نہیں تھا۔ رابعہ چلی گئی تو وہ کیا کرے گا وہ تو گرتا ہوا ایسا ستون تھا جسے رابعہ نے سہارا دے کر گرنے سے بچا لیا تھا۔ اس کی ضرورت تو اسے لمحہ لمحہ تھی۔ جدائی جانگسل عرصہ کیوں کر برداشت کرے گا۔

لیکن انسان بڑا ہی سخت جان ہے۔ جس بات کا تصور بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ جب وہ حقیقت بن کر ٹوٹ پڑتی ہے تو چپ چاپ برداشت کر لیتا ہے۔ بانو کی موت کو بھی تو آخر اسی حسن نے برداشت کیا تھا۔

رابعہ اسے اپنے کمرے میں جاتے دیکھ چکی تھی۔ کتنی ہی دیر انتظار کرنے کے بعد جب وہ اس کے کمرے میں نہ آیا تو رابعہ خود ہی اس کے پاس چلی گئی۔ وہ پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے کمرے کے وسط میں کھڑا تھا ٹائی کی گرہ ڈھیلی تھی۔ اور کوٹ اتار کر اس نے پلنگ کے تکیے پر پھینک دیا تھا۔

"آپ آ گئے" رابعہ اس کی محویت سے محظوظ ہو کر بولی۔

وہ ایک دم پلٹا۔ اس کا چہرہ اس بچے کی طرح پریشان تھا۔ جس سے کوئی کھلونا زبردستی چھین لیا جائے۔

"کیوں؟" رابعہ اس کے قریب آ گئی۔

"رابعہ۔" حسن نے اسے بازوؤں کے حلقے میں لے کر یوں سینے سے لپٹا لیا۔ جیسے ہر ہاتھ سے اسے محفوظ کر لیا ہو۔

"اللہ۔ آپ۔ رابعہ کسمسائی۔

"میں تمہیں نہیں جانے دوں گا رابعہ۔ نہیں جانے دوں گا۔"

"کہاں؟ کہاں نہیں جانے دیں گے۔ رابعہ اس کے بازوؤں کے مضبوط حصار سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"ممانی اتوار کی رات واپس کراچی جانا چاہتی ہیں۔" حسن کے بازوؤں کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ رابعہ بھی اس طرح افسردہ ہو گئی۔ لیکن حسن کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔

چند لمحے دونوں خاموش رہے۔ رابعہ نے حسن کا ہاتھ تھام کر کرسی پر بٹھا دیا۔ اسے خوشی بھی ہو رہی تھی۔ کہ حسن اس کی خاطر اس قدر پریشان ہے۔ محبت کی انتہا پا کر انسان خوش ہی تو ہوتا ہے۔

"اب آپ ہمارے ہاں آیئے گا نا۔ چھٹی کی کوشش ابھی سے شروع کر دیجئے میں ایک ایک لمحہ انتظار کروں گی۔" رابعہ نے اسے ادھر ادھر کی باتوں میں لگا دیا لیکن حسن کا دل نہیں بہلا۔ لاشعوری طور پر اسے محسوس ہو رہا تھا۔ کہ وہ ایک بار پھر اجڑ رہا ہے۔ تین دن بعد وہ ریلوے اسٹیشن پر اپنے مہمانوں کو رخصت کر رہا تھا۔ یہ تین دن جن جن بے تابیوں کی نذر ہوئے۔ جس جس اضطراب سے گزرے دونوں کے پژمردہ چہرے اس بات کی گواہی دے رہے تھے۔ زندگی بھر ساتھ دینے کی قسمیں بھی کھائی گئیں۔ اور ایک دوسرے کے لئے مر مٹنے کے وعدے بھی ہوئے۔ پھر بھی پریشانیاں نہ گئیں۔ گاڑی حرکت میں آئی تو حسن کا دل جیسے رک گیا۔ رابعہ کو بھی یوں لگا جیسے قالب اور روح کا ساتھ چھوٹ رہا ہو۔ حسن نے اس کے کھڑکی میں رکھے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں جلدی خط لکھنے کا وعدہ لیا۔ سلطانہ سامان درست کرنے کے بہانے اپنے برتھ کی طرف منہ کیے کھڑی تھی۔ دونوں کو باتیں کرنے کا موقعہ دے رہی تھی۔

http://www.rehanahmed.com

ریت کی تہہ پر کتنے ہی گہرے نقش کیوں نہ بنائے جائیں۔ پانی کا ریلا انہیں بہا لے جاتا ہے کوئی نشان رہا۔ نہ کسی نقش کا وجود۔ سب کچھ مٹ گیا۔ سب کچھ بہہ گیا۔ اور ریت کی تہہ ایک نئے سرے سے ہموار یوں بچھ گئی۔ جیسے اس پر کبھی کوئی نقش بنا ہی نہ تھا۔ ؟ حسن بستر پر لیٹا تو پارے کی طرح مضطرب تھا۔ رابعہ چلی تھی۔ اسے اسٹیشن پر چھوڑ کر سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔ طبیعت بے طرح گھبرا گئی تھی۔ اسے شاید بار احساس ہوا تھا۔ کہ وہ رابعہ کو اس شدت سے چاہنے لگا ہے۔ اسٹیشن پر اس کی حالت غیر تھی۔ جذبات مچل رہے تھے۔ کھڑکی میں رکھے رابعہ کے نرم و گداز ہاتھ پر اس نے اپنے تپتے لب رکھ کر اپنے پیار کے دائمی نشان مہر ثبت کرنے کی خواہش بڑی طرح محسوس کی تھی۔

یاد وہ رابعہ کو کر رہا تھا۔ لیکن ذہن کا جانے کون سا دریچہ کھلا رہ گیا تھا۔ جس سے ایک عرصے کے بعد ہوا آئی تھی۔ اور وہ اپنے دل سے برابر سوال کیے جا رہا تھا۔ کہ کیا اس کا دل واقعی ریت کی تہہ تھا۔ ؟

اس سوال کا جواب کچھ بھی ہو۔ حسن اب اس موڑ پر تھا۔ جہاں سے پرانے راستے نظروں سے اوجھل جاتے ہیں۔ اور تاحد نگاہ سامنے ہی سامنے جانے والی راہیں نظر آتی ہیں۔

اس حقیقت کے باوجود رات بھر حسن کو ابتدا اور انتہا۔ دونوں نقطے اپنے اپنے مقام کی اہمیت کا احساس دلاتے رہے۔ کسی وقت تو اسے یوں لگتا۔ جیسے وہ کسی سیال شے سے لبالب بھرا کانچ کا وہ نازک سا برتن ہے۔ کسی لمحہ اور کسی وقت معمولی سی بے احتیاطی سے بھی ٹوٹ جائے گا۔

وہ سیال شے بہہ نکلے گی۔ سیال شے! جو ماسوا درد کے اور کچھ نہیں۔

دن گزرنے لگے حسن کانچ کے اس نازک برتن کو سنبھال سنبھال کر رکھتا۔ رابعہ کے خط کا انتظار کرنے لگا۔

ایک، دو، تین اور چار دن گزر گئے۔ رابعہ کا کوئی خط اسے نہ ملا۔ اس کی حالت اس پیاسے کی سی ہو

اس کی جان لبوں پر آجاتی ہے۔ دفتر میں کام کرتے وہ انتظار مجسم بن کر نگاہ شوق وا کیے ڈاک کے انتظار
... گھر پہنچتے ہی اماں پوچھتیں۔
کراچی سے کوئی خط آیا۔ خدا خیر کرے۔ خیریت سے پہنچ گئی ہوں دونوں۔" پانچواں دن بھی ناامیدی
... گزر گیا۔

اگلے دن وہ اپنے کام میں مصروف تھا۔ ہر آہٹ پر سر اٹھا کر دیکھ لیتا۔ اپنے او رسینئر سے ایک معاملے
... بات کرتے وقت بھی اس کی آنکھیں چپراسی کی منتظر تھیں، جو روزانہ ڈاک لے کر اس کے کمرے میں آتا
چپراسی چھوٹے بڑے نیلے پیلے کئی لفافے لے کر اندر آیا۔ اسے آداب کہنے کے بعد تعظیم سے ڈاک میز پر
... دی۔

حسن نے بے تابی سے لفافوں کو چھانٹا۔ دفتری ڈاک میں ایک نیلے رنگ کا لفافہ اس کے نام بھی تھا۔ اس کا
... خوشی سے دھک دھک کرنے لگا۔ یقیناً یہ خط رابعہ کا تھا۔ ہاں یہ خط رابعہ ہی کا تھا۔

مختصر سے خط میں جذبات کی حدتیں سموئی تھیں۔ اس نے بچوں کے سے جذباتی پن رابعہ نے تو جیسے خود اسی
کے جذبات کی ترجمانی کی تھی۔

رات اس نے رابعہ کے اس پیارے سے خط کا بڑے ہی پیارے انداز میں جواب دیا۔ اور۔ پھر خطوط کا
... ایک باقاعدگی سے چلنے لگا۔

رابعہ کی حالت بھی حسن ہی کی سی تھی۔ خط ملنے میں ایک دن کی بھی تاخیر ہو جاتی۔ تو وہ بے چین ہونے لگتی۔
... حسن کے خطوط ہی کا تو سہارا تھا۔ ورنہ زندگی کا حسن تو وہ لاہور ہی بکھیر آئی تھی۔ یہاں بے کلی اور بے چینی
... سوا اور کیا تھا۔

سلطانہ نے رحیم سے اپنے کامیاب دورے کی تفصیلاً سرگزشت کہی۔

" آپ حسن کو دیکھیں تو حیران رہ جائیں۔ ماشاء اللہ شہزادہ لگتا ہے۔ شہزادہ۔ بڑا ہی سلجھا ہوا لڑکا ہے۔
... اور کیا چاہیے۔"

"بانو کو تو اب یاد نہیں کرتا۔" رحیم نے پوچھا۔

" چھوڑیئے جی۔ بانو بیچاری ختم ہو گئی۔ اب اس کا نام بھی نہیں لیتا۔ ہمیں تو آنے ہی نہیں دیتا تھا۔ بڑا ہی
... اصرار کیا رکنے کا۔ لیکن آپ کی وجہ سے میں آ گئی۔"

"تو کیا وہیں کی ہو رہنے کا ارادہ تھا۔" رحیم نے ہنس کر سلطانہ سے کہا۔

"جی تو یہی چاہتا تھا۔" سلطانہ نے بھی مذاق سے کہا۔

رحیم نے پیار سے سلطانہ کو دیکھا۔ شاید ایام رفتہ کی کوئی جوان جھلک اس کے چہرے پر نظر آ گئی تھی۔ کچھ

دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد سلطانہ پھر لاہور کے قصے سنانے لگی۔

"آپا فروری یا مارچ میں آرہی ہیں۔"

"خوشی کی بات ہے۔"

"حسن بھی آئے گا۔"

"یہ اور بھی خوشی کی بات ہے۔"

"آپا اک خاص مقصد سے آرہی ہیں۔"

"یعنی"

"رابعہ کے لئے آرہی ہیں رشتہ مانگیں گی۔"

طے تو کر ہی چکی ہو۔ اب مجھے کیا پوچھتی ہو۔"

"میرے خیال میں منگنی کی رسم ادا کر دیں گے۔ بار بار لاہور سے تھوڑا ہی آسکیں گی۔"

"تم جانو اور تمہارے کام۔ مجھے تو اپنے لائسنس کی پڑی ہے۔"

"ہائے اللہ آپ کو تو سوائے کاروبار کے کچھ سوجھتا ہی نہیں۔"

"جو میرا کام ہے میں کر رہا ہوں اور جو تمہارا کام ہے تم کرو۔" رحیم نے ہنس کر کہا۔

"میں منگنی دھوم دھام سے کرنا چاہتی ہوں۔" سلطانہ نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"ضرور ضرور۔ اپنی ایک ہی تو بیٹی ہے۔ اور آپا بیچاری کی زندگی کی یہ پہلی خوشی ہے۔ پیسے کا فکر نہ کرو جیسے جی چاہے ارمان نکال سکتی ہو۔"

سلطانہ خوش ہو گئی۔ من پسند رشتہ مل ہی رہا تھا۔ اب دل کے ارمان نکالنے کی بات تھی۔ اللہ میاں نے بہت کچھ دے رکھا ہے۔ کسی شے کی کمی نہ تھی۔ پھر کیا بات مانع ہوتی۔ کاروبار دن بدن ترقی کر رہا ہے۔ یہی لاکھوں کے پھیر ہو جانے کی توقع تھی۔

سلطانہ نے منگنی کا پروگرام اسی دن سے بنانا شروع کر دیا۔

ادھر اماں بھی دن رات اسی کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔ حسن اور رابعہ کے تعلقات سے باخبر تو تھیں اس بندھن سے آگاہ تھیں۔ جو دونوں کو باندھ چکا تھا۔ حسن اور رابعہ کی محبت کی عمارت بڑی شان سے کھڑی ہو گئی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں اس شان کو دیکھ کر اماں کو اس عمارت کا خیال آجاتا۔ جو کھنڈروں پر کھڑی ہو ہے۔

حسن اپنے حال میں مست تھا۔ چھٹی کے لئے اس نے درخواست دے دی تھی۔ اتنے سالوں میں کبھی چھٹی کی ضرورت ہی نہ پڑی تھی۔ اس لئے چھٹی منظور ہونے کا پورا یقین تھا۔ کراچی پہنچنے کو بے تاب تھا خط

باقاعدگی سے مل رہے تھے۔ لیکن یہ قطرہ قطرہ اس کی تشنگی کو ہوس بنا رہا تھا۔ وہ تو صدیوں کا پیاسا تھا۔ سیرابی چاہتا تھا۔

مارچ کے مہینے کراچی جانے کا پروگرام۔ حسن نے اپنے لئے دو ٹھنڈے سوٹ بنوائے تھے۔ پتلونیں سلوائیں۔ بش شرٹیں خریدیں۔ بڑے ذوق شوق سے وہ جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اماں کے لئے بھی اس نے سنجیدہ سنجیدہ رنگوں کے تین چار جوڑے بنوا دیے۔ جانے سے پہلے اماں نے موقعہ پا کر اس مقصد کی وضاحت کر دی۔ جس کے لئے وہ اتنا لمبا سفر کرنے پر تیار ہوئی تھیں۔

"حسن بیٹے۔ کراچی روز روز تو جانا ہو نہ سکے گا۔ ایک بار ہی سارا کام نپٹا آوں گی۔ اماں نے ہنس کر کہا۔
حسن کچھ سمجھا نہیں۔ جب اماں نے مسکرا مسکرا کر ساری بات کہی تو وہ بھی مسکرانے لگا۔

اماں شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ رابعہ بڑی پیاری بچی ہے۔ اپنا خون ہے۔ اس گھر کو جنت بنا دے گی۔ بڑی سلجھی ہوئی لڑکی ہے۔ "اماں تعریفیں کرنے لگیں۔

"اپنی بھتیجی کی اتنی تعریف نہ کیجئے۔ حسن نے ہنس کر کہا۔ "ویسے آپ کو اختیار ہے۔ جو چاہے کیجئے۔"
اماں نے جھولی پھیلا کر تشکر سے آسمان کی طرف دیکھا۔ ان کی نگاہیں آب دیدہ تھیں۔ حسن اماں کی حالت سے بڑا متاثر ہوا۔ اسے یوں لگا۔ جیسے اب تک شادی سے انکار کر کے وہ اماں پر ظلم کرتا آیا تھا۔

کراچی کی نشستیں بک کروالی گئیں۔ اماں نے سوہابازار صرافوں کی دکانیں چھان ماری تھیں۔ بڑی مشکل سے انہوں کنگنوں کی ایک جڑاؤ جوڑی پسند آئی تھی۔ ایک نفیس سی انگوٹھی بھی خریدلی تھی اور اندرون شہر میں گوٹے کناری کا کام کرنے والوں سے سرخ جارجٹ کا دوپٹہ سچے گوٹے نکلوں سے بھروالیا تھا۔ کناروں پر تین انگل چوڑی کناری اور جھلملاتی کرن بھی لگوادی تھی۔ اماں خوشی خوشی ہر کام کرتی پھر رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا۔ وہ اپنی عمر کے کئی سال پیچھے لوٹ گئی ہیں۔ بیوگی کے تیرہ وتار دن گزارنے کے بعد جیسے اب انہیں سہاگ کی روشنی مل رہی تھی۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے۔ جوان بیٹے کی ماں کبھی بیوہ نہیں ہوتی۔ اماں بھی ان دنوں نئی سہاگن کا سا نکھار اور چمک چہرے پر لئے ادھر ادھر اٹھلاتی پھرتی تھیں۔ برکتے کو واپسی پر نیا ریشمی جوڑا دینے کا وعدہ انہوں نے ابھی سے کرلیا تھا۔

حسن بھی مطمئن تھا۔ ان کے چہرے کی خوشیوں پر ہزاروں غم نثار کیے جاسکتے تھے۔ ویسے بھی اب اس کے غم ماضی کے سینے میں دفن ہوچکے تھے۔ حمید نے بھی اسے ذہنی طور پر آمادہ کیا تھا۔ کراچی پہنچ کر زندگی نے نئی کروٹ لی۔ رابعہ انہیں لینے کیلئے اسٹیشن پر موجود تھی۔ اللہ اللہ شوق کی بے تابی۔ حسن کا بس چلتا تو جارحانہ طور پر اس پر جھپٹ پڑتا۔ اس نے خوب صورت لباس اور چہرے کی دل کش آرائش سے دعوت نظر بھی تو اس ڈھنگ سے دی تھی۔

حسن کو یہاں آکر صرف رابعہ سے سروکار تھا۔ صرف رابعہ کی ضرورت تھی۔ اسے ماموں کی جہازی سائز کوٹھی پھر کر دیکھنے کا شوق تھا۔ نہ اس کے وسیع کاروبار سے دل چسپی۔ پھر بھی وہ اخلاقاً ماموں سے تپاک سے ملا۔ ماموں اُسے دیکھ کر نہال ہوگئے۔ پانچ سال بعد اسے دیکھا تھا۔ واقعی وہ تو شہزادہ نظر آرہا تھا۔

حسن اور رابعہ ایک دوسرے میں کھو گئے۔ کبھی کراچی کی حسین شاہراہوں پر گھومتے ہوتے تو کبھی سمندری فضامیں عشق کے نغمے الاپتے۔ کبھی گھر کا کوئی خاموش کونا مسکن ہوتا تو کبھی کوئی چوٹی کا ہوٹل۔ زندگی

رواں دواں تھی۔ اماں نے ایک دن موقع پاکر بھائی سے رشتے کی بات چھیڑی۔

"حسن تمہارا اپنا ہے رحیم رابعہ کے لئے اسے قبول کر لو۔ اماں نے تھوڑی سی تمہید کے بعد دل کی بات کہہ دی۔

رحیم کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ خوب رو، شریف اور برسرروزگار لڑکا مل گیا تھا۔ لڑکا بھی کوئی غیر ہوتا تو بات تھی۔ اپنا ہی بچہ تھا۔ رشتہ داری کے بندھن اس نئے رشتے سے اور مضبوط ہو رہے تھے۔

"مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے آپا۔ یہ باتیں تو غیروں میں ہوتی ہیں۔ رابعہ آپ ہی کی ہے۔ دینے کی بات ہے۔ آپ ہی کی جھولی میں کیوں نہ ڈال دوں۔"

"جیتے رہو۔ عمر دراز۔ خدا کاروبار میں برکت دے۔" اماں نے ایک ہی سانس میں کئی دعائیں دے ڈالیں۔ بھائی نے ان کا دامن مراد بھر دیا تھا۔ خوشی سے ان کا چہرہ چمکنے لگا۔ لیکن اس موقع پر اماں کو کچھ یادیں بھی سوگوار کر گئیں۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے

"منگنی کی رسم ادا کر دی جائے۔" سلطانہ نے بات چھیڑ دی۔

"تمہاری ممنون ہوں سلطانہ۔" اماں نے آنچل سے آنسو صاف کر ڈالے۔ "جس دن چاہو یہ رسم کر لو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا اجر دے گا۔ تم نے مجھے مایوس نہیں کیا۔"

کچھ دیر باتیں ہوا کیں۔ پھر منگنی کا دن مقرر ہوا۔ سلطانہ اماں سے مل کر پروگرام بنانے لگیں۔ جو جو بات سلطانہ نے کہی اماں نے ہاں میں ہاں ملا دی۔ اتنا شاندار پروگرام تھا۔ اماں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

گانے کا پروگرام بھی تھا۔ کوئی تین سو آدمیوں کو پرتکلف کھانا دینے کا اہتمام بھی تھا دوسرے ہی دن سلطانہ تیاریوں میں مشغول ہو گئیں۔ کئی آدمی کام پر لگا دیئے گئے۔ چمن درست کرتا تھے۔ کوٹھی کی آرائش ہونا تھی۔ سیٹھ عبدالرحیم کی بیٹی کی منگنی تھی۔ کوئی معمولی تقریب تو نہ تھی۔ رابعہ بھی گوہر مقصود پا رہی تھی۔ اس کا انگ انگ فرط مسرت سے ناچ رہا تھا۔ اس نے جسے چاہا اسے پا لیا تھا۔ زندگی نے نوازشوں کا مینہ برسایا تھا اس پر۔

لیکن حسن کی حالت عجیب سی تھی۔ منگنی کے دن تو وہ کچھ زیادہ ہی پریشان نظر آ رہا تھا۔ گھر بھر میں خوشیوں کے شادیانے بج رہے تھے۔ لاؤڈ سپیکر پر خوبصورت دھنوں کے گیتوں کے ریکارڈ بج رہے تھے۔ حسن جیسے خواب سے چونک اٹھا تھا۔ اس کا دل بے طرح گھبرا رہا تھا۔ وہ ان ہنگاموں سے دور کہیں ایسی جگہ چھپ جانا چاہتا تھا۔ جہاں اُسے اپنی آواز بھی سنائی نہ دے۔

بعض حقیقتیں ایسی بھی ہوتی ہیں۔ جو وقتی تقاضوں کا خوش کن جواب ہوتی ہیں۔ لیکن جب یہ حقیقتیں اپنی

آئیں۔ "اماں جی اپنے بیٹے کی خوشی میں شریک ہوجئے" نا۔ باہر آکر بیٹھیئے سب آپ کے بچے ہیں۔ بھائی کس کا ہیں۔ " دردانہ نے بھی اصرار کیا۔

اور رشتے کا بھائی غلام غوث بھی آپہنچا۔ اماں کے دقیانوسی پن پر کئی چہرے مضحکہ کا رنگ لئے ہوئے تھے۔ اماں بے چاری خوب پھنسیں۔ ایسی منگنیاں بھلا اماں بچاری نے کہاں دیکھی تھیں۔ منگنی کی عام سی تقریب ہوا کرتی تھی۔ قریبی عزیز رشتہ دار جمع ہو گئے۔ لڑکی پر چنری ڈال دی گئی۔ جھولی میں شگن کے طور پر مٹھائی اور چھوہارے بھر دیے سسرال والوں کا لایا ہوا زیور پہنا دیا اور بس۔ منگنی تو منگنی۔ اماں نے تو ایسی شادی بھی نہ دیکھی تھی کبھی۔

بڑی مشکلوں سے اماں کو راضی کیا گیا۔ اپنے چوڑے سے چارجٹ کے دوپٹے کو اچھی طرح سے اوڑھا۔ ایک چادر کی طرح لپیٹا۔ ہلکا سا گھونگھٹ نکالنے پر تو بیگم رشید دردانہ اور ارد گرد کھڑے بھی لوگ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ دردانہ نے ان کا دوپٹہ پیچھے کو سرکا دیا۔ "نہ بیٹا" اماں نے دوپٹہ پھر ماتھے تک کر لیا۔

بیگم رشید دردانہ اور کئی فیشن ایبل عورتوں کے جلو میں اماں باہر آ گئیں۔ اب ہر طرف سے سلام ہونے لگے۔ مزاج پرسیاں ہوئیں۔ اماں پر گھبراہٹ مسلط رہی نوجوان عورتوں اور مردوں کے ملے جلے قہقہے بے باک باتیں اور بے روک ٹوک میل جول اماں کو کسی طور اچھا نہ لگ رہا تھا۔ لیکن مجبوری تھی۔ اکثریت کا ساتھ دینا ہی پڑتا ہے۔ اور سب سے بڑی بات ان کے بیٹے کی خوشی تھی۔ اللہ نے کن کن منتوں اور مرادوں کے بعد یہ دن دکھایا تھا۔

درمیانی صوفے پر حسن اک ادائے بیخودی سے بیٹھا تھا۔ اس کا جسم یہاں تھا لیکن روح کہیں اور تھی۔ ویرانوں میں بھٹک رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو اک دیدہ دلیر مجرم کی طرح لگ رہا تھا۔ چند خوش پوش نوجوانوں کے آجانے سے حسن کو اپنے پریشان کن افکار سے چھٹکارا مل گیا۔

تھوڑی دیر خوب پر لطف ہنگامہ سا رہا۔ اس کے بعد دلہن لائی گئی۔ رابعہ کو اس کی سہیلیوں نے اس طرح بنایا سنوارا تھا۔ کہ دیدہ و دل بچھے جا رہے تھے۔ حسن صوفے کے ایک طرف سمٹ گیا۔ رابعہ جھجکی جھجکی بیٹھ گئی۔ حسن نے اپنی خارجی اور داخلی توجہ اس کی طرف مبذول کر دی۔

رابعہ کی سہیلیوں نے حسن کا گھیراؤ کر لیا۔ نوجوان لڑکیوں کی حسین چھیڑ چھاڑ سے وہ محظوظ ہوا۔ بڑی ہمت کر کے اس نے اپنے حواس مجتمع کر لئے۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا اب پچھتاوے سے کیا حاصل اس نے حمید کے مقولے پر عمل کیا۔

ذہن کی سوچ کے زاویے ہی تو ہیں۔ کبھی قائمہ بن گئے۔ کبھی حادہ۔ تو کبھی منفرجہ۔ موقع کا لحاظ کر کے حسن کی سوچ بھی صحیح زاویے پر آکر رک گئی۔ اماں کے لئے اسے مسکرانا پڑا۔ رابعہ کے لئے اسے قہقہے لگانے

پوری شدت سے لاشعور سے ٹکراتی ہیں تو تلاطم بپا ہو جاتا ہے۔ ذہن میں شور اٹھتا ہے۔ انسان سمجھ نہیں سکتا کہ کیا ہو رہا ہے۔ لیکن داخلی طوفان انتشار بے چینی اور گھبراہٹ بن کر طبیعت پر چھا جاتے ہیں۔

حسن بھی ایسے ہی داخلی طوفانوں کی خارجی صورت سے دوچار تھا۔ دل کا کوئی گوشہ تو اب بھی ایسا تھا جس سے رس رس کر رک رک کر لہو بہہ رہا تھا۔

سرِ شام ہی مہمان آنا شروع ہو گئے۔ سلطانہ کی سہیلیاں عبدالرحیم کے دوست بھی مدعو تھے۔ رابعہ کی سہیلیاں تو دوپہر ہی سے جمع تھیں۔ اس کے کمرے میں خوب اودھم مچا رہی تھیں۔ چھیڑ چھاڑ بھی ہو رہی تھی۔ رابعہ کی خوش بختی پر خوشی کا اظہار کرتے کئی نوجوان چہرے ماند بھی پڑ رہے تھے۔ رابعہ نے تو اپنے خوابوں کا تور پا لیا تھا۔ ان پر ابھی حسرت ہی حسرت تھی۔

موسم بڑا ہی حسین تھا۔ تقریب کا اہتمام وسیع و عریض چمن میں کیا گیا تھا۔ رنگ برنگے شامیانے تیز برقی روشنی میں بڑے بھلے دکھائی دے رہے تھے۔ ہر طرف چمک دمک سی تھی۔ درختوں میں رنگ برنگے قمقمے اپنی بہار الگ دکھا رہے تھے۔ شامیانوں کے نیچے سرخ سرخ قالین سبزے کے فرش پر بچھے تھے۔ قطار در قطار صوفے لگائے گئے تھے۔ مہمانوں کی سہولت اور آرام کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ پنڈال کے عین وسط میں شہر کی مشہور مغنیہ حسن آراء کے لئے اس طرح جگہ بنائی گئی تھی۔ کہ مہمان ہر طرف سے اسے بآسانی دیکھ سکیں۔

درمیانی صوفے پر جھلملاتی چادر ڈالی گئی تھی۔ پھولوں سے یہ صوفہ لدا ہوا تھا۔ منگنی کی رسم ادا کرنے کو دولہا دولہن کو یہاں بٹھایا جاتا تھا۔

سلطانہ بڑی بشاش بشاش ادھر ادھر مہمانوں سے باتیں کرتی قہقہے پہ قہقہہ لگاتی آ جا رہی تھی۔ سیٹھ ناظم کی لڑکی کی شادی پر اس نے ایسا انتظام دیکھا تھا۔ اپنی بیٹی کی منگنی پر ایسی تقریب منعقد کر کے وہ لاشعوری طور پر سیٹھ ناظم کو نیچا دکھا رہی تھی۔ لوگ دل کھول کر اسے داد دے رہے تھے۔

عورتوں اور مردوں کے بیٹھنے کا اکٹھا انتظام تھا۔ کچھ پردہ نشینوں کے لئے ڈرائنگ روم میں جگہ بنائی گئی تھی۔ اماں بیچاری ایسی محفلوں میں شرکت کی کہاں عادی تھیں۔ اب تک اپنا سفید لٹھے کا برقعہ پورے احترام سے استعمال کرتی تھیں۔ مردوں کے سامنے جانے سے ہچکچا رہی تھیں۔

"اے ہے آپا۔ چھوڑیئے بھی اب - چلیئے سب مہمان آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ کتنی بری بات ہے۔ کہ لڑکے کی ماں پردو کیے بیٹھی رہیں۔ مہمانوں نے تو آپ ہی سے ملنا ہے اور پھر منگنی کی رسم بھی تو یہیں ادا ہو گی۔"

اماں نے کھسیانی سی ہنسی ہنس کر بات ٹال دی۔ لیکن ان کو باہر لانے کا اصرار بڑھنے لگا۔ بیگم رشید اندر

پڑے۔ جذبات کی لرزہ خیز ہلچل اور زخمی اتار چڑھاؤ کا تو وہ اب عادی ہو چکا تھا۔

لڑکیوں نے حسن کو بڑا سراہا۔ شکل و صورت کے لحاظ سے بھی اور اخلاق کی وجہ سے بھی۔ رخسانہ اور ناصرہ تو تعریف میں رطب اللسان تھیں۔

"ہماری رابعہ کچھ کم ہے بھلا" صبیحہ نے حسن کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "خوش قسمت ہیں آپ۔ لڑکی نہیں حور دی ہے ہم نے آپ کو۔"

"باپ رے باپ رے۔" حسن نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "مجھے تو لڑکی چاہئے تھی۔ حور کیا کروں گا۔" سب نے قہقہہ لگایا۔

"حور سے مطلب خوبصورت لڑکی ہے صاحب۔ جنت کی حور نہیں۔ ایک اور صاحبہ نے تشریح فرمائی۔

"دیکھے بغیر کیسے مان لوں کہ یہ صاحبہ خوبصورت بھی ہیں۔" حسن نے دزدیدہ نظروں سے جھکی جھکی رابعہ کو دیکھا۔

"بڑے چالاک ہیں" ایک شوخ آواز آئی۔ "مفت مفت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"پیسے لے لیجئے لیکن مجھے تسلی کر لینے دیجئے۔ کہ لڑکی واقعی خوبصورت ہے ہو سکتا ہے گنجی ہو۔ کالی کلوٹی ہو۔" لڑکیوں نے ہائے وائے کا شور مچا دیا۔

"ہم تو دیکھ کر رہیں گے۔" حسن نے ہاتھ بڑھا کر رابعہ کا دوپٹہ سرکانا چاہا۔ روحی نے اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔ لڑکیاں چیخیں۔ رابعہ سمٹ کر اور گٹھڑی بن گئی۔

"دیکھئے صاحب" حسن نے شوخی سے کہا "جب تک ہم ان صاحبہ کو دیکھ نہ لیں گے منگنی کی رسم نہیں ہو سکتی۔ جائیے ہمیں انکار ہے۔"

"کس بات سے انکار ہے۔" سلطانہ لڑکیوں کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھی۔ حسن ایک دم سیدھا ہو کر سعادت مندی سے اس طرح بیٹھ گیا۔ جیسے منہ میں زبان ہی نہ ہو لڑکیوں کا دلنشین قہقہہ گونج گیا۔ "کہہ دوں خالہ جان سے" روحی نے اس کے کان میں کہا حسن نے گھور کر نفی میں سر ہلا دیا۔ شوخی مسرتوں سے ملے جلے قہقہوں کے درمیان سلطانہ نے حسن کی انگلی میں انگوٹھی پہنا دی۔ اماں نے سرخ نگلوں والا دوپٹہ رابعہ پر ڈالا۔ غوث کی بیوی نے اماں کے لائے ہوئے کنگن اور انگوٹھی رابعہ کو پہنا دی۔ مبارک سلامت کا شور مچا۔ اماں نے رابعہ کا سر چوم کر پیار کیا۔ پھر بیٹے کی پیشانی بھی چوم لی۔ ان کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو جھلملا رہے تھے۔ آنکھوں کے گوشے حسن کے بھی نم ہو گئے۔

خدا جانے خوشی کی انتہا تھی۔ یا کسی ابتدا کی دردیلی یاد۔

بعض زخم پچھے سے بھی تو دکھ جاتے ہیں۔

مہینے بھر کی چھٹی تھی۔ یوں لگا جیسے تیس دن پر لگا کر اڑ گئے ہوں۔ حسن تھا۔ منگنی کی رات کو رابعہ کو دلہن کے روپ میں دیکھ کر وہ اس لمو کو جیسے بھول گیا۔ جو رس رس کر رک رک کر بہہ رہا تھا۔ زندگی کی بہاریں لوٹ آئیں تو اس کا دل مچل گیا تھا۔ اس رات اس نے اس بے جگری سے قہقہے لگائے کہ ان قہقہوں پر تصنع کا گمان ہونے لگا۔ رابعہ کی تعریف اس انداز میں کی کہ سارا زورِ بیان یوں صرف کر دیا کہ کسی اور کے متعلق کچھ کہنے سننے کو الفاظ ہی نہ رہیں۔

رابعہ چند منٹ تنہائی میں سامنے آئی۔ وہ وحشیانہ۔ جارحانہ انداز میں اس پر ٹوٹ پڑا۔ اس وحشت اور جارحیت نے آج اتنی جسارت کر لی۔ کہ اس کے تشنہ لب رابعہ کے آتشیں لبوں سے چھو گئے۔ حسن کو محسوس ہوا کہ ان شراروں میں بھی فردوسی ٹھنڈک تھی۔

رابعہ اسے اس کے پیار کی انتہا سمجھی۔ حسن بھی شاید یہی سمجھا۔ لیکن یہ دونوں کی بھول تھی۔ یہ اس مایوسی کا ردِعمل تھا۔ جو حسن کی زندگی پر کائی کی طرح جمی ہوئی تھی۔

دن گزرتے گئے حسن اور اماں واپس لاہور آ گئے۔ اماں کی تو خوشیوں کا ٹھکانہ نہ تھا۔ واپس آ کر رشتہ داروں اور عزیزوں کو اس تقریب کی خوشی میں شاندار دعوت دی۔

لڑکیاں بالیاں جمع ہو کر ڈھولک لے بیٹھیں۔ گانے گائے۔ لڈی ڈالی۔ غرضیکہ خوشی کا مظاہرہ ہر انداز سے کیا۔ اماں اپنے چھ تولے کے کڑے جو سلطانہ نے انھیں پہنائے تھے۔ ہر ایک کو خوشی اور فخر کے ساتھ دکھاتی پھریں۔

محلے میں بھی مٹھائی تقسیم کی۔ جو کراچی والوں نے شگن کے طور پر دی تھی۔ وہ کپڑے بھی سب کو کئی کئی بار دکھائے جو اس رسم پر سلطانہ نے ان کو دیئے تھے۔ منگنی کی تقریب کی روداد تو انھوں نے ہر ایک کو اس تفصیل سے سنائی کہ سننے والے رشک کرنے لگے۔

گھر میں کئی دن مسرور سا ہنگامہ رہا۔ حامد ماموں کی بیٹیاں تو تین چار دن یہیں رہیں۔ صغرا آپا کا پورا خاندان بھی دو دن بڑا جمان رہا۔ اماں مہمانوں سے ذرہ بھر نہیں گھبرا رہی تھیں۔ ایسے موقعے تو قسمت والوں کو میسر آتے ہیں۔ خوشی خوشی سب کی خاطر داری میں مشغول تھیں۔

حسن بہت جلد شادی کا خواہشمند تھا۔ رابعہ کے ہونٹوں کا لمس اب تک اس کے لبوں پر زندہ تھا۔ یہ لذت بخش حیات۔ یہ جذبات کیلئے بلا روک ٹوک بہاؤ۔ شادی اس کا دوسرا نام تھا۔ یوں بھی حسن رابعہ کو اپنے اور دینی و دنیاوی طور پر اس طرح مسلط کر لینا چاہتا تھا۔ کہ اس کی سوچ کبھی بدلنے نہ پائے۔

یہی بات اس دن اس نے حمید سے کہہ دی۔

"اچھی بات ہے شادی واقعی جلدی ہونی چاہئے۔"

"لیکن اماں"

"کیوں۔ وہ کیا کہتی ہیں۔"

"اپنے ایک ہی ایک بیٹے کی شادی دل کے سارے ارمان نکال کر کرنا چاہتی ہیں۔"

"وہ بھی سچی ہیں۔ ارمان نکالنے کو وقت بھی درکار ہے۔"

"دسمبر میں ارادہ رکھتی ہیں۔"

"اور تم"

"میں میں میں تو آج۔ ابھی۔"

حسن کو آواز پر اعتماد نہ رہا۔ حمید کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ چند لمحے حسن کو دیکھتا رہا۔ پھر اس پر سنجیدگی طاری ہو گئی۔ لائیٹر جیب سے نکالا۔ اور حسب عادت سگریٹ کے لئے حسن کی طرف دیکھا۔ حسن نے درمیانی میز پر رکھی سگریٹ کی ڈبیا اس کی طرف بڑھا دی۔

"تو گویا تم بہت جلد شادی کرنا چاہتے ہو۔" اس نے سگریٹ ہونٹوں میں دبایا۔

"بالکل"

بڑے انتہا پسند ہو۔" اس نے سگریٹ کا کش لے کر دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔ یقین مانو۔ بسا اوقات تو مجھے تمہاری انتہا پسندی سے خوف آنے لگتا ہے۔

"کیوں؟"

"کہیں یہ صورت تمہیں لے نہ ڈوبے۔" حمید نے برجستہ کہا۔ حسن سر جھکا کر سوچنے لگا۔

"انسان تو معقول ہونا چاہئے میرے دوست۔ کیسے آدمی ہو۔ کہ اپنے اوپر اتنا اختیار بھی نہیں"۔

"یہ بات نہیں حمید۔

"تو کیا بات ہے۔"

"چھوڑو۔ تم سمجھ نہ سکو گے۔"

"جی بجا فرماتے ہیں جناب۔ دنیا بھر کی عقل اور سمجھ تو آپ کے حصے ہی میں آئی ہے" حمید کی بات سے حسن نے کوئی حظ نہ اٹھایا۔ برکتے چائے کی ٹرے لے کر آ گئی تھی۔ سلسلہ گفتگو یہیں رک گیا۔

دونوں خاموشی سے چائے پینے لگے۔ حسن کی شادی کے سلسلے میں پھر کوئی بات نہ ہوئی۔ حمید اپنی تبدیلی کے امکان کا ذکر کرنے لگا۔ حسن کو اس کی تبدیلی کے ذکر سے کوفت ہوئی۔ وہ تو اس کا ذہنی سہارا تھا۔ یہاں سے چلا گیا تو اسے کون سنبھالے گا جلدی سے پوچھا۔ کب تک ہو گی پوسٹنگ۔"

"خیال ہے اگلے ماہ ہو جائے گی۔"

"کہاں؟"

"غالباً پشاور۔"

"چلو غنیمت ہے۔ زیادہ دور نہیں جا رہے۔"

"ایسا نہ کہو حمید مجھے ابھی تمہاری اشد ضرورت ہے۔"

"رابعہ بھابی کے آنے تک نا۔"

ایسا ہی سمجھ لو۔"

"حسن۔" حمید نے کرسی پر سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے ٹھوس سنجیدگی سے کہا۔ حمید یہاں رہے یا کہیں اور "اسے تم اپنا سایہ سمجھو۔ سایہ جو کبھی جدا نہیں ہوتا۔"

اندھیرے ہوں تو سایہ بھی جدا ہو جاتا ہے۔" حسن نے مذاق سے کہا۔

"یہی تو سمجھ کی غلطی ہے۔ اندھیروں میں سایہ جدا نہیں ہوتا حسن۔" وجود میں سمٹ جاتا ہے۔ مجھے اندھیروں میں میں اور تم دو نہیں ایک ہو جائیں گے۔"

حمید نے جس خلوص سے یہ بات کہی۔ حسن بڑا متاثر ہوا۔

چائے کی دو پیالیاں پینے کے بعد حمید نے گھڑی دیکھی۔ پانچ بجنے والے تھے۔ حسن نے اور کچھ دیر بیٹھنے کا اصرار کیا۔ لیکن اسے اپنے کسی گھریلو کام کے لئے انار کلی جانا تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ حسن بھی اٹھ بیٹھا۔

"چلتے ہو۔"

"نہیں۔ اس وقت طبیعت کچھ ساز گار نہیں۔"

"اندر جا کر سو جاؤ۔"

"سونے کو بھی دل نہیں چاہ رہا۔"

"رابعہ بھابی کو خط لکھنا شروع کر دو۔"

حمید نے چھیڑا۔ حسن گہری سانس بھر کر مسکرا دیا۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے بیٹھک سے باہر آ گئے۔ حمید نے نصیحتیں کرنا شروع کر دیں۔ جنہیں سعادت مندی سے حسن سنتا رہا۔ جب حمید کہہ چکا تو حسن نے گہری افسردگی سے کہا۔

"مجھے تو اپنے آپ کی بھی سمجھ نہیں آتی حمید۔ خدا جانے کیا ہوتا ہے۔ کبھی تو یوں لگتا ہے کہ قدرت نے دنیا بھر کی خوشیاں سمیٹ کر میرے دامن کو بھر دیا ہے۔ لیکن کبھی...... کبھی...... یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے ازلی تہی دامن ہوں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔"

"حسن" حمید نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلکے سے جھنجھوڑا۔ "تصور اور یاد کی اہمیت اپنی جگہ۔ لیکن تمہیں اب حقیقت سے آنکھیں نہیں پھیرنا چاہئیں۔ اب تم رابعہ سے وابستہ ہو چکے ہو۔ اخلاقی تقاضا ہی نہیں تمہارا فرض بھی ہے۔ کہ اب اپنے کسی کرب، کسی درد، کسی کسک کو اتنی اہمیت نہ دو۔ کہ زندہ حقیقت کی حق تلفی ہو۔ تمہیں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ ایسی اچھی لڑکی تمہیں مل گئی۔ فی زمانہ ایسی لڑکیاں نایاب نہیں۔ تو کمیاب ضرور ہیں۔"

"شاید تم سچ کہتے ہو۔"

"شاید نہیں واقعی سچ کہتا ہوں۔"

باتیں کرتے دونوں گلی کی نکڑ پر آ گئے۔ گلی میں کچھ بچے گولیاں کھیل رہے تھے۔ دو چار عورتیں احمد حسین کی ڈیوڑھی میں بیٹھی محلے بھر کی باتیں کر رہی تھیں۔ سامنے سے وہ لنگڑا فقیر آ رہا تھا۔ جو ہر دروازے پر صدا لگاتا۔ اور کچھ نہ کچھ لئے بغیر کبھی نہ ٹلتا تھا۔ شاہ صاحب کے مکان کے سامنے پھل کی ریڑھی لئے سرجو کھڑا تھا۔ جو دگنے دام بتا کر سودا دینے کا عادی تھا۔

گلی کی اپنی ہی زندگی تھی۔ دونوں ذاتی باتیں بھول کر اس گلی کی باتیں کرنے لگے۔ سڑک پر خالی تانگہ جا رہا تھا۔ حمید نے جلدی سے حسن سے مصافحہ کیا۔ اور لپک کر سڑک پر آ گیا

اماں شادی کی تیاریوں میں مشغول ہو گئیں۔ اور حسن قطرہ قطرہ بوند بوند پانی سے اپنے تشنہ ہونٹوں کی پپڑیاں تر کرتا رہا۔ مکمل سیرابی سے پہلے یہ قطرہ قطرہ بھی غنیمت تھا۔ اب اس کا وقتی اضطراب تھم چکا تھا۔ رابعہ کو اس نے اپنے آپ پر پوری طرح حاوی کر لیا تھا۔

اب وہ تھا اور رابعہ کے خطوط کا انتظار۔ اس دن وہ اپنے دفتر میں بیٹھا تھا۔ نئی سڑک جس کا نقشہ اور تخمینہ لگایا گیا تھا۔ شروع ہو چکی تھی۔ ان دنوں اس کی دفتری مصروفیات کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھیں۔ اس کے باوجود اس کا انتظار اپنی جگہ تھا۔ خط آتا۔ وہ جواب لکھتا۔ اور اسی دن سے نئے خط کا انتظار شروع کر دیتا۔

ستمبر ختم ہو رہا تھا۔ اکتوبر اور نومبر صرف دو ماہ باقی تھے۔ دسمبر...... دسمبر قریب آ رہا تھا۔ اب ان کے خطوط میں دسمبر کی آمد پر خوشی اور گھبراہٹ کے ملے جلے سے تاثرات ہوتے جو اپنی جگہ لذت بخش اور حیات افروز تھے۔ وہ سڑک دیکھ کر دفتر میں واپس آیا تو ایک بج رہا تھا۔ دفتر میں آنا شاید ضروری نہ ہوتا۔ لیکن اسے ڈاک دیکھنا تھی۔ آج رابعہ کا خط اسے ملنا تھا۔

میز پر پڑی سرکاری ڈاک اس نے جلدی سے الٹی پلٹی۔ نیلا لفافہ اس کی نظر پڑ گیا۔ بغیر نام دیکھے ہی اس نے لفافہ اٹھا لیا۔ باقی ڈاک اس نے میز پر بکھیر دی۔ جلدی جلدی وہ اس ڈاک پر نظر ڈال کر گھر پہنچ کر پورے اطمینان سے رابعہ کا خط پڑھنا چاہتا تھا۔ لمبے چوڑے اور خاکی لفافوں کے درمیان ایک اور عام سا لفافہ تھا۔ جس پر اس کا ذاتی پتہ درج تھا۔

"یہ کس کا ہے" اس نے لفافہ اٹھا لیا۔ پتہ دیکھا۔ اس پر اس کا پنڈی کا پتہ درج تھا۔ جسے کاٹ کر لاہور کا پتہ لکھا گیا تھا۔ خط پر کئی مہریں تھیں۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا۔ کہ لفافہ ڈاکخانہ والوں کی کوتاہیوں کی نذر ہو کر ادھر ادھر بھٹکتا رہا تھا۔

کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے رابعہ کا خط جیب میں ڈالا۔ اور اس لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد بھی

جب بھیجنے والے کا پتہ نہ چلا تو چاک کر کے خط نکالا۔ خط دارالامان والوں کا تھا۔

حسن کی نظریں سطور پر رینگنے لگیں۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اس کے چہرے پر موت کی نمی آ گئی۔ بلاارادہ اس نے پھر خط کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ لفافے میں صرف یہی ایک پرزہ کاغذ تھا۔ وہ جلدی سے خط کو پھر پڑھنے لگا۔ یوں لگ رہا تھا۔ جیسے خط کسی ایسی زبان میں ہو۔ جو اس کی سمجھ سے بالا ہو۔

اس کی آنکھیں جامد اور ساکت ہو کر ان سطور پر رک گئیں۔ خط اس کے کانپتے ہاتھوں سے گر گیا۔ اس کی لرزتی انگلیاں مٹھیوں کی صورت بھینچ گئیں۔

"با...... نو" اس کا سر میز کی سطح سے ٹکرا گیا۔ وہ کئی لمحے غافل پڑا رہا۔

"صاحب جی۔ صاحب جی" چپراسی اسے اس حالت میں کئی منٹ دیکھنے کے بعد قریب آ کر بولا۔

"کیا ہوا صاحب جی"

وہ اسی طرح پڑا رہا۔ چپراسی ساتھ والے کمرے سے کلرک کو بلا لایا۔

"صاحب جی بے سدھ پڑے ہیں۔"

"کب سے؟"

"پانچ سات منٹ تو میں دیکھتا رہا۔ بلایا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔" چپراسی ڈر رہا تھا۔ کہیں صاحب دل کے دورے سے راہی ملک عدم نہ ہو گئے ہوں۔

کلرک میز کے قریب آیا۔ لیکن اس کے کندھا ہلانے سے پہلے حسن نے میز سے اسی تیزی کے ساتھ سر اٹھایا۔ جس تیزی سے گرایا تھا۔

"بانو۔ بانو" ۔ وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔ اس نے میز سے وہ خط پھر اٹھایا۔ مٹھی میں بھینچ کر وہ اٹھا۔ اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا گریبان پکڑ لیا۔ اس نے بار بار آنکھیں میچیں۔ بار بار کھولیں۔

"بانو زندہ ہے۔ بانو پاکستان آ گئی ہے۔" وہ کلرک کو مخاطب کر کے بولا۔ اس نے چپراسی کو بتلایا۔ دونوں بھلا کیا سمجھ سکتے تھے۔ صاحب کی حالت سے ہراساں تھے۔

"بانو...... زندہ...... ہے۔ بانو زندہ ہے۔" وہ لڑکھڑاتے ہوئے باہر جانے کو بڑھا۔ کلرک نے بڑھ کر اسے تھام لیا۔ دوسری طرف سے چپراسی نے سہارا دیا۔ حسن کی حالت عجیب سے عجیب تر ہو رہی تھی۔ دفتر کا پورا عملہ اس کے گرد جمع ہو گیا۔ بانو کون تھی کب میری خواب زندہ ہو گئی تھی۔ ان سوالوں کا جواب دینے کی اسے فرصت کہاں تھی۔ کتنی ہی دیر وہ ہوش و خرد سے بیگانہ سا صرف یہی پکارتا رہا۔

"بانو زندہ ہے۔ بانو پاکستان آ گئی ہے"۔

ایس ڈی او رحمت علی نے جلدی سے ٹھنڈے پانی کا گلاس لا کر حسن کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ پنکھے کے

پہ کرسی ڈال کر اسے بٹھا دیا۔ کوئی اخبار سے پنکھا کرنے لگا۔ کوئی فائل سے۔

"ٹیلی فون۔ " حسن نے سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ہال کے سرے والی میز پر ٹیلیفون تھا۔ کلرک بھاگا۔ حسن خود ہی اٹھا اور بے تابی سے ٹیلی فون اٹھایا۔ حمید کا نمبر ملا کر وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ "بانو زندہ ہے حمید۔ وہ پاکستان آگئی ہے۔ جلدی پہنچو"۔

اس نے اپنا گھومتا ہوا سر ٹیلی فون پر ٹکا دیا۔ رحمت علی نے غیر متعلقہ لوگوں کو کمرے سے نکال دیا۔ فوجی جیپ لے کر حمید دس منٹ میں پی ڈبلیو ڈی کے دفتر پہنچ گیا۔ حسن اسے دیکھتے ہی والہانہ طور پر اس سے لپٹ گیا۔ "بانو زندہ ہے حمید۔ بانو زندہ ہے...... " وفور جذبات سے اس کی آواز ندھ گئی۔ حمید کو دیکھ کر وہ بے کل سا ہو گیا۔ خط حمید کے ہاتھ میں دے دیا۔ جیپ واپس بھیج کر حمید نے حسن کو سنبھالا دے کر اس کی گاڑی میں بٹھایا۔ خود سٹیرنگ سنبھالا۔ حسن کی حالت دید کے قابل تھی۔ حمید کا دل رقت سے بھر بھر گیا۔ اس کی زبان گنگ تھی۔

"اماں " حسن نے ڈیوڑھی ہی سے ہانک لگائی۔ اماں باورچی خانے کے دروازے سے باہر آ رہی تھیں۔ حسن کی آواز سے دل دہل گیا۔ وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح اماں کی طرف لپکا۔

"اماں۔ " اس کے منہ سے کوئی اور جملہ ہی نہ نکل سکا۔ اماں کا دل دھک سے رہ گیا سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے گھبرا کر بولیں۔ "یا اللہ خیر۔ "

"اماں " حسن ان کے گلے سے لپٹ گیا۔

"کیا ہوا بیٹے " اماں نے دھک دھک کرتے دل کو بمشکل سنبھالا۔ حسن کے پیچھے پیچھے حمید بھی اندر آ رہا تھا۔ "کیا ہوا...... ؟"

"اماں...... بانو زندہ ہے۔ " اس نے اماں کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے۔ اس نے اپنا سر اماں کے کندھے پر رکھ دیا۔

اماں جیسے اس کی بات ہی نہ سمجھیں۔ "کیا کہہ رہا ہے" ۔ اس نے حسن کو کندھوں سے پکڑ کر اپنے سامنے کرتے ہوئے حیرت و استعجاب سے جیسے چیخ کر کہا۔

"بانو زندہ ہے اماں۔ " حسن کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ وہ بار بار مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔ لبوں پر پیپڑیاں جم رہی تھیں۔ بال بکھر گئے تھے۔ گریباں کھلا تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں مدتوں کی ویرانی کی دھول سمٹ رہی تھی۔

اماں سے کھڑا نہ ہوا جا سکا۔ برکتے اور تاجاں بھی گرد آ کھڑی ہوئی تھیں۔ حسن کو حمید نے چارپائی پر بٹھا دیا۔ اور اماں کو برکتے نے۔ ماں بیٹے کے حواس قائم نہ تھے۔ حمید نے خط پڑھا "بانو بنت خواجہ نصیر الدین بھی ان بدنصیب لڑکیوں میں سے ہے جو پاکستان لائی گئی ہیں۔ بانو لدھیانہ کی رہنے والی ہیں۔ سب عزیز فسادات میں شہید ہو گئے تھے۔ پاکستان میں سوائے آپ کے انہیں اور کسی کا پتہ معلوم نہیں۔ "

اماں کو یوں لگا۔ جیسے فسادات میں ملک و ملت کے نام پر کٹنے والوں کی لاشیں ان کے سامنے لا کر رکھ دی گئی ہیں۔ وہ سر پر ہاتھ رکھ کر بین کرنے لگیں۔ حمید جھک کر جیسے مرنے والوں کو تعظیم دے رہا تھا۔ کچھ دیر اسی طرح گزر گئی۔ ذہن جیسے ماؤف ہی ہو چکے تھے۔

حسن توبار بار مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔ سر کو جھٹک رہا تھا۔ موت کبھی کچھ واپس نہیں کرتی۔ لیکن آج موت نے بانو اسے واپس کر دی تھی۔ حمید حسن کو اس کے کمرے میں لے گیا۔ وہ اب کچھ پر سکون ہو رہا تھا۔ لیکن تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بستر سے اٹھ کر کہنے لگتا۔ "بانو...... بانو زندہ ہے۔" شام تک حمید اس کے ہاں رہا۔ حسن صرف بانو کے متعلق سوچ رہا تھا۔

"خدا جانے وہ کس حال میں ہو گی" حسن نے بیتاب ہو کر کہا۔ اس نے سختی سے اپنا گریبان پکڑ رکھا تھا۔

"ہاں" حمید نے گہری سوچ سے چونک کر کہا۔ "پانچ سالوں میں خدا جانے ان پر کیا بیتی؟" حمید سوچ میں ڈوب گیا۔ حالات نے اگر بانو کی شکل مسخ کر دی ہوتی۔ تو اس دیوانے کا کیا بنے گا۔ حمید ڈر رہا تھا۔ ساتھ ہی اسے رابعہ کا خیال آ رہا تھا۔ جس کے متعلق کچھ سوچنے کی حسن کو فرصت ہی نہ تھی۔

"اللہ کرے بانو ہر طرح سے محفوظ ہوں" ڈرتے ڈرتے حمید نے اس خدشے کی طرف اشارہ کر ہی دیا۔ جو دل میں اٹھ رہا تھا۔

"حسن اٹھ کر کمرے میں بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ بانو...... جیسی بھی ہو گی۔ جس حال میں بھی ہو گی۔ مجھے منظور ہو گی۔ تم نہیں جانتے حمید۔ وہ میرے لئے کیا ہے۔ وہ کوئی دوسری شے نہیں۔ حمید وہ تو میرا اپنا آپ ہے۔ میرا وجود ہے میری ذات ہے۔"

حمید نے اس وقت کچھ اور کہنا مناسب نہ سمجھا۔ حسن کو تنہا چھوڑ دینا ضروری سمجھا۔ کل نو بجے دارالامان جانا ہے حسن کو یاد دہانی کرا کے حمید اسے کمرے میں چھوڑ باہر نکل گیا۔ اب حسن تھا اور اس کی تڑپتی بے چینیاں۔

اماں نے حسن کے دیوانہ پن کو دیکھا۔ انہیں بھی حمید کی طرح رابعہ کا خیال آ رہا تھا۔ دیوانے کے تیور جو کچھ کہہ رہے تھے۔ وہ رابعہ کے حق میں یقیناً ضرر رساں تھے۔ اماں نے بانو کی واپسی پر زبان سے کلمہ شکر ادا کیا تھا۔ لیکن کوئی ان کے جذبات کا تجزیہ کرتا۔ تو انہیں خوشی کی بجائے دھڑکا لگ گیا تھا۔ لیکن انسان ایمان داری سے اپنے جذبات کا تجزیہ کہاں کرتا ہے۔ اپنے آپ تک سے جھوٹ بولتا ہے۔ دوسروں کی تو بات ہی اور ہے۔ اماں بھی انسان تھیں۔ برکتے اور تاجاں کے سامنے بانو کی بازیابی پر کلمہ شکر کہنے کے باوجود دل کہہ رہا تھا۔ وہ ناحق آ گئی۔

حسن نے رات کو آنکھوں میں کاٹی۔ بانو کے نام کے ساتھ ہی اسے پیازی پیازی ریشم کے پھسلتے پھسلتے لچھوں کا احساس ہونے لگا تھا۔

بانو!

بانو!

بانو!

ساری رات وہ اس نام ہی کا ورد کرتا رہا۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے فوراً بعد نواب ممدوٹ مرحوم نے جو ان دنوں پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے۔ مغویہ لڑکیوں کی برآمدگی کے لیے ایک کمیٹی بنائی تھی۔ اس کمیٹی کے صدر مرحوم شیخ صادق حسن تھے۔ اور سیکرٹری مسٹر این اے رضوی۔ پی ایس پی تھے۔ جس جگہ یہ بد قسمت لڑکیاں ہندوستان سے لا کر رکھی جاتی تھیں۔ اس جگہ کا نام دارالامان تھا۔ ان دنوں یہ ڈسٹرکٹ جیل کے ایک حصہ ہی میں قائم تھا۔ بعد میں دارالامان اپوا والوں کے زیرِ انتظام آ گیا۔

دارالامان کے انچارج مرحوم صوفی عبدالحمید تھے۔ ملک کی سرکردہ اور معتمد ہستیاں اس کمیٹی کی ممبر تھیں۔ ہندوستان میں اس کمیٹی کے ہیڈ کوارٹر پٹیالہ اور جالندھر میں تھے۔ شیخ محمد امین انسپکٹر سی آئی ڈی وہاں کے انچارج تھے۔

ملک و ملت کے نام پر مٹنے والی بد نصیب لڑکیاں دارالامان لائی جاتیں۔ جہاں پوری تحقیق اور تسلی کے بعد انھیں ان کے لواحقین کے سپرد کر دیا جاتا۔ جن کا کوئی نہ ہوتا۔ انھیں وہیں رکھا جاتا۔ شادی کر دی جاتی یا کوئی دست کاری سکھا کر جینے کا آسرا بنا دیا جاتا۔

حمید نے آج چھٹی لے لی تھی صبح ہی صبح تیار ہو کر وہ حسن کے پاس پہنچا۔ حسن کی شب انتظار گزری تھی۔ اس کی سرخ آنکھوں اور تھکے تھکے چہرے سے صاف عیاں تھا۔ حمید حسن کو تھام کر گاڑی تک لایا۔

"ہمت سے کام لو حسن۔ یوں کام نہیں بنے گا۔" حمید نے سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس کے کندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔

حسن نے کوئی جواب دیے بغیر سیاہ چشمہ آنکھوں پر لگا لیا۔ حمید بلبل کی تڑپ دیکھ رہا تھا۔ کمیٹی کے دفتر میں قانونی کارروائیوں کے بعد دونوں دارالامان پہنچے۔

چپراسی نے انھیں اس چھوٹے سے کمرے میں بٹھا دیا۔ جو دفتر کا کام دیتا تھا۔ کمیٹی کی رکن اور قوم کی بچی

...اور ہمدرد خاتون مرحومہ فاطمہ بیگم بھی اس کمرے میں موجود تھیں اور خواتین بھی تھیں۔ کارکن مرد بھی تھے۔

حسن میز کے قریب پڑی کرسی پر حمید کے دائیں ہاتھ بیٹھا تھا۔ اس نے حمید کا ہاتھ سختی سے پکڑ رکھا تھا۔ اس کی ... سی گرفت سے حمید کو اس کے دلی جذبات کی پوری طرح اندازہ ہو رہا تھا۔ کمرے کی فضا بڑی سوگوار تھی۔ ان بدنصیب لڑکیوں کی زہرہ گداز داستانوں پر ہر دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ حسن کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ... باتوں کا جواب حمید ہی دے رہا تھا۔ حسن تو چشم بہ ساکت سا بیٹھا تھا۔

"مظلوم لڑکیاں عظیم ہیں۔" حسن یہ آواز سن رہا تھا۔ "پاکستان کے لئے جانی اور مالی قربانیاں دی گئیں۔ لیکن جو قربانی ہماری ان بیٹیوں نے دی ہے۔ وہ اس خون سے کہیں زیادہ ہے۔ جو پاکستان کے لئے بہایا گیا۔ یہ جبر و استبداد کی چکی میں سالہا سال پستی رہی۔ انہیں الٹی چھری سے اس طرح ذبح کیا گیا۔ کہ جان نکلی نہ ... رہی۔ یہ درندوں کے وار سہہ سہہ کر بھی اس آس پر زندہ رہیں۔ کہ انہیں اس ارض مقدس کو دیکھنا تھا۔ ان کی جگہ دلوں میں بنایئے ان عصمتوں کو مجروح نہ جانیئے۔ ان کی پاکیزگی پر شک نہ کیجئے۔ ان کے داغوں کو سینوں سے لگا لیجئے۔ اس لئے۔ اس لئے کہ یہ داغ انہوں نے پاکستان کے لئے کھائے ہیں۔"

کہنے والے کی آواز رندھ گئی۔ کمرے کی بوجھل فضا میں سسکیاں ابھرنے لگیں۔

"بانو..... کو بلا دیجئے۔" حسن بے اختیارانہ تڑپ اٹھا۔ اس کی فریاد سے کمرہ لرز گیا۔ حمید نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

حسن کا وجود بھاری ہو رہا تھا۔ کرسی پر بیٹھے اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے کسی دلدل جگہ میں کسی وزنی شے کی طرح نیچے ہی نیچے بیٹھتا چلا جا رہا ہو۔

منتظم اٹھ کر اندر گیا۔ دو تین خواتین بھی اندر گئیں۔ حسن نے میز کے سرے اپنے دونوں ہاتھوں میں دبا لئے۔ اس کی آنکھیں اس دروازے پر جم گئیں۔ جس سے یہ لوگ اٹھ کر اندر گئے تھے۔ منتظم واپس آیا۔ اس کے پیچھے دو عورتوں کے ساتھ۔

بربریت، وحشت اور درندگی کی روندی ہوئی اک لاش۔

لاش!..... با..... "حسن کرسی سے اچھل پڑا۔ لیکن دوسرے لمحے یوں ساکت ہو گیا جیسے موی کیمرہ چلتے چلتے رک گیا ہو۔

بانو..... ہاں۔ شاید وہ بانو ہی تھی۔

پیازی پیازی ریشم کے پھسلتے پھسلتے لچھے نہیں..... وہ تو یوں لگ رہی تھی۔ جیسے بان کی کھردری چارپائی پر کورے کھدر کی چادر کسی نے کس کر لپیٹ دی ہو۔

بانو نے سوکھی ویران آنکھوں سے حسن کو دیکھا۔ یوں دیکھا۔ جیسی کہہ رہی ہو۔ "میری ہمت کی داد دو حسن میں آگئی ہوں۔ موت سے لڑ لڑ کر زندہ رہی ہوں۔ میں آگئی ہوں۔ میں جو میں نہیں رہی۔ لیکن پھر بھی میں ہوں۔" حمید نے حسن کو کندھوں سے پکڑ کر کرسی پر بٹھادیا۔

"ہمیں جلدی فارغ کر دیجئے"۔ حمید نے حسن کی حالت دیکھتے ہوئے کہا۔

"جاؤ بیٹی اپنی چیزیں لے آؤ۔ مبارک ہو تم اپنے عزیزوں سے مل گئی۔" ایک خاتون نے بانو سے کہا۔ "اپنی ساتھی بہنوں سے بھی مل کر آجاؤ۔"

بانو جب سے اب تک ساکت کھڑی ایک ٹک حسن کو دیکھے جا رہی تھی۔ ایک خاتون نے اس کا کندھا ہلایا اور پھر سہارا دے کر اندر لے گئی۔ لاش سے بھی بھلا چلا جا سکتا ہے؟

"حوصلے سے کام لیجئے۔ صبر کیجئے۔ ہمت رکھیئے" کئی مغموم آوازیں حسن سے مخاطب تھیں۔ وہ گنگ کھڑا تھا۔ حسن نے اپنے دانت اپنے آستیں میں گاڑ دیئے۔ اس کا سر میز کی سطح پر جھک گیا۔ اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ اور اس کے سینے کے زیر و بم میں بے آواز ہچکیاں ٹوٹنے لگیں۔ حمید خاموشی سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ دارالامان کے اس کمرے میں کئی مغویہ لڑکیاں آئی تھیں۔ اپنے والدین' اپنے عزیزوں اور اپنے سرپرستوں سے پہلی بار یہاں ملی تھیں۔ کمیٹی کے ارکان اور منتظم نے دکھ درد کے طوفان یہاں اٹھتے دیکھتے تھے آنسوؤں کے سیلاب بہتے دیکھے تھے۔ چیخوں اور آہ و بکا سے یہ کمرہ بارہا گونجا تھا۔ جدائی کے جانگسل عرصے کے ملاپ کی صورتیں بھی دیکھنے میں آئی تھیں۔ ان کی آنکھیں اس بات کی بھی گواہ تھیں کہ ان عبرتناک لاشوں کے مسخ چہرے دیکھ کر کئی رشتہ دار انہیں ساتھ لے جانے کی بجائے یہیں چھوڑ گئے تھے۔ اور پھر آہوں کے درد بھرے طوفان اس صورت اٹھے تھے۔ کہ خود درد کا سینہ پھٹ گیا تھا۔

لیکن اس طرح بے آنسوؤں کے آج تک کوئی نہیں رویا تھا۔ بے آواز کے کوئی چیخیں یوں بلند ہوئی تھیں۔ کہ کمرے کے پتھریلے در و دیوار پگھل گئے تھے۔ ہر آنکھ بانو کو نہیں حسن کو دیکھ دیکھ کر نم ہو رہی تھی۔ حسن کا دماغ لٹو کی طرح گھوم رہا تھا۔ اتنی تیزی سے کہ اس پر ساکت ہونے کا گمان ہونے لگا۔

"ہمت سے کام لیجئے۔ حوصلہ رکھئے۔ آپ نے اس بدنصیب کو سہارا دینا ہے" کوئی کہہ رہا تھا۔ بانو اندر آ رہی تھی۔ "صبر ہمت حوصلہ۔" حسن نے میز پر رکھا ہوا سر اٹھایا۔ اس کی نظر بانو پر پڑی۔

"خدایا!..... " حسن کی چیخ شدت کرب سے پھٹ گئی۔ دونوں ہاتھوں سے اس نے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ حمید نے بھی شدت کرب سے اپنا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔

بانو اکیلی نہ تھی۔ ڈیڑھ دو سالہ بچہ اس کے کندھے سے یوں لگا تھا جیسے ظلم اپنی پوری قوت سے اس کے جسم سے پیوست ہو گیا ہو۔

بانو کانپ رہی تھی۔ دائیں بائیں کھڑی خواتین نے اسے سہارا دے رکھا تھا۔ کمرے میں دبی دبی سسکیاں اور دل لرزتی آہیں فضا کو ناقابل برداشت بنا رہی تھیں۔ لوگ تو کیا پتھریلے درو دیوار رو رہے تھے۔ نگران نے آنسو پونچھتے ہوئے خواتین سے بانو کو باہر لے جانے کا اشارہ کیا۔

"بانو! بانو پر تو مشکلیں اتنی پڑی تھیں کہ اب آسان ہو گئی تھیں۔ لیکن اب اسے کیا ہو رہا تھا۔ سمجھ نہ پا رہی تھی۔ کہ مشکل آسان ہوئی ہے کہ آسان مشکل۔

کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا...... کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔ عورتیں اسے تسلیاں دیتے ہوئے باہر لے گئیں۔ وہ بچے کو اور مجھے لگاتے سوچ رہی تھی کہ وہ کون ہے؟ بانو ہے یا سندر کور؟ لڑکی ہے یا عورت...... وہ کیا ہے۔ اس نے کسی کو شوہر تسلیم نہیں کیا۔ لیکن اس نے بچے کو جنم دے دیا۔ وہ طوائف بھی تو نہیں...... وہ کیا ہے؟ آخر کیا ہے؟ وہ بھی سونی ویران آنکھیں پھاڑے وہ سب کو دیکھتے ہوئے جیسے پوچھ رہی تھی۔ میں کون ہوں؟ میں کیا ہوں؟ معاشرہ مجھے کیا نام دے گا؟

ناظم نے تسلی و تشفی کے لیے بہت سی باتیں کیں۔ غمگسار خواتین نے بھی حسن کو ہمت دلانے کے لیے بہت باتیں کیں۔ نصیحتیں کیں۔ ہمدردی جتلائی۔ دلاسہ دیا۔ لیکن حسن کچھ نہیں کچھ بھی نہیں سن رہا تھا۔ اس کا دماغ تو گھومتے ہوئے لٹو کی طرح تھا۔ جو اپنی ہی تیزی سے ساکت سا ہو گیا تھا۔ یہاں بھی جو کارروائی تھی حسن کی بجائے حمید ہی نے سرانجام دی۔

پھر حمید نے سہارا دے کر حسن کو اٹھایا۔ دارالامان میں مقیم جتنے لوگ جتنی بے آسرا عورتیں جتنی بدنصیب لڑکیاں بھی تھیں۔ سب حسن اور بانو کے گرد جمع تھے۔ ہر آنکھ خون دل بہا رہی تھی۔ سب نے بچشم نم انہیں رخصت کیا۔ ہوتے ہوتے سب گاڑی تک یوں آئے۔ جیسے جنازے کو بصد عقیدت و احترام اٹھائے چلے آ رہے ہوں۔

جنازے یوں بھی اٹھا کرتے ہیں۔ سارا راستہ مرگ کا سا سکوت رہا۔ حمید گاڑی چلا رہا تھا۔ جس کے سینے میں لوٹتی ہچکیوں کے جھٹکے لگ رہے تھے۔ رومال کا کونا بھی دانتوں تلے سختی سے دبا لیتا۔ کبھی ہونٹ دانتوں میں دبا لیتا۔ سسکیاں بے صدا سسکیوں کی گونج بڑی جان لیوا تھی۔

اور بانو! بانو...... ! تو اس طرح بیٹھی تھی۔ جیسے سرد و بے جان پتھر کا مجسمہ کسی نے سیٹ پر رکھ دیا ہو۔ غم کی تھی نہ خوشی کا احساس۔ گاڑی دروازے کے سامنے روک کر حمید نے پچھلا دروازہ کھولا۔ بانو باہر آ گئی۔ حمید نے تعظیماً سر جھکاتے ہوئے ڈیوڑھی کی طرف اشارہ کیا۔ بانو کے قدم اٹھنے لگے۔

اماں صحن ہی میں چارپائی پر بیٹھی تھیں۔ برکتے پاس بیٹھی ساگ بنا رہی تھی۔ جمعدارنی صفائی کرنے کے بعد رات کی باسی روٹی کے ساتھ چائے پی رہی تھی۔ منی کا پیالہ اس نے ہونٹوں سے لگا رکھا تھا۔ بانو صحن میں آ گئی۔

http://www.rehanahmed.com

برکتے نے بھک منگی سمجھ کر کچھ کہنے کو لب کھولے۔ لیکن حسن اور حمید کو آتے دیکھ کر چپ ہو گئی۔ حمید نے حسن کو تھام رکھا تھا۔ اماں کی نظر ادھر پڑی۔ بھاری بھر کم وجود کے باوجود وہ بجلی کی سرعت سے اٹھیں۔ اور لپک کر ادھر آئیں۔

"کون......؟" وہ بے اختیار چیخیں اور پھر یوں ٹھٹک گئیں۔ جیسے قبرستان میں کسی پرانی قبر سے مردہ اٹھتے دیکھ لیا ہو۔

"تم...... با...... نو......" ان پر رعشہ سا طاری ہو گیا۔ حسن حمید سے بازو چھڑا کر آگے آیا۔ ہاتھ بانو کی طرف پھیلا کر چیخا۔

"یہ بانو ہے...... اماں۔"

یہ چیخ نہیں۔ اک بین تھا۔ جو درد کی شدت سے پھٹ گیا۔

اماں نے تڑپ کر بانو کے ڈھانچے کو لپٹا لیا۔ ان کی چیخیں نکل گئیں۔ برکتے بھی رونے لگی۔ اور جمعدارنی کے بھی آنسو نکل آئے۔ حمید سر جھکائے پشت پر ہاتھ باندھے خاموش کھڑا رہا۔

حسن میں یارائے صبر نہ رہا۔ لڑکھڑاتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ اور اپنے بستر پر اوندھا گر گیا۔

اس کی چیخوں، سسکیوں، ہچکیوں اور آنسوؤں کے سامنے صبر کے۔ ہمت کے۔ حوصلے کے سب بند ٹوٹ گئے۔

"کاش تم مر گئی ہوتیں بانو۔ کاش تم مر گئی ہوتیں۔" وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "تمہارے مر جانے کا صدمہ قابل برداشت تھا۔ لیکن یہ زندہ رہنے کا سانحہ کیوں کر برداشت کر لوں۔ تمہیں بانو سمجھ کر خوشی سے قہقہے لگاؤں۔ یا بانو کی لاش سمجھ کر لپٹ لپٹ کر روؤں۔

باہر اماں بین کر رہی تھیں۔ محلے کی کچھ عورتیں آواز سن کر آ گئی تھیں۔ بانو کو گھیرے میں لئے سب آنسو بہا رہی تھیں۔

اور اندر حسن رو رہا تھا۔ وہ حسن رو رہا تھا۔ جو آنسوؤں کو شیوہ مردانگی نہیں گردانتا تھا۔

اور

جو بانو کے مرنے کی خبر پا کر بھی نہیں رویا تھا۔

آج زندہ بانو پر آنسو بہا رہا تھا۔

تڑپ تڑپ کر رو رہا تھا۔ بلک بلک کر آنسو بہا رہا تھا۔

برسوں پہلے کی بات ہے کہ لدھیانہ کے محلہ گجرل میں ایک ممتاز کشمیری خاندان آباد تھا۔ حاجی معراج الدین دولت مند تو نہ تھے۔ لیکن اپنے علاقے میں ان کی بڑی عزت تھی۔ ایمان دار۔ ہمدرد اور مخلص انسان تھے۔ ان دنوں انسانیت کے تول دولت کے پلڑوں پر نہ ہوتے تھے۔ اسی لئے معراج الدین کی عزت مسلمان ہندو اور سکھ بھی یکساں طور پر کرتے تھے گجرل محلہ میں ہندو مسلم آبادی مشترکہ طور پر رہ رہی تھی۔ اسی محلے میں لالہ گوپی ناتھ بھی رہتا تھا رام لال کپور بھی۔ سیتارام کوہلی کا بھی یہیں گھر تھا۔ اور مہندر سنگھ۔ دیوان رائے چندر اور سردار ہرنام سنگھ بھی یہیں رہتے تھے۔ مسلمانوں کے گھرانے یہاں آباد تھے۔ گلی کی نکڑ پر نصیر الدین کا دس مرلے کا کھلے صحن والا دو منزلہ مکان تھا۔ معراج الدین نصیر الدین کے رشتہ کے بھائی بھی تھے۔ نصیر الدین کے بیٹے سلیم کے ساتھ اپنی چھوٹی بیٹی ثریا کا رشتہ بچپن ہی میں طے کر دیا تھا۔ یوں رشتہ داری کچھ اور مضبوط ہو گئی تھی۔

معراج الدین کی دیوار لالہ گوپی ناتھ کے مکان سے ملتی تھی۔ ان کے عین سامنے مہندر سنگھ کا مکان تھا۔ معراج الدین کا مکان ایسا بڑا تو نہ تھا۔ پھر بھی ضرورتوں کے لئے کافی تھا۔ ان دنوں انسان کی ضرورتوں نے اتنی وسعت بھی تو اختیار نہ کی تھی۔ انہیں چھوٹے چھوٹے گھروں میں شادیاں بھی ہوتی تھیں۔ تقریبیں منعقد کی جاتی تھی۔ غمی کے موقعوں پر بھی پورا خاندان اکٹھا ہوتا تھا۔ مکان تنگ تھے۔ لوگوں کے دل وسیع تھے۔ آج کل مکان وسیع ہیں لیکن دل تنگ ہیں۔

ہندو مسلم بڑے سلوک اور اتفاق سے رہتے تھے۔ معراج الدین اور نصیر الدین کی دوستی ہندو اور سکھوں سے بھی تھی۔ لالہ گوپی ناتھ اور ایشور سنگھ۔ سردار مہندر سنگھ بھی ان کے قریبی دوستوں میں سے تھے جب سب اکٹھے ہوتے تو رات کے بارہ بارہ بجے تک گپ شپ کی محفل جما کرتی تھی۔ بھائی چارہ اتنا تھا کہ ایشور سنگھ کی بیٹی کی برات آئی۔ تو نصر الدین نے ساری برات کو دودھ پلایا تھا۔

اسی طرح جب معراج الدین کی بڑی بیٹی رشیدہ ایک سال کی ازدواجی زندگی کے بعد باپ کے گھر آئی تو ان بھی دوستوں نے سینہ تان کر کہا تھا۔ رشیدہ ہماری بیٹی ہے۔ ہم اس کی بیوگی کا بوجھ مل کر اٹھائیں گے۔

رشیدہ کسی پر بوجھ تو نہ تھی لیکن ان لوگوں کا اخلاقی سہارا بیوگی کے ایام کاٹنے میں بڑا مددگار ثابت ہوا۔ اور اس کا تین ماہ کا بچہ حسن پیار اور محبت کے ماحول میں پرورش پانے لگا۔

معراج الدین کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ عبدالکریم لدھیانہ ہی میں ملازمت کرتا تھا۔ بیوی بچوں کے ساتھ مکان کے نچلے حصے میں رہائش تھی۔ دوسرا بیٹا عبدالرحیم جالندھر میں کپڑے کی معمولی دکان کرتا تھا۔ اس کے سسر نے اسے جالندھر ہی میں بلا لیا تھا۔ بڑی لڑکی رشیدہ تھی۔ جو بٹھنڈہ کے ایک خوشحال خاندان میں بیاہی گئی تھی۔ اس کا شوہر انجینئر تھا۔ اس رشتے پر جہاں اپنوں کو خوشی ہوئی تھی۔ شریک حسد سے جل بھن گئے تھے۔ رشیدہ کی بدقسمتی تھی۔ ایسا محبت کرنے والا شوہر ایک سال بعد ہی تنہا چھوڑ گیا تھا۔ سسرال والوں کی نظریں اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی بدل گئیں۔ بہت بڑی جائیداد تھی جو دیوروں نے ہتھیا لی۔ رشیدہ کے پاس صرف اس مکان کے کاغذات رہ گئے تھے جو اس کے مہر میں لکھا گیا تھا؟ تین ماہ کے بچے کو لے کر وہ اپنے باپ کے گھر آ گئی۔ باپ اور بھائیوں کے سہارے زندگی کٹنے لگی۔ حسن کو انجینئر بنانے کا فیصلہ معراج الدین نے اس وقت کیا تھا۔ جب وہ شیر خوار تھا وہ اسے باپ کا بدل بنانا چاہتے تھے۔

”حسن انشاء اللہ انجینئر بن کر اپنے باپ کی جگہ پر کھڑا ہو گا۔ اور پھر ان بٹھنڈہ والوں سے اپنے باپ کا سارا حق وصول کرے گا۔“

وہ رشیدہ کو ہمیشہ تسلیاں دیا کرتے تھے۔ رشیدہ نے بھی حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا قسمت کا لکھا ٹل نہیں سکتا بیوگی ہی میں عمر کاٹنا تھی۔ حسن جیسا پیارا بچہ قدرت نے اسے شوہر کے نعم البدل کی صورت میں دیا تھا۔ پکی مسلمان عورت تھی۔ اللہ کی رضا پر راضی ہو کر بچے کو پالنے لگی۔

خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ گھر کی مالک بسوئیں بھی موجود ہوں۔ عبدالکریم کی بیوی سکینہ کبھی کبھی دل دکھانے والی باتیں کر دیا کرتی تھی۔ لیکن معراج الدین کا رعب و دبدبہ ایسا تھا۔ کہ بہو بیٹے کو کچھ کہنے کی مجال نہ تھی۔

رشیدہ نے بھی تو گھر کا بیڑا اٹھا لیا تھا۔ کھانا پکانا سینا پرونا سب اس نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ کسی وقت بھی آرام سے نہ بیٹھتی تھی۔ کبھی فرش دھو رہی ہے تو کبھی کپڑے۔ ماں کو تو اس نے جیسے تخت کی رانی بنا دیا تھا۔ ثریا کو تو اپنی بچی کی طرح اسی نے پالنا شروع کیا۔

”ہیرا تھی میری بیٹی!...... سسرال والوں نے تو قدر نہ کی تھی۔ بچے کی بھی پرواہ نہ کی۔ میری بیٹی کی خاطر نہ سہی اپنے بچے کے خون کی خاطر ہی اس کا آسرا بنے رہتے۔“ رشیدہ بیچاری اپنا غم چھپا کر الٹا ماں کو تسلیاں دیا کرتی۔

"تم غم نہ کیا کرو ماں۔ میرے پاس حسن جو ہے۔ یہی میرا سرمایہ ہے۔ جیتا رہے۔ بڑا ہو کر سب سے نپٹ لے گا۔ میری تو یہی خواہش ہے کہ وہ اپنے باپ کی طرح لائق ہو۔"

"ہم مر بھی گئے تو اسے انجینئر ضرور بنانا...... " معراج الدین کہتے " میری زبردست خواہش ہے کہ میرا بچہ انجینئر بنے۔ یہ سب تمہاری ہمت اور تربیت پر ہو گا بیٹی۔"

معراج الدین واقعی حسن کو انجینئر بنتے نہ دیکھ سکے۔ چند دن کے معمولی بخار نے ہی زندگی سے منہ موڑ لینے پر مجبور کر دیا۔ حسن ان دنوں ابھی نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ مرنے سے پہلے معراج الدین نے حسن کو پاس بلایا۔ اور سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے ٹوٹتی آواز میں کہا " حسن بیٹے تمہیں انجینئر بننا ہو گا۔ تم ایک لائق باپ کے بیٹے ہو اس کا نام روشن کرنا۔"

اور پھر رشیدہ کو بھی اسی قسم کی نصیحت کی تھی۔ " بیٹی تمہارے پاس حسن کے باپ کی اتنی پونجی ضرور ہے کہ تم اپنے بچے کو قابل بنا سکو۔ میرے بعد بھائیوں کا منہ دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے زیور تمہارے کام آئیں گے۔ حسن انجینئر بن گیا۔ تو اس سے زیادہ تم اور کیا چاہو گی۔

معراج الدین کی خواہش کا احترام رشیدہ نے پوری طرح کیا۔ حسن نے بھی دن رات ایک کر کے محنت کی۔ میٹرک اس نے بڑے اعزاز سے پاس کیا۔ اور پھر کالج میں داخلہ لے لیا۔ اسے بھی انجینئر بننے کی لگن تھی۔

نصیر الدین کے فہیم سے حسن کی بچپن کی دوستی تھی۔ فہیم میٹرک سے آگے نہ جا سکا۔ تعلیم چھوڑ کر وہ نوکری کی تلاش میں لگ گیا۔ حسن نے ایف اے پاس کر کے لاہور انجینئرنگ کالج میں داخلہ لے لیا۔ فہیم کلکتہ دفتر میں ملازم ہو کر بمبئی چلا گیا۔ نصیر الدین کا بڑا بیٹا سلیم باپ کے ساتھ کاروبار میں شریک ہو گیا۔

" نصیر الدین کے چار بیٹے سلیم فہیم نعیم اور ندیم تھے۔ سلیم سب سے بڑا تھا۔ فہیم دوسرے نمبر تھا۔ فہیم سے چھوٹی ایک ہی بیٹی بانو تھی بانو سے چھوٹے دو بھائی نعیم اور ندیم تھے۔ نصیر الدین بھی معراج الدین کی طرح مخلص دیانت دار اور صحیح مسلمان تھا اپنے حلقے میں ان کی بھی بڑی عزت تھی۔ کاروبار معقول تھا۔ گزر بسر خوش حالی سے ہوتی تھی ان کی بیوی صالحہ بڑی وضع دار خاتون تھی۔ شوہر کی خدمت گزار بیوی اور بچوں کی مثالی ماں تھی۔ بانو اس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ لیکن بچی کی اٹھان انہوں نے جن خطوط پر کی تھی۔ وہ قابل قدر تھے۔ بانو شکل و صورت اخلاق و عادات میں یکتا تھی۔ پیازی پیازی رنگت اور نرم و گداز بدن میں ریشمی لچھوں کا سا لوچ رکھنے والی یہ لڑکی مروت " انکسار اور خدمت گزاری کے گراں قدر جذبوں سے بھی مالا مال تھی۔ ماں نے جسے اپنے پرائے چھوٹے بڑے بی بی کہتے تھے۔ اس کی تربیت ہی اس انداز سے کی تھی۔

میٹرک تک تعلیم پانے کے بعد بی بی نے اسے گھر بٹھا لیا تھا۔

"لڑکیوں نے آخر گھر ہی بسانا تھا" بی بی اکثر کہا کرتی تھیں۔ اس لئے گھر کے کام کاج میں ماہر ہونا چاہئے۔ بانو آگے بھی پڑھنے کی خواہاں تھی۔ اس کی سہیلیاں حامد اور ساوتری نے کالج میں داخلہ لے لیا تھا ہرنام کور دہلی کے کالج میں داخلہ لے کر ہاسٹل میں چلی گئی تھی۔ بی بی کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ گھر گرہستی کا بوجھ اس پر آن پڑا جس کو وہ بطریق احسن نبھانے لگی۔

چند ہی ماہ میں وہ کھانے پکانے اور سینے پرونے میں ماہر ہو گئی۔ اسلامی تعلیم کا انتظام بھی بی بی نے خوب کیا"۔ فارغ اوقات میں ادھر ادھر کی کتابیں پڑھنے کی بجائے بی بی نے اسے کلام پاک کی تفسیریں پڑھنے کی تاکید کی۔ اپنی اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنے کا شوق دلایا۔ بانو کو قدرتی طور پر شعر و شاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ لیکن یہ بات بی بی کی مرہون احسان تھی۔ کہ بانو کے لئے اقبال اور اقبال کی شاعری پر کئی کتابیں بانو کو میسر آگئیں۔

وہ ماں باپ کی لاڈلی بھی تھی۔ یہ لاڈ پیار ہمیشہ حدود کے اندر ہی رہا۔ بھائی بھی اکلوتی بہن کو دل و جان سے چاہتے تھے نسیم بمبئی سے جب بھی آتا۔ اس کے لئے اچھی اچھی چیزیں لانا نہ بھولتا۔ سلیم کا تو طریق ہی یہ تھا کہ ہر روز اس کے لئے کوئی دوپٹہ کوئی قمیص ضرور لے آتا۔ بی بی سیانی عورت تھی۔ اسی طرح بانو کے لئے جہیز جمع ہو گیا تھا۔ دو بڑے بڑے صندوق کپڑوں سے بھر گئے تھے۔ اور بھائیوں کی لائی ہوئی چھوٹی موٹی چیزوں کو اس نے لوہے کی بڑی پیٹی میں بڑی احتیاط سے لپیٹ لپیٹ کر رکھا ہوا تھا۔

نعیم اور ندیم چھوٹے تھے۔ لیکن باجی سے والہانہ پیار تھا۔ بانو تو ان پر جان چھڑکتی تھی۔ محبت، سکون اور خلوص بھرے ماحول میں جو آنکھ کھولی تھی۔ زندگی بڑے اطمینان سے رواں دواں تھی۔ ۔

دونوں گھرانوں کے تعلقات شروع ہی سے خوش گوار تھے۔ ثریا کو بی بی کی بہو بننا تھا۔ رشیدہ اور بی بی میں رشتہ داری کے علاوہ بھی پر خلوص محبت تھی۔ ماں اور باپ کے مرنے کے بعد ثریا کی شادی کا بوجھ رشیدہ کے کندھوں پر آ پڑا تھا۔ عبدالکریم اور عبدالرحیم کو بھی اپنے فرض کا احساس تھا۔ رشیدہ چاہتی تھی کہ بہت جلد اس فرض سے سبک دوش ہو جائے۔

چاچا رام لال کپور کی دھرم پتنی کوشلیا بھی رشیدہ کی مونس و غمگسار تھی۔ اس نے بھی ثریا کی شادی کر دینے کا مشورہ دیا۔ رشیدہ ثریا کو اپنی ہی بچی سمجھتی تھی حسن اور ثریا میں بھی عمر کی سال دو سال کی کمی بیشی تھی اس لئے بہن بھائیوں کا سا پیار تھا۔

شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ دونوں طرف سے تیاریاں زور شور سے ہونے لگیں۔ دونوں بھائیوں نے مقدور سے زیادہ ہمت کی۔ وہ کسی سے یہ سننا نہیں چاہتے تھے کہ باپ کے مرنے کے بعد بھائیوں نے ثریا کو یونہی الوداع کر دیا۔ رشیدہ کی ماں نے بھی کپڑا لتا بہتیرا جمع کر رکھا تھا۔ کچھ زیور بھی تھا۔ رشیدہ اور ثریا جہیز بنانے سنوارنے لگیں۔ رشیدہ اور ثریا کی ہندو اور سکھ سہیلیوں نے بنائی سلائی میں بڑی مدد دی۔ کامنی نے

گوٹا لگایا۔ بازار سے سو روپے سے کم میں بنتا نہ تھا۔ مہندر نے دو سوتی کی دو چادروں پر بڑے خوب پھول بنا دیے۔ اسما نے دوپٹوں پر مقیش کر دی۔ خالدہ نے کرن اور گوٹے ٹانکنے کا کام سنبھال لیا۔

حسن ان دنوں چوتھے سال میں تھا۔ اماں کی فرمائش پر وہ لاہور سے ہر پھیرے ثریا کے لئے کبھی برتن۔ کبھی کبھی گوٹا کناری اور کبھی آرائشی چیزیں لے کر آتا۔

ادھر بی بی اور بانو بھی شادی کی تیاریوں میں جٹ گئیں۔ سلیم پہلا بیٹا تھا۔ فراغت بھی تھی۔ اور بی بی کی پس انداز کی ہوئی رقم بھی۔ جی کھول کر بیٹے کی شادی پر ارمان نکالنا چاہتی تھیں۔ بانو ثریا کے لئے بڑے ارمان سے تیار کر رہی تھی۔ ثریا سے پوچھ پوچھ کر چیزیں اس کی پسند کے عین مطابق بنا رہی تھی۔ کپڑے اس نے زیور بھی ثریا کی پسند کا بنوایا۔

کی پیاری سی بھابی کو گھر لانے کے تصور سے ہی بانو جھوم جھوم جاتی تھی۔ بالائی منزل پر سیڑھیوں کے ساتھ والا کمرہ جس کی کھڑکیاں گلی میں کھلتی تھیں۔ ثریا کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ گھر کی قلعی کروائی گئی تھی۔ روغن ہوئے۔ مہمانوں کے آنے سے پہلے پہلے ہر چیز تیار ہونا تھی۔

سلیم بھی ان دنوں دہلی بدل کر آ گیا تھا۔ اسے بھی شادی کی تاریخ سے مطلع کر دیا گیا تھا۔ مہینے بھر کی چھٹی لے کر آنے کے لئے بی بی نے تاکیداً لکھوایا تھا۔ سلیم بانو کو چہکتی پھرتی دیکھ کر خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ اس نے خوب کنگنوں کی جوڑی اسے باگ پکڑائی دینے کو بنوائی۔ خاندانی دستور کے مطابق جب دولہا گھوڑے پر سوار ہوتا ہے تو بہن گھوڑے کی باگ پکڑ کر راستہ روکتی ہے۔ اور اس وقت تک راستہ نہیں دیتی جس وقت تک بھائی کوئی تحفہ یا کوئی رقم وصول نہیں کر لیتی۔

”بھائی جان! مجھے باگ پکڑائی کیا ملے گی۔“ بانو اٹھلا کر پوچھتی۔ سلیم نفی میں سر ہلا دیتا۔ ”ہوں“ وہ لاڈ سے کہتی۔ ”انگوٹھی لوں گی بھیا۔ چوکور نگ والی۔ ابھی سے بنوا لیجئے گا۔ چھوڑوں گی نہیں۔ آپ نے نہ دی تو بھابی کی اتروا لوں گی۔ پھر نہ کہیئے گا۔“

”چل بڑی آئی بھابی کی انگوٹھی اتروانے والی۔“ بی بی پیار سے کہتیں۔

”بھائی جان جو ہامی نہیں بھرتے۔“

”ایسی تھڑدلی کیا ہوئی۔ کچھ نہ کچھ تو دے کر ہی خلاصی کروائے گا۔“

”چلے دو روپے دے دوں گا۔“ سلیم ہنس کر کہتا۔

”ہوں“ وہ پیار سے اترا کر کہتی۔ ”میں کوئی نائن تو نہیں جو دو روپے لے کر ٹل جاؤں گی........“

”اچھا پانچ سہی۔“

”نہیں جی انگوٹھی۔ پانچ کی بنے یا دس کی۔ مجھے پتہ نہیں میں تو انگوٹھی لوں گی۔ جیسی سلو ترے کے

http://www.rehanahmed.com

پاس ہے۔ اس کے بھائی نے اسے بنوا کر دی تھی۔ "

" ساوتری تو سیٹھ دھنی رام کی پتری ہے۔ تمہارا بھائی اتنا امیر تو نہیں۔ " وہ جان بوجھ کر چھیڑتا ہے۔ انگوٹھی انگوٹھی کرتے اپنے کام میں مشغول ہو جاتی اور سلیم بانو کی اس وقت کی خوشی کا اندازہ کرنے لگتا۔ جب انگوٹھی کی جگہ خوب صورت کنگن ملیں گے۔

بس بھائی کی خوب صورت چھلوں اور چھیڑ چھاڑ کے درمیان شادی کی تیاری ہونے لگی۔

ان دنوں کی بات ہے جب بر صغیر کی آزادی و تقسیم ناگزیر ہو چکی تھی۔ مسلم قوم حرم کی پاسبانی کے لئے لیگ کے ہلالی پرچم تلے جمع ہو چکی تھی۔ اور خیبر سے چاٹگام اور کشمیر سے راس کماری تک ایک ہی نعرہ گونج رہا "لے کے رہیں پاکستان" یہ صرف ایک نعرہ ہی نہیں تھا۔ ایک قوم کا عزم جہاد تھا۔ اس قوم نے اپنے وجود کا سراغ پالیا تھا اور ایک صدی کی غلامی کے بعد وہ زنجیریں جھٹک کر اتار پھینکنے کو تیار ہو گئی تھی۔ جو اسے پہنائی گئی تھیں۔ اور ملت کا پاسبان وہ نحیف سا انسان جسے اقبال کی چشم بینا نے پرکھ رکھا تھا۔ مرد آہن بن کر قوم کو بھنور سے نکال لے جا رہا تھا۔ یہ مرد آہن محمد علی جناح تھا۔

آزادی کی جدوجہد تو تقریباً ایک صدی پیشتر ہی جنم لے چکی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہندوستانیوں نے اپنے وجود کا ثبوت دیا تھا۔ پھر سراج الدولہ اور ٹیپو شہید نے آزادی کی قندیلیں روشن کی تھی۔

ہندوستان میں اس وقت دو بڑی سیاسی جماعتیں تھیں۔ کانگریس اور مسلم لیگ۔ کانگرس اپنے آپ کو ہندوستان کی سب جماعتوں کا نمائندہ کہتی تھی۔ ہندو مسلم بھائی بھائی کا نعرہ زور شور سے لگا رہی تھی۔ مسلمان اس نعرے کی کشش سے کھنچے چلے گئے۔ ہندو مہاتما کا ذہن اس قوم کو ورغلانے کے لئے مسلسل کام کرتا رہا۔

لیکن جب مسلمانان ہند پر اس خالص ہندو جماعت کے اغراض و مقاصد واضح ہوئے تو مہاتما کی بغل میں چھپی چھری دیکھ لی گئی جو ان کی بقا کی گردن پر پھیرنے کے لئے تیز کی جا رہی تھی۔ تو مسلم قوم کو ہوش آ گیا۔ ملت کے چند افراد اب بھی کانگریس کے ساتھ تھے۔ لیکن اکثریت مسلم لیگ کے ہلالی پرچم تلے جمع ہو چکی تھی۔

ہندوستان میں برہمو راج قائم تھا لیکن 712 میں اس سرزمین پر اک نئی قوم نے قدم رکھا — یہ قوم عرب کے صحراؤں سے اٹھی تھی — اور اپنی مظلوم بہنوں کی فریاد پر پہاڑوں کے سینے چیرتی ہوئی دریاؤں کو کاٹتی ہندوستان کے ساحل پر آ اتری — بہنوں کی فریاد پر ان کا بھائی محمد بن قاسم اس دیس پر آ پہنچا تھا — جس میں برہمو راج قائم تھا — اور جس ملک کے اصلی باسی اچھوت بنا دیئے گئے تھے — ان کی زندگی موت سے بدتر بنا دی

گئی تھی —

ہندوؤں کی مسلمانوں سے دشمنی نئی نہیں — یہ تو ہندو کے دل میں اس وقت ہی پیدا ہو گئی تھی — جس وقت اس بت کدے میں محمد بن قاسم کی اذان گونجی تھی — اور رسول عربی کے شیدائیوں نے نہتوں اور بے یار و مددگاروں کے لئے سینہ سپر ہو کر ان لٹیروں کا مقابلہ کیا تھا — جو اس ملک کے اصلی باسیوں کو اچھوت بنا کر ان کا عرصہ حیات تنگ کرنے کو یہاں کے مالک بن بیٹھے تھے —

مسلمانوں نے تقریباً ایک ہزار سال تک ہندوستان پر حکومت کی — ہندو کی مسلم دشمنی کا سلسلہ ابتداہی سے چلا آتا ہے — راجہ داہر کی لوٹ مار سے لے کر آج تک ہندو اور مسلمان کے درمیان جمد علی البقاء کی ایک مسلسل مسلح اور غیر مسلح جنگ متواتر قائم ہے — یہ جنگ کبھی پانی پت "تھانیسر اور کرنال کے میدانوں میں صف آرا ہوئی — کبھی بمبئی "کلکتہ" دہلی "لاہور اور پشاور کے بازار میدان جنگ بن گئے — کبھی مسلمان فاتح اور ہندو مفتوح اور کبھی ہندو کی سیاست کامیاب اور مسلمان مغلوب ہوئے —

ہندو قوم نے جب بھی اس سرکش قوم سے ٹکرلی منہ کی کھائی — کبھی محمود غزنوی کے سامنے دوزانو ہوئی تو کبھی محمد غوری کے — صدیوں کے اس تصادم سے ظاہر ہو گیا — کہ یہ قوم تلوار سے دام میں آنے کی نہیں — تو ہندو ذہنیت نے چولا بدلا — گاندھی نے ملی بھگت کا لبادہ اوڑھا — مسلمانوں کے خاتمے پر انگریز ہندوستان کے سفید و سیاہ کا مالک بنا — مسلمانوں کا شیرازہ بیا بکھرا تھا — جنگ آزادی میں بہت جوش و خروش دکھانے کے بعد اب ان پر افراتفری کا سا عالم تھا — ہندو کے ریاکار ذہن نے اس موقعے سے فائدہ اٹھایا — اور اپنے سفید فام آقاؤں کے قدموں میں جھک کر انہیں اپنی وفاداری کا یقین دلایا — انگریز کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا — اپنی پرانی دشمنی کی سنگین انگریز کے کندھے پر رکھ کر مسلمانوں کے دل و جگر کی چھیدنا شروع کر دیا —

1885ء میں انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد رکھی گئی — سر ہیوم اس کا انگریز سربراہ تھا — اس جماعت کا قیام انگریزوں کی وفاداری پر قائم ہوا تھا — چونکہ اس کا سربراہ انگریز تھا — اس لئے عام طور پر انگریزی دان طبقے نے ہی اس میں شمولیت کی — مسلمان تعلیم میں ہندو سے پیچھے تھا — اس لئے زیادہ تر ہندوؤں نے ہی اس جماعت شمولیت کر کے انگریز کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا — کچھ مسلمان بھی اس میں شریک ہوئے —

کانگریس کا اجلاس ہر سال باقاعدگی سے ہوتا — اس میں انگریزی کے گن گائے جاتے — لیکن رفتہ رفتہ اس جماعت نے کچھ مطالبات کی فہرست تیار کر لی — یہ مطالبات ہر سال دہرائے جانے لگے — ایک مطالبہ یہ تھا — کہ ہندوستان میں نیابتی نظام رائج کیا جائے — یعنی برطانوی پارلیمنٹ کے نمونے پر یہاں پر بھی پارلیمنٹ بنائی جائے —

دوسرا مطالبہ یہ تھا — کہ سرکاری دفاتر میں برطانوی افسروں کو کم کر کے اہل ملک کو جگہ دی جائے — اور

مطالبہ یہ تھا — کہ بڑے بڑے سرکاری عہدوں کو مقابلے کے امتحان کے ذریعہ پر کیا جائے —
یہ مطالبات بظاہر معقول تھے لیکن ہندو ذہنیت بہت دور کی سوچ رہی تھی — چونکہ ان کی اکثریت تھی — اسی طرح مسلمانوں پر چھا جانے کا ہر موقعہ انہیں میسر آ سکتا تھا —

سرسید نے ہندو کے ان عزائم کو بھانپا اور مسلمانوں کو کانگریس کی شمولیت سے روکا — اور انہیں تعلیم سے آراستہ ہو کر اپنے اخلاق اور کردار کو سنوارنے کی ترغیب دی — مسلمانوں کو بحیثیت قوم اپنا آپ پہچاننے کا موقع دیا —

مسلمانوں نے اپنا آپ پہچاننے کی کوشش کے باوجود رواداری کا دامن نہیں چھوڑا — ہندوؤں سے بہ حیثیت قوم اتحاد کی ہمیشہ کوشش کی — لیکن ہندوؤں کی مسلم کش سازشوں نے ہمیشہ ان کوششوں کا منہ چڑایا —
سرسید اور نواب سلیم اللہ کی اتحاد کی کوششیں ناکام ہوئیں — سر آغا خاں اور امیر علی کی کوشش اتحاد و بنگال ہندوؤں کے ہاتھوں ناکامی سے دوچار ہوئی — 1913ء کے مسلم لیگ کے اجلاس لکھنو میں علی برادران نے رواداری کا یہاں تک ثبوت دیا — کہ ذبیحہ گاؤ کا حق ترک کر دیا — 1924ء میں علی برادران کی کوشش پنڈت موتی لال نہرو کے ہاتھوں ناکام ہوئی —

1905ء میں محمد علی جناح نے کانگریس پارٹی میں شمولیت کی — 1913ء میں کانگریس نے انہیں ایک وفد کی شکل میں لندن بھیجا — وہاں آپ نے مسلم لیگ سے بھی وابستگی کی — کانگریس نے عدم تعاون کی راہ اختیار کی تو جناح اس سے علیحدہ ہو گئے — 1921ء میں وہ پھر سیاست کے میدان میں آئے — لیکن دلی کوششوں کے باوجود دونوں قوموں میں اتحاد نہ ہو سکا — وہ کانگریس کی ہٹ دھرمی سے مایوس ہو گئے — 1928ء میں جب ایک نام نہاد کنونشن نے نہرو رپورٹ کی تصدیق کر دی تو وہ دل برداشتہ ہو کر سیاست سے الگ ہو گئے —

1930ء میں الہ آباد میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا — مسلم لیگ کا قیام 1906ء میں عمل میں آیا تھا — الہ آباد کے اس جلسے کی صدارت مفکر اعظم، شاعر ملت علامہ اقبال نے فرمائی — اور اپنے خطبہ صدارت میں انہوں نے مسلم قوم کو ہندو کے جارحانہ عزائم اور انگریز کے شاطرانہ مقاصد کو بڑی جرات اور بےباکی سے بے نقاب کیا — اور اپنی قوم کو اکثریت کے دباؤ اور مظالم سے بچنے کا ایک حل پیش کیا — وہ حل نظریہ پاکستان تھا یعنی ہندوستان میں مسلم اکثریت کے علاقوں کو ملا کر آزاد اسلامی ریاست قائم کی جائے —
اقبال کی فکر نے 1937ء میں عمل کی راہ پائی — مفکر اعظم نے بھنور میں پھنسی قوم کی کشتی کی پتوار اک بظاہر دھان پان مگر جو اصل میں مرد آہن تھا — تھما دی — یہ مرد مومن محمد علی جناح تھا جو بیک وقت انگریزی سامراج اور ہندو اکثریت سے ٹکرایا — یہ وہ قائد تھا جس کا قول تھا — کہ کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے ایک ہزار مرتبہ سوچو —

اور غور کرو — کوئی فیصلہ ہو جائے تو اس پر سیسہ پلائی دیوار کی طرح ڈٹ جاؤ — وہ دو مخالف طاقتوں کے سیسہ پلائی دیوار کی طرح ڈٹ گیا — مسلم قوم نے اپنے محبوب قائد کی آواز پر لبیک کہی — کیوں کہ 1935ء کے قانون کے مطابق جب چھ صوبوں میں کانگریس راج قائم ہوا تھا — تو ہندو کی مسلم کش پالیسی چکی تھی — مسلمانوں پر بحیثیت قوم عرصہ حیات تنگ ہونے لگا تھا — اردو کی جگہ ہندی نے لے لی تھی — خدائے قدوس کے سامنے جھکنے والے سروں کو مہاتما گاندھی کی مورتی کے سامنے جھکنے پر مجبور کیا جانے لگا فرزندان توحید پر ودیا مندر جیسی سکیم کو ٹھونسا گیا تھا — ملت کی بیٹیوں کے تعلیمی نصاب میں دیوداسیوں کے شامل ہوئے تھے — باری تعالیٰ کی حمد و ثنا اور رسول عربی کی نعت خوانی کرنے والوں کو بندے ماترم سکھایا جا تھا —

جہاں تک ہندو قوم کی تہذیب، ادب اور کلچر کا تعلق تھا — اسے حق تھا — کہ وہ سنسکرت اور ویدانتی تہ احیاء کرے — لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا — کہ وہ مسلمانوں کو اپنے طرز فکر کی مانند ڈھالنے کی کو کرے —

مسلمانوں کی آنکھ کھل گئی — گو گھر کے بھیدی کئی ملت فروشوں کانگریس میں شامل ہے اور مہاتمائی انہیں اپنے مقاصد کے لئے آلہ کار بناتا رہا — تاہم مسلمانوں کی اکثریت ہلالی پرچم تلے جمع ہو چکی تھی —

1939ء میں جنگ عظیم شروع ہوئی — تو انگریزوں کو اپنی بقاء اور سالمیت کے لئے قربانی کے بکروں ضرورت پڑی — انگریز کی نازک حالت کا اندازہ کر کے کانگرس نے آزادی کا مطالبہ کرتے ہوئے زور دیا کہ حکومت کانگریس کے حوالے کر دی جائے — لیکن انگریز مسلمانوں کو نظر انداز نہ کر سکا — اس لئے قربانی کے بکرے اسے مسلمانوں جیسی غریب قوم سے بڑی آسانی سے دست یاب ہو سکتے تھے ÷ چنانچہ اپنا پورا نہ ہوتے دیکھ کر کانگرسی وزارتوں نے استعفاء دے دیا —

مسلم لیگ نے اس دن یوم نجات منایا — اور پھر مارچ 1940ء میں لاہور میں مسلم قوم نے اپنے محبوب لیڈر کی قیادت میں ایک الگ اسلامی ریاست کا مطالبہ پیش کر دیا — شرق تا غرب اور شمال سے جنوب پورے میں "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ" اور "ملت کا پاسبان ہے محمد علی جناح" کے ولولہ انگیز نغمے گونجنے لگے مسلمانوں کا یہ اتحاد کانگریس کے کلیجے میں تیر کی طرح لگا — ہندو کا صدیوں کا بنایا ہوا منصوبہ درہم برہم گیا — مہاتمائی ذہن اس بیدار ہوتی قوم کو پھر سے گہری نیند سلانے کی سوچنے لگا — لیکن سویا ہوا شیر بیدار ہو تھا — وہ اٹھا اور اک آن سے اٹھا — جس قوم سے اقبال کو گلہ تھا — کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں — اس کا جوش و ولولہ دیکھ کر حیرانی ہوتی تھی — کہ ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی — شا بچے پرواز کو پر تولنے لگے — اور دل مرد مومن میں پھر زندہ ہو گئی۔

وہ بجلی کہ جو تھی نعرۂ لاتذر میں

... ان کے لئے برتر از اندیشہ سود و زیاں بن گئی تھی —

... نے شور مچایا — نہرو چیخا — ہندو ذہنیت نے آخری پانسا پھینکا — مسلم قوم کا گلا اپنوں کے ہاتھوں ... وہ ملت فروش اور غاصب جو کانگرسی ہتھکنڈوں میں آئے ہوئے تھے — مسلمانوں کو بہکاتے کے ... گئے —

... جاتی ہے — مسلم قوم کو ہمیشہ اپنوں ہی نے لوٹا ہے — میر جعفر اور صادق جیسے لوگ تباہی کا باعث بنے ... ہندو اس نقطے سے آگاہ تھا — وہ جس قوم کو بزور شمشیر مغلوب نہ کر سکا تھا — ایک قومی نظریئے کا قائل ... تھا — ان غداروں ہی کے ہاتھوں تباہ کروانے کے در پے ہوا — اس نے کرائے کے وہ عالم دین اکٹھے ... وہ ایک ہاتھ میں قرآن تھام کر قوم کو دیدہ دلیری سے بتاتے تھے — کہ تم اور ہندو ایک ہی ماں کے بیٹے ... الگ ملک بناؤ گے تو تباہ ہو جاؤ گے — تمہاری داستان مٹ جائے گی — تم برباد ہو جاؤ گے — لیکن اپنے ... لئے ڈٹ جانے والوں نے ان سب فریبوں کے طلسماتی جال توڑ دیئے —

... عظیم جاری تھی — انگریزوں کی جان پر بنی تھی — وہ ایک طرف روس اور جرمنی سے نپٹ رہے ... دوسری طرف جاپان برما تک آپہنچا تھا — اس جانکنی کے عالم میں کانگرس نے شدت سے مطالبہ کیا — ... مت ہمارے حوالے کر دو —

انگریزوں نے کرپس مشن کے ذریعے جنگ کے بعد برصغیر کو آزادی دینے کی حامی بھرلی — اور 1945ء ... کے خاتمہ پر لارڈ ویول نے کانگریس اور مسلم لیگ کے اتحاد سے حکومت بنانے کی کوشش کی — لیکن ... کی ہٹ دھرمی تھی — وہ اب بھی بضد تھی — کہ وہی ہندوستان کے سب مذہبوں، فرقوں اور جماعتوں ... جماعت ہے یہ کوشش ناکام ہوئی —

... کانفرنس تھی — اس کا ایک فائدہ مسلمانوں کو یہ ہوا — کہ انہیں اپنا الگ وجود منوانا پڑا — اور اس ... الیکشن ضروری ہو گیا —

... 1946ء میں مسلم لیگ نے پاکستان کے نام پر اور کانگریس نے ہندو کی وحدت کے نام پر الیکشن ... مسلم لیگ نے شاندار کامیابی حاصل کی — کانگریس کی کامیابی کے لئے ہندو مہا سبھا اور ہر ہندو تحریک ... چڑھ کر حصہ لیا — ہندو خواہ مہا سبھائی تھا خواہ شدھی سنگھٹن — کانگریس کو کامیاب کرنے کے ... اسی لئے زور لگا رہا تھا کہ وہ جانتا تھا — کانگریس کی جیت ہندو کی جیت ہے — برہمو سوراجیہ کا جو خواب ... رہا ہے — وہ اسی طرح پورا ہو سکتا ہے — اسی طرح وہ مسلمان قوم سے دس صدیوں کی غلامی کا بدلہ لے ...

http://www.rehanahmed.com

لیکن مسلم لیگ نے مرکز کی تیس کی تیس نشستیں جیت کر ثابت کر دیا ــ کہ مسلم قوم کا اپنا الگ وجود ہے
اور بقول قائد اعظم "ہم دس کروڑ تعداد کی ایک مستقل قوم ہیں اور یہ تعداد ایک ایسی قوم ہے ــ جس کی تہذیب، زبان ــ ادب ــ صنعت و ساخت ــ اسم و تعریف ــ قانون و ضابطہ ــ تاریخ و روایت رغبت و خواہش ــ مصرح و مشراح طور پر ہندوستان کی دیگر اقوام سے مختلف ہیں ــ"

گاندھی کے اس اعلان کو کہ تاریخ میں کوئی مثال دستیاب نہیں ــ کہ جو لوگ اپنا مذہب تبدیل کر لیں وہ اور ان کی اولاد، آباؤ اجداد سے علیحدہ قوم بن جاتی ہے ــ" قائد اعظم کے اس جواب نے کاٹ کر رکھ دیا تھا ــ

گاندھی اسی نقطے کو لئے چیختا رہا ــ کہ تبدیلی مذہب سے تبدیلی قوم نہیں ہوتی ــ لیکن اب مسلمان جان چکے تھے ــ کہ صریحاً مکر ہے، فریب ہے ــ کون نہیں جانتا ــ کہ یہودی اور عیسائی ایک ہی نسل، ایک ہی خاندان سے ہونے کے باوجود محض تبدیلی مذہب کی بناء پر دو قومیں بن گئیں ــ اسلام ظہور میں آیا ــ تو اپنے آپ کو بت پرست آباؤ اجداد سے علیحدہ کر لیا ــ وہ ساکنین مکہ سے ایک الگ قوم بن گئی ــ

ہندوستان کے مسلمان اپنے فیصلے پر چٹان کی طرح ڈٹ گئے تھے ــ انگریزی سامراج آخری ہچکیاں لے رہا تھا ــ اس کی فوجی طاقت جنگ کی وجہ سے کمزور ہو چکی تھی ــ اس کے افسر بددل ہو چکے تھے ــ ایسی صورت میں ہندوستان کو آزادی دینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تھا اور برصغیر کو تقسیم نہ کرنا بھی ناگزیر نظر آتا تھا ــ دس کروڑ کی ایک ایسی جماعت جو اپنے اصول پر مرمٹنے اور اپنے مقصد کو ہر قیمت پر حاصل کرنے کا عزم کر چکی تھی انگریز نظر انداز نہ کر سکا ــ ہندو کی مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش ناکام ہو چکی تھی ــ اپنوں سے فریب دینے کا حیلہ بھی کارگر نہ تھا ــ فسادات اور بے دریغ قتل و غارت سے مسلمانوں کو ان کے عزم سے لرزا دینے کا حیلہ بھی کام نہ آیا ــ بہار اور بنگال میں فسادات کے شعلے بے طرح بھڑک اٹھے ــ لیکن مسلم قوم کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی ــ نگاہ مرد مومن تقدیریں بدل دینے کا تہیہ کر چکی تھی ــ

چنانچہ 3 جون 1947ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے آزادی کا ریڈیو پر اعلان کیا ــ اور پھر 14 اگست 1947ء کو دنیا کے نقشے پر ایک نیا ملک ابھرا ــ یہ نیا ملک پاکستان تھا ــ

دونوں ملکوں کی حد بندی کے لئے ریڈ کلف کو ہندوستان بھیجا گیا ــ ہندو بربریت جوش غیض و غضب سے آگ برسانے لگی ــ قدم بوسی کی دیرینہ عادت نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور پھر ریڈ کلف کو اپنی کشتی میں سوار کر لیا ــ مسلمانوں سے انتقام لینے کی آگ ہندو نے انگریز کے رویئے سے بجھانے کے سب حیلے کئے ــ

اور سب جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے ان بدترین دشمنوں ہندوؤں اور انگریزوں نے مسلم قوم سے کس طرح بدلا لیا ــ ہندو محمد بن قاسم اور محمود غزنوی کی ضربوں کا بدلہ لے رہا تھا ــ اور انگریز صلاح الدین ایوبی

معرکوں کا انتقام لے رہا تھا —

دونوں ملکوں کی حد بندی کے دو کمیشن مقرر ہوئے — ان کا مشترکہ صدر ریڈ کلف تھا — حد بندی کا آخری فیصلہ ان کی ذاتی رائے پر تھا — یہ اس درندے کی کمینگی اور سفلہ پن تھا جو اس نے حد بندی قلم سے نہیں آگ اور خون سے کی — مسلمانوں کے اس ازلی دشمن نے مسلمانوں کی اکثریت کے علاقے بھی ہندوستان میں شامل کر دیئے — گورداسپور اور جالندھر کے بعض علاقے مسلم اکثریت کے علاقے تھے — اور دانستہ وہ حصہ بھی ہندوستان میں شامل کر دیا — جو کشمیر تک جانے کے لئے ہندوستان کو راستے کا کام دیتا تھا —

ہندو کینہ پرور تھا — اس نے ہر طرف سے ناکامی کا منہ دیکھتے ہی اکالی دل اور جن سنگھ اور راشٹریہ سیوک سنگھ اپنی تنظیمیں بنائی تھیں — ان کے مندر اور گوردوارے اسلحہ سے بھرنے لگے تھے — مسلمان رواداری ہی میں مارا گیا —

http://www.rehanahmed.com

حسن لدھیانہ ریلوے اسٹیشن سے باہر نکلا تانگے والے لپک کر آئے "نہیں بابا جی نہیں۔ مجھے تانگہ وانگہ نہیں چاہیے مجھے کچھ زیادہ دور نہیں جانا" حسن تانگے والوں کو مسکرا مسکرا کر جواب دیتا آگے بڑھ گیا ایک تانگے والے نے تو زبردستی اس کا بیگ اٹھا لیا۔ چھوٹا سا بیگ۔ جس میں ایک سوٹ ایک پاجامہ قمیص شیو کا سامان اور گھر پہننے کے چپل تھے۔ تانگے والا سواری کیلئے بضد تھا لیکن حسن پیدل جانا چاہتا تھا۔ اس کا گھر کچھ دور بھی تو نہیں تھا۔

ثریا کی شادی کا اسے بلاوہ ملا تھا ثریا جو ثریا خالہ بھی تھی اور ثریا بہن بھی دونوں کی بچپن ہی سے بڑی گوٹ تھی اب تک بہن بھائیوں کا سا پیار تھا کسی اور کی شادی ہوتی تو شاید حسن آنے سے انکار کر دیتا۔ ایک تو اس کا یہ آخری سال تھا لگ لپٹ کر محنت کرنے کی ضرورت تھی دوسرا الیکشن قریب آ رہے تھے۔ مسلم قوم کی موت اور زیست کا معرکہ پڑنے والا تھا۔ حسن تحریک پاکستان کا زبردست اور فعال رکن تھا ویسے بھی طالب علم اس تحریک کی ریڑھ کی ہڈی تھے جوان خون نے اس تحریک کو جوش اور ولولہ بخشا تھا۔ طالب علم اپنی تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ملک کے کونے کونے مسلم لیگ کا پیغام پہنچا رہے تھے۔ وقت کم تھا اور کام زیادہ اسی لئے حسن ثریا کی شادی پر صرف تین دن کی رخصت لے کر آیا حالانکہ اماں نے کم از کم دس پندرہ دن کی چھٹی لے کر آنے کی تاکید کی تھی۔

حسن پیدل ہی چلتا گھر جانے والی سڑک پر ہو لیا اپنی گلی سے وہ ابھی دور ہی تھا کہ ڈھولک کی آواز اس کے کانوں میں پڑی اسے ثریا کا خیال آ گیا اسے خوب خوب چھیڑنے کے پروگرام بناتا وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگا گلی کے موڑ پر ہی اسے فہیم مل گیا۔

"اسلام علیکم" حسن گرمجوشی سے کہتے ہوئے آگے بڑھا بچپن کے دونوں دوست ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے فہیم بھی حسن کو دیکھ کر خوشی سے بے اختیار سا ہو گیا تھا

"کہو کیسے ہو"

"قرا چی کہو"

"ٹھیک ٹھاک ہونا"

"بالکل بالکل۔ سناؤ"

دونوں ایک دوسرے کا دستی مصافحے کے بعد بھی پکڑے جواب نے بغیر اپنا اپنا سوال داغ رہے تھے دونوں ایک دوسرے سے مل کر بے حد خوش ہو رہے تھے "آؤ اندر چل کر بیٹھیں" فہیم نے اس کو بازو سے پکڑ کر گھر کی طرف کھینچا گلی کے نکڑ پر ہی تو ان کا مکان تھا۔

"نہیں یار" حسن نے کہا "پہلے گھر جاؤں گا"

"چلے جانا۔ ذرا دم تو لے لے"

"نہیں بھئی اندر چلا گیا تو دو گھنٹے بھی وہاں سے مل نہ سکوں گا خوب لوگ آئے ہوئے ہیں نا"

"ہاں تقریباً" سبھی آ چکے ہیں"

"پھر تو خوب رونق ہو گی"

"ہے تو۔" فہیم ہنس کر بولا "رونق ہی رونق ہے"

"اچھا" حسن نے قہقہہ لگایا "لگتا ہے تمہاری پٹیالے والی خالہ بھی آ چکی ہیں"

"خوب سمجھے" فہیم ہنس دیا پٹیالے والی خالہ راحت کی چھوٹی بیٹی نصیر واسے بچپن ہی سے پسند تھی حسن اس کا راز بہت جانتا تھا دونوں دوست چند لمحے مسکرا مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر حسن اس سے گھر والوں کی خیریت پوچھتا رہا۔

"تمہاری سرگرمیوں کا کیا حال ہے" فہیم نے پوچھا

"اللہ کے فضل سے عروج پر ہیں" حسن نے کہا

"بڑا جوش و خروش ہے مسلمانوں میں انشاء اللہ یہی حالت رہی تو ہم بہت جلد میدان مار لیں گے"

"انشاء اللہ" انشاء اللہ حسن نے کہا "یار آرام سے باتیں کریں گے مجھے ان کپڑوں میں سخت کوفت ہو رہی ہے گھر جا کر مل بھی آؤں اور کپڑے بھی بدل لوں پھر آ کر آرام سے باتیں کریں گے"

"اچھا بھئی!"

"آؤ تم بھی"

"مجھے ذرا بازار جانا ہے بی بی نے دو تین چیزیں منگوائی ہیں"

"کب تک آ جاؤ گے؟"

"گھنٹہ بھر بعد"

"بس ٹھیک ہے میں بھی آجاؤں گا پھر آرام سے باتیں ہوں گی"

حسن ہاتھ ہلاتا ہوا آگے بڑھا کئی بچے اس کے گرد جمع ہو گئے "حسن بھائی آگئے حسن بھائی آگئے۔

"راستہ تو دو بھئی" حسن انہیں ایک طرف دھکیلتے ہوئے بولا سکینہ ممانی کی بڑی لڑکی تو اس کی آمد کی خبر گھر پہنچانے کو دوڑی گئی تھی۔

مندر سنگھ اسے راستے ہی میں مل گیا پچند منٹ وہ اس کی خاطر رکا علیک سلیک ہوئی احوال پرسی بھی ہوئی مندر سنگھ حسن کو اشیرباد دے کر آگے بڑھ گیا

گھر مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ رحیم ماموں معہ اہل و عیال آگئے تھے۔ اماں کی خالائیں پھوپھیاں اور ممانیاں بھی جمع تھیں۔ صبح بارات تھی سارے مہمان پہنچ چکے تھے تنگ جگہ کے باوجود ہر کوئی خوش نظر آتا تھا شادی بیاہ کے موقع پر ہی تو بچھڑوں کا ملاپ ہوتا تھا لاہور سے صفیہ خالہ بھی آئی تھیں ان کی صاحب زادیاں مع بچوں کے پہنچی تھیں گھر میں اس وقت زیادہ عورتیں اور بچے ہی تھے مرد اور نوجوان لڑکے لالہ گوپی ناتھ کے کھلے صحن میں جمع تھے برات کو یہاں بٹھانے کا انتظام تھا ابھی آرائش میں مصروف تھے سارا صحن رنگ برنگی جھنڈیوں سے بوقلموں بنا تھا دروازے پر کیلے کے پتوں سے آرائشی محرابیں سی بنائی جا رہی تھیں۔ گلی کے ہندو اور سکھ نوجوان بھی کام میں پیش پیش تھے محلے کی بیٹی سب کی بیٹی تھی تعصب اور دشمنی کی فضا ابھی ایسے عوام تک نہ پہنچی تھی ابھی انسان مرا نہیں تھا۔

حسن گھر میں داخل ہوا کسی کو سلام کرتا کسی کے سر پر چپت لگاتا کسی سے جھک کر دعائیں لیتا صحن میں آگیا اماں صفیہ خالہ کی صاحب زادی کیلئے کھانا نکلوانے آئی تھیں حسن کو دیکھتے ہی لپک کر آئیں۔

"اتنی دیر سے آئے بیٹا" حسن نے سر جھکا کر ماں کو سلام کیا اماں نے اسے لپٹا کر پیار کیا اور ڈھیروں دعائیں دینے کے بعد دیر سے پہنچنے کی شکایت کی حسن مسکرا دیا

"چھٹی کتنی ملی ہے؟" اماں نے بے صبری سے پوچھا

"صرف تین دن کی"

"کیوں؟"

"بہت کام ہے اماں"

کام کی وضاحت کرنے سے پہلے ہی سلطانہ ممانی اٹھ کر آگئی حسن نے سلام کیا اس نے دعا دی اور بھی عورتیں اس کے گرد آکھڑی ہوئیں۔

"ثریا نظر نہیں آئی"

"لو اب وہ لوگوں میں گھومتی پھرے" سلو ممانی نے ہنس کر کہا "صبح شادی ہے مایوں بیٹھی ہے وہ تو"

"وہ کہاں"
"اوپر سامنے والے کمرے میں"
"میں اس کے پاس جا سکتا ہوں"
"کیوں نہیں" سب ہنس پڑے"
"اماں" میں یہ بیگ کہاں رکھوں کپڑے تبدیل کرنا ہیں" اماں نے گریبان میں ہاتھ ڈال کر بنیان میں رکھا چابیوں کا گچھا نکال کر پیتل کی لمبی سی چابی حسن کو پکڑا دی "اوپر میرے کمرے میں چلا جا ثریا کا جہیز وہیں رکھا ہے جب باہر آنا تو دروازہ بند کر کے آنا"
"اچھا" کہہ کر وہ بیگ ہاتھ میں لئے سیڑھیوں کی طرف گیا کئی نئے چہرے ملے کئی آشنا صورتیں نظر آئیں بمشکل بچتا بچاتا وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا وہ اوپر کمرے میں جانے ہی والا تھا کہ ثریا کے کمرے سے قہقہوں کی آواز آئی
"میں اندر آ جاؤں" کہتے ہوئے وہ کمرے کے اندر چلا گیا ثریا کی سہیلیاں اسے گھیرے میں لئے بیٹھی تھیں۔
ہندو لڑکیاں بھی تھیں سکھ بھی دو عیسائی بھی تھیں مسلمان سہیلیاں بھی تھیں اور رشتہ دار بھی۔ سردی تھی وہ ان لڑکیوں سے کمرا بھرا ہونے کے باوجود فضا اچھی تھی ثریا کیسری دوپٹے میں لپٹی ہوئی پلنگ پر لڑکیوں سے گھری ہوئی تھی۔
"بھئی ہماری ثریا خالہ کہاں ہیں" حسن پلنگ کے قریب آ گیا دو تین پردہ دار لڑکیاں پلنگ کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئی تھیں ثریا نے جھکا ہوا سر اٹھایا حسن کو دیکھ کر فرط مسرت سے مسکرا دی۔
"بڑی خوش ہو شادی پر" حسن نے کہا "وعلیکم سلام بس خوشی سے باچھیں کھلی جا رہی ہیں" سب لڑکیاں ہنس پڑیں۔ ثریا نے شرما کر منہ گھٹنوں میں دے لیا۔
"توبہ توبہ آجکل کا زمانہ پہلے تو لڑکیاں شادی کے نام پر ہی رو رو کر ہلکان ہو جاتی تھیں" حسن نے مذاق سے کانوں کو چھوا" اور آجکل دانت نکال نکال کر ہنستی ہیں"
سب لڑکیاں قہقہے لگا رہی تھیں ثریا بیچاری شرم سے دوہری ہوتی گئی کچھ دیر اور ثریا کو ستانے کے بعد وہ اوپر اماں کے کمرے میں چلا گیا۔

کھانا کھانے کے بعد حسن عزیزوں رشتہ داروں سے بمشکل جان چھڑا کر نصیر الدین کے ہاں چل دیا نسیم سے گپ شپ لگانے کو جی چاہ رہا تھا بچپن کے ساتھیوں کی اک طویل عرصے کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔

بیٹھک مہمانوں سے کھچا کھچ بھری تھی سفید پگڑیوں والے بزرگ بھی تھے جو حقے کی گڑگڑاہٹ میں گرما گرم باتیں کر رہے تھے نوجوان لڑکے بھی تھے جو اپنے جوش اور ولولے کو دبائے ان کی باتیں سن رہے تھے کچھ عورتیں دروازے میں کھڑی تھیں دو چار معمر خواتین جو سیاست سے دلچسپی رکھتی تھیں بیٹھک کے صحن میں کھلنے والے دروازے کی اوٹ میں کھڑی گرما گرم بحث سن رہی تھیں۔

حسن بیٹھک میں جانے کی بجائے اندر صحن میں چلا گیا اسے پہلے بی بی کو سلام کرنا تھا کشادہ صحن بھی مہمانوں برتنوں اور کپڑوں کی وجہ سے تنگ تنگ نظر آ رہا تھا صحن میں دائیں ہاتھ باورچی خانہ تھا لیکن آج باورچی خانے سے باہر صحن کے ایک طرف اینٹوں کے چولہے بنے تھے جن پر بڑے بڑے تانبے کے قلعی شدہ دیگچوں میں کھانا پک رہا تھا۔ مرد کھانا کھا چکے تھے اب عورتوں کی باری تھی سامنے والے دو کمروں میں دستر خوان بچھے تھے خاندان کی لڑکیاں بالیاں کھانے کے برتن لگا رہی تھیں عورتیں اور بچے خاصہ شور مچا رہے تھے۔

چولہوں کے قریب رنگین پایوں والی پیڑھیاں تھیں جن پر خاندان کی عمر رسیدہ خواتین بیٹھی ہوئی تھیں باتوں کے ساتھ ساتھ کھانا بھی نکال رہی تھیں ایک پیڑھی پر بی بی بیٹھی ہوئی تھیں۔

اس نے کیسری دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ خاندانی دستور کے مطابق شگن کے طور پر اسے یہ دوپٹہ اوڑھایا گیا تھا ورنہ بی بی جیسی سنجیدہ مزاج عورت تو ایک عرصے سے سفید دوپٹے کی عادی تھی حسن صحن میں داخل ہوا تو مانوس چہرے اس کے گرد جمع ہو گئے کسی کو سلام کرتا کسی سے دعا لیتا وہ بی بی کی طرف بڑھا۔ سر قدرے جھکا کر اس نے بی بی اور اس کے پاس بیٹھی عورتوں کو سلام کیا بی بی اسے دیکھ کر خوش ہو گئیں پٹک سے اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

آ ۓ بیٹا خیریت سے تو ہے کتنے دن کی رخصت ملی" بی بی نے پیڑھی پر بیٹھتے ہوئے کئی سوال کر دیۓ پھر

ادھر دیکھا نائن برتن صاف کر رہی تھی بی بی بولیں "نے رکھو! ذرا کرسی تو اٹھا لا ادھر"

"نہیں اماں بیٹھک میں بیٹھوں گا کرسی نہ منگائیے

"نہیں بیٹھو بیٹا کھانا میں کھالو"

"کھانا کھا کر آ رہا ہوں"

"اچھا ۓ ہی پی لو شیر چاۓ بنی ہوئی ہے"

حسن مسکرا کر چپ ہو گیا بی بی ساتھ والی عورت سے کہنے لگی "آپ نے پہچانا اسے خالہ صغرا" خالہ صغرا اپنی

آنکھوں سے حسن کو دیکھ کر نفی میں سر ہلا کر بولیں "ٹھیک یاد نہیں پڑتا"

"وہ کا بیٹا حسن ہے" بی بی نے خالہ صغرا کے گھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہنس کر کہا

"وہ کا بیٹا۔ ماشاءاللہ۔ ماشاءاللہ لو اب میں کیسے پہچانوں بھلا" خالہ صغرا ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے

"اتنا سا تھا جب دیکھا تھا اب تو ماشاءاللہ جوان ہو گیا ہے" نائن کرسی گھسیٹ لائی

"ہاں اوسے کو ایک پیالہ شیر چاۓ کا دے دے" بی بی نے نائن سے کہا حسن کرسی کے پاس کھڑا کھڑا بی بی

کی خیر و عافیت پوچھنے لگا بیٹے کی شادی پر وہ بہت خوش نظر آ رہی تھیں

"بیگم مسلمان بھی ہوا یا نہیں" حسن نے ہنس کر بی بی سے کہا

"کر و یسے کا ویسا ہے" بی بی بھی ہنس دی۔

"ہاں خدانخواستہ وہ ہندو ہے کیا" خالہ صغرا نے منہ بنا کر کہا۔

"وہ خدا نہ کرے ہاں ہندوؤں کا دوست ضرور ہے کانگرسی ہے پکا" بی بی بولیں

"تو تم سارا خاندان لیگی ہو گی" خالہ صغرا نے پھر منہ کا زاویہ بدلا۔

"اللہ کے فضل سے" بی بی دسترخوان گھٹنے پر رکھتے ہوئے بولی۔

"پاکستان۔ خواب ہی لگتا ہے خالہ صغرا نے ہونٹ سکیڑے

"اس خواب کی بہت جلد تعبیر ہو گی خالہ اماں" حسن نے کہا

بانو چاۓ کا پیالہ لے کر آ گئی اس نے بھی کیسری دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا حسن کو سلام کر کے اس نے چاۓ کا

پیالہ پکڑا دیا "بڑی مزیدار چاۓ ہے حسن بھائی"

"شکریہ۔" حسن نے کہا "تم نے بنائی ہو گی۔"

"جی" بانو بولی۔ حسن نے چاۓ کا گھونٹ لیا بانو باورچی خانے کی طرف جانے لگی۔

"واللہ تمہیں لیا بانو" حسن نے پوچھا

"امی نے نہیں لینے دیا" بانو نے شکایت کی۔

"کیوں بی بی داخل کروا دیا ہوتا بانو کو" حسن نے کہا۔

"بس میٹرک تک کافی ہے تعلیم" سعیدہ سامنے والے چولہے کے پاس بیٹھے بولی کچھ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد حسن بیٹھک میں آ گیا اور بانو باورچی خانے میں چلی گئی۔ بیٹھک میں گرما گرم بحث ہو رہی تھی موضوع پاکستان تھا حسن کے بیٹھک میں داخل ہوتے ہی سلام دعا کے سلسلے میں چند لمحے گفتگو کی وہ سب کو سلام کر کے ایک صوفے پر نصیر الدین کے پاس بیٹھ گیا کچھ لڑکے بالے دری اور چھوٹے سے قالین پر بھی بیٹھے تھے جو کمرے کے درمیان میں بچھا تھا معمر اور بزرگ حضرات صوفے اور کرسیوں پر بیٹھے تھے دو حقے تھے جن کی نے کبھی ایک کے سامنے ہوتی کبھی دوسرے کے سامنے بحث کا معرکہ کانگریسیوں اور مسلم لیگیوں کے درمیان تھا سلیم کانگریسی تھا اس کی بٹھنڈہ والی پھوپھی کا بیٹا کامران بھی اس کا حامی تھا نصیر الدین، عزیز دار اور ڈاکٹر شعیب پکے مسلم لیگی اور نظریہ پاکستان کے زبردست مبلغ تھے فہیم بھی لیگی تھا ہر کوئی اپنا نظریہ منوانے پہ تلا ہوا تھا۔ بحث خاصی لڑائی کی صورت اختیار کر رہی تھی ان دنوں سب طرف یہی حال تھا حسن کچھ دیر خاموشی سے ان لوگوں کے دلائل سنتا رہا پاکستان کے حامیوں کی اکثریت تھی لیکن سلیم اور کامران ان سے برابر ٹکر لے رہے تھے جوش میں اٹھ کر کامران بولا۔

"پاکستان! پاکستان! میں پوچھتا ہوں پاکستان کا مطلب کیا ہے۔"

"لا الٰہ الا اللہ" حاضرین میں سے کسی نے کہا۔

"یہ نعرہ عوام کو بے وقوف بنا کر اپنا الو سیدھا کرنے کیلئے لیگی رہنماؤں نے لگایا ہے" کامران نے غصے سے لال ہو کر کہا۔

ڈاکٹر میر لیگی تھا اسے بھی تاؤ آ گیا۔ وہ کچھ کہنے کو تھا کہ حسن مفاہمت اور مصالحت کے انداز میں بولا "ایک منٹ ڈاکٹر صاحب میں کامران صاحب کے سوال کا جواب دیتا ہوں۔ آپ پاکستان کا مطلب پوچھ رہے ہیں نا کامران صاحب! میں آپ کو بتاتا ہوں۔

"فرمائیے" سلیم نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

"پاکستان ہماری ملی ہستی کے تحفظ کا میدان عمل ہے" حسن پروقار اور سنجیدہ آواز میں بولا لیگیوں نے حسن کو داد بھری نظروں سے دیکھا نصیر الدین اس جامع جواب پر سر ہلا کر مسکرائے پیچھے کھڑے فہیم نے داد کے طور پر اس کے کندھے کو تھپکا لیکن اس جواب سے کامران چمک کر بولا۔

"ایک ہزار سال سے مسلمان یہاں رہ رہے ہیں ملی ہستی کے تحفظ کے لئے میدان عمل کی اب ضرورت پڑی؟ اس کا خیال اب جناب کو آیا؟"

http://www.rehanahmed.com

"اب نہیں کامران بھائی...... مسلمان نصف صدی سے اس کے لئے کوشاں ہیں۔ ایک ہزار سال تک ہم نے یہاں حکمرانی کی ہے۔ غلامی کا تو یہی سو سال گزرا ہے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ اس دورِ غلامی میں ہم بحیثیت قوم اخلاقی، ثقافتی اور سیاسی شعور کھو چکے تھے۔ یہ ہمارے اوصاف تھے۔ جو ہندو نے اپنے میں پیدا کر لئے۔ اب یہ اوصاف اس کا قومی احساس بن چکے ہیں۔ وہ ہمیں محض اقلیت سمجھتے ہیں۔ کانگریس نے غیر فرقہ واری کا خول چڑھا رکھا ہے۔ لیکن اس کی سرشت اس کے افعال بلا شرکت غیرے ہندو ہیں"۔

"سب بکواس۔ عوام کو گمراہ کرنے کا ہتھیار ہے یہ"۔ کامران لال پیلا ہو کر بولا۔

"فتنہ و فساد بپا کرنے کا پروپیگنڈا ہے"۔ سلیم بولا۔ "سینکڑوں سال سے ہم ماں جائے بھائیوں کی طرح یہاں رہتے چلے آئے ہیں۔ ہم سب ہندوستانی ہیں"۔

"یہی تو المیہ ہے سلیم بھائی۔ کہ ہم ہندوستانی نہیں۔ مسلمان ہیں۔ صرف مسلمان۔ ہم ہندوؤں سے بالکل الگ قوم ہیں۔ ہمارا مذہب۔ ہماری زبان۔ ہمارا ادب۔ نام و نسب۔ شعورِ اقدار۔ قانون۔ اخلاق۔ رسم و رواج۔ تاریخ و روایت۔ رجحان و مقاصد۔ انفرادی زاویہ نگاہ اور فلسفہ حیات۔ سب ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ پاکستان وہ خطہ زمین ہو گا جہاں مسلم قوم ایک آزاد قوم بن کر اپنی روحانی اخلاقی تمدنی معاشرتی اور سیاسی زندگی کو کامل نشوونما بخش سکے گی"۔

"واقعی...... واقعی...... ایک بزرگ، حسن کی پُرزور تقریر سے متاثر ہو کر بولے۔ گفتگو ہلکی پھلکی جذباتی ڈگر سے ہٹ کر دلائل کی روشنی میں ہونے لگی تھی۔ اس لئے اصحاب کی اکثریت خاموشی سے باتیں سننے لگی۔

"چھوڑیئے جی...... ہم ایک ہزار سال سے یہاں رہتے چلے آئے ہیں"۔ کامران بولا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں" حسن نے اس کی بات اچک لی۔ "ہم ایک دوسرے سے ایک ہزار سال سے میل جول رکھتے چلے آئے ہیں۔ ہندوؤں کی تہذیب مسلمانوں کی تہذیب سے دوچار رہی ہے۔ لیکن یہ آپ کو ماننا پڑے گا۔ کہ دونوں کے اختلافات اپنی جگہ اسی شدت سے قائم ہیں"۔

"بالکل نہیں"۔ سلیم جوش میں آ کر بولا۔ "انھیں اختلافات اب بنایا جا رہا ہے"۔ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا۔ کہ نعیم بولا "آپ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ ہندو ازم اور اسلام صرف دو مذہب نہیں۔ در اصل دو مختلف معاشرتی نظام ہیں۔ دونوں کو ایک سمجھا جا ہی نہیں سکتا۔ ایک کے بنیادی اصول دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ متضاد و متصادم ہیں"۔

"بالکل...... بالکل...... " نصیر الدین بولے۔ "ایک مذہب دوسرے مذہب سے متصادم اور متضاد ہے۔ ایک کی دوسرے میں شادی نہیں ہو سکتی۔ ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھا نہیں سکتے۔ ایک قوم کے ہیرو دوسری قوم کے بدترین دشمن ہیں"۔

اسی لئے تو مسلمانوں کی ملی اور سیاسی ہستی کے لئے ایسے خطہ زمین کی ضرورت ہے جہاں وہ آزادانہ زندگی بسر کر سکیں۔ جہاں ہندو بھیڑیے ہمیں بھیڑیں سمجھ کر کھانے کو نہ دوڑیں۔ حسن جوش میں آ گیا۔ جہاں لا الہ کی حکومت ہو۔ جہاں خلفائے راشدین کا نظام حکومت ہو۔ جہاں عرب کے صحراؤں سے اٹھنے والی صدا کی بے روک ٹوک تکمیل ہو۔ جہاں رسول عربی کے شیدائی اس معاشرے کی تشکیل کر سکیں۔ جو آج سے چودہ سو سال قبل ان کا مقدر روشن کرنے کے لئے وضع کیا گیا تھا۔

"واقعی...... واقعی" ڈاکٹر میر بولا۔ "پاکستان وہ گوشہ عافیت ہے۔ جہاں ہم ہندو کے جار حانہ عزائم سے پناہ حاصل کر سکتے ہیں"۔

"سب ہندو ایک سے نہیں۔ مہاتما گاندھی"۔ سلیم کچھ کہنا چاہتا تھا کہ حسن نے جوش میں اس کی بات کاٹ لی۔ "رہنے دیں بھائی جان۔ ان مہاتما کی بات نہ کریں۔ یہ سب ڈھونگ ہے۔ مسلمانوں کو ورغلانے کا۔ ورنہ مہا بھائی۔ سناتن دھرمی آریہ سماجی تشدد پر ایمان رکھنے والا اور عدم تشدد کا پجاری سب ہندو ایک ہیں۔ مسلمانوں کے بدترین دشمن۔ خدا جانے آپ کب اس دھوکے اور فریب کو سمجھ سکیں گے۔ یہ مسلمان قوم کی بدقسمتی ہے کہ آپ جیسے لوگ بھی اس مہاتما کی مہاتمائی کے قائل ہو گئے۔ جن کے منہ میں رام رام اور بغل میں چھری ہے۔ جو سوچے سمجھے منصوبے کے ساتھ مسلمانوں کی شاہ رگ کاٹنے کی ہمت کر رہا ہے"۔

"آپ لوگ سخت متعصب ہیں"۔ کامران بولا۔ "مذہب کو جنون بنا لیا ہے۔ اور اس جنون کو اب ہوا دی جا رہی ہے۔ مذہب کو درمیان میں لانے کی ضرورت ہی کیا ہے"۔

"اس لئے کہ ہم پہلے مسلمان ہیں پھر کچھ اور"۔ ڈاکٹر میر نے جواب دیا۔

"یہ چند لیڈروں کا ذاتی مفاد کے لئے نعرہ ہے میر صاحب"۔ سلیم بولا۔ اور میں سمجھتا ہوں اس سے فرقہ وارانہ تعصب کو ہوا مل رہی ہے اور کیا ہو رہا ہے۔ آئے دن کہیں نہ کہیں فسادات ہو رہے ہیں۔ انسان انسان کا دشمن بن رہا ہے۔ اس سے حاصل کیا ہو گا۔

"ہم جانتے ہیں کہ مسلمانوں کو ان کے عزم سے ڈگمگانے کے لئے قتل و غارت کا سہارا لیا جا رہا ہے۔ اقلیت کے علاقوں میں مسلمانوں کی جان و مال ہر وقت خطرے میں ہے۔ لیکن ہم تشدد اور جارحیت کا مقابلہ کرنے کا عزم کر چکے ہیں۔ یہ عزم آج نہیں کیا گیا سو برسوں کی غلامی میں مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا رہا ہے۔ سرسید اور محمد علی جوہر نے مسلمانوں کو ان کا مقام یاد دلایا۔ اقبال نے امید اور عمل کے نئے افق روشن کئے اور قائداعظم نے ہندو اور انگریز کے دوہرے تسلط سے مسلم قوم کو آزاد کرانے کا بیڑہ اٹھایا ہے"۔

قائداعظم نے فرمایا تھا۔ "فہیم بولا ہم غیر ملکی حکمرانوں اور ذات پات کے دقیانوسی معاشرتی نظام کے دوہرے تسلط میں ہیں۔ یہ تسلط کچھ مدت اور رہا تو مسلمان انفرادی طور پر بحیثیت انسان اور اجتماعی طور پر بحیثیت قوم

سے ہندوستان سے معدوم ہو جائیں گے۔

"بالکل بجا فرمایا ہے انھوں نے" ۔ عزیز ڈار نے تائید کی اور شکر الحمد للہ قوم اس حقیقت کو سمجھ چکی ہے۔

"ہم بیدار ہو چکے ہیں" ۔ سعید نے کہا "اور جب کوئی قوم بیدار ہوتی ہے تو اس کے راہ کی رکاوٹیں خود بخود ہٹ جاتی ہیں۔

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

نصیر الدین نے قدرے ترنم سے اقبال کا شعر پڑھا۔

"قوم آج اپنے مقصد کے حصول کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ یہ قوم کچھ عرصے کے لئے غافل ضرور ہو گئی تھی۔ مردہ نہیں تھی۔ ہندو اسی بات سے تو بوکھلا گیا ہے" ۔ عزیز ڈار نے کہا۔

"انگریز ہمارا دشمن ہے۔ ہندو ہمارا حریف ہے" ۔ حسن کا چہرہ جوش جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔ "دونوں اس قوم کو کچلنے کے درپے ہیں۔ جس کے ذہن میں صلاح الدین ایوبی کے کارنامے ہیں۔ جس کی رگوں میں سراج الدولہ اور ٹیپو کا لہو ہے" ۔

"یہ ہندو اور انگریز دونوں کی بھول ہے" ۔ سعید نے کہا۔ "ہم پاکستان بنانے کا عزم کر چکے ہیں۔ پاکستان بن کے رہے گا" ۔

"دیوانے کا خواب ضرور پورا ہو گا" ۔ سلیم نے طنزیہ کہا۔

"ضرور پورا ہو گا" ۔ حسن جوش میں آکر تیز آواز میں بولا۔ "ہم اپنے عزم پر چٹان کی طرح ڈٹے ہیں۔ اس لئے کہ پاکستان کا مطالبہ اسلام کا بنیادی مطالبہ ہے۔ ہم پاکستان محض ایک قطعہ زمین سمجھ کر حاصل نہیں کر رہے۔ ہم تو ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنے کے درپے ہیں جہاں اسلام کے ازلی و ابدی اصولوں کو آزما سکیں۔ کیونکہ بقول قائد اعظم اسلام ہماری زندگی اور ہمارے وجود کا بنیادی سرچشمہ ہے۔

بحث اب مدلل ہو رہی تھی۔ اس لئے سوائے چند کے سب غور سے باتیں سن رہے تھے۔ بی بی بھی بیٹھک اور صحن کے درمیانی دروازے میں آکھڑی ہوئی تھی۔ وہ بھی مسلم لیگ کی ایک فعال رکن تھی۔ شہر میں عورتوں کی تنظیم میں شامل تھی۔ بانو بھی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے زور شور سے ہونے والی بحث کو دلچسپی سے سن رہی تھی۔ اس اسلامی مملکت کا تصور کر رہی تھی جو بہت جلد دنیا کے نقشے پر ابھرنے والی تھی۔ اس نظام کے متعلق سوچ رہی تھی۔ جو اس عظیم مملکت میں آزمایا جانے والا تھا۔ اس معاشرے کا خیال کر رہی تھی۔ جو خالص اسلامی اقدار کا حامل ہونے والا تھا۔ خوشی اور مسرت کے جذبات اس کے سینے میں مچل رہے تھے۔

"ایک بات ہے حسن" عبد الرحمن جو اب تک پوری گفتگو میں ایک سامع کی حیثیت رکھتا تھا ۔ بولا!

http://www.rehanahmed.com

"فرمایئے" حسن اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"پاکستان بنانے کا نعرہ تو تم لوگ لگا رہے ہو پاکستان بنے گا مسلم اکثریت کے علاقوں میں۔ یعنی وہی علاقے پاکستان میں شامل کرنے کا مطالبہ ہے نا۔ جہاں مسلم اکثریت میں ہیں"۔

"جی ہاں" حسن احترام سے اس بزرگ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "جی مسلم قوم کا یہی مطالبہ ہے کہ جن جن علاقوں میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے۔ انہیں ایک الگ ریاست کی صورت میں مسلمانوں کے حوالے کر دیا جائے۔ اور ہماری خوش قسمتی ہے کہ اکثریت کے علاقے ایک دوسرے سے ملتے ہیں ادھر بنگال میں ادھر صوبہ سرحد، سندھ اور پنجاب کا"۔

"وہ تو ٹھیک ہے"۔ رحمان حقے کی نے کش میں لینے کے بعد نصیر الدین کی طرف کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن تشویش تو اس بات کی ہے کہ مسلمان ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جن علاقوں میں وہ اقلیت میں ہیں۔ وہاں ان کا کیا بنے گا"۔

سلیم اور کامران رحمان کے اس نقطے پر بے طرح اچھلے۔ پھر طنزیہ قہقہہ لگا کر حسن کو دیکھا۔ "انہیں کیا پرواہ کہ اقلیت کے علاقوں کے مسلمانوں کی پرواہ کریں۔ انہیں تو پاکستان چاہئے۔ پاکستان"۔

"بغیر سوچے سمجھے پاکستان کا شوشہ چھیڑ دیا ان لوگوں نے"۔ سلیم نے بھی طنز کیا۔

"یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہندوستان کی بہت سی جگہوں میں مسلمان بہت چھوٹی اقلیتوں میں ہیں"۔

"ان مسلمانوں کو پاکستان بن جانے کے بعد بقول تمہارے جارحیت سے واسطہ نہ پڑے گا"۔ سلیم نے حسن سے براہ راست پوچھا۔

"قربانی کے بغیر کسی عزم کو حاصل کرنے کا خیال خوش فہمی ہے چچا جان" حسن نے سلیم کی بجائے رحمان کی طرف دیکھا۔ "ہمیں علم ہے کہ مسلمانوں کی یہ اقلیتیں جو پورے ہندوستان میں بکھری ہوئی ہیں۔ غیر محفوظ رہیں گی۔ لیکن ہمیں یہ تو تسلی ہو گی۔ کہ سات کروڑ مسلمان محفوظ ہو چکے ہیں۔ طوفان میں کچھ نہ بچنے سے کیا یہ بہتر نہیں۔ کہ زیادہ حصہ بچا لیا جائے۔ ہم جانتے ہیں۔ کہ مسلمان اقلیتی علاقوں میں مشکلوں سے دوچار ہوں گے۔ لیکن پاکستانی بھائی ان سے دور نہیں ہوں گے۔ اور جب بھی ان اقلیتوں کو کسی قسم کا خطرہ درپیش ہوا۔ تو وہ تڑپ کر ان کی مدد کو دوڑیں گے۔ متحد اور منظم ہو کر ان اقلیتوں کی پشت پناہی کریں گے۔ اس لیے کہ زمین تقسیم ہو جانے سے ہمارا خون ہمارا مذہب اور ہماری تہذیب تو تقسیم نہ ہو گی"۔

"تمہارا جواب کچھ تسلی بخش نہیں"۔ رحمان نے پھر کہا۔ "سات کروڑ کو بچا کر تین کروڑ کو ہندو کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا عقل مندی نہیں"۔

"اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں چچا جان...... ہندو ہمیں اقلیت سمجھتا ہے۔ ایک اور تین کی نسبت ہے ہماری

ان کی۔ پاکستان نہ بنا تو یہ اکثریت اقلیت کو ترسا ترسا کر مارے گی۔ پھر میں تو ان تین کروڑ مسلمانوں کو غیر محفوظ نہیں سمجھتا۔ ایک عظیم اسلامی ریاست اور اس کے جانباز ان مسلمانوں کی پشت پر ہمیشہ رہیں گے...... محمد بن قاسم کو ہزاروں میل دور ایک دکھیا بہن کی فریاد تڑپا گئی تھی۔ دیوار پار بیٹھے بھائیوں کی مصیبت پر پاکستانی سرفروش دھیان نہ دیں گے؟ میرا ایمان ہے کہ پاکستان کی مائیں محمد بن قاسم جنیں گی۔ محمود غزنوی پیدا کریں گی۔ اور کبھی نہ کبھی یہ لوگ سومنات کے مندر کھلوائیں گے۔ داہروں سے ٹکرائیں گے۔ جن کی بات پر سب لیگی واہ واہ کہہ اٹھے۔

"یہ سب جذباتی باتیں ہیں"۔ سلیم بولا۔ کامران اب کچھ چپ چپ سا نظر آ رہا تھا۔ "پاکستان پاکستان سب فریب ہے۔ اس زمانے میں اسلامی سلطنت کا تصور ہی ممکن نہیں۔ مسلم لیگی لیڈر اپنا سیاسی الو سیدھا کر رہے ہیں اور بس"۔

حسن نے گھور کر سلیم کو دیکھا۔

"سب عوام کو بے وقوف بنا رہے ہیں"۔ سلیم نے پھر کہا۔ یہ مسلمانوں کے اس متوسط طبقے کا نعرہ ہے۔ جو ہندو سے ملازمتوں میں مار کھا رہا ہے۔ یا اس سرمایہ دار طبقے کی مانگ ہے۔ جو ہندو سرمایہ دار کا مقابلہ کرنے کا اہل نہیں۔ عام آدمی کو پاکستان سے کوئی دلچسپی نہیں۔

"جی آپ بجا فرماتے ہیں۔"۔ حسن کو سلیم پر غصہ آ رہا تھا۔ نصیر الدین اس کے تیور دیکھ کر ہنس پڑے۔

"بحث ضرور کرو۔ لیکن بحث میں لڑائی کی صورت نہ نکل آئے"۔

"نہیں ابا جان لڑائی کس بات کی"۔ سلیم نے کہا۔ "اپنا اپنا خیال ہی ہے نا"۔

"خیال نہیں ایمان کہئے"۔ حسن تاؤ میں آ کر بولا۔

"جو کچھ بھی ہے نظریہ پاکستان ہی غلط ہے سرے سے" سلیم خوشگوار لہجے میں بولا۔ حسن تلملا گیا۔ ڈاکٹر میر اور عزیز دار بھی بل کھانے لگے۔

"دیکھو حسن" سلیم بحث ختم کرنے کے موڈ میں تھا۔ "میں نے نظریہ پاکستان کو غلط کہا ہے میں اپنی بات پر قائم ہوں۔ آپ مسلم اکثریت کے علاقوں کو یک جا ملا کر اسلامی ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں نا"۔

"جی" حسن کا موڈ بگڑا ہوا تھا۔

"اور یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ مذہبی رابطہ ان علاقوں کو متحد کر دے گا۔ جو جغرافیائی لسانی، اقتصادی اور ثقافتی اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں؟"۔ سلیم کا انداز مصالحانہ نہیں تھا۔

"بالکل" حسن نے اپنے جوش کو قابو میں لاتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں مانتا"۔ سلیم ڈھٹائی سے بولا۔ "جن صوبوں کو آپ مذہبی ربط سے جوڑنا چاہتے ہیں۔ وہ متحد ہو سکیں گے؟"۔

"کیوں نہیں؟" حسن جوش میں آ کر بلند آواز میں بولا۔ "جغرافیہ اتنی افتراق انگیز چیز ہے۔ اور مذہبی ربط بھی کوئی چیز نہیں۔ تو کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں۔ کہ طرابلس کے شہیدوں کا لہو آپ کو اپنے سینے سے رستا کیوں محسوس ہوا تھا۔ عراق کے حادثہ کا درد آپ کے جگر میں کیوں اٹھتا ہے۔ خلافت عثمانیہ کی بقا کے لئے آپ کیوں تڑپتے ہیں"۔

سلیم کوئی جواب نہ دے سکا۔ سب نے حسن کو داد بھری نظروں سے دیکھا۔ "یہ صرف مذہبی ربط ہے سلیم بھائی۔ جو جغرافیائی' لسانی' اقتصادی اور ثقافتی حدود کو پھلانگ جاتا ہے۔ جب یہ مذہبی ربط ہمیں طرابلس' عراق اور ترکی سے جوڑ سکتا ہے۔ تو ایک ہی خطہ زمین پر کیوں متحد نہیں رکھ سکتا۔

"حسن زندہ باد"۔ فہیم نے حسن کی پشت پر ہاتھ مار کر کہا۔ سب نے جی کھول کر داد دی۔

"حسن نہیں پاکستان زندہ باد کہو"۔ حسن مسکرایا۔

رات کافی جا چکی تھی۔ صبح بارات تھی۔ نصیر الدین نے محفل برخواست کر دی۔ سب اٹھ کر سونے کو چل دیئے۔ لڑکے بالے قالین اور دری پر ہی لیٹ گئے۔ بی بی اور بانو ان کے لئے رضائیاں اور تکئے لانے لگیں۔

حسن کچھ دیر سلیم کے پاس بیٹھا نجی سی باتیں کرتا رہا۔ دونوں کو ایک دوسرے کی احوال پرسی کا اب موقع ملا تھا۔ ان باتوں پر اس سیاسی گفتگو کا مطلقاً اثر نہیں تھا جو بڑے زور و شور سے اتنی دیر ہوتی رہی تھی۔

http://www.rehanahmed.com
http://www.rehanahmed.com

برات کے کھانا کھانے کا مرحلہ طے ہوا۔ تو لڑکی والوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ حسن کی اماں رشیدہ تو بہت گھبرائی گھبرائی تھیں۔ سلطانہ اور سکینہ متفکر تھیں۔ برات کچھ زیادہ ہی آگئی تھی۔ اللہ سے دعائیں مانگ رہی تھیں کہ عزت رہ جائے۔ ذرا سی کسر بھی ہوئی۔ تو عمر بھر کا طعنہ بن جائے گا۔ "بن ماں باپ کے بچی تھی لوگوں نے کچھ سے اتار پھینکنے والی بات کی۔ لوگوں کو تو باتیں بنانے کے لیے موضوع چاہیے اسی لیے جب برات نے کھانا کھا لیا۔ تو سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب گھر کے دوسرے مہمانوں کی باری تھی۔ خاندان کی عورتیں انہیں کھانا کھلا رہی تھیں۔ اور نوجوان بڑی مستعدی سے باہر سے کھانا لا لا کر سیڑھیوں میں کھڑی عورتوں کو دے رہے تھے۔ براتی کھانے کی تعریف کر رہے تھے۔ کچھ لوگ آج کے اہم موضوع پر گفتگو میں مصروف تھے۔

بالائی منزل پر ثریا اپنی سہیلیوں میں گھری بیٹھی تھی۔ ستاروں سے جھلملاتا سرخ جوڑا پہن رکھا تھا۔ سہیلیاں سنگھار کر رہی تھیں۔ زیور کے ڈبے کھلے پڑے تھے۔ بناؤ سنگھار کے بعد زیور سے اسے لادنا تھا۔ لڑکیوں کے قہقہوں میں ثریا کے دل کی دھڑکنیں ڈوب رہی تھیں۔ آج پیا ملن کا مرحلہ تھا۔ خواب جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ ان کی سنہری تعبیر اسے آج ملنے والی تھی۔

بانو کی خوشیاں آج عروج پر تھیں۔ اس نے ہلکے پیازی رنگ کے ریشمی کپڑے پہن رکھے تھے۔ ہاتھوں میں نیلم کے دیے ہوئے بڑے بڑے کنگن تھے۔ اٹھلاتی ہوئی ادھر سے ادھر پھر رہی تھی۔

ثریا کے پاس پہنچنے کے لیے اس نے کئی بار دستک دی۔ لیکن ثریا کی سہیلیوں نے دروازہ نہیں کھولا۔ اندر ہی سے جواب دے دیا۔ "گھر جا کر دیکھنا بھابی کو۔ یہاں ہم نہیں دکھائیں گے۔"

دروازہ اس نے کئی بار پیٹا۔ لیکن کھولا نہیں گیا۔ "میں ثریا باجی کی نند نہیں۔ بہن ہوں" اس نے ہنس کر کہا۔

لیکن کرارا سا جواب ملا۔ "گرگٹ کی طرح رنگ نہیں بدلو..... ہم تمہاری چالاکی میں نہیں آنے کے۔" بالآخر وہ واپس آ گئی۔ چھوٹے چھوٹے بچے بھی دلہن دیکھنے کو بیتاب تھے۔ لیکن بند دروازہ پیٹنے کے سوا انہیں کچھ نہ ملا۔

کھانا ختم ہو گیا۔ تو دولہا کو سلامی کی رسم کے لئے اندر بلایا گیا۔ پھولوں اور زرتار سہرے میں ڈھکا سلیم اندر آ گیا۔ صحن میں کرسی بچھا دی گئی۔ جہاں نئی بیاہی مست مست عورتوں نے اسے گھیرے میں لے کر ہنسی مذاق شروع کر دیا۔ قہقہے پہ قہقہہ پڑا۔ پہلے ہی شور کون سا کم تھا۔ اب اس میں مترنم سا اضافہ ہو گیا۔ سلیم بھی ان کی باتوں کا شگفتہ شگفتہ جواب دے رہا تھا۔

سلامی کی رسم کے بعد خاندان کی نوجوان لڑکیاں سلیم کے گرد جمع ہو گئیں۔ دلہا پیسے وصول کر چکا تھا۔ اب انہیں اس سے کچھ نہ کچھ لینا تھا۔ پھر بنیکھیڑا اک رسم تھی جو ابھی انجام پاتا تھا۔

ہوتا یوں تھا۔ کہ خاندان کی نوجوان لڑکیاں جو عام طور پر رشتے میں دلہن کی بہنیں ہوتی تھیں۔ دولہا کی ٹانگ کرسی سے باندھ دیتی تھیں۔ دولہا ان سے گلو خلاصی پیسے دے کر کرواتا تھا۔

بانو نے اوپر جنگلے سے سلیم کو کرسی پر بیٹھے دیکھا۔ شاداں اس کی ٹانگ باندھنے کو کپڑا تلاش کر رہی تھی۔ بانو بھائی کی مدد کے لئے لپک جھپک سیڑھیاں اتر صحن میں آ گئی۔ عورتوں بچوں اور لڑکیوں کو بمشکل ہٹاتے اپنے لئے جگہ بناتے وہ سلیم کے دائیں ہاتھ کھڑی ہو گئی۔

دلہن کی بہنوں سے اب وہ اپنے بھائی کے ساتھ مقابلہ کرنے کو تیار تھی۔ نسیم نے اپنا دوپٹہ ہی اتار لیا۔ اور سلیم کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گئی۔ باقی لڑکیاں بھی اس پر گری پڑتی تھیں۔ ہنسی جوبن پر تھی۔ سلیم کبھی ٹانگ ایک طرف کر لیتا۔ کبھی دوسری طرف نسیم کی مدد کو صبیحہ بھی جھک گئی۔ معرکہ گرم ہو گیا۔ جب بھی وہ ٹانگ قابو میں کرتے۔ کرسی کی ٹانگ سے باندھنے کی کوشش میں کامیاب ہونے لگتیں۔ بانو ان کے ہاتھوں پر چٹکیاں کاٹنے لگتی۔ وہ بھی کرسی کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ لڑکیاں چیخیں مارتیں۔ کوشش ناکام ہو جاتی اور گرد کے لوگ لڑکے قہقہے پہ قہقہے لگانے لگتے۔ بالائی منزل پر جنگلے کے گرد بھی عورتیں جمع ہو کر یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔

حسن میر صاحب کا پیغام لے کر آپا رفعت کے پاس آیا۔ میر صاحب کو پانچ بجے کی گاڑی سے دلی واپس جانا تھا۔ رفعت آپا جنگلے پر آدھا دھڑ لگائے شور مچا رہی تھی۔ "بانو کی بچی۔ اے ہٹاؤ۔ یہی نہیں باندھنے دے رہی۔"

حسن نے بھی جھک کر نیچے دیکھا۔ لڑکیاں سلیم کے جیسے قدموں میں گتھم گتھا ہو رہی تھیں۔ رفعت آپا کو پیغام دینے کے بعد اس نے آپا ہی سے پوچھا۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔

"شادی ہو گی تو پتہ چل جائے گا" رفعت آپا حسب عادت قہقہہ لگاتے بولی۔

...ا"۔ تائی حسیناں نے کہا۔

"وہ کیا ہوتا ہے"۔ حسن نے تجسس سے پوچھا۔ رفعت آپا نے ساری بات اسے سمجھا دی۔ وہ مسکرانے ...

"یہ بانو بڑی چالاک ہے۔ بھائی کی ہمدرد بن رہی ہے۔ ہر بار نعیم کی کوشش ناکام بنا رہی ہے۔ اسے یہاں ... تو پھر کام بنے گا"۔

حسن مسکراتے ہوئے مڑا۔ دھماد ھم سیڑھیاں اترتا وہ صحن میں آ گیا۔ بانو کی وجہ سے نسیم کی ایک کوشش پھر ... گئی۔ خوب خوب شور مچ رہا تھا۔

حسن کو جانے کیا سوجھی۔ جھرمٹ کو دھکیل کر جگہ بنائی۔ چپکے سے سلیم کی کرسی کے پیچھے بیٹھ گیا۔ نسیم ... پھر کوشش کی۔ دوپٹہ سلیم کی ٹانگ کے گرد لپٹیا۔ پیشتر اس کے کہ بانو اس کے ہاتھ پر چٹکی کاٹتی۔ ... اس کی دونوں کلائیاں ہاتھوں میں پکڑ کر اسے پیچھے کی طرف گھسیٹ لیا۔

"ہائے اللہ...... کون ہے یہ...... چھوڑو میرے ہاتھ۔ کون ہے......؟" بانو زمین پر بیٹھی تھی۔ اردگرد ... کھڑی تھیں۔ کچھ نہ دیکھ سکی نہ سمجھ سکی۔ بس گھسٹتی چلی گئی۔

نسیم نے دوپٹہ باندھ کر سلیم کی ٹانگ کرسی کے ساتھ باندھ دی۔ تالیاں بجیں شور مچا۔ قہقہے پڑے۔ اب ... صبیحہ اور کئی لڑکیاں سلیم سے بیک وقت پیسوں کا مطالبہ کر رہی تھیں۔

"...وں کو ہوا لگاؤ"۔

"بھیجرے ہو رہے ہیں"۔

"سو سے کم نہ لینا"۔

"پندرہ سالیاں ہیں"۔

"نکالو بھی سلیم"۔

... رنگ باتیں ہو رہی تھیں۔ سلیم مسکراتے ہوئے سب کو دیکھ کر پیسے دینے سے انکار کر رہا تھا۔ حسن ... کو کلائیوں سے پکڑ کر جھرمٹ سے باہر گھسیٹ لیا۔ اس نے نسیم کی کوشش یوں کامیاب بنا دی تھی۔

عورتوں کے نرغے سے گھسٹ کر باہر نکلتے ہی بانو نے دیکھا: اس کی دونوں کلائیوں پر حسن کے دونوں ہاتھ ... دونوں ایک دوسرے کے بالکل قریب آمنے سامنے تھے حسن دوزانو تھے۔ اور بانو بیٹھنے اور دوزانو ہونے کی ... سی حالت میں۔

بانو نے اک جھٹکے سے ہاتھ چھڑائے۔ حسن نے ملائمت سے اس کی ملائم کلائیاں چھوڑ دیں۔ دونوں

نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ یوں جیسے آئینے میں کوئی اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔ نظروں کا میل ملاپ صرف لمحوں کا تھا۔ لیکن یوں جیسے صدیاں بیت جائیں۔ شور و غل ارد گرد اور اوپر گرتی پڑتی عورتوں سے بے نیاز وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ حسن تیکھے نقش و نگار کا نام نہیں۔ نہ ہی گوری دمکتی رنگت حسن ہے۔ حسن اک سیال روشنی ہے۔ اُمڈا ہوا نور ہے۔ جو آنکھوں کے راستے دل میں نہیں روح کی گہرائیوں میں اترتا چلا جاتا ہے اور سب تاریک گوشے اس آن اس لمحے منور ہو جاتے ہیں۔

یہ آن کب آتی ہے۔ یہ لمحہ کب جنم لیتا ہے۔ اس کے بارے میں کوئی فارمولا بنایا جا سکتا ہے۔ نہ کوئی قید و بند۔ حسن اور بانو پر یہ آن آ گئی تھی۔ اس لمحے نے جنم لے لیا تھا۔ ایک نئی حقیقت منکشف ہو گئی تھی۔ جیسے اپنے آپ کو پا لیا ہو جیسے اپنے وجود سے آگہی ہو گئی ہو۔

ورنہ دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی تو نہ تھے۔ ایک ہی محلّے میں رہتے تھے۔ بچپن سے ایک دوسرے کو دیکھتے چلے آئے تھے۔ ساتھ کھیلے تھے۔ حسن نے کئی دفعہ بانو کو حساب کے سوال سمجھائے تھے۔ بانو نے کئی بار اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں حسن کو کھلائی تھیں۔

حسن صرف تیکھے نقش و نگار اور گوری رنگت کا نام ہوتا تو حسن مدتوں پہلے اس سے متاثر ہو گیا ہوتا۔ آج لمحے کی آنکھ تو اب کھلی تھی۔ دونوں خاموشی سے اٹھے۔ خاموشی ہی میں عورت مرد کے ازلی بندھن کا اعتراف ہو گیا۔

حسن نے بانو کے سراپا کو ایک بار پھر دیکھا۔ پیازی ریشم کے پھسلتے پھسلتے لمحوں کے احساس سے بے خود ہو گیا۔ اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے یہ چہرہ اس کے لاشعور میں دبکا ہوا وہ بت ہے۔ جو محتسب کی آنکھ بچا کر آج اُبھر کر شعور میں آن دھمکا ہے۔ اسی لئے تو اس سراپا سے اسے برسوں کی والہانہ وابستگی احترام اور چاہت کا احساس ہو رہا تھا۔ اور اسے اپنا وجود اس بت سے کوئی الگ شے بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

وہ اب تک کمہار کی گندھی ہوئی مٹی کا بے ہنگم سا تودہ تھا۔ جو آج اچانک چاک پر چڑھ جانے سے اک صورت اک خاص انداز میں ڈھل گیا تھا۔ اپنی ہستی کا شعور اپنے آپ کا ادراک اسے آج ہوا تھا۔ اور بانو کو یوں لگ رہا تھا۔ جیسے چرخی پر چڑھی ہوئی وہ ڈور ہے جو پتنگ کے اوپر ہی اوپر اٹھنے سے چرخی سے تیزی کے ساتھ خود بخود اترتی چلی جاتی ہے۔ پتنگ اور ڈور کا تو ازلی ساتھ ہے۔ بانو نے چپکے چپکے اس حقیقت کا اعتراف کر لیا۔

رات حسن کو نیند بالکل نہیں آئی۔ ثریا کا جہیز والا کمرہ خالی ہو چکا تھا۔ اماں نے یہ کمرہ اسے دے دیا تھا۔ تاکہ دن بھر کی تکان رات کی پر سکون نیند سے دور ہو سکے۔ دلہن کے چلے جانے سے گہما گہمی بھی کم ہو گئی تھی۔ رات تک آدھے سے زیادہ مہمان واپس جا چکے تھے۔ باقی تھک کر نیند کی آغوش میں پہنچ چکے تھے۔ حسن نے دن بھر مشین کی طرح کام کیا تھا۔ براتیوں کے استقبال سے لے کر دلہن کی رخصتی تک وہ مصروف رہا تھا۔ اب بستر پر لیٹا تو نیند آنکھوں سے دور بھاگ گئی۔

وہ جھلملاتے سے رنگین تصور میں کھو گیا۔ وہ بانو ہی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ وہ بانو جسے ہوش سنبھالتے سے دیکھتا آیا تھا اور یہ بانو جسے اس نے آج دیکھا تھا۔ ایک دوسرے سے قطعاً مختلف نظر آ رہی تھیں۔ وہ بانو ایک خوبصورت نوجوان لڑکی تھی۔ جس میں نگاہوں کو خیرہ کرنے والی دل کشی کی چمک بھی تھی۔

لیکن یہ بانو...... یہ بانو سیال نور تھا۔ پگھلی ہوئی روشنی تھی۔ بتی بجھا کر بھی وہ اس روشنی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اندھیرے میں بھی اس نور کی چمک دیکھ کر حظ اٹھا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ آج تک وہ کہاں تھا؟۔

صبح وہ دیر سے اٹھا۔ کھلی آنکھوں سے سوتے اور بند آنکھوں سے جاگتے رات گزار دی تھی۔ بانو مختصر سے عرصے میں طوالت کی منزلیں طے کر گئی تھی۔ حسن اپنے پہلو میں لذت آمیز سی کسک محسوس کر رہا تھا۔ آج اسے اپنی ہستی بالکل بدلی بدلی محسوس ہو رہی تھی۔

نیند رات بانو کو بھی ترساتی رہی۔ لیکن بانو اور حسن کی سوچ کے انداز میں فرق تھا بانو تو اس تصادم سے بوکھلائی ہوئی تھی۔ تمام رات وہ اپنے ذہن میں آنے والی اس آواز سے ہی لڑتی رہی جس نے حسن بھائی کو صرف حسن بنا دیا تھا۔

وہ کئی دفعہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ اسی کی چارپائی پر ناصرہ سوئی ہوئی تھی۔ بانو ڈر رہی تھی۔ کہیں اس کے من کی ہلچل کی خبر ناصرہ کو نہ ہو جائے۔ جتنا وہ اس ہلچل کو دبانا چاہتی تھی۔ اتنا ہی یہ شوریدہ سر ہوتی جا

رہی تھی۔ بانو سوچنے لگی۔ صبح وہ کیا کرے گی۔ کتنے بہت سے لوگ ہوں گے۔ کہیں اس کے من کا چور پکڑا نہ جائے۔

حسن۔۔۔ احسن بھی تو صبح آئے گا۔ اس کے سامنے کے تصور ہی سے بانو کو جھرجھری آ گئی۔ لطیف سا جو سرزد ہو گیا تھا اس سے۔ لذت آمیز سی کپکپی اس کے وجود پر چھا گئی۔ صبح دعوت ولیمہ تھی۔ شادی کا مسرت بخش ہنگامہ آج یہاں منتقل ہو گیا تھا۔ شاداں و فرحاں چہرے ہر سو نظر آ رہے تھے۔ رنگ برنگے ریشمی لباسوں میں ملبوس بچے کھیل کود اور شور و غل میں مصروف تھے۔ عورتیں زمانے بھر کی باتیں کرتے ہوئے اپنے جگمگ جگمگ کرتے لباسوں اور چمکتے دمکتے زیوروں کی نمائش میں مصروف تھیں۔ مہمانوں سے گھر بھرا پڑا تھا۔

بانو نے آج زعفرانی لباس پہنا تھا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اپنے سراپا کو دیکھا۔ تو یوں لگا جیسے وہ اپنے آپ کو اپنی آنکھوں سے نہیں۔ حسن کی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔ اس احساس کے ساتھ ہی حجاب کی سرخی اس کے گالوں کو گلنار کر گئی۔

حسن بار بار اندر آ جا رہا تھا۔ بانو سے اس کا کئی بار سامنا ہوا۔ لیکن یہ سامنا لمحاتی تھا۔ بانو بجلی کی طرح چمک کر غائب ہو جاتی۔ حسن کے بصری حواس اس کی چکاچوند سے متاثر ہو جاتے۔ حسن کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔

"حسن بیٹے" نصیر الدین نے حسن کو ڈیوڑھی کی طرف جاتے دیکھ کر آواز دی۔

"جی" وہ رکا۔

"ذرا بی بی سے پچاس روپے تو پکڑ لاؤ"۔ نصیر الدین نے کہا۔

"اچھا جی"۔

"میں گوپی ناتھ کی بیٹھک میں ہو دس گا"۔

"اچھا"۔

حسن اندر چلا گیا۔ صحن میں کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ بی بی کہیں نظر نہ آئی۔ مہمانوں کے اتنے بڑے اجتماع میں بی بی کو ڈھونڈنا آسان کام نہ تھا۔ وہ کبھی اوپر مہمان داری کے فرائض انجام دے رہی تھیں، کبھی نیچے۔ کبھی درمیانی منزل میں چاند سی بہو کی بلائیں لے رہی تھیں۔ تو کبھی بانو کو ہدایات دیتے بالائی منزل کی طرف جا رہی تھیں۔

"بی بی کہاں ہوں گی" حسن نے حسیناں خالہ سے پوچھا۔

"بی بی" پتہ نہیں اوپر تھیں شاید"۔ اس نے ادھر ادھر دیکھ کر جواب دیا۔ حسن اوپر جانے کو تھا کہ حسیناں نے آواز دی۔ "حسن بیٹے"۔

"جی"۔

http://www.rehanahmed.com

"ادھر سامنے والے کمرے میں ہے شاید"۔ اس نے باورچی خانے کے ساتھ والے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ ابھی ابھی بی بی کی آواز اندر سے آئی تھی۔

حسن اس کمرے کی طرف چل دیا۔ بی بی اندر ہی تھی۔ بڑے بکس سے کوئی ریشمی کپڑے نکال رہی تھی۔ عنابی رنگ کے گوٹے کناری سے جھلملاتے لباس میں ہمیشہ بے تکلفی سے پیش آنے والا حسن ٹھٹکا۔ کچھ جھجکا...... بانو نے بھی اسے دیکھا۔ گھبرا کر منہ دوسری جانب پھیر لیا۔

"بی بی" حسن لمحوں کے توقف کے بعد بولا۔

"ہوں" بی بی کپڑوں کا بنڈل اٹھاتے ہوئے اس کی طرف مُڑی۔

"چچا جان نے پچاس روپے مانگے ہیں"۔

"اس کے ابا نے" بی بی نے قدم اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"جی" وہ بولا۔

"اے بانو" بی بی نے چلتے چلتے رک کر کہا" چابیاں تمہارے پاس ہی ہیں نا۔"

"جی امی۔" بانو آہستگی سے بولی۔

"نیچے والے صندوق میں سے اسے پیسے نکال دے۔" کہتے ہوئے بی بی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔" دائیں ہاتھ والے خانے میں پڑے ہیں۔ کمرے سے نکلو تو تالا لگا دینا چاہیے۔"

بی بی چلی گئی اس کمرے میں ثریا کے جہیز کا سامان بے ترتیب سا پڑا تھا۔ مہمانوں کے جانے کے بعد ہی ہر چیز ٹھکانے پر رکھی جا سکتی تھی۔

کمرے میں وہ دونوں اکیلے تھے۔ اس اکیلے پن کا احساس آج پہلی بار دونوں کے لئے گھبراہٹ کا باعث بن رہا تھا۔ ورنہ ایسے موقعے کئی بار پہلے بھی آئے تھے۔

بانو اس کی طرف رخ موڑے کھڑی تھی۔ حسن اس سے دو تین گز کے فاصلے پر دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ نیلے گرم سوٹ میں وہ بڑا وجیہہ لگ رہا تھا۔ یوں بھی حسین آنکھیں خمار کیف الفت سے بوجھل بوجھل تھیں۔ اس بوجھل پن نے اس کے مردانہ وقار میں اضافہ کر دیا تھا۔

"پیسے نکال دیجئے۔" چند لمحوں کے سکوت کے بعد حسن نے کہا۔

بانو جھکی...... پیسے نچلے بکس میں تھے۔ اوپر والا بھاری بکس ہٹانا تھا۔

حسن نے جلدی سے آگے بڑھ کر وہ بکس اٹھا کر دوسری طرف رکھ دیا۔ بانو نے ایک لمحہ کو اس کی طرف دیکھا۔ خوبصورت آنکھوں کا اظہار تشکر شکریہ کے لفظی اظہار سے کہیں زیادہ موثر تھا۔

بکس کھول کر اس نے پیسے نکالے اور حسن کی طرف بڑھا دیئے۔ ہاتھ سے ہاتھ لگا نہ انگلیوں کی پوریں

چھو میں۔ پھر بھی بجلی کا ایک کا دونوں نے ہی محسوس کیا۔ حسن پیسے لے کر باہر چلا گیا۔ بانو کتنی دیر کھلے بکس کے سامنے بیٹھی رہی۔

دوسرے دن شام کی گاڑی سے حسن واپس جا رہا تھا۔ لاہور داخلہ لئے اسے چوتھا سال تھا۔ گھر کئی دفعہ آیا اور گھر سے کئی دفعہ گیا۔ لیکن اس دفعہ کا جانا کچھ اور ہی تھا۔ صبح ہی سے طبیعت بجھی بجھی تھی۔ گھر میں شور تھا۔ ہنگامہ تھا۔ لیکن اس کی روح میں سونا پن اتر رہا تھا۔

شام اماں اور گھر والوں سے رخصت ہو کر گھر سے نکلا۔ بیگ ہاتھ میں لئے وہ بانو کے گھر میں داخل ہوا۔ مہمان ابھی یہاں بھی کافی تھے۔

"بس چل دیئے"

"بھئی اتنی کم چھٹی۔"

"کچھ دن تو اور رہتے۔"

"پھر تو محفل جمی نہیں۔ ذرا سلیم سے ایک اور معرکہ مار لیتے۔"

نسیم اور دوسرے رشتہ داروں نے اس کی سنے بغیر اپنی کہی۔ وہ مسکراتا رہا۔ بی بی صحن میں دالان کے دروازے کے قریب پڑے پلنگ پر اپنی بھابیوں، بہنوں اور دوسری رشتہ داروں سے باتیں کر رہی تھیں۔ بانو دالان کے دروازے پر کھڑی تھی۔ نصیر الدین دائیں ہاتھ کرسی پر بیٹھے حقے سے شغل فرما رہے تھے۔

"جا رہے ہو" نصیر الدین نے کہا۔ بانو کے چہرے پر دھندلا سا غبار پھیل گیا۔

"جی" حسن نے مودبانہ جواب دیا۔

"پھر کب آؤ گے" بی بی نے منہ موڑ کر پوچھا۔

"اب تو امتحان سے فارغ ہو کر ہی آؤں گا۔" حسن نے جواب دیا۔

" بیٹھو نا" گاڑی میں تو وقت ہے۔ بھئی ایکسپریس ہی پکڑو گے نا۔" نصیر الدین نے گھڑی دیکھی۔

کرسی کے پاس مونڈھے پر حسن بیٹھ گیا۔ بیگ اس نے زمین پر رکھ دیا۔

"یہ آخری سال ہے نا تمہارا۔" نصیر الدین نے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"دو امتحان دینے ہیں تم نے اس دفعہ۔" نصیر الدین نے ہنس کر اس کی طرف دیکھا۔

"جی۔" وہ گھبرا سا گیا۔ بی بی بھی نصیر الدین کی طرف دیکھنے لگی۔

"بھئی ایک تو انجینئرنگ کا ہے۔ دوسرا الیکشن کا۔"

"واقعی۔" ہنس کر حسن نے انہیں دیکھا۔

"کیا خیال ہے مسلم لیگ الیکشن جیت لے گی۔" نصیر الدین نے کہا۔

"سو فیصد" حسن کی بجائے فہیم بولا۔ جو ایک لمحہ پہلے کمرے سے نکلا تھا۔ حسن نے بھی اس کے یقین کی تائید کی۔

"ان الیکشنوں پر ہی سب دارومدار ہے۔ مسلم لیگ کو یہ موقعہ ملا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ اور بااختیار تنظیم ثابت کر دکھائے۔" نصیر الدین حقے کے کش لے کر بولے۔ "انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔" حسن بولا۔ "لیگ اور مسلمان ایک ہی وجود کے دو نام ہیں۔"

کچھ دیر ہلکی پھلکی سی گفتگو ہوتی رہی۔ بی بی اس میں پیش پیش تھی۔ حسن کی بی بی سے یوں بھی عقیدت والہ گئی تھی اس کی بچی تلی گفتگو سے وہ بڑا متاثر ہوا۔ حسن نے گھڑی دیکھی اب اسے اسٹیشن پہنچنے کے لئے اٹھنا ہی تھا۔ دل کس کافر کا جانے کو چاہ رہا تھا۔ بانو سے اس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ لیکن اس کے قریب ہونے کا احساس تو تھا۔

فہیم اسے گاڑی چڑھانے کو ساتھ ہی چل دیا۔ حسن سب سے ملتا ملاتا۔ دعائیں لیتا گھر سے باہر آ گیا۔ بانو کو اس نے شائستہ نظروں سے الوداع کہی تھی۔

حسن وعدہ تو امتحانوں سے بعد آنے کا کر کے گیا تھا۔ لیکن ماں کی اچانک بیماری کا تار ملتے ہی اسے لدھیانہ آنا پڑا۔

اماں کو کبھی کبھی درد قولنج ہوا کرتا تھا۔ لیکن اس بار تو دورہ اتنا شدید پڑا کہ زندگی کی امید ہی نہ رہی۔ ان کی خراب حالت دیکھ کر سلیم نے حسن کو تار دے دیا۔ حسن کو اماں سے والہانہ پیار تھا۔ جب سے آنکھ کھولی تھی۔ اس شفیق ہستی کے چہرے پر غم کے سائے ہی منڈلاتے دیکھے تھے۔ بیوگی نے ان کی ہر خوشی کا چہرہ مسخ کر رکھا تھا۔ اماں اپنے ماں باپ کے گھر رہ رہی تھی۔ لیکن حسن اس کی حیثیت سے آگاہ تھا۔ گھر کی ہستی کا سارا بوجھ اماں نے اٹھار کھا تھا۔ اور جب سے نانی اماں اور نانا جان فوت ہوئے تھے۔ زینت ممانی کی حکمرانی نے اس بوجھ کو کسی حد تک ناقابل برداشت بھی بنا دیا تھا۔ لیکن مجبوری نے زبان بندی پر مجبور کر رکھا تھا۔ ایک تو اماں کے کندھوں پر ثریا کا بار تھا۔ دوسرا ابھی ان کا بیٹا بھی کسی قابل نہیں ہوا تھا۔

حسن ان کی حالت دیکھ کر اکثر کڑھتا تھا۔ وہ بہت جلد اپنی تعلیم مکمل کر لینے کا خواہاں تھا۔ اس نے مصمم ارادہ کر رکھا تھا۔ کہ امتحان دیتے ہی نوکری کے لئے جدوجہد شروع کر دے گا۔ اور پھر جہاں کہیں اسے نوکری ملے گی۔ وہ اماں کو ساتھ لے جائے گا۔ اپنا چھوٹا سا گھر بنائے گا۔ پرسکون سا چھوٹا سا گھر جس میں اماں کی حکمرانی ہوگی۔

اس تخیلی گھر کے ساتھ پچھلے دنوں ایک اور وجود کا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس وجود نے اس گھر کو جنت کی رعنائیوں کا حامل بنا دیا تھا۔ یہ وجود بانو کا تھا۔ جسے اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے وہ ہر وقت محسوس کرتا رہتا تھا۔ اماں کی عمر بھر کی محرومیوں کا بدلہ بانو جیسی لڑکی ہی چکا سکتی تھی۔

آٹھ بجے کے قریب حسن لدھیانہ ریلوے سٹیشن پر تھا۔ دل دھڑک رہا تھا۔ اماں کی صحت و سلامتی کے لئے دعائیں مانگ رہا تھا۔ تار پا کر تو وہ سخت متوحش ہوا تھا۔ سٹیشن سے باہر نکلا۔ تو وہ بہت جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا۔

...رہا تھا۔ کہ سامنے چند گز کے فاصلے پر اسے اپنے محلے کا اللہ دتہ دھوبی ادھر ہی آتا نظر آیا۔

"میری اماں کا کیا حال ہے دتے۔" حسن نے بے تابی سے پوچھا۔

"اب ٹھیک ہیں صاحب جی" دتا اس کے قریب آ کر بولا۔ "میں ابھی ابھی انہیں دیکھ کر ہی آ رہا ہوں۔ ...بڑا احسان کیا صاحب جی۔ ورنہ کل تو بی بی جی کی حالت بیحد خراب ہو گئی تھی۔"

"اب ٹھیک ہے نا۔"

"جی بڑا آرام ہے۔ رات سے آرام ہے۔"

"ہوا کیا تھا؟"

"درد قولنج"

"اوہ بڑی پرانی تکلیف ہے اماں کو۔"

"لیکن پہلے ایسا دورہ کبھی نہ پڑا تھا۔"

"ہوں"

حسن تانگے میں بیٹھ گیا۔ وہ اماں کو دیکھنے کے لئے بیتاب ہو رہا تھا۔ دتے دھوبی کی باتوں سے کچھ تو تسلی ہو ...گئی۔ پھر بھی بے چینی نہ گئی تھی۔

...بڑے بازار میں اسے سلیم مل گیا۔ تانگہ روک کر وہ نیچے اترا۔ علیک سلیک کے بعد اس نے اماں کے متعلق ...پوچھا۔

"حوصلہ رکھو۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اب وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ کل تو ہم سب گھبرا گئے تھے۔ ...لئے تمہیں تار دے دیا۔ اچھا کیا تم آ گئے۔ خالہ تمہیں دیکھنے کی خواہش مند تھی۔"

"ہاں"

"علاج کس کا ہو رہا ہے۔"

"ڈاکٹر لدھا رام کا۔"

اماں کی وجہ سے متفکر تھا۔ سلیم نے اس کی تسلی کر دی تھی۔ وہ کچھ پر سکون سا ہو گیا۔ دل ہی دل میں اللہ کا ...ادا کرتا وہ پھر تانگے میں آ بیٹھا۔

گلی کی نکڑ پر بانو کے گھر کے نیچے تانگہ کھڑا ہوا۔ اس گھر کو دیکھ کر اس کا دل بے اختیار سا ہو گیا۔ عقیدت ...اس نے اس پر نظر ڈالی۔ یہ وہ مقدس جگہ تھی۔ جہاں اس کے دل کے حرم کا بت رکھا تھا۔ سجدہ ریزی کی ...مچلی۔ لیکن اماں کا احترام غالب آیا۔ پہلے اسے اماں کے پاس پہنچنا چاہئے۔ تانگے والے کو پیسے دے کر ...نے بیگ اٹھایا اور گھر کی جانب تیز تیز قدم اٹھاتے چل دیا۔

راستے میں دو تین واقف کار ملے۔ بات علیک سلیک تک رہی۔ وہ اماں کو دیکھنے کی بے چینی ہو دل میں لیے ہوئے تھا۔

ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہی صحن پر نظر پڑی۔ گھر کچھ سونا سونا سا تھا شاید پچھلی بادشاہی کی گہما گہمی کا خیال تھا۔ وہ صحن میں آیا۔ دائیں ہاتھ ممانی زینت کے دالان کو تالا پڑا تھا۔ باورچی خانے کا دروازہ کھلا تھا۔ لیکن کسی کے اندر ہونے کا احساس نہ ہوا۔ وہ بائیں ہاتھ کے کھلے دروازے میں داخل ہو گیا۔ اس میں ان دنوں اماں کا قیام تھا۔ اماں سامنے ہی پلنگ پر پڑی تھیں۔ چہرہ بے حد زرد تھا۔ خاصی نحیف لگ رہی تھیں۔ اس کا دل بھر سا آیا۔ لپک کر اماں کے پلنگ کے قریب پہنچا۔ بیگ زمین پر رکھ کر وہ اماں پر جھک گیا۔ اماں شاید اسی کے انتظار میں آنکھیں بند کیے پڑی تھیں۔ اسے قریب محسوس کر کے آنکھیں کھول دیں۔ حسن پٹی پر بیٹھ گیا۔

"اماں" وہ ان پر پوری طرح جھک گیا۔

"میرے بچے" اماں کی آواز بھرا گئی۔ بازوؤں میں دبوچ کر اسے سینے سے لگا لیا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو ڈھل آئے۔

کئی لمحے ان کی چھاتی پر سر ٹکائے رہا۔ اماں اس کی پشت پر شفقت سے ہاتھ پھیرتی رہیں۔ پھر حسن نے دھیرے دھیرے سر اٹھایا۔ وہ بمشکل اپنے جذبات پر قابو پائے تھا۔ اپنے ہاتھوں سے اماں کے آنسو پونچھے۔

"شکر ہے تم آ گئے۔" اماں نے کمزور سی آواز میں کہا۔

"اب کیسی ہیں اماں" حسن نے ان کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں محبت سے تھام کر پوچھا۔

"زندگی کے دن تھے ابھی۔" اماں گہری سانس لے کر مسکرائیں۔ "ورنہ کل تو بس۔"

"اتنی مایوسی کی باتیں نہ کیجئے اماں" حسن نے متاثر ہو کر کہا۔ پھر اماں کو ہنسانے کی نیت سے بولا۔ "آپ کی بڑی لمبی عمر ہے۔ ابھی تو آپ نے۔"

اچانک ملحقہ کمرے کا دروازہ کھلا۔

"کس نے جگا دیا۔" بانو تیزی سے اندر آتے ہوئے بولی۔ لیکن حسن کو اماں کے پلنگ کی پٹی پر بیٹھے دیکھ کر ٹھٹھک کر رہ گئی۔

یک دم حسن نے گردن موڑ کر دیکھا۔ بانو کو دیکھ کر وہ بھی ششدر سا رہ گیا۔

"اللہ! جذبوں میں اتنی کشش بھی ہوتی ہے۔" سوچتے ہوئے وہ مسکرا دیا۔ بانو گھبرا کر مڑی۔ اماں نے اسے دیکھ لیا تھا۔ جلدی سے بولیں۔ "بانو میری دوا کا وقت ہو گیا کیا۔؟"

"جی" وہ کچھ جھجک رہی تھی۔

http://www.rehanahmed.com

"...ے دو بیٹی۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔" اماں نے دعائیں دیتے ہوئے بانو کو دیکھا۔ حسن کی نظریں بانو ... جھک کر اٹھتے گلابی پیروں پر تھیں۔

...کتنا سکھ دیا میری بچی نے...... اپنی بیٹی بھی ہوتی۔ تو شاید اتنی خدمت نہ کرتی۔ کل تو۔ ...ات تو پچھلے ہفتے کی میکے گئی ہوئی ہے۔ اس کی بہن کی شادی تھی۔" اماں کہہ رہی تھیں" دو دن ہوئے ...یم بھی چلا گیا پنیالے...... بس بانو تھی یا ثریا۔ بی بی بچاری بھی تین گھنٹے میرے سرہانے کھڑی رہی۔"

...نو نے دوائی کی شیشی اٹھائی۔ اس کے ہاتھوں میں کپکپاہٹ تھی۔ دل بے قابو ہو کر دھڑک رہا تھا۔ سمٹنے ...ے کا انداز دل کش تھا۔ حسن اماں کی پٹی پر بیٹھا ان جلوؤں کو آنکھوں میں سمیٹ رہا تھا۔ اس کا انگ انگ ...ر رہا تھا۔

...نو نے دوائی پیالی میں انڈیلی۔ یہ پیالی اماں تک پہنچانے کا مرحلہ خاص مشکل تھا۔ حسن اماں اور اس کے ...ان ہو تھا۔ اماں برابر بولے جا رہی تھیں۔ حسن خاموشی سے رنگین جلوؤں سے حظ اٹھا رہا تھا۔

...نگ سے گز بھر کے فاصلے پر رک کر بانو نے محجوب انداز میں پیالی آگے بڑھا دی۔ حسن نے غیر ارادی طور ...ا تو بڑھایا۔ پیالی دونوں کے ہاتھوں میں لرز گئی۔ دوائی لینے کے بعد اماں نے برا سا منہ بنایا۔ بانو نے پانی کا ...اس ان کو تھما دیا۔ کلی کرنے کے بعد اماں پھر تکیئے پر سر رکھ کر لیٹ گئیں۔ حسن پلنگ سے اٹھ کر مینٹل ...ے قریب جا چکا تھا۔ جانے کیوں پہلو میں درد سا ہو رہا تھا۔ لیکن یہ درد شدت کے باوجود لذت کے ہزار پہلو ...ئے ہوئے تھا۔

"بیٹی" اماں نے بانو کی طرف دیکھا۔ جو مینٹل پیس کے قریب پڑی میز پر دوائی کی شیشیاں ٹھیک کر کے ...ہی تھی۔

"جی" بانو نے شیشی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"بیٹی۔ بھائی کے لئے چائے ہی بنا لاؤ۔" اماں نے کہا۔

"کوئی بھائی وائی نہیں۔" بانو کے جواب دینے سے پہلے ہی حسن نے کہا۔ لیکن آواز اتنی تھی۔ جو صرف ...ہی پہنچ سکتی تھی۔ اماں نہ سن پائیں۔

"کیا؟......" اماں حسن کی طرف متوجہ تھیں۔

"جی۔ کچھ نہیں۔" وہ بانو پر اک نگاہ غلط انداز ڈال کر مسکرا دیا۔ بانو کا چہرہ کانوں کی لوؤں تک سرخ ہو ...گیا تھا۔ دل پہلے ہی بے ہنگم سا دھڑک رہا تھا۔ اب تو جیسے اختیار سے باہر ہو گیا۔ جلدی سے وہ کمرے سے باہر نکل ...گئی۔

اماں حسن کو بانو کی خدمت گزاری کی داستاں سنانے لگیں۔ چائے بھی بانو نے پلائی اور کھانا بھی اسی نے

کھلایا۔ حسن تو جیسے بے پئے مست ہوا جا رہا تھا۔ بانو کے قربت اس طرح میسر آئے گی ۔ اس کا تو اسے گمان بھی نہ تھا۔ اپنی خوش بختی پر ناز کر رہا تھا۔ دونوں نے بہت کم باتیں کیں۔ لیکن سب باتیں کرنے کی نہیں ہوتیں۔ محسوس کرنے کی بھی ہوتی ہیں۔ دونوں ان کہی باتوں کو بڑی اچھی طرح محسوس کر رہے تھے۔

حسن رات بھر کا جاگا تھا۔ سفر کی تھکاوٹ بھی تھی۔ اور پھر یہاں پہنچتے ہی طمانیت اور سکون کے لمحے ملے تھے۔ کھانا کھاتے ہی نیند کی خواہش محسوس کی۔ ملحقہ کمرے میں بستر لگا تھا۔ وہ کپڑے تبدیل کر اطمینان سے سو گیا۔

کئی گھنٹے نیند نکالنے کے بعد جب آنکھ کھلی تو دن ڈھل رہا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر بستر پر لیٹا رہا۔ اس کی سوچ کے گرد گھوم رہی تھی۔ اماں کی کتنی بے لوث خدمت کی تھی اس نے۔ پیار و محبت کے جذبوں میں عقیدت شامل ہو گئی تھی۔

دو تین سگریٹ پھونکنے کے بعد وہ بستر سے اٹھا۔ انگلیوں سے بالوں کو سلجھایا وہ اماں کے کمرے میں گیا۔ ثریا اور بی بی کی باتوں کی آوازوں نے اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ورنہ وہ تو بڑے سہانے تصور میں کھویا ہوا تھا۔ بی بی کو جھک کر سلام کرنے کے بعد وہ ثریا کی طرف بڑھا۔ ثریا بھی مسکراتے ہوئے اس کی طرف لپکی۔ اس نے اسے بازوؤں میں لے کر بڑے بھائی کی طرح شفقت سے پیار کیا۔

"اتنی لمبی تان کر سوئے تھے۔ دو تین دفعہ تمہیں دیکھ آئی۔ ثریا نے ہنس کر کہا۔

"جگا لیا ہوتا۔" حسن بھی مسکرایا۔

"رحم فرمایا تم پر عابد دولت نے" وہ اٹھلائی۔ "سوچا رات بھر کے جاگے ہو گے۔ آرام کر ہی لو۔"

"شکریہ۔ شکریہ۔ "بڑی دریا دل ہو گئی ہو۔ شادی کر کے۔"

اماں اور بی بی دونوں چھیڑ چھاڑ سے محظوظ ہونے لگیں۔

"بڑی خوبصورت ہو گئی ہو۔ کیا یہ سب ان کپڑوں کی وجہ سے ہے یا واقعی۔" اس کے ریشمی کپڑوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"لو پہلے کیا بد صورت تھی وہ۔" بی بی نے بہو کو محبت سے دیکھ کر کہا۔ "چاند چاندنی ہے۔"

"اوہو۔ بی بی اتنی مبالغہ آرائی۔"

"چل شریر کہیں۔" اماں نے سرزنش کی۔ وہ اماں کے قریب پلنگ پر بیٹھ گیا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ خاندان۔ بیاہ شادی اور موسم سے ہوتی بات چیت ملکی سیاست پر آ گئی۔ بی بی کو سیاست سے دلچسپی تھی۔ ثریا چائے بنانے چلی گئی۔

"لاہور میں کیا حال ہے مسلم لیگ کا۔" بی بی نے پوچھا۔
"اللہ کا فضل ہے۔ خوب زور شور سے الیکشن کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔" حسن نے اعتماد سے جواب دیا۔
"اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ہمت اور حوصلہ دے۔ زیست و موت کا مرحلہ ہے۔"
"بالکل...... مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کروانا ہے۔ اس کے لئے انتھک کام اور اتحاد کی ضرورت ہے۔"
"اتحاد، تنظیم، یقین محکم۔" بی بی مسکرائی۔ "ہمارا نصب العین یہی ہے۔"
"آپ لوگ آج کل کیا کر رہے ہیں؟"

"جو کچھ بن پڑتا ہے۔"
"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن کچھ فنڈ جمع بھی ہوا۔"
"پچھلے دنوں ہم نے ایک مینا بازار لگایا تھا۔ لڑکیوں نے ایک ڈرامہ بھی سٹیج کیا۔ کوئی اڑھائی ہزار روپیہ جمع ہوا۔ قائد اعظم ریلیف فنڈ میں دے دیا۔
"بہت خوب...... بی بی اس وقت مسلم لیگ کو ایک ایک پیسے کی ضرورت ہے۔ آپ اسی طرح فنڈ ہی جمع کریں تو بہت مدد مل سکتی ہے۔"
"بیٹا یہی کام ہمارے بس کا ہے۔ کر رہے ہیں۔" بی بی بولیں۔ "کبھی کبھی جلسے کا بندوبست بھی ہو جاتا ہے۔ نظریہ پاکستان عوام تک پہنچانے کے لئے جلسے وغیرہ بڑے اہم ہیں۔"
"اکثر کرتے رہا کریں جلسے۔"
"جتنا وقت مل سکتا ہے۔ کر لیتے ہیں۔ دراصل عورتوں کو گھر سے نکالنا بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ ہماری کمیٹی کی ممبران خود ایسی ہیں۔ کہ مشکل وقت دے سکتی ہیں۔ عوام کی تو بات ہی الگ ہے۔"
"پھر بھی بی بی اتنا بھی غنیمت ہے۔ حسن بولا۔" شکر ہے ہماری عورت کچھ تو بیدار ہوئی ہے۔" ثریا چائے کی ٹرے لے کر آ گئی۔ ـ وہ حسب عادت مسکرا رہی تھی۔
"اس کا میاں مسلمان ہوا یا نہیں۔" ثریا کی طرف دیکھ کر حسن نے بی بی سے پوچھا۔
"اسے قائل کر لو تو جانوں۔ تم نے کوئی کام کیا ہے۔" بی بی مایوسی سے بولیں۔
"وہ تو شاید قائل ہو ہی جائے۔ اس کے کانگرسی دوست اسے قائل ہونے نہیں دیتے۔"
"یہی بات ہے۔"
"ثریا خالہ تم بھی اپنے میاں کو کچھ نہیں کہتیں۔ ملت کے غدار کو سیدھی راہ پر لے آؤ۔ ورنہ معاملہ اچھا

نہیں۔" حسن نے مسکرا کر کہا۔ ثریا ہنس پڑی۔

"تم اپنی نبھاؤ۔" مسکراتے ہوئے بولی۔ "ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔"

"گویا اس کا رنگ تم پر بھی چڑھ گیا ہے۔" حسن نے پوچھا۔

"چڑھے گا نہیں تو اور کیا۔" ثریا ہنستے ہوئے بولی۔

چائے کے دوران بھی گپ شپ ہوتی رہی۔ ثریا نے اماں کو سہارا دے کر بٹھایا۔ حسن نے چا میں گھونٹ گھونٹ ڈال کر انہیں پلائی۔

شام بی بی گھر چلی گئی۔ ثریا کو آج اماں کے پاس چھوڑ دیا۔ بانو گھر چلی گئی تھی۔ تین دن سے متواتر کی خدمت کر رہی تھی۔ یوں بھی حسن کے آجانے سے اسے گھر جانا ہی تھا۔

بانو رات بھی نہیں آئی۔ صبح بھی حسن انتظار ہی کرتا رہا وہ نہیں آئی۔ ایک دم ہی اسے ویرانی کا ا ہونے لگا۔ مزاج کی شگفتگی جاتی رہی۔ الجھا الجھا سا ادھر ادھر پھرتا رہا۔

شام اسے واپس جانا تھا۔ اماں کی طرف سے مطمئن ہو چکا تھا۔ لیکن بانو اسے بیکل کر گئی تھی۔ وہ کل اب تک نہ لوٹی تھی۔ حسن کا ذہن وسوسوں کی آماجگاہ بن گیا۔

شام بی بی بھی اماں کو دیکھنے آگئی۔ ثریا بھی یہیں تھی۔ نعیم اور ندیم بھی آئے ہوئے تھے۔ ناصرہ موجود تھیں۔ اور رکھو دھوبن اپنی ڈیڑھ سالہ بچی کو توری کی طرح کندھے سے لٹکائے اماں کے احوال پر تھی۔ لیکن ان سب کی موجودگی میں حسن کو تنہائی کی ویرانی ڈس رہی تھی۔

گاڑی کا وقت قریب تھا۔ حسن تیار ہوا۔ بیگ میں اپنی چیزیں ڈالیں۔ اماں کے گلے ملا۔ ثریا کے سر پھیرا۔ بی بی سے دعائیں لیں۔ نعیم ندیم سے ہاتھ ملایا۔ اور رکھو کے سلام کا سر کے اشارے سے جواب چل دیا۔ اماں کی دعائیں اسے گھر سے باہر نکلتے بھی سنائی دے رہی تھیں۔

بانو کے گھر کے سامنے وہ چند لمحے رکا۔ کچھ سوچا۔ پھر آگے بڑھ گیا۔ لیکن جانے کونسی مقناطیسی تھی۔ جس نے قدم روک لئے۔ وہ ایک دم مڑا۔ اور تیز تیز قدم اٹھاتے گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ گھر باورچی خانے کے دروازے کے پاس ہی چارپائی پر بانو بیٹھی تھال میں چاول ڈالے چن رہی تھی۔ ایک شلغم کاٹ کر رکھے ہوئے تھے۔ تھالی میں ٹماٹر اور سبز دھنیہ بھی صاف کر کے رکھا ہوا تھا۔

قدموں کی چاپ پر اس نے سر اٹھایا حسن کو دیکھ کر وہ گھبرا سی گئی۔ حسن اس کے قریب آگیا۔ وہ وہیں رک کر کھڑی ہو گئی۔ دوپٹہ ٹھیک طرح سے اوڑھتے ہوئے کسمسائی۔

حسن خاموش کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ نظروں کی تپش چہرے پر محسوس کر رہی تھی۔ کہتے کہتے بولی پر نہیں ہیں۔"

"میں بی بی سے ملنے نہیں آیا۔" حسن نے دو ٹوک جواب دیا۔

"جی۔ جی..... اس نے پلکیں اٹھائیں۔ جھپکائیں۔ پھر جھکالیں۔ اک لمحے میں یہ عمل کئی بار ہوا۔

"بانو..... " حسن کی آواز سوز دروں سے تپ رہی تھی۔ بانو نے اس کی طرف دیکھا یہ نگاہیں مستفسرانہ

"بانو۔" وہ اس کے عین سامنے آ گیا۔

بانو نے پھر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی محجوب سی مسکراہٹ بھی تھی۔

"بانو" حسن مضطربانہ انداز میں بولا۔

"میں صرف دو دن کے لئے آیا تھا۔ وہ بے تابی سے بولا۔

"بانو نے اداس نظریں اٹھائیں۔

"تم تین دن اماں کے پاس رہیں۔ میں کل آیا۔ تم واپس چلی آئیں۔ میں رات انتظار کرتا رہا۔ صبح سے

تمہاری راہ دیکھتا رہا۔ تم نہیں آئیں۔ تم کیوں نہیں آئیں۔ حسن نے یوں بے دھڑک سب کچھ کہہ

وہ سب کچھ کہنے کا حق رکھتا ہو۔ اور بانو اس حق کو تسلیم کر چکی ہو۔

تکلف اور حجاب کے پردے دو وجودوں کے درمیان ہو سکتے ہیں۔ لیکن جب معاملہ دو روحوں کے ملاپ کا

پردے خود بخود گر جاتے ہیں۔ بانو کے لبوں پر بڑی ہی لطیف مسکراہٹ آ گئی۔ تکلف اور حجاب کے

گر گئے تھے۔ بانو حسن کا حق تسلیم کر چکی تھی۔

"بانو کیا سمجھ لوں کہ تمہیں میری موجودگی گوارا نہ تھی۔ اور۔" حسن کی بات بانو کی مضطرب نظروں اور

بے چین حرکت نے کاٹ دی۔

"آپ۔ آپ۔" وہ اپنے ہاتھ ملتے ہوئے صرف اتنا ہی کہہ سکی۔ اس کی آواز کے کرب نے حسن کی

کا ازالہ کر دیا۔ کئی لمحے وہ خاموشی سے اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھتا رہا۔ بانو نے تڑپا دینے والی مجروح

سے پھر اسے دیکھا۔

"میں لاہور واپس جا رہا ہوں بانو۔" اس نے افسردہ سی آواز میں کہا۔ بانو نے دھیرے دھیرے سر اٹھایا۔

خوب صورت آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔

"بانو" حسن کے لب پھڑپھڑائے۔ بانو نے سر جھکا لیا تھا۔ دوسرے لمحے وہ واپس جانے کو مڑ چکا تھا۔ اس کی

سرشار تھی اس کے حواس پر کسی فاتح کا سا احساس تھا۔ اسے توقع سے کہیں زیادہ مل گیا تھا۔

صحن کی ڈیوڑھی میں کھلنے دروازے پر پہنچ کر اس نے ایک بار پلٹ کر دیکھا۔ بانو ساکت سی کھڑی اسے ہی

رہی تھی۔

۱۹۴۶ء میں انتخابات ہوئے۔ مسلم لیگ نے مرکز کی تمام نشستیں اور صوبوں کی بیشتر نشستیں جیت کر
کر دیا کہ وہی مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ تنظیم ہے۔ مسلم اکثریت کے صوبوں میں سوائے سرحد کے
نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔

تاریخ میں کوئی مثال ایسی دستیاب نہیں۔ جب کہ پوری قوم اتنے عرصے میں ایک پلیٹ فارم پر
ہو۔ جس عرصے میں اس وسیع و عریض بر اعظم کے مسلمان جمع ہوئے۔ اور نہ ہی اس سے قبل کسی قوم نے
طور پر لفظ اقلیت سے موسوم کیا جاتا رہا۔ ایسی ہمت اور مستعدی سے اپنے وجود کی اہمیت تسلیم کرائی۔
لاکھوں کروڑوں انسانوں نے ایسے نامساعد حالات میں فکر و عمل کے ایسے اتحاد کا ثبوت دیا تھا جو مسلمانان
دیا۔

مسلم لیگ کی کامیابی سے کانگرس جو خالص ہندو تنظیم تھی اور جس نے دھوکہ دہی کے لئے بھائی
لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ سخت تلملائی۔ رام راج کا خواب بکھرتا نظر آیا۔ نہرو چیخا۔ ووٹ کا غلط استعمال
ہے۔ گاندھی کے آتما صدمے سے بلبلائی۔ مسلمانوں کی ہزار برس کی غلامی کے بعد اب ہندو انگریز سے
حاصل کر کے مسلمانوں کو کچل کر اسے برہمو سماج کا قابل نفرت حصہ بنا دینے کا سوچ رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جس
اس نے ہند کے اصلی باسیوں کو ہزار سال قبل روندا تھا۔ اور خود ملک کا مالک بن بیٹھا تھا۔ ہندو ذہنیت
سوچ رہی تھی۔

لیکن دل مسلم اس زندہ تمنا کو پا چکا تھا۔ جو اس کی روح گرما چکی تھی۔ قلب کو تڑپا چکی تھی۔ بجلیاں
بادل میں بھی خوابیدہ تھیں۔ قوم کو آداب خود آگاہی ہو آگئے تھے۔ لیکن مسلمانوں کی بدقسمتی یہ تھی
جہاں ان میں سراج الدولہ اور ٹیپو پیدا ہوئے تھے وہاں میر جعفروں اور میر صادقوں کی بھی کمی نہ تھی۔
فروش کانگرس سے وابستہ تھے۔ کانگرس جس قوم کو تلوار سے رام نہ کر سکی۔ اسے اسی کے افراد سے

http://www.rehanahmed.com

اسلام کے درپے ہو گئی۔ کانگرس مسلمانوں کو اپنا آلہ کار بنا لیا۔ مہاجنوں کی تجوریوں کے منہ کھل گئے۔ مسلمانوں کے ایمان کا سودا مسلمان ہی کی وساطت سے کرنے کی تدبیریں سوچی جانے لگیں۔

پنجاب میں تقریباً ساری مسلم نشستوں پر مسلم لیگ قابض تھی۔ از روئے اخلاق و قانون وزارت بنانے کا حق مسلم لیگ کو حاصل ہوتا تھا۔ لیکن ہندو ذہن مسلمان کا اقتدار کہاں گوارہ کر سکتا تھا۔

سر خضر حیات اور اس کے چند ساتھیوں کو جو انگریز کے پروردہ تھے۔ کانگرس نے اپنے ساتھ ملا لیا۔ انھیں مسلمانان پنجاب کا نمائندہ تسلیم کر کے ہندو سکھ اور دوسرے غیر مسلم عناصر کو ان کا پشت پناہ بنا دیا۔ خضر وزارت تشکیل پا گئی۔ یہ در حقیقت کانگرس لیکن بظاہر یونی نسٹ وزارت تھی۔ ہندو نے نگین خضر کے ماتھے پر رکھ دی تھی۔ یوں قوم کو اپنوں نے لوٹا۔

یہ مسلمانان پنجاب کی غیرت کو کھلا چیلنج تھا۔ اپنی اکثریت کے صوبے میں شاطرانہ چالوں سے اس پر کانگرس چھا گئی تو دوسری جگہوں پہ مسلمانوں کا کیا حشر ہو گا؟ اور ایسی صورت میں اگر آزادی مل گئی۔ تو کانگرس مسلمانوں کو اقلیت سمجھ کر کیا کیا ظلم نہ ڈھائے گی۔ یہ موقعہ تھا۔ جو مسلمان پوری طرح جاگ اٹھے۔ خضر وزارت کو توڑ دینے کے لئے وہ سیسہ پلائی دیوار کی طرح ڈٹ گئے۔ اور اپنے حق کے لئے انہوں نے جدوجہد کا عملی آغاز شروع کر دیا۔

یہ تحریک پاکستان کی تقویت کے لئے کافی تھا۔ ایجی ٹیشن شروع ہو گئی۔ وزارت پر عدم اعتماد کے مظاہرے شروع ہو گئے۔ حکومت نے امن بحال کرنے کے لئے مسلم لیگ پر پابندی عائد کر دی۔ بظاہر دوسری جماعتوں کو بھی خلاف قانون قرار دے دیا۔ لیکن کانگرس کو من مانی کرنے کی کھلی چھٹی مل گئی۔

حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ مسلم لیگی زعماء کی گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ پریس پر پابندی لگی۔ مسلم لیگ کو ہر طرف سے کچلنے کی سازش عمل میں لائی گئی۔۔ لیکن

مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔

لیڈروں کے جیل میں ٹھونسے جانے کے بعد قیادت نوجوان طبقے کے ہاتھ میں آ گئی۔ نئے خون نے تحریک کو دو آتشہ کر دیا۔ نوجوان اپنی تعلیمی سرگرمیوں کو پس پشت ڈال کر پاکستان حاصل کرنے کے عظیم مقصد کو لے کر اٹھے۔ آناً فاناً ملک کے طول و عرض میں پھیل گئے۔

حالات نے جو صورت اختیار کی۔ انگریز سنجیدگی سے جائزہ لینے پر مجبور ہو گیا۔ خضر ہراساں تھا جن شاہین بچوں کو بے بال و پر سمجھا تھا۔ ان کی پرواز دیکھ کر سہم گیا تھا۔ قوم کی مائیں، بہن بیٹیاں بھی اس جہاد میں شریک ہو گئی تھیں۔

گورنر نے مجبور ہو کر خضر وزارت توڑ کر مسلم لیگ کو وزارت بنانے کی دعوت دی کانگرس کے نرغے میں

آیا ہوا شکاری یوں نکل گیا۔ اس کا صدیوں کا سپنا ٹوٹ گیا۔ مایوسی ہی مایوسی چاروں طرف گھیرا ڈالے تھی۔ حسن امتحان سے فارغ ہو کر لدھیانے آیا سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اس نے امتحان کی تیاری بھی کر لی تھی۔ پاس ہو جانے کی قوی امید تھی۔ نوکری کے لئے بھی وہ اپنے دو ایک دوستوں کے والدوں سے مل آیا تھا دوستوں کے والد اثر رسوخ رکھنے والے تھے۔

حسن اب فارغ تھا۔ چند دن لاہور قیام کرنے کے بعد اپنے دوستوں سے جدا ہو کر لدھیانے آ گیا مستقبل کا پورا پروگرام اس نے طے کر لیا تھا۔

اماں کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ نعیم بھی تبدیل ہو کر لدھیانے آ گیا ہے۔ حسن کی خوشی کی انتہا نہ رہی کھانا کھا کر اس نے آرام بھی نہیں کیا۔ نعیم سے ملنے ان کے ہاں چل دیا نعیم سے زیادہ بانو کی کشش کھینچ رہی تھی۔ نعیم تو تقریب ملاقات کا بہانہ تھا۔

ڈیوڑھی میں بی بی کھڑی تھی۔ اس نے بڑے مودبانہ طریق سے انہیں سلام کیا۔

"جیتے رہو..... " بی بی نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "کب آئے خیریت سے تو ہے نا۔ "

"جی شکریہ"

امتحان ہو گیا۔ "

"جی"

"کیسے پرچے ہوئے؟"

بس پاس ہونے کے ہو گئے ہیں۔ اتنا بھی غنیمت ہے۔ تیاری کا تو موقع ہی نہیں ملا۔

"الیکشن جیتنے میں لگے رہے۔" مبارک ہو۔ " بی بی نے خوش دلی سے کہا۔ پھر مڑیں اور بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔

"چلو بیٹھو بی بی بیٹھک میں داخل ہو گئیں۔

"نعیم کی۔ سنا ہے یہاں تبدیلی ہو گئی۔ " حسن بھی ان کے پیچھے پیچھے اندر چلا آیا۔

"ہاں سات آٹھ دن ہوئے۔ اچھا ہوا بدل کر یہاں ہی آ گیا ہے۔ "

"کہاں ہے وہ۔ "

"پتہ نہیں اوپر ہو گا۔ تم بیٹھو میں بلاتی ہوں اسے۔ " بی بی باہر نکلیں۔ حسن کرسی پر بیٹھ کر اخبار دیکھنے لگا۔

"اسلام علیکم " نعیم نے بڑا زور دار سلام مارا۔ حسن اچھل کر اٹھا اور دوسرے لمحے دونوں بغل گیر ہو گئے۔

"کب آئے؟" معانقے کے بعد دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر بیک وقت بولے۔ دونوں ہنس پڑے۔

"بیٹھو" فہیم کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ حسن بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"کمال ہے نا چار سال پہلے ہم اکٹھے ہی لدھیانہ سے نکلے تھے۔" حسن نے خوش دلی سے کہا۔ "اور اکٹھے واپس آئے ہیں۔"

"دوستی ہو تو ایسی ہو۔" فہیم نے حسن کو ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

دونوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔

"فہیم" بی بی اندر آتے ہوئے بولیں۔ فہیم نے ماں کی طرف مستفسرانہ دیکھا۔ بی بی نے اشارے سے حسن کے لئے شربت پانی لانے کو کہا۔

"اچھا بی بی جاتا ہوں۔" فہیم بولا۔

"کہاں" حسن نے پوچھا۔

"کوئی پانی وانی لے آؤں تمہارے لئے۔"

"تکلف چھوڑو یار۔ باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔"

"باتیں کرنے کو بڑا وقت ہے" بی بی بولیں۔ "اب تو دن رات اکٹھے رہو گے۔ ساری کسر نکل جائے گی۔ جاؤ بیٹا۔ پانی لے آؤ پہلے۔"

فہیم اٹھ کر باہر نکل گیا۔ حسن بی بی سے گھر بار کی خیریت دریافت کرنے لگا۔

"ثریا خالہ کہاں ہیں؟" حسن نے پوچھا۔

"اوپر اپنے کمرے میں ہو گی۔ کچھ سی پرو رہی ہے۔ بی بی بولیں۔

"میں انہیں مل آؤں۔" حسن اٹھا۔

"جاؤ۔" بی بی نے کہا۔ "بڑا یاد کرتی ہے تمہیں۔ تم یہیں آگئے۔ بڑی خوش ہو گی۔ وہ۔"

حسن مسکراتے ہوئے کمرے سے باہر نکلا اور ڈیوڑھی سے اوپر جانے والی سیڑھیوں پر جلدی جلدی چڑھنے لگا۔

ثریا کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر سے مشین چلانے کی آواز آرہی تھی۔

"ثریا خالہ" حسن بے دھڑک کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ مشین پر جھکی ثریا خالہ کو کندھوں سے پکڑ کر جھوڑ دینے کو لپکا۔ اس کے پیار کا یہ بھی انداز تھا۔ لیکن مشین پر جھکا ہوا چہرہ اٹھا گردن مڑی۔

"اوہ" اس کے لبوں سے نکلا۔ وہ ثریا نہیں بانو تھی۔ ثریا شاید کسی کام سے اوپر گئی تھی۔

بانو کے چہرے پر گلاب کی نرم و نازک پتیوں کا سا معصوم نکھار آگیا۔ لبوں پر مسکراہٹ کی چمک گئی۔ حسن کی پر شوق نظروں نے یہ نکھار اور چمک بڑے سلیقے اور اہتمام سے جذب کرلی۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ بانو کا مشین پر چلتا ہاتھ رک گیا تھا۔ دونوں کے دل دھڑک رہے تھے۔ ایک ہی لے پر۔ ایک ہی ترنم سے۔

"بانو۔" حسن نے خاموشی کا طلسم توڑا۔ "اچھی تو رہیں۔" بانو لجا کر سمٹ گئی۔ وہ چند قدم اٹھا کر اس کے سامنے آگیا۔

"میں امتحانوں سے فارغ ہو کر آگیا ہوں بانو۔ اب نوکری ملنے تک یہیں رہوں گا۔ تمہیں خوشی ہوئی نا۔"

بانو نے بڑے حسین انداز میں اسے دیکھا۔ اس کی مسرتوں کا اندازہ لگانا حسن کے لئے کچھ مشکل نہ تھا۔ خوشی کا جانفزا احساس اس کے رگ وپے میں دوڑ گیا۔

"تم نہیں جانتیں بانو۔ میں نے اس دن کا کس بے چینی سے انتظار کیا۔"

"کس کا انتظار کیا" ہنستے ہوئے ثریا بولی۔ وہ کمرے میں آگئی تھی۔ بانو گھبرا گئی۔

"تمہارا اور کس کا ثریا خالہ" حسن نے حاضر دماغی سے کام لیا۔ "اوہ ثریا خالہ۔ تم کتنا یاد آتی تھیں مجھے خوشی تو اسی بات کی ہے کہ میں یہاں آگیا ہوں۔ دن رات تمہارے قریب رہوں گا۔ خوب تنگ کیا کروں گا تمہیں۔ ترس گیا تھا تمہیں دیکھنے کو۔

ثریا کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ دیا۔

ثریا ہنس دی۔ بانو نے گھبراہٹ پر قابو پالیا۔

"جھوٹا کہیں کا۔ کبھی بھولے سے بھی یاد نہ کیا ہو گا۔ لگا اب الٹی سیدھی ہانکنے تجھے تو اپنی مسلم لیگ سے چھٹی نہ ملتی ہوگی۔ مجھے یاد کیا کرتا۔؟"

ثریا خالہ" حسن نے شوخی سے کہا۔ "گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار۔ لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا۔ میرا دن کا چین اور رات کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ جناب نے"

ثریا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بانو کے چہرے پر سرخی کی لہر دوڑ گئی۔ حسن کا اشارہ اسی کی ذات کی طرف تھا۔ وہ یہ بات سمجھ گئی تھی۔ ثریا کی آڑ لے کر حسن اپنی بے تابیوں اور بے چینیوں کو بانو پر واضح کرتا رہا۔

نعیم سرکاری ملازم تھا۔ تحریک پاکستان میں عملی حصہ نہ لے سکتا تھا۔ لیکن حسن آزاد تھا۔ اس لئے کھل
... آیا۔ جلد ہی اس نے شہر کی لیگی تنظیم سے رابطہ قائم کیا۔ اور اپنی بے لوث خدمات ملت کے لئے وقف
... ملک اس وقت بڑے نازک دور سے گزر رہا تھا۔ مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو چکے تھے۔ پاکستان کا
... ایک حقیقت بننے کے مراحل تیزی سے طے کر رہا تھا۔ انگریز بوکھلایا ہوا تھا۔ ہندو تلملا رہا تھا۔ خضر وزارت
... کے بعد گورنر نے پنجاب میں مسلم لیگ کو وزارت بنانے کی دعوت دی تھی۔ کانگرس منہ میں آیا شکار
... پر تیار نہ تھی۔ مہا تمائی ذہن کی تخریبی سوچ عملی صورت میں ظاہر ہونے لگی۔ مسلم لیگ کی وزارت کو
... کیوں کر برداشت کر لیتی۔ مسلمانوں کا مسلمانوں کی اکثریت کے صوبے میں بھی راج اسے گوارا نہ تھا۔
ہندو سازشی ذہن تیزی سے مسلمانوں کی تباہی کے منصوبے بنا رہا تھا۔ راشٹریہ سیوک سنگھ اور اکالی دل جیسی
... اور پکڑ رہی تھیں۔ ہندو اور سکھ کثیر تعداد میں پاکستان میں شامل ہونے والے علاقوں سے بردوار کا رخ کر
... تھے۔ نیپر سے دھڑا دھڑ اسلحہ ہندوستان کے ان علاقوں میں پہنچ رہا تھا۔ جو ہندوستان ہی میں رہنا تھے۔
... وں کے گوردوارے اسلحہ خانے بن رہے تھے۔ ہندوؤں کے مندر اسلحہ ساز فیکٹریوں میں تبدیل ہو رہے تھے۔
مسلمان آئینی حدود کے اندر رہ کر پاکستان حاصل کرنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ یہ مسلمان کی بے وقوفی کی حد
... سادگی تھی۔ بہار اور گڑھ مکتیشر کے فسادات جہاں مسلمان کو بھیڑوں بکریوں کی طرح ذبح کیا گیا۔ ان
... ال لوٹا گیا اور ان کی آبرو مجروح کی گئی۔ مسلمانوں کی آنکھ کھول دینے کو کافی تھے۔ لیکن مسلمان روادار تھا۔
... کے بڑے صبر سے برداشت کر رہا تھا۔ اس کا نعرہ ایک ہی تھا۔ "لے کے رہیں گے پاکستان"
"نہرو چیخ رہا تھا۔ کہ پاکستان بنے گا تو میری لاش پر بنے گا۔" گاندھی چلا رہا تھا کہ پاکستان "گئو ماتا کے
... کرنے والی بات ہے۔
ان باتوں سے بوئے نفرت آتی تھی۔ تعصب اور دشمنی کے لپکے آتے تھے۔ لیکن مسلمان اس وقت

بھی حدود تجاوز کرنے کو تیار نہ تھے۔ عام تاثر یہی تھا۔ کہ ملک تقسیم ہو جائے گا تو تعصب' منافرت اور دشمنی ختم ہو جائے گی۔ بلکہ دونوں قوموں میں پیار اور محبت بڑھے گا۔ ایک گھر میں جب دو بھائی اکٹھے نہیں رہ سکتے گھر کی تقسیم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ایک ملک میں جب دو قومیں اکٹھی نہیں رہ سکتیں تو ملک تقسیم کر لیا جائے گا لیکن پاکستان اور ہندوستان کی سیاست بڑی غلط ڈگر پر چل نکلی تھی۔ یہ ایک منطقی گتھی نہیں تھی۔ جسے باتوں اور بحث مباحثے سے سلجھایا جا سکتا۔ دوربین نظریں خون کا وہ دریا دیکھ رہی تھیں۔ جو اس تقسیم کی وجہ سے بہنے والا تھا۔

سلیم کے سوا نصیر الدین کا پورا گھرانہ مسلم لیگی تھا حسن کے آجانے سے اس گھرانے کے جوش ولولے میں دو چند اضافہ ہو گیا تھا۔

"جی چاہتا ہے استعفا دے کر میں بھی عملی طور پر تمہارے شانہ بشانہ کام کروں۔ اکثر فہیم اس سے کہتا۔ قسم جب تمہیں سٹیج پر کھڑے تقریر کرتے دیکھتا ہوں۔ تو بے اختیار جی چاہتا ہے کود کر سٹیج پر آجاؤں۔

"اتنے بے صبرے نہ ہو فہیم۔ حسن ہنس کر کہتا۔ "تمہارے بغیر ابھی کام چل رہا ہے۔ تمہارا سہارا بھی کافی ہے۔ اور پھر تمہاری جگہ بی بی اور بانو جو کام کر رہی ہیں۔"

"بی بی اور بانو اپنی جگہ۔ اس وقت تو قوم کے بچے بچے کو کام کی ضرورت ہے"۔

"ٹھیک تو کہتے ہو۔ پھر بھی ابھی کام تسلی بخش طریق سے چل رہا ہے۔"

دن گزر رہے تھے۔ ہندو جارحیت میں جتنا اضافہ ہو رہا تھا۔ تحریک پاکستان اتنی ہی شدت اختیار کر رہی تھی۔

بہار میں فسادات کی آگ بھڑکی۔ لیکن ان فسادات سے مسلم کا حوصلہ پست نہیں ہوا۔ بلکہ اس خون نے مسلمان کے عزم کو تقویت ملی۔

ان دنوں بہار کے نوجوان اپنے زخمی سینوں اور جلے دامن کو لئے ملک کے طول و عرض میں نظریہ پاکستان کی حمایت کرتے پھر رہے تھے۔ وہ خود جل گئے تھے۔ لیکن ہندوستان کے مسلم اکثریت کے علاقوں کے مسلمانوں کو محفوظ دیکھنا چاہتے تھے۔

بہار کا ایک ایسا ہی نوجوان لدھیانے آیا۔ اس کے والدین جوان بیوی اور ایک سال کا بچہ ہندوؤں کا شکار ہو چکا تھا۔ لیکن یہ مظالم اس کے عزم کو ڈگمگا نہ سکے تھے۔

لدھیانہ کے مسلمانوں نے بڑے جوش و خروش سے اس کا خیر مقدم کیا۔ فوراً جلسے کا بندوبست کیا گیا۔ حسن اور اس کے ساتھیوں نے دن رات ایک کر کے جلسے کو کامیاب بنانے کی سعی کی۔ خود اشتہارات تقسیم کئے۔ لاؤڈ سپیکر لے کر جلسے کا اعلان گلی گلی کوچے کوچے کیا۔

بی بی، بانو اور دیگر کارکن عورتوں سے بھی جلسے کو کامیاب بنانے کی عملی جدوجہد کی۔

"آپ عورتوں کو گھروں سے باہر لائیں۔ اس زخمی دل والے نوجوان کی فریاد ہر کان تک پہنچنی چاہئے

بی بی" حسن نے بانو اور بی بی سے کہا۔ "آپ گھر گھر جا کر عورتوں کو جلسے میں شمولیت کی دعوت دیں۔"

بانو کے لئے فرمودہ الٰہی کے بعد اگر ایمان لانے کی کوئی شے تھی۔ تو وہ حسن کی بات ہی تھی۔ حسن کی بات اس کا ایمان تھا۔ بی بی کے ساتھ اس نے واقعی گھر گھر جا کر لوگوں کو راہ ہدایت دکھائی۔

جلسے میں توقع سے کہیں زیادہ عورتوں اور مردوں نے شرکت کی۔ سٹیج کے پیچھے پردہ لگا کر عورتوں کا بندوبست کیا گیا تھا۔ عورتوں اور مردوں کا اتنا عظیم اجتماع لدھیانہ میں پہلی بار دیکھنے میں آیا تھا۔ یہ مسلمانوں کی بیداری کا کھلا ثبوت تھا۔

لوگ اس لئے بھی بہاری مسلمان کو دیکھنے کے لئے بے تاب تھے۔ جو بیتے کا رستا خون دکھانے آیا تھا۔ جلسے کی کارروائی شروع ہوئی۔ تلاوت کلام پاک کے بعد جوشیلے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ دو ایک مقامی لیڈروں نے دھواں دھار تقریریں کیں۔ لوگوں میں جوش و ولولہ موجود تھا۔ تقریریں موثر تھیں۔ جوش و ولولہ 'نعرہ تکبیر اور پاکستان کے نعروں سے خوب عیاں تھا۔

اب وہ بہاری نوجوان سٹیج پر آیا۔ تو لوگوں کا جوش دید کے قابل تھا۔ ہر دل مضطرب اور ہر آنکھ نم تھی۔ بہاری نوجوان کا درد ہر مسلمان کو اپنے دل میں اٹھتا محسوس ہو رہا تھا۔ اللہ اللہ اتحاد کا یہ عالم!..... وہ بہاری نوجوان مقرر نہیں تھا۔ نہ ہی اسے استادانہ فن آتے تھے۔ لیکن جذبات کے اظہار کا جو اس نے سیدھا سادا طریقہ اختیار کیا وہ ہر دل میں اتر گیا۔ مظالم کی سنسنی خیز داستان جو اس نے دہرائی۔ ہر دل سہم گیا۔

"مظالم کی یہ سنسنی خیز داستان سنا کر میں اپنے لئے ہمدردی جیتنے کا خواہش مند نہیں ہوں۔ نہ ہی میں مظلوم بن کر آپ سے رحم کی توقع لے کر آیا ہوں۔ ہم جانتے ہیں۔ کہ کسی بھی عظیم مقصد کو قربانی کے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں فخر ہے۔ کہ قربانی دینے میں ہم نے پہل کی۔ ہم جانتے ہیں۔ پاکستان بنے گا تو سرحد میں بنے گا سندھ اور پنجاب میں بنے گا بنگال میں بنے گا۔ بہار کو اس ارض مقدس میں شامل نہیں کیا جائے گا۔ اس کے باوجود ہم اس گوشہ عافیت کے لئے کوشاں ہیں۔ کیوں کہ ہم مسلم اکثریت علاقوں میں رہنے والوں سے زیادہ ہندو کو بہتر جانتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں۔ پاکستان بن جانے کی صورت میں ہم غیر محفوظ ہوں گے۔ لیکن ہمارے لئے یہی تسکین اور اطمینان کا پہلو ہو گا۔ کہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی اکثریت محفوظ ہو چکی ہے۔ اس تسکین دہ احساس کے سامنے قربانی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ قوموں کی بقا کے چراغ شہیدوں کے لہو سے جلا کرتے ہیں۔ ہم اس مقصد کے پیش نظر یہ پہلو فراہم کرنے کو تیار ہیں۔"

پنڈال نعروں سے گونج رہا تھا۔ لوگوں کا جوش و خروش دید کے قابل تھا۔ مرحبا۔ مرحبا کی صدائیں اٹھ رہی

تھیں۔ اسلام زندہ باد اور پاکستان زندہ باد کے فلک شگاف نعرے گونج رہے تھے۔ جلسے کو حسن نے بھی خطاب کیا۔ نظریہ پاکستان پر سیر حاصل تقریر کرنے کے بعد اس نے قربانی اور ایثار کے اس پتلے کو خراج عقیدت پیش کیا۔ جو لٹ کر بھی پاکستان کا حامی تھا۔ حسن نے سچے مسلمان کی شان بیان کرتے ہوئے جب لوگوں سے کہا

"غلامی میں مسلمان کے لہو کا یہ رنگ ہے تو آزاد ملک میں آزاد قوم کے خون کی کیا شان ہوگی؟"

جلسے میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ ہر ذہن میں اس اسلامی مملکت کا پر تو گھر آگیا۔ جس میں اسلامی نظام حکومت ہو گا۔ جو چوروں اور لٹیروں کی نہیں۔ خدا کے نیک بندوں اور رسول مقبول کے سچے پرستاروں کی ریاست ہوگی

رات دیر تک حسن نصیر الدین کے ہاں بیٹھا رہا۔ آج کے جلسے پر تبصرہ ہو رہا تھا ایک دوسرے کو داد دی جا رہی تھی۔

"بانو بی بی نے واقعی بہت بڑا کام کیا ہے۔ آج تک اتنی تعداد میں عورتیں کبھی جلسے میں شریک نہ ہوئی تھیں۔"

"اس کا بہت اچھا اثر ہو گا۔" نصیر الدین بولے۔ "عورتوں میں اپنی بات منوانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ ایسے مردوں کو بھی راہ راست پر لے آئیں گی۔ جو اب تک نظریہ پاکستان کے مخالف ہیں۔ ہر عورت اگر اپنے گھر میں لیگ کا عزم دہرائے گی۔ تو بہت امید افزا نتائج ہوں گے۔"

"چھوڑیئے جی" حسن نے شوخی سے پاس بیٹھی ثریا خالہ کو دیکھا۔ "عورتوں میں اپنی بات منوانے کی صلاحیت ہوتی۔ تو ثریا خالہ اب تک سلیم بھائی جان کو راہ راست پر لے آتیں......"

ثریا مسکرانے لگی۔ بی بی بولیں۔ "محض ہٹ دھرمی ہے۔ ہندو دوستوں کے پیچھے چڑھا ہوا ہے۔ اللہ راہ راست پر آجائے گا۔

"آج میں نے بڑا قائل کرنے کی کوشش کی۔" فہیم بولا۔

"نتیجہ صفر" حسن مسکرایا۔

"بھئی وہ بڑے بھائی کا رعب دے کر مرعوب کرنا جانتے ہیں...... مجھے چپ ہونا پڑا۔" "چپ نہیں ہونا چاہئے تھا۔" بی بی نے کہا۔

"بڑے بھائی کے خلاف اسے اس طرح تو نہیں بھڑکاؤ۔" نصیر الدین حقے کا کش لیتے ہوئے مسکرائے۔

"جب ملت کے مفاد کا سوال پیدا ہو تو چھوٹا بڑا سب برابر ہیں۔" بی بی نے کہا سب مسکرانے لگے۔

دیر تک یہی باتیں ہوتی رہیں۔ حسن نے آج کھانا بھی یہیں کھایا۔ بانو نے اپنے ہاتھوں سے اس کے لئے کھانا چنا...... حسن کی قربت کا ایک ایک لمحہ اس کے لئے فرط و انبساط کا باعث تھا۔

کھانے کے بعد بھی اس بہاری نوجوان کا تذکرہ ہوتا رہا۔ اس کی قربانی کو سراہا جاتا رہا۔ واقعی جب مقابل

وانوں میں بیدار ہوتی ہے۔ تو انھیں اپنی منزل آسمانوں ہی میں نظر آتی ہے۔ راستے کی ہر رکاوٹ خود بخود ہٹ جاتی ہے۔ حسن دیر تک اس نوجوان کو خراج عقیدت پیش کرتا رہا

حسن کی بصیرت افروز تقریریں سن سن کر بانو نے حسن کی ذات کے گرد عقیدت کا نورانی ہالہ بنا لیا اور خوب تو تھا ہی۔ محبت میں عقیدت بھی شامل ہو گئی تھی اور جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ یہ نورانی ہالہ بڑھتا چلا گیا اس کی تقریر کا ایک ایک لفظ بانو کے ذہن میں گھر کر جاتا۔ اس کا کہا ہوا ایک ایک جملہ اسے ازبر ہوتا۔ وہ اس کی قابلیت کی معترف تھی۔ اس کی روانی اور شیرینی گفتار کی معتقد تھی۔

رات گئے احسن گھر جانے کو اٹھا۔ نصیرالدین سو چکے تھے۔ ثریا اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ صرف وہ نعیم اور بانو ہی بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔

"میرا بیگ" حسن سب کو سلام کر کے دروازے تک آیا۔ تو اسے اپنا بیگ یاد آگیا۔

"وہ میں نے اوپر رکھا تھا۔" بانو بولی۔ "ٹھہریئے میں لا دیتی ہوں۔"

حسن سیڑھیوں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ بانو چند لمحوں بعد اوپر سے بیگ لے آئی۔ بیگ حسن کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے آج کی تقریر پر داد دینا چاہی۔ جھجکی لیکن پھر جرأت سے بولی۔

"آپ کتنے اچھے مقرر ہیں۔ کتنی جرات اور بیباکی سے تقریر کرتے ہیں۔"

"میں تو ایک اور کام بھی بڑی جرات اور بے باکی سے کرتا ہوں۔" حسن شوخ نظروں سے اسے دیکھ کر ہنسی ہونٹوں میں دبا کر بولا۔

"وہ کیا۔" بانو نے اشتیاق سے پوچھا۔

"عشق" حسن بانو کے تاثرات دیکھے بغیر ڈیوڑھی کی جانب چل دیا۔ بانو ایک لمحہ کو بوکھلائی۔ لیکن دوسرے لمحے وہ مسکرا دی۔ اس کے انگ انگ میں مسرتوں کے سوتے پھوٹ پڑے۔ وہ تیزی سے دوڑی۔ اور آ کر آتی بی بی کے گلے میں بانہیں ڈال کر جھول گئی۔

"اے ہے کیا ہو گیا تجھے" بی بی جھلائی۔

اسے کیا ہو گیا تھا؟ بھلا بی بی کو کیوں کر بتا دیتی۔

ململ کے دوپٹے کی دوہری بکل مارے بانو جائے نماز پر بیٹھی تھی۔ نماز کے بعد ہاتھ دعا کے لئے اٹھے
آنکھیں بند کر کے وہ بڑے خضوع و خشوع سے اللہ میاں کے حضور دعا مانگ رہی تھی۔

حسن کاغذات ہاتھ میں لئے کمرے میں داخل ہوا۔ چند اشتہارات نقل کرتا تھے۔ ان دنوں پر
پابندی تھی۔ مسلم لیگ کو کچلنے کی سازش ہو رہی تھی۔ لیکن ہر پابندی قبول کرتے ہوئے تحریک زوروں پر تھی
کام منظم طریق سے ہو رہا تھا۔ مسلم نوجوان مشین کی طرح کام کر رہا تھا۔ پابندیوں اور رکاوٹوں کے باوجود
کام ایسا نہ تھا۔ جو وقت پر نہ ہوا ہو۔

اشتہارات کی پریس میں چھپوائی نہ ہو سکتی تھی۔ وہ کام ملت کی بیٹیاں سرانجام دے رہی تھی۔ اشتہار
قلموں سے دستی لکھ کر تقسیم کئے جاتے تھے۔ بی بی' بانو اور خاندان کی کئی اور عورتیں حسن کے لائے ہو
اشتہارات نقل کیا کرتی تھیں۔ اس وقت حسن اس سلسلے میں یہاں آیا تھا۔ جلسہ عام منعقد کرنا تھا۔ اشتہار
چاہئے تھے۔

بانو دعا مانگنے میں منہمک تھی۔ سپید ململ کے دوپٹے کی دوہری بکل میں اس کا چہرہ نورانی لگ رہا تھا۔
محویت کے عالم میں اس حسین چہرے سے پھوٹتا حُسن نگاہوں میں جذب کرنے لگا۔ وہ اسے یوں دیکھ رہا تھا
پہلی بار دیکھا ہو۔ حالانکہ بات یہ نہ تھی۔ اب تو وہ بانو سے دن میں کئی کئی بار ملتا تھا۔ خاصی بے تکلفی بھی ہو گی
کام ہی ایسا تھا۔ اللہ میاں نے ان کی معصوم محبت کے پاکیزگی سے پروان چڑھنے کی راہیں استوار کر دی تھیں

حسن کی نظریں ساکت سی ہو گئی تھیں۔ بانو کے چہرے کے تقدس کا احترام تھا۔ وہ اسی انہماک سے ا
دیکھتا رہا۔ جس انہماک سے وہ دعا مانگنے میں مصروف تھی۔ بانو اسے کتنی محبوب تھی۔ اپنی چاہت کا وہ اندازہ کر
تھا۔ لیکن اسے یوں محسوس ہوا۔ کہ اس اندازے کے لئے دنیا کا کوئی میزان بھی کام نہیں دے سکتا۔ اس
محبت اس کا عشق وسیع کائنات کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ ہر شے پر محیط تھا۔

حسن ہولے ہولے اس کے عین سامنے آ کھڑا ہوا۔ بانو نے دعا مانگ کر دونوں پھیلے ہاتھ سمیٹے۔ حسن کو
...وں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"آپ کب آئے۔" وہ جائے نماز کا کونہ الٹتے ہوئے بولی۔

"کچھ دیر ہوئی۔ وہ دری پر اس کے سامنے ہی بیٹھ گیا۔ گول کیے ہوئے کاغذات ایک طرف رکھتے ہوئے
"کیا دعا مانگ رہی تھیں۔"

"جی" بانو اس کے سوال سے متحیر ہو کر بولی۔

"کیا دعا مانگ رہی تھیں۔" حسن کے لبوں پر شوخ مسکراہٹ تھی۔ جو جی چاہا مانگ

"یہی تو پوچھنا چاہتا ہوں۔ تمہارا جی کیا چاہ رہا تھا۔" حسن نے اپنی آنکھوں کو دلفریب انداز میں گھما کر۔
وہ بانو کے دل کی بات جاننا چاہتا تھا۔ اس نے پھر اصرار سے پوچھا۔

"میری دعا ہر مسلمان کی دعا ہے۔ میں تو ہر نماز کے بعد ایک ہی دعا مانگتی ہوں۔"

"صرف ایک"

"جی ہاں۔ ہر نماز کے بعد دعا کرتی ہوں۔ کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ان کے مقصد میں کامیاب کرے۔
...ان بن جائے۔ تاکہ مسلمان ایک آزاد ملک میں صحیح اسلامی معاشرے کی بنیادیں رکھ سکیں۔"

"بس؟" حسن نے شوخی سے کہا۔

"بس" وہ بھی خوب ادائی سے بولی۔

"اوں ہوں" حسن نے ماننے سے انکار کر دیا۔

"کیوں؟" اس نے حیرانی سے کہا۔

"میں تقریر تو نہیں کر رہی تھی۔ دعا مانگ رہی تھی۔ دعا دل کی زبان سے مانگی جاتی ہے آپ نے کیسے سن
" بانو اٹھتے ہوئے بولی۔

"دل کے کانوں سے" حسن اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرایا۔

بانو کے گالوں پر شفق لہرا گئی۔

"بتا دوں اس دعا کے علاوہ اور کیا مانگ رہی تھیں"

"بتا دیجئے۔"

"بتا دوں۔"

"بتا دیں۔"

"تم کہہ رہی تھیں اللہ میاں۔"

"جی اور؟ کہیے نا؟"

"تم کہہ رہی تھیں اللہ میاں" حسن نے دعا کے انداز میں ہاتھ پھیلا کر شوخی سے کہا۔

"اللہ میاں حسن میرا ہو جائے۔" حسن کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"کیسے؟" چور پکڑ لیا نا۔ یہی دعا مانگ رہی تھیں نا۔"

"جی نہیں۔" بانو سنجیدگی سے بولی۔

"جھوٹی۔"

"سچ کہہ رہی ہوں۔ میں نے ایسی دعا کبھی نہیں مانگی۔"

"کیوں؟"

"ضرورت ہی نہیں سمجھی۔"

"ضرورت ہی نہیں سمجھی۔"

"واقعی۔"

"ہاں"

بانو کی باتوں سے حسن کے دل کو دھچکا سا لگا۔ وہ کچھ بجھ سا گیا۔ ساری شوخی مفقود ہو گئی۔ بانو نے اس کے چہرے کے تغیر کو دیکھا اور محسوس کیا۔ خوشی کا دھیما دھیما احساس اس کے دل کو گدگدانے لگا۔

"میں ایک کام کے لئے آیا تھا۔" حسن نے قدرے توقف کے بعد خشک اور کھردرے لہجے میں کہا۔

"کہیے۔" بانو کے چہرے پر دیئے کی لو کی طرح مسکراہٹ تھرتھرا رہی تھی۔

"یہ اشتہار نقل کرنا ہیں۔"

"کتنے ہیں؟"

شاید اڑھائی سو۔

"کب تک چاہئیں۔"

"کل شام تک۔"

"بہتر۔" بانو نے ہاتھ بڑھا کر حسن کے ہاتھ سے کاغذ لے لئے۔"

"اور کوئی کام؟ بانو نے متبسم نظروں سے اسے دیکھا۔

"جی بس۔ شکریہ" تلخ سے لہجے میں کہہ کر حسن دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ روٹھا روٹھا نظر آ رہا تھا۔ حسن کا یہ رنگ اس نے آج پہلی بار دیکھا تھا۔ دل میں لطیف سی گدگدی ہو رہی تھی۔ اس کا بے ساختہ جی چاہا

...اس سے اسی طرح روٹھا رہے۔ اور وہ دل میں لطیف سی گدگدی چھپائے اسے پیار بھری نظروں سے ...

...حسن کمرے سے باہر نکل گیا۔ گول کئے ہوئے کاغذات ہاتھ میں لئے وہ کمرے کے صحن میں کھڑی مسکراتی ... وہ اسے روکنے کا بھی نہ کہہ سکی تھی۔

"باجی" نعیم کی آواز پر وہ چونکی۔ اس کا چھوٹا بھائی نعیم اندر آ گیا تھا۔

"ہوں" اس نے استفسار کیا۔

"کچھ لڑکیاں آئی ہیں۔ آپ کو بلا رہی ہیں۔"

"سعیدہ، نسیمہ وغیرہ ہیں۔"

"جی ہاں سعیدہ ہیں۔ اور بھی چار پانچ عورتیں آئی ہیں۔"

"کہاں بٹھایا۔"

"بی بی کے کمرے میں۔" "بی بی آ گئیں۔" "ابھی نہیں۔"

"چلو میں آتی ہوں۔ یا یوں کرو۔ انہیں اوپر ہی بھیج دو۔ یہاں روشنی میں کام ٹھیک طرح ہو سکے گا"

"اچھا" نعیم چلا گیا۔ بانو نے جلدی جلدی کمرے کی چیزیں درست کیں۔ پلنگ پر رنگین چادر بچھا دی۔ ...کھڑکیوں کے پردے ہٹا دیئے۔

ان سب لڑکیوں کو اس نے لکھائی کے کام کے لئے تیار کیا تھا۔ فرصت کے وقت سب جمع ہو جاتیں۔ ...کوئی اور تحریر نقل کرنا ہوتی۔ تو کر دیتیں۔ پانچ چھ لڑکیوں کے آ جانے سے بانو کو حوصلہ ہو گیا۔ اڑھائی ...سطریں لکھنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ اب چار چار سطریں ہی تو تھیں۔ دو دنوں میں یہ کام ختم ہو سکتا تھا۔ لڑکیاں ...آ گئیں۔ علیک سلیک کے بعد گپ شپ ہوتی رہی۔ پھر قلم دوات سنبھالے گئے ہر لڑکی محنت سے اشتہار نقل ...کرنے لگی۔ بانو کے ذہن میں بار بار رنگین عکس لہرا رہے تھے۔ حسن آج اس سے روٹھ گیا تھا۔ کتنا اچھا لگ رہا تھا ...اس کا جی اسے اسی حالت میں دیکھنے کو مچل مچل گیا۔

آبگینوں کو ٹھیس لگنے والی بات ہی تھی۔ ورنہ بانو نے کوئی ایسی ناروا بات تو نہ کہی تھی۔ کہ حسن یو
جاتا۔

بانو نے تو اس کی خفگی سے لذت احساس پائی تھی...... لیکن جب وہ سنجیدگی سے خفا ہو گیا تو بانو متفکر ہو گ
تین دن ہو گئے۔ حسن ان کے ہاں نہیں آیا۔ کہاں تو دن میں تین چھوڑ دس بار آتا تھا۔ کہاں تی
گزر گئے۔ بانو کے سوا کسی نے بھی تو کچھ محسوس نہ کیا۔ محسوس کرتے بھی کیوں کر۔ فہیم خود اس کے پاس
تھا۔ بی بی اماں سے ملنے ضرور جاتیں۔ وہیں حسن سے ملاقات ہو جاتی۔ ثریا نے دو ایک مرتبہ پوچھا۔ تو ا
کاغذات کے پلندے دکھا دیے۔ جن کو بکھرائے وہ اپنے کمرے میں مقید تھا۔

بانو بے کل ہوئی جا رہی تھی۔ جھنجھلا بھی رہی تھی۔ ایسی کونسی غلطی سرزد ہو گئی۔ جو اس
طرح ناطہ ہی توڑ لیا۔ یہ بھی بھلا کوئی بات تھی۔ بانو جتنا سوچتی اتنا ہی غصہ آتا۔ وہ خیال ہی خیال میں اس
جاتی۔

لیکن کبھی کبھی اس کا جی چاہتا۔ کہ ندیم یا فہیم کے ہاتھ بلاوہ بھیج دے۔ ایسا وہ سوچ سکتی تھی۔ اس
عملی جامہ پہنانا ناممکن تھا۔ اس کی نسوانی خودداری بھی تو کوئی چیز تھی۔

اشتہار نقل ہو چکے تھے۔ دو دن کی بجائے کام تین دن میں ختم ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ دو سر
چھ لڑکیوں کی بجائے صرف دو آ سکی تھیں۔ کچھ گھریلو مصروفیات کی وجہ سے باقی لڑکیاں وقت نہ نکال سکی تھیں

تیسرے دن حسن نے ندیم کے ہاتھ اشتہاروں کا پیغام بھیجا۔

"باجی بھائی جان! خفا ہو رہے کہہ رہے تھے۔ اشتہار ابھی تک کیوں نہیں لکھے گئے"۔

"جا کر کہہ دو۔ ابھی کام ختم نہیں ہوا۔" بانو بھی چڑ گئی۔ ندیم چلا گیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد پھر
آیا۔

"باجی وہ کہتے ہیں۔ جتنے اشتہار لکھے جا چکے ہیں۔ اتنے ہی دے دیں۔"

"ان سے کہو۔ اتنا ہی ضروری ہے تو خود آ کر لے جائیں۔"

"اچھا" ندیم چلا گیا۔ بانو ایک لطیف سی گھبراہٹ دل میں لئے حسن کا انتظار کرنے لگی۔ وہ اس وقت ثریا کے کمرے میں تھی۔ اشتہار مکمل ہو چکے تھے۔ انھیں گول کر کے بانو نے دھاگے سے لپیٹ کر میز پر ڈال دیا تھا۔ سلیم کے ساتھ اس کے ایک ہندو دوست کی شادی میں شرکت کے لئے گئی تھی۔ بی بی نیچے باورچی خانے میں رات کے کھانے کا اہتمام کر رہی تھی۔ بانو کا زیادہ وقت اسی کمرے میں گزرتا تھا۔ ثریا بھابی سے زیادہ لگاؤ تھا۔

بانو انتظار کی اذیت اور لذت سے آج آشنا ہوئی تھی۔ زندگی اتنی حسین بھی ہو سکتی ہے۔ اسے بار بار یہی احساس ہو رہا تھا۔ دل مضطرب کو تھامے وہ کمرے میں ٹہلتی رہی۔ حسن بھی شاید اشارے ہی کا منتظر تھا۔ تین دن گزر گئے تھے۔ نگاہیں محبوب کی دید کو ترس گئی تھیں۔ بانو سے اپنے آپ کو یوں الگ تھلگ کر لینا بڑا صبر آزما تھا۔ تین دن ہی میں اس نے بے تاب جذبوں کے سامنے بے بسی سے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

وہ سیدھا ثریا کے کمرے میں چلا گیا۔ ندیم نے بتایا تھا۔ کہ بانو ثریا بھابی کے کمرے میں ہے۔ بانو میز پر جھکی کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی۔ حسن کے کمرے میں آنے کا اسے احساس ہوا تھا۔ لیکن حسن کی یہ بھی اک ادا تھی۔ وہ یوں بے نیازی سے لکیریں کھینچتی چلی گئی۔ جیسے آنے والے کا اسے مطلق پتہ نہ چلا ہو۔

چند لمحے حسن اس کی لانبی ناگن ایسی چوٹی کو پشت پر لہراتے دیکھتا رہا۔ پھر کھنکار کر اپنے وجود کا احساس دلایا۔ بانو نے دھیرے دھیرے گردن موڑی۔ حسن کو دیکھا۔ سفید کلف شدہ قمیض اور خاکی پتلون میں اس کی وجیہ شخصیت بڑی دلفریب نظر آ رہی تھی۔ قمیض کا گلا کھلا تھا۔ آستین کہنیوں تک پلٹ رکھی تھی۔ بال ماتھے پر بکھر کر اس کے مردانہ حسن میں بے پناہ اضافہ کر رہے تھے۔ چہرہ تنا ہوا تھا۔ زبردستی خفگی مسلط کی ہوئی تھی۔ لیکن آنکھوں میں بڑی زندہ سی چمک تھی۔ یہ چمک اس کے دلی جذبات کی آئینہ دار تھی۔ ہار مان کر چلا آیا تھا۔ بانو نے بھی تو ہار مان کر ہی اسے بلایا تھا۔ بانو سیدھی ہو کر اس کی طرف پلٹی۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ بھرپور نظروں سے دیکھا۔ بانو نے مسکرانے میں پہل کی۔ روٹھے ہوئے محبوب کو منا لینے کا پہلا قدم تھا یہ۔ حسن دانستہ سنجیدہ ہو گیا۔

"آپ اتنے دنوں سے کہاں تھے؟" بانو نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اپنے گھر" حسن منہ پھلائے بولا۔

"یہاں کیوں نہیں آئے۔" بانو نے اک ادائے ناز سے سوال کیا۔

"ضرورت ہی نہیں سمجھی۔" حسن نے بانو ہی کے الفاظ دہرا دیے۔

بانو ہنس پڑی۔ حسن نے منہ اور پھلا لیا۔
"اشتہار تیار نہیں ہوئے۔" اس نے لاتعلقی سے خالص کاروباری انداز میں پوچھا۔
"تیار ہیں" بانو نے کہا۔ وہ اب بھی مسکرا رہی تھی۔
"تیار ہیں؟ سب تیار ہیں۔" حسن نے پوچھا۔ وہ حیران حیران سا اسے دیکھنے لگا۔
"جی" بانو مسکرائی۔
حسن اسے دیکھنے لگا۔
"جی" بانو مسکرائی۔
"ندیم نے تو پیغام دیا تھا۔ مکمل نہیں ہوئے ابھی۔"
"جی میں نے ایسا ہی کہلوایا تھا۔"
"کیوں؟"
"میری مرضی"
حسن کے چہرے پر مسرتوں کے پر تو لہرائے۔ لیکن وہ بدستور سنجیدہ سی خفگی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔
"لاؤ اشتہار دے دو۔" حسن نے ہاتھ بڑھایا۔
"اوں ہوں" بانو نے نفی میں سر ہلا دیا۔
"کیوں؟" حسن قدم بڑھا کر میز کے قریب آ گیا۔
"پہلے یہ بتائیے آپ کو ہوا کیا ہے؟ بانو کی خوبصورت آنکھوں میں شوخی کی حسین چمک تھی۔
"ہونا کیا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں۔" حسن نے اک گہری سانس لیتے ہوئے افسردگی سے بانو کی طرف دیکھا۔
"آپ مجھ سے ناراض ہیں؟" اب بانو نے سنجیدگی سے کہا۔
"نہیں۔" حسن نے برف کی طرح ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ سر جھکائے وہ بوٹ کی نوک سے دری کو مسل رہا تھا۔
"جھوٹے" بانو نے بڑے پیار سے کہا۔ برف پگھلی ضرور۔ لیکن لہجے کی ٹھنڈک قائم رہی۔
"اشتہار دے دو۔"
"نہیں دوں گی۔ پہلے بتائیے ناراض کیوں ہیں۔"
"میں ناراض نہیں ہوں۔"
"چہرہ آئینے میں دیکھیں ذرا۔"

"مجھے بہت سے کام ہیں۔ اشتہار دے دو۔ مجھے جانا ہے۔"

"میں آپ کو یوں جانے نہیں دوں گی۔ میں جانتی ہوں آپ ناراض ہیں۔" بانو نے متانت سے کہا۔

"جانتی ہو تو پھر پوچھنے کی ضرورت کیا ہے۔" وہ تلخی سے بولا۔

"آپ اس دن اس بات سے خفا ہو گئے تھے نا۔ کہ میں نے آپ کی بات کی تائید کیوں نہیں کی تھی۔" بانو سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔

"اس جسارت پر پشیمان ہوں۔" بڑی بے تعلقی کا اظہار تھا۔

"حسن۔" بانو اس کے کھوکھلے پن سے تڑپ گئی۔ چہرے پر ذہنی اذیت و کرب کے سائے لہرا گئے۔ تڑپ اس کے دل میں بھی اتر گئی۔ بانو کے بازوؤں پر دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔ "بانو اس دن کس بے دردی سے میرے شوق کو کچلا تھا۔ میری بات کی تائید کر دیتیں تو کیا تھا۔"

"میں غلط بات کی تائید کیوں کر کرتی۔" بانو نے ٹھوس سنجیدگی سے کہا۔

"یعنی۔ یعنی۔" حسن مضطرب ہو گیا۔

بانو نے نگاہیں اٹھائیں۔ حسن کی خوبصورت آنکھوں میں جھانک کر بڑی متانت سے کہا۔ "میں اب بھی مانگوں گی۔ کہ میں نے اس طرح کی دعا کبھی نہیں مانگی۔"

حسن کے ہاتھ اس کے بازوؤں سے گر گئے۔ بانو رخ پلٹ کر کھڑی ہو گئی۔ مستحکم آواز میں بولی۔ "میں نے ایسی دعا مانگنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ شاید اس لئے کہ میں نے ہمیشہ آپ کو اپنا سمجھا ہے۔ جو چیز پہلے ہی مجھے مل چکی ہے۔ میں اسے کیوں کر اللہ میاں سے مانگوں۔"

"بانو ...." وفور جذبات سے حسن بیخود سا ہو گیا۔ اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنی طرف گھما لیا۔

"مجھے تو کبھی بھی محسوس نہ ہوا۔ کہ آپ اور میں دو الگ وجود ہیں۔" بانو سنجیدگی سے کہتی چلی گئی۔ "مجھے تو یوں لگتا ہے۔ جیسے میں ازل ہی سے آپ سے وابستہ ہوں۔ ایسی صورت میں کیوں کر اللہ میاں سے یہ دعا مانگوں کہ آپ میرے ہو جائیں۔ ہاں میں ہر نماز کے بعد آپ کی صحت و سلامتی کی دعا ضرور مانگتی ہوں۔" وہ بڑے انداز میں مسکرائی لیکن اس کی آنکھیں نم تھیں۔ "آپ میرے ہیں حسن"

"بانو!" حسن نے بے اختیار ہو کر اس کے دونوں ہاتھ ہاتھوں میں پکڑ لئے۔ اتنی مضبوطی سے کہ جیسے دنیا کی کوئی طاقت اب انہیں اس گرفت سے آزاد نہ کر سکے گی۔ پھر دھیرے دھیرے اس نے ان عظیم ہاتھوں کو اپنے

لب کیا۔

اوپر اٹھایا۔ وہ ان ہاتھوں میں اپنے شدت جذبات سے دہکتے ہونٹوں کی گرمی بھی منتقل کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے ان ہاتھوں کو ہونٹوں سے نہیں لگایا۔ آگ کی لکیر پھاند کر وہ ان ہاتھوں کو اپنی آنکھوں تک لے

گیا۔

اور پھر بڑے احترام سے اس نے آنکھوں کے نور کی ٹھنڈی ٹھنڈی عقیدت ان ہاتھوں میں سمو دی۔ واقعی!

عشق نور ہے۔ عشق روشنی ہے۔

عشق لافانی ہے۔ عشق لازوال ہے۔

عشق الوہیت سے پھوٹتا ہوا سرچشمہ ہے۔

http://www.rehanahmed.com

حسن پاس ہو گیا۔ اماں کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ مدتوں کی سر پر تنی بیوگی کی چادر انہیں یوں لگا جیسے حسن کے پاس ہوتے ہی سرک گئی ہے۔ واقعی جوان قابل اور ہونہار بیٹے کی ماں کبھی بیوہ نہیں ہوتی۔

کتنی ہی منتیں مانی تھیں۔ کتنے ہی چڑھاوے چڑھانے تھے۔ مدتوں کی آس پوری ہو گئی تھی۔ حسن انجینئر بن گیا تھا۔ اماں اتراتی پھرتی تھیں۔ خوشی خوشی منتیں پوری کر رہی تھیں۔

حسن نے نوکری کے لئے پہلے ہی دوڑ دھوپ شروع کر رکھی تھی۔ پاس ہوتے ہی مختلف محکموں میں درخواستیں دے دیں۔ اپنے ان دوستوں کو بھی یاد دہانی کرا دی۔ جن کے والد کلیدی عہدوں پر فائز تھے۔ وہ جلد سے جلد نوکری حاصل کرنے کا متمنی تھا۔ اس چھوٹے سے گھر کی جسے تخیل کے پردوں پر مدت سے دیکھتا چلا آیا تھا۔ اب شدت سے ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ اماں کو ایک پرسکون ماحول مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ بانو کو اپنانے کی خواہش بھی روز افزوں شدید ہوتی جا رہی تھی۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا۔ کہ وہ آبرومندانہ روزی کما کر اپنا پرسکون گھر بنا لے۔

بانو اس کی زندگی کے ہر پہلو پر چھا چکی تھی۔ وہ سچ مچ اسے اپنا ہی وجود محسوس ہوئی۔ اس سے قریب ہوتا یا دور۔ جذبوں کی شدت وحدت یکساں رہتی۔ بانو وہ نقطہ تھی جس سے اس کی زندگی کا خط پھوٹتا تھا۔

یہی حال بانو کا تھا۔ دل نے حسن کو اپنا سب کچھ مان لیا تھا۔ عشق کی تمام منازل طے کرنے کے بعد وہ اس مقام تک پہنچ چکی تھی۔ جہاں محب و محبوب دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔ حجاب کے پردے رہتے ہیں۔ نہ غیریت کی دیواریں۔

اپنی اس دلی لگن کے ساتھ ساتھ دونوں قومی کام کو بھی لگن سے کرنے میں مگن تھے۔ حسن جلسوں جلوسوں کا اہتمام کرتا پھرتا تھا۔ بانو قائد اعظم ریلیف فنڈ کے لئے چندہ جمع کرنے کی مہم میں پیش پیش ہوتی۔ بانو کو حسن جیسے عظیم انسان پر فخر تھا اور حسن کو بانو جیسی باوقار دوشیزہ پر ناز۔ دونوں دوش بدوش کام کر رہے تھے۔

شام ہو رہی تھی۔ سردی نے اپنا تسلط جمانا شروع کر دیا تھا۔ حسن ثریا کے کمرے میں ایک کرسی کی پشت پر جھکا کھڑا تھا۔ قریب ہی بانو پلنگ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ سلائی کی چیزوں کا ڈھیر پلنگ پر رکھا تھا۔ مینا بازار لگ جانے والا تھا۔ ایک سٹال بانو کے سپرد تھا۔ بانو نے بیچنے کے لئے سلائی کی خوبصورت چیزیں بنائی تھیں۔

مینا بازار کی باتوں کے ساتھ ساتھ کچھ دل کی باتیں بھی ہو رہی تھیں۔ دونوں سرشار سے نظر آ رہے تھے۔ ما وما فیہا سے بے خبر دونوں صرف ایک دوسرے کے وجود ہی سے باخبر تھے۔ یہی وجہ تھی۔ کہ ثریا کمرے میں آ گئی لیکن انھیں خبر نہ ہوئی۔

ثریا دونوں کے جذبات سے کسی حد تک آگاہ تھی۔ عشق اور مشک بھی بھلا کبھی چھپتے ہیں۔ اکثر بانو کو چھیڑا کرتی تھی۔ کبھی حسن سے بھی دو دو باتیں ہو جایا کرتی تھیں۔

وہ کمرے میں آئی۔ دونوں کو محو پا کر چند لمحے کھڑی رہی۔ حسن نے بانو سے جانے کیا کہا۔ بانو نے شرما کر منہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ حسن اسے دزدیدہ نظروں سے دیکھ کر مسکرا دیا۔

"کھوں۔ کھوں" ثریا نے مسکراتے ہوئے کھنکارا۔

حسن نے پلٹ کر دیکھا۔ ثریا شریر نظروں سے اسے دیکھ کر ہنس پڑی۔

اوہو...... کیا بے وقت آن دھمکیں ثریا خالہ۔ حسن نے شوخی سے کہا۔

"کیوں جی؟ کیا ہو رہا تھا۔" ثریا خالہ آنکھیں منکاتے ہوئے اس کے سامنے آ گئی۔

"عہد و پیمان" حسن نے شریر نظروں سے بانو کی طرف دیکھا۔ بانو لمحہ بھر کو چکرا گئی۔

"کیا عہد و پیمان" ثریا نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"یہ بانو سے پوچھو" حسن نے بھی شوخی سے نڈر سا جواب دیا۔

"ہائے اللہ۔" بانو نے تیکھی نظروں سے حسن کو گھورا۔

حسن کھلکھلا کر ہنس دیا۔ بانو بڑے پیارے انداز میں اپنا نچلا ہونٹ کاٹنے لگی۔ اس نے رخ دوسری طرف اس طرح پھیر لیا۔ کہ حسن اور ثریا کی طرف اس کی پشت ہو گئی۔

"کیا بات ہے؟" ثریا نے پھر آنکھوں کو نچاتے ہوئے ہاتھوں سے اشارہ کیا۔

"معاملہ طے پا گیا ثریا خالہ" حسن مچلا ہوا تھا۔ بانو کسمسا کر رہ گئی۔

"کیا مطلب" ثریا نے ایک نظر بانو پر ڈالی۔ پھر حسن کی طرف مستفسرانہ دیکھا۔ "میرے پلے تو خاک بھی نہیں پڑا"۔

حسن نے ہنستے ہوئے ثریا کے سر کو انگلی سے چھوا۔ اور پھر ہاتھ نفی میں ہلاتے ہوئے ہنس پڑا۔

"دماغ تو ہے" ثریا جلدی سے بولی۔ لیکن تمہاری پہیلیاں بوجھنے کو نہیں۔ سیدھی سیدھی بات کرو"۔

"اماں بھی بانو ....." حسن نے بانو کی طرف قدرے جھکتے ہوئے پوچھا۔ بانو بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گئی اُسے ثریا خالہ سے شرم آ رہی تھی۔

"اماں بھی دو" ثریا سب کچھ جانتے کے باوجود اصرار کر رہی تھی۔

"بتا دوں" حسن نے ثریا کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ اس کی آنکھوں میں نشے کا رنگ اتر رہا تھا۔ چہرے پر آوارہ سی قلقلی تھی۔

"کہہ بھی چکو..... "

"میرا ایک کام کرو گی۔ "

"پہلے کام کی نوعیت تو معلوم ہو۔ "

"نہیں پہلے وعدہ کرو۔ "

"اچھا وعدہ کیا۔ "

"میری اچھی خالہ" اس نے ثریا کو جھنجھوڑ ڈالا۔ بانو مسکرانے لگی۔

"اب کام بھی تو بتاؤ" ثریا نے بمشکل اپنے آپ کو چھڑایا۔

"ثریا خالہ" وہ جھجکا۔

"ثریا خالہ۔ ثریا خالہ" ثریا نے حسن کی نقل اتاری "بس اور کچھ نہیں کہنا۔ "

"اماں سے کہہ دو۔ کہ میں۔ میں اور بانو۔ " وہ پھر رک گیا۔ سنجیدگی سے جب سب کچھ کہہ دینے کا موقعہ آیا۔ تو وہ بوکھلا گیا۔

"کیا کہہ دوں؟" ثریا انجان بن کر پوچھ رہی تھی۔

"میں اور بانو۔ وہ جھجکا۔ ثریا کھلکھلا کر ہنس پڑی" بیچارا۔ "

"تم سمجھ تو گئی ہو۔ ثریا خالہ۔ کیوں ستاتی ہو۔ اماں سے سب کچھ کہہ دو نا!" حسن شہ پا کر بولا۔

"منہ دھو رکھو ابھی" ثریا نے آنکھیں مٹکا کر کہا۔

"کیوں؟"

پہلے اپنے پاؤں پر تو کھڑے ہو لو۔ پھر ایسے خواب دیکھنا۔ "

"خواب تو اب دیکھ چکا۔ " حسن بڑی پروقار سنجیدگی سے بولا۔ "انہیں اب میری آنکھوں سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ "

"واہ رے میاں مجنوں پہلے نوکری کی فکر کرو۔ "

"نوکری تو مل ہی جائے گی امتحان پاس کر لیا ہے۔ نوکری کی جدوجہد کر رہا ہوں۔

"کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی تو ملے گی ہی۔"

"تو پھر شادی بھی کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی ہو ہی جائے گی۔" ثریا نے ہنستے ہوئے اسی کے لہجے میں کہا۔

"نہیں خالہ۔ کہیں کا تو سوال ہی نہیں۔ تمہیں بتا دوں۔ کہ اپنا تو اول و آخر بانو ہی ہے۔"

آہستہ بول" ثریا نے جلدی سے کہا۔ "بڑا ماڈرن بن رہا ہے۔ گھر والوں نے سن لیا تو شامت ہی آجائے کہیں۔ لاہور جا کر بڑا بے باک ہو گیا ہے۔"

"جو جی میں آئے کہہ ڈالو ثریا خالہ۔ لیکن یہ بات اماں سے ضرور کہہ دینا۔ بانو میری زندگی ہے۔"

"ہائے ہائے۔" ثریا نے گھبرا کر حسن کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "اتنی زور سے مت بول۔ یہ معاملے تیری عقل میں نہیں آنے کے۔ کسی نے سن لیا تو برا ہو گا۔"

"کیوں" حسن نے گھبرا کر کہا۔

"بھئی ہم لوگ ابھی اتنے آزاد نہیں ہوئے۔ کہ اپنی پسند کا یوں برملا اظہار کرتے پھریں۔"

"اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ میں تو تمہیں بتا رہا ہوں۔ کسی کو وسیلہ تو بنانا ہی ہے"

"اچھا بھئی۔ سن لیا سب کچھ۔ پھٹے ڈھول بات تو آہستہ کر۔"

"اماں سے بات کرو گی نا۔"

"ضرور کروں گی۔"

"معاملہ منٹوں میں طے ہونا چاہیئے ثریا خالہ۔ انتظار کی تاب نہیں مجھ میں۔"

"چل بڑا آیا کہیں سے۔"

"میری اچھی خالہ" حسن نے ثریا کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ بانو گھٹنوں میں سر دیئے شرمائی ہوئی تھی۔ " "چل اب بھاگ یہاں سے" ثریا نے بانو کی طرف دیکھ کر حسن سے کہا۔

"میں اپنے کام کے لئے کھڑا ہوں۔ مینا بازار کے متعلق۔"

"چل چل۔ بڑا آیا۔ فریبی۔ اچھا گر ہاتھ آیا ہے۔"

حسن کھلکھلا کر ہنس دیا۔ ثریا مسکراہٹ دبا کر اسے پیار سے گھورنے لگی۔

...امی کی ایما پر شاید ابھی اس کی اماں سے بانو کے متعلق کچھ نہ کہتی۔ لیکن دوسرے ہی دن بانو کی پٹیالہ والی
...خالہ کا خط آیا۔ جس نے اسے فوری قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔

وہ بی بی کے ساتھ باورچی خانے میں بیٹھی دوپہر کے کھانے پکانے میں مصروف تھی۔ بی بی گوبھی کاٹ رہی تھی۔
...وہ چولہے پر چڑھی روغنی ہنڈیا میں چمچ چلاتے ہوئے گوشت بھون رہی تھی۔

بانو خط لے کر باورچی خانے میں آئی۔ اس کے ہاتھ میں سلائیاں تھیں۔ سلیم کا وہ سویٹر بن رہی تھی۔ جسے
...وہ شروع کر رکھا تھا۔ بانو کے چہرے پر کچھ ناگوار سے تاثرات تھے۔

"کس کا خط ہے" ثریا نے پوچھا۔

"پٹیالے والی خالہ کا" بانو خط بی بی کے ہاتھ میں دے کر باورچی خانے سے باہر چلی گئی۔

"...را منہ بنایا ہوا تھا بانو نے" ثریا نمائز گوشت میں ڈالتے ہوئے بولی "میں تو ڈر ہی گئی۔" ایسے ہی کرتی
..." بی بی نے دوپٹے سے ہاتھ پونچھ کر خط کھولتے ہوئے کہا۔

"اس خالہ سے تو چڑ ہے اسے۔"

"وہ کیوں" ثریا نے حیرانگی سے کہا۔

بی بی نے جلدی جلدی خط پڑھا۔ اور پھر ثریا کی طرف بڑھاتے ہوئے مسکرائی "پڑھ لو"

پٹیالے والی خالہ کا خط سیدھا سادا سا تھا۔ لیکن بانو کا ذکر بڑے لگاؤ اور پیار سے کرتے ہوئے اپنے بیٹے اصغر
کے متعلق بہت کچھ لکھا تھا۔

"اس کا ارادہ اصغر کے لئے بانو کو مانگنے کا ہے۔" بی بی پھر سے کام میں مشغول ہو گئی۔ "شادی پر آئی تھی
...ذکر کیا تھا۔"

"کیا کرتا ہے وہ" ثریا نے بے صبری سے پوچھا۔

"بی اے میں پڑھ رہا ہے۔"

"یہ آپ کی سگی بہن ہیں۔"

"سگی ہی سمجھو۔ چچا کے مرنے کے بعد ہمارے ابا نے ہی اسے پالا تھا۔"

"اس کی بیٹی ثمینہ ہے نا۔"

"ہاں وہی۔ شادی پر آئی تھی دونوں۔ میرا خیال ثمینہ کو فہیم کے لیے مانگنے کا ہے۔"

"ہاں ہاں۔ بڑی پیاری لڑکی ہے۔ لیکن بی بی۔" ثریا کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"کیوں؟" گوبھی کے پھول سے ڈنٹھل اتارتے ہوئے بی بی کا ہاتھ رک گیا۔

"کچھ نہیں" ثریا نے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔

"اس کا میاں بڑے اثر و رسوخ والا ہے۔ پٹیالہ دربار میں رسائی ہے۔"

"نوکری کرتے ہیں۔"

"جی نہیں نوکری کہاں۔ اپنا کاروبار ہے۔ لاکھوں کے پھیر ہیں۔ مہاراجہ پٹیالہ کے تو منہ چڑھے ہیں۔ بڑی قدر ہے گھر میں۔" بی بی بہن کے ٹھاٹھ کا ذکر کرنے لگی۔

ثریا چپ ہو گئی۔ اس کا ذہن کسی اور طرف ہی گھوم گیا تھا۔ بی بی نے کٹی ہوئی گوبھی کی پرات ثریا کی طرف کھسکا دی۔ اور اٹھتے ہوئے بولیں۔ "کھانا کھا کر مجھے ذرا ناصرہ کی امی کو دیکھنے جانا ہے۔ وہ سیڑھیوں سے گر گئی ہیں۔ سنا ہے ہڈی ٹوٹ گئی ہے بازو کی۔"

"ہاں" ثریا سوچ میں ڈوبی تھی۔

"تم کھانا دکان پر بھجوا دینا۔ فہیم تو چار بجے آئے گا نعیم اور ندیم بھی اسی کے ساتھ چائے پی لیں گے۔"

ثریا ہوں ہاں کر کے جواب دیتی رہی۔ بی بی باورچی خانے سے باہر نکل گئی۔ ثریا حسن اور بانو کے دلی جذبات سے آگاہ تھی۔ نئی صورت حال کے سنگین ہونے سے پہلے ہی اسے دونوں کا بندھن باندھ دینا چاہیے تھا۔ کھانا دوکان پر بھجوانے کے بعد اس نے بانو کے ساتھ دو چار نوالے نگلے۔

"کیوں بھابی۔ بڑی جلدی میں ہیں۔" بانو نے کہا۔

"میں ذرا ادھر جا رہی ہوں۔" ثریا نے ہاتھ کھینچ کر کہا۔

"خیریت"

"بس کچھ ضروری کام ہے آپا سے" ثریا اٹھ کر نل کے نیچے ہاتھ دھوتے ہوئے بولی۔

"ابھی آ جاؤں گی۔ اکیلے گھبراؤ گی تو نہیں۔"

"نہیں بھابی" بانو ہنس پڑی "آپ کے آنے سے پہلے تو اکثر اکیلی ہی رہتی تھی۔"

بانو کھانا کھاتی رہی۔ ثریا اسے باورچی خانے کی چیزیں سنبھالنے کی ہدایت دیتی لپک کر اوپر گئی۔ برقعہ لے کر

...ڑھی سے باہر نکل گئی۔
...قریب ہی تھا لیکن پردہ ضروری تھا۔ جب سے شادی ہوئی تھی۔ ثریا گھر سے برقعہ اوڑھ کر نکلتی تھی۔ سلیم
... کا بڑا سختی سے پابند تھا۔ ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہی ثریا نے کالے برقعے کا اوپر والا حصہ اتار کر کندھے پر
... بھابی بچوں کے کپڑے دھو رہی تھی۔
"آپا اوپر ہوں گی۔" ثریا نے سلام کرنے کے بعد پوچھا۔
"ہاں اوپر ہی ہیں۔ آؤ بیٹھو"
"اوپر ہی ہو آؤں۔ مجھے ان سے کام ہے۔"
ثریا تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ پہلی منزل کے اختتام پر اس کا ٹکراؤ حسن سے ہوا وہ نیچے آرہا تھا۔ "
"خیریت؟" ثریا خالہ۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ آرام سے اوپر آیئے۔" حسن نے اس کے لئے راستہ
چھوڑتے ہوئے کہا۔
"بچھاڑے گئے۔" اس نے وہیں رک کر حسن کی طرف دیکھا۔
"کیوں؟" حسن چونکا۔ "کیا بات ہے؟"
"میدان میں اور بھی حریف ہیں۔" ثریا نے تشویش ظاہر کی۔
"میں سمجھا نہیں۔ کیا مطلب ہے تمہارا۔" حسن حیران ہو کر بولا۔
ثریا نے کھڑے کھڑے ساری بات حسن سے کہہ دی۔ وہ کون سی جہاندیدہ تھی۔ جو ہر پہلو سے سوچ کر بات
کرتی۔ خطرہ دیکھ کر دھڑکا لگا تھا بھاگی بھاگی یہاں آئی تھی جذباتی سی ہو رہی تھی۔ حسن سامنے آیا۔ اسے ہی سب کچھ
کہہ دیا۔ حسن گنگ سا کھڑا رہ گیا۔ وہ تو ایسا تصور بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ سمجھ ہی نہ پایا۔ کہ اسے
کیا کہنا چاہیئے۔
"میں آپا کے پاس اسی لئے تو آئی ہوں۔ ان کے رشتہ طلب کرنے سے پہلے ہمیں رشتہ مانگ لینا چاہیئے
..."
وہ سیدھی اوپر چلی گئی۔ حسن کتنی دیر سیڑھیوں میں کھڑا رہا۔ پھر کچھ سوچ کر نیچے اترا۔ اس کے قدم در
... کی جانب اٹھنے لگے۔ اماں دھوپ میں بیٹھی حسن کی قمیضوں کی مرمت کر رہی تھیں۔ دھلائی آنے پر ان
کی عادت تھی۔ ہر کپڑا دیکھا کرتیں۔ کوئی بٹن اکھڑا ہوتا تو لگا دیتیں۔ کہیں سے کپڑا اچکا ہوتا تو مرمت کر
دیتیں۔ اس وقت حسن کی دو قمیضیں لئے بیٹھی تھیں۔ بٹنوں کی ڈبیہ کھلی پڑی تھی۔ ایک قمیض کا بٹن لگا یا تھا۔
دوسری کا کالر مسک گیا تھا۔ اسے بیٹھی سی رہی تھیں۔
ثریا نے جس جذباتی انداز سے حسن سے بات کی تھی۔ اسی انداز میں اماں سے بھی باتیں کرنے لگی۔
"آپا بانو جیسی لڑکی چراغ لے کر ڈھونڈیں۔ جب بھی نہیں ملے گی۔"
"میں کب انکار کرتی ہوں۔ لیکن حسن کہیں نوکر بھی تو ہولے۔"
"آئے ہائے...... آپ تو خدا جانے کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ ثریا چارپائی پر برقعہ ڈالتے ہوئے بولی۔"
نوکری بھی مل ہی جائے گی۔ آپ کو کون سا ابھی شادی کرنے کا کہہ رہی ہوں۔
"بے صبری سے کام نہیں بنتا ثریا۔" اماں نے سکون سے کہا۔ "لڑکا نوکر ہو جائے تو پھر بات کرتے بھی

اچھا لگتا ہے۔ ہماری کون سی جائیداد پڑی ہے۔ جس کے بل بوتے پر رشتہ لڑکے کی نوکری کے بغیر ہی مل جائے گا۔"

"خدایا۔" ثریا جھنجھلا کر بولی "میرا مطلب تو یہ ہے کہ آپ رشتہ مانگنے میں پہل کر لیں۔ کہیں ایسا نہ ہو۔ پٹیالے والی خالہ میدان مار جائے۔"

اس کالڑ کا تو ابھی پڑھ رہا ہے۔"

"لڑکا تو ابھی پڑھ رہا ہے۔ لیکن وہ بات طے کرنے کی خواہش مند ہیں۔ امیر لوگ ہیں انہیں کیا پرواہ۔ لڑکا بعد میں بھی پڑھتا رہے گا۔" اماں چپ ہو رہی۔ مجبور ہو کر ثریا کو حسن کی پسند کا بھی اماں کو کہنا پڑا۔ اماں یہ بات جانتی تھیں۔ لیکن جذبے شدت کے کن مراحل سے گزر رہے تھے۔ اس کا انہیں علم نہ تھا۔ ثریا نے ڈھکے چھپے لفظوں میں ساری بات ان کے گوش گزار کر دی۔

حسن کے لئے رشتوں کی کمی ہے نہ بانو کے لئے۔" ثریا نے بڑی بوڑھیوں کے انداز میں کہا۔ "لیکن حسن اور بانو ایک دوسرے کے بہت قریب آچکے ہیں ان کا ملاپ ہو جانا چاہیئے۔ ورنہ بڑے سنگین نتائج بھی نکل سکتے ہیں۔"

"اچھا" اماں نے سوئی دانت میں پھیرتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

"ہاں آپا۔"

"بس یہ بات اپنے تک ہی رکھنا۔ لوگ بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہیں۔" اماں سوچتے ہوئے بولیں۔

بڑی بحث و تمحیص کے بعد ثریا نے انہیں رضامند کر لیا۔

"ان سے بات کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"اُئے ہے لڑکی۔ رشتہ مانگنے اکیلی اٹھ بھاگوں گی۔ بھائی بھاوج کو تو ساتھ لے کر جاؤں گی۔ میرا تو خیال ہے۔ عبدالرحیم اور سلو کو بھی بلا بھیجوں۔"

"آپ اتنا لمبا پروگرام نہ بنائیں ابھی کریم بھائی کو ساتھ لے کر آجائیں ہمارے گھر۔ منگنی وغیرہ کرنا ہوئی تو انہیں بھی بلا لیجئے گا۔"

"یہ بھی ٹھیک کہا تم نے۔"

ادھر ثریا اور اماں رشتہ مانگنے کے پروگرام بنانے لگیں۔ ادھر حسن اور بانو زندگی بھر ایک دوسرے کا ساتھ دینے کی قسمیں کھا رہے تھے۔ ہر رکاوٹ سے ٹکرا جانے کا عہد کر رہے تھے۔

نادان پروانے ناکامی کی حالت میں جل جانے کا بھی عزم کر رہے تھے۔

"ہم ایک غرض لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں نصیر بھائی۔" اماں نے کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی عبدالکریم اور اس کی بیوی کو لے کر بانو کے رشتے کے لئے آئی تھیں۔

رات کے نو بج رہے تھے۔ سردیوں کی ٹھٹھری ہوئی رات میں اس وقت ان کا آنا کچھ معنی تو رکھتا تھا۔ بی بی سمجھ گئی تھی۔ لیکن بات کی نوعیت کا انہیں علم نہ تھا۔

نصیر الدین رضائی اوڑھے اپنے پلنگ پر بیٹھے تھے۔ حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ بی بی باورچی خانے سے ابھی ابھی فارغ ہو کر آئی تھی۔ آنے والوں کا مسکراہٹ سے خیر مقدم کرتے ہوئے وہ نصیر الدین کے پلنگ کی پائنتی کی طرف بیٹھ گئی تھی۔

اماں نے بات شروع کی۔ عبدالکریم اور سکینہ مسکرانے لگے۔ بی بی ذرا محتاط ہو کر بیٹھ گئی۔ نصیر الدین حسب عادت خوش دلی سے مسکرائے۔

"کیا بات ہے رشیدہ بہن" انہوں نے حقے کی نے عبدالکریم کی طرف پھیرتے ہوئے پوچھا۔ اماں اور سکینہ بی بی کے پلنگ پر بیٹھی تھیں۔ عبدالکریم دونوں پلنگوں کے درمیان ایک طرف رکھی کرسی پر تھا۔

"حسن میاں پڑھ لکھ کر فارغ ہو گئے ہیں۔ عبدالکریم نے اماں کی بات آگے بڑھائی۔

"نوکری کے لئے درخواستیں دے رہا ہے۔" نصیر الدین ان کی بات سمجھے بغیر بولے۔

"انشاء اللہ جلد ہی مل جائے گی۔ ہونہار لڑکا ہے۔ ایسے بچے اپنا مقام آپ بنا لیتے ہیں۔ بڑی ترقی پائے گا۔"

حسن کی تعریف سے اماں کا حوصلہ بندھا تشکرانہ نصیر الدین کو دیکھا

"آپ ہی کا بچہ ہے" وہ بولیں

"کیوں نہیں کیوں نہیں" نصیر الدین نے حقہ گڑگڑایا

"اسے باقاعدہ طور پر اپنا بیٹا بنا لیجئے" عبدالکریم نے قہقہہ لگایا۔

"کیا؟" نصیر الدین اب چونکے بی بی نے بھی پہلو بدلا

"دیکھئے بھائی جی" عبدالکریم نے ہنستے ہوئے کہا "آپا جس غرض سے آئی ہیں یہی ہے"

"مجھے خالی نہ لوٹایئے گا نصیر بھائی" اماں نے اپنے سفید دوپٹے کو پھیلا کر کہا۔ "" بانو میری بیٹی بنا دیجئے"

"لو بھئی" نصیر الدین نے ہنس کر بی بی کی طرف دیکھا خوش وہ بھی نظر آ رہی تھی۔ لیکن اس وقت خاموش بیٹھی رہی۔

"آپ سب کچھ جانتے ہیں" عبدالکریم بولا "حسن کے متعلق بھی کسی پوچھ کی ضرورت نہیں۔ گھر کا معاملہ ہے۔ آپا صرف تسلی چاہتی ہیں"

"بھئی اسے کہیں نوکر تو ہو لینے دو" نصیر الدین بولے۔

"ایسی بھی کا ہے کہ جلدی ہے" بی بی پہلی بار بولی "نوکر ہو لے دیکھا جائے گا"

"نہیں جی" اماں بولیں "مجھے تو تسلی کے دو بول کہہ دو۔ باقاعدہ ہاں بے شک اس کے نوکر ہونے پر کر لینا۔ نوکر اللہ نے چاہا تو بہت جلد ہو جائے گا۔ انٹرویو کے لئے دو جگہ سے بلاوا آیا ہے کہیں تو کام بنے گا ہی نا۔"

"ضرور بنے گا" نصیر الدین بولے

اماں نے بڑے عجز سے رشتے کے لئے اصرار کیا۔ اپنی مدتوں کی بیوگی کا گلوگیر آواز میں تذکرہ کرتے ہوئے بولیں "آپ سب کو معلوم ہی ہے۔ میں نے زندگی کی خوشیاں کتنی دیکھی ہیں۔ میں بانو جیسی لڑکی پانے کی متمنی ہوں۔ میرے گھر کی روشنی اس ہیرے سے ممکن ہوگی۔ میری شدید خواہش ہے مجھے مایوس نہ کریں"

نصیر الدین اور بی بی خاموش بیٹھے رہے اماں اگلی پچھلی بہتیری باتیں کرتی رہیں بالآخر معاملہ یہاں طے ہوا۔ کہ سب صلاح کر کے کوئی جواب دیں گے"

اماں نے یہ تجویز مان لی۔ دوسرے دن سلیم اور فہیم کی موجودگی میں نصیر الدین نے یہ بات چھیڑی حسن انہیں بے حد پسند تھا۔ اپنی عزیز اور اکلوتی بچی کے لئے وہ ایسے ہی لڑکے کے متلاشی تھے۔ اعتراض بی بی کو بھی نہ تھا۔ صرف اپنی بہن کا خیال تھا۔

"وہ شادی پر آئی تو خاص طور پر مجھے پیغام دے گئی تھی" بی بی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"چھوڑو بی بی وہ بھی کوئی رشتہ ہے" سلیم بولا۔

"کیوں؟" بی بی ایک دم بولی "کیا کمی ہے ان میں۔ لاکھوں والے ہیں۔"

"لڑکا کیا ہے! "سلیم نے کہا "جب سنو بی اے ہی میں ہوتا ہے" بی بی کو برا لگا۔

"بی بی۔ سب سے پہلے لڑکا دیکھنا چاہئے" فہیم بولا "اصغر اور حسن کا کیا مقابلہ۔ مانا کہ وہ پیسے والے لوگ ہیں۔ لیکن پیسہ ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔

"امنگ سے بات تو کرنا آتی نہیں اسے" سلیم بولا "اس کے متعلق تو سوچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"
"حسن ماشاء اللہ صورت شکل اخلاق ہر لحاظ سے بے مثال ہے" فہیم نے بی بی سے کہا۔
"واقعی..... واقعی" نصیر الدین بولے
"میں کب انکار کرتی ہوں۔ بمن کا خیال آ رہا تھا ذرا..... "بی بی بولیں
"فہیم کی بات وہاں طے کریں گے" سلیم نے کن آنکھیوں سے فہیم کی طرف دیکھا۔
"بالکل..... بالکل" نصیر الدین نے پر زور تائید کی۔
"ہو کے لئے حسن ہر لحاظ سے موزوں ہے بی بی۔ دیکھا بھالا لڑکا ہے۔ انجینئر بن گیا ہے بڑی ترقی پائے گا"
بی بی کو تو بھی حسن پسند تھا بچی کی قسمت کا جذباتی فیصلہ کرنے کی وہ خود بھی حامی نہ تھی۔
"اب تو باپ کی جائیداد کا کیس بھی کر سکتا ہے" نصیر الدین بولے۔
"چھوڑیئے ابا جان" فہیم بولا" جائیداد کیا شے ہے اپنے زور بازو سے پیدا کرلے گا حسن ان خاندانی جھگڑوں کا حامی نہیں ہے۔ وہ بڑا صابر اور قناعت پسند انسان ہے" آخر کس ماں کا بیٹا ہے "نصیر الدین نے
"رشیدہ نے ساری عمر جس طرح کاٹی ہے بڑے دل گردے کا کام ہے"
"ماں باپ کے ساتھ بھائی بھاوجوں کی بھی غلامی کرتی رہی" بی بی بولیں۔" صابر تو واقعی بڑی ہے وہ" اماں اور ابا کی طرف داری میں بھی بول رہے تھے۔ مخالفت بی بی بھی نہیں کر رہی تھیں۔ صرف بمن کا خیال تھا۔
بلا گھر کی باتیں ہوتی رہتیں کبھی نصیر الدین اور بی بی اکیلے میں یہ قصہ لے بیٹھتے کبھی سلیم اور فہیم کے ساتھ گو دونوں بھائیوں نے تو اپنی رائے حسن کے حق میں دے دی تھی۔ اس سے بہتر لڑکا ان کی نظر میں کوئی بھی تھا۔

جہاں تک لڑکے کا تعلق تھا۔ بی بی کو بھی علم تھا کہ اصغر حسن کے پاسنگ بھی نہیں پھر بانو کے تاثرات بھی دیکھ رہی تھیں۔ نادان نہ تھیں کہ جانتے بوجھتے بچی کے مستقبل کا غلط فیصلہ کر دیتیں ثریا گھر میں پکنے والی کھچڑی کی ربورٹ حسن تک پہنچا رہی تھی۔ حسن کی بے تابیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔
"اگر سب رضامند ہیں تو پھر حامی کیوں نہیں بھر لیتے۔ بات ختم ہو جانی چاہئے اب تو۔ وہ بیقرار ہو کر ثریا سے کہتا۔

"بھی بیٹی والے یونہی کرتے ہیں" ثریا اسے تسلی دیتی۔
"عجیب روایت ہے کہ کسی کی جان پر بن جائے اور آپ کی ادا نکھرے" حسن جھلا کر کہتا۔
"جان پر بنانے کی ضرورت نہیں "ثریا کہتی" معاملہ تمہارے حق میں جا رہا ہے تھوڑے دن اور صبر کرو"
وہ صبر ہی تو کئے بیٹھا تھا۔ جس دن سے منگنی کی بات چیت چھڑی تھی۔ ثریا نے اس کا داخلہ اپنے گھر میں حکماً

بند کر دیا تھا۔ گو اس نے اس حکم کی تعمیل پابندی سے نہیں کی۔ کام کے سلسلے میں کئی بار آنا پڑا لیکن جہاں وہ آ
بانو چھلاوے کی طرح غائب ہو گئی کچھ دن تو وہ بانو کی ان اداؤں سے محظوظ ہوتا رہا لیکن تا۔ گے معاملہ آر ہو رہا
نہ پار۔ بے تابیاں بڑھتی جا رہی تھیں تنہائی کا کوئی موقع ہی میسر نہ آیا تھا۔

اماں نے تین چار پھیرے اور کئے۔ گو ہر دفعہ انہیں خوش دلی سے رخصت کیا جاتا لیکن رشتے کی باقاعدہ ہاں
بھری جاتی یہ انتظار بھی صبر آزما تھا۔ انہی دنوں حسن کو دہلی اور راولپنڈی سے انٹرویو کے لئے بلاوہ آ گیا۔ وہ پہلے
راولپنڈی گیا۔ کیوں کہ یہاں راحت حسین کے والد کی وجہ سے ملازمت مل جانے کا قوی امکان تھا۔

اسے واقعی راولپنڈی پی ڈبلیو ڈی میں لے لیا گیا۔ اس دن تو اماں کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ تھا۔ حسن کا تار
کر بانو کے ہاں پہنچیں۔ تار نصیر الدین اور بی بی کے سامنے رکھ کر اصرار سے بولیں۔

"آج تو میں بغیر منہ میٹھا کئے نہیں جاؤں گی۔ تمہاری شرط بھی پوری ہو گئی۔ میرا حسن ماشاء اللہ نوکر بھی ہو گیا
ہے۔"

اصرار اتنا شدید تھا۔ کہ مزید دیر کرنے کی گنجائش رہی نہ ضرورت

"تمہاری ہی بیٹی ہے بہن" نصیر الدین نے کہا "حسن بھی اپنا ہی بچہ ہے اللہ تعالیٰ اس نئے بندھن کو مبارک
کرے۔"

"آمین" فرطِ مسرت سے اماں کی آواز بھرا گئی شکر کے آنسو آنکھوں میں جھلملانے لگے۔ آج کوئی ان کے
دل سے پوچھتا۔ انہوں نے کیا پا لیا تھا۔ نصیر الدین کے سارے خاندان کو دعائیں دیتے اماں کی آواز ڈوب ڈوب
گئی۔

"مبارک ہو بہن" انہوں نے بی بی کے گلے ملتے ہوئے کہا۔

"تمہیں مبارک ہو" بی بی بھی کچھ گلوگیر آواز میں بولیں۔ بیٹی دوسروں کو سونپ رہی تھیں۔ کوئی آسان
کام تو نہیں تھا۔

"ثریا بیٹی" نصیر الدین نے ثریا کے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا "اپنی آپا کا منہ میٹھا کرا دو"

"سچ" وہ خوشی سے دیوانی سی ہو کر بہن کے گلے سے چمٹ گئی۔

مسرت کے آنسو دونوں کی آنکھوں میں جھلملا رہے تھے۔

"یہ کیا ہے ثریا بھابی"

"ایک بڑی پیاری چیز"

"یعنی؟"

"بوجھو تو جانیں"

"بوجھنا ہوتا تو آپ سے پوچھتی کیوں؟ بتایئے نا کیا ہے"

"بتا دوں"

"بتایئے"

"شرماؤ گی تو نہیں"

"ہائے اللہ آپ تو پہیلیاں بجھواتی ہیں"

"دیکھو بانو۔ تمہارے گال تو ابھی سے تمتمانے لگے"

"ہائے اللہ! آپ کتنی شریر ہیں"

"مان تو گئی ہو۔"

"نہیں"۔

"جھوٹی"۔

"جی نہیں"۔

"تو خود دیکھ لو۔ چودھویں کا چاند ہے"۔

ثریا نے بڑے سے لفافے کو کھول کر حسن کی بڑی ہی خوبصورت تصویر بانو کے سامنے پلنگ پر رکھ دی یہ تصویر اس نے پنڈی سے بھیجی تھی۔ مردانہ وجاہت اور دل کشی کا شاندار عکس تھا بانو دیکھتے ہی شرما گئی۔

ثریا ہنس ہنس کر اسے چھیڑنے لگی۔ میں نے تو بھئی پہلے ہی پوچھ لیا تھا شرماؤ گی تو نہیں....... اب آنکھیں کیوں ... رہی ہو دیکھ تو لو......"

"ہٹایئے بھابی"

"کیوں؟ شرم آنے لگی؟"

"ہائے اللہ"

"واہ..... واہ..... بڑی شرمیلی ہو یہ کوئی نیا تو نہیں۔ وہی حسن ہے۔ شرما رہی ہو اس سے۔ دیکھو تو کتنا پیارا لگ رہا ہے ماشاء اللہ خدا نظر بد سے بچائے۔ لو دیکھ لو اچھی طرح سے......" ثریا نے ہنستے ہوئے تصویر بانو کے گال سے لگا دی۔ بانو کے پیازی پیازی گال سرخ ہو گئے۔

ثریا ہنستی رہی "مذاق نہیں کر رہی بانو۔ حسن کو اچھی طرح دیکھنے کی تو کبھی جرات نہ ہوئی ہو گی۔ تصویر کو غور سے دیکھ لو" وہ ہر وقت ہنسنے کی عادی تھی۔ ہنس ہنس کر بانو کو چھیڑنے لگی۔

"اب تو اسے دیکھنے کا تمہیں پورا حق ہے۔ منگیتر ہے تمہارا"۔

"ہائے بھابی" بانو نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

"بھئی ہم تو اپنی طرف سے تمہیں کھلی اجازت دے رہے ہیں" ثریا نے اس کے گدگدی کی۔

"چھپ چھپ کر تو ضرور دیکھو گی۔ لو میں تصویر تمہارے پاس ہی چھوڑ جاتی ہوں"

"لے جایئے اسے ہمیں ضرورت نہیں" بانو کا انگ انگ مسکرا رہا تھا۔ اترا کر ثریا کو دیکھا نگاہوں میں خوابوں کا حسن بکھر رہا تھا۔

"میری بنو۔ تنہائی میں اسے اچھی طرح دیکھ لو۔ کیا یاد کرو گی۔ کسی بھابی سے پالا پڑا تھا" ثریا ہنستے ہوئے واقعی کمرے سے نکل گئی۔ جاتے جاتے دروازہ بھی بند کرتی گئی۔

ثریا کے جانے کے بعد بانو نے پلنگ پر پڑی تصویر کو دیکھا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا۔ تصویر نہیں حسن خود اس کے سامنے آ بیٹھا ہے۔ حسن جو اب صرف حسن نہیں۔ اس کا منگیتر بھی تھا منگیتر!

جانے اس لفظ میں کونسا جادو تھا۔ کیسا سحر تھا۔ کیا طلسم تھا۔ بانو چھوئی موئی کی طرح سمٹ گئی۔ دزدیدہ نظروں سے تصویر کو دیکھا۔ اک جھرجھری سی آ گئی۔ لیکن اس وقت کمرے میں تو کوئی بھی نہ تھا۔ اس نے تسلی کے لئے چاروں طرف دیکھا۔ پھر اس کی نظریں تصویر پر جم گئیں۔ وہ اسے دیکھتی رہی۔ نگاہ اشتیاق بیتاب ہوتی گئی۔

دھیرے دھیرے اس نے ہاتھ بڑھا کر تصویر اٹھالی۔ اور بڑی جرات سے حسن کی جھیل ایسی گہری گہری آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ تصور جھلملانے لگا۔

وہ اس کمرے میں پہنچ گئی۔ جو پھولوں اور سنہری تاروں سے سجا تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر امیروں کی طرح جھلملاتے پردے تھے۔ فرش پر چمکتا ہوا سرخ قالین تھا۔
سنہری مسہری پردوں والی چھپر کھٹ کے نرم نرم ریشمی بستر پر وہ بیٹھی تھی۔ اس کے سر پر سرخ دوپٹہ تھا۔ جس کی کناری سنہری کرن چوڑا گوٹا اور ستاروں کی طرح جھلملاتے ٹکلے برقی روشنی میں چمک رہے تھے۔ دوپٹے کے ہالے میں اس کا سارا وجود آ گیا تھا۔ کمرہ اس کے کنوارے سانسوں کی مہک سے معطر تھا۔ طلائی اور کندنی زیورات سے اس کا جانسوز حسن نکھر رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر طلائی جھومر تھا۔ جو سہاگ کے سرخ دوپٹے میں چمک رہا تھا۔
سرخ گوٹے کناری اور گول گول ٹکلوں سے بھرا دوپٹہ اس کے پورے وجود کو سمیٹے ہوئے تھا۔ سارے کمرے میں وہ دوپٹہ بڑا نمایاں تھا۔ اچانک بھاری بھاری قدموں کی آواز آئی اس کا دل بے اختیار ہو کر دھڑکنے لگا۔ دوپٹے کے جھلملاتے گھونگھٹ کی اوٹ سے اس نے جھکی جھکی نظروں سے دیکھا۔
کالے بوٹوں کی آواز چھپر کھٹ کے قریب سنائی دی۔ وہ سمٹ گئی۔ شرم سے دوہری ہو گئی۔ پھر وہ چھپر کھٹ کی پٹی پر بیٹھ گیا۔ بانو نے سر گھٹنوں میں دے لیا۔
"بانو" حسن کی جذبات سے تھرتھرائی آواز آئی۔ اس کے دوپٹے کو حسن کی مردانہ انگلیوں نے چھوا۔ بانو کے سارے بدن میں جیسے برقی رو دوڑ گئی۔
"اے ہے۔ اتنی محویت...... "ثریا کھلکھلا کر ہنس دی" میں نہ کہتی تھی۔ چھپ چھپ کر ضرور دیکھو گی اسے"
گھبرا کر بانو نے تصویر پلنگ پر پھینک دی بڑ ثریا قہقہے لگا رہی تھی۔ بانو ندامت سے مسکرانے لگی تھی۔ اس کی نظریں جھکی تھیں۔ شاید ڈر رہی تھی۔ کہیں ثریا بھابی اس کی آنکھوں میں ڈھل آنے والے خوابوں کو یوں دیکھ نہ لے۔
"کوئی بات نہیں...... بانو...... "ثریا نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کھینچ کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا" ہر لڑکی پر یہ وقت آتا ہے۔ میں بھی تمہارے بھیا کی تصویر چھپ چھپ کر دیکھا کرتی تھی"
بانو خفت سے مسکرانے لگی "یہ خواب بڑے حسین ہوتے ہیں بانو" ثریا نے پھر اس کے گدگدی کی۔ پھر تصویر اٹھا کر لفافے میں ڈالتے ہوئے بولی "یہ میاں مجنوں اللہ جانے کیسے کیسے خواب دیکھ رہا ہو گا"
بانو کے گال اس تصویر سے پھر سرخ ہو گئے اسے تو اب حسن کے ذکر ہی سے شرم آنے لگی تھی۔
"ان خوابوں کی تعبیر بہت جلد مل جائے گی" ثریا نے شوخ نظروں سے بانو کو دیکھا "بڑا بے صبرا ہے یہ اسے میں جانتی ہوں اچھی طرح سے...... اب تو ماشاءاللہ نوکر بھی ہو گیا ہے۔ چڑھائی کر دے گا شادی کے لئے......"

بانو چپکے چپکے مسکراتی رہی۔ شرمانے کے باوجود اس کا جی چاہ رہا تھا۔ کہ ثریا بھابی اسے یوں ہی چھیڑتی چلی جائے۔ اب بانو کے شب و روز میں ایک نیا رنگ بھر گیا تھا۔ یہ خواب جو اس نے حسن کی جھیل ایسی گہری آنکھوں میں جھانکتے دیکھا تھا۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے کام کرتے، اسے نظر آنے لگا۔

سہاگ کا سرخ گوٹے کناری سے جگ مگ جگ مگ کرتا دوپٹہ اس کے کنوارے سینے میں ہل چل بپا رکھتا۔

اماں اور ثریا کے خط سے حسن کو صورت حالات سے آگاہی ہو چکی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے قدرت نے اس کے دامن کی وسعتوں سے کہیں زیادہ دے دیا ہو۔ بانو ہمیشہ کے لئے اسے سونپ دی گئی تھی۔ وہ بانو اس کا پہلا پیار تھی۔ وہ بانو جو اس کے صرف جسم کا تقاضا نہیں تھی۔ خالی فطرت کی مانگ بھی نہ تھی۔ وہ تو اس کے وجود کی کسی شدید پکار کا تقاضا تھی۔ اسے سینے سے لپٹا لینے کی خواہش سے کہیں زیادہ اس نے اسے سینے کے اندر چھپا لینے کی خواہش محسوس کی تھی۔

وہ ان دنوں پنڈی میں تھا۔ بانو سے سینکڑوں میل دور...... لیکن بانو تصور کے آنچل پر ہر وقت یوں تھرتھراتی رہتی تھی۔ کہ اتنی دوری کا احساس نہ ہوتا تھا۔ وہ کام میں لگا ہوتا بیکار پھرتا ہوتا یا سونے کے لئے بستر میں لیٹا ہوتا۔ بانو کسی غیر مرئی شے کی طرح اسے اپنے قریب محسوس ہوتی۔

راحت حسین کے والد کی وجہ سے اسے یہ نوکری مل گئی تھی۔ باپ بیٹے کی دوڑ دھوپ سے اسے ایک چھوٹا راولپنڈی کے صاف ستھرے علاقے میں مکان بھی مل گیا۔ مکان کے سامنے چھوٹا سا چمن بھی تھا۔ پچھلی طرف بھی کچھ کھلی جگہ تھی۔ تین کمروں پر مشتمل مکان اس کی اماں کی ضروریات کے لئے کافی تھا۔

وہ اماں کو بہت جلد یہاں لے آنا چاہتا تھا۔ یوں بھی لدھیانہ سے آئے تین ماہ ہو چکے تھے۔ بانو سے ملنے کی تڑپ بھی تھی۔ اس نے اماں کو خط لکھ دیا کہ وہ انہیں لینے آ رہا ہے اتوار ملا کر تین چھٹیاں لی تھیں۔ اس لئے اماں کو سب تیاری مکمل کر لینے کا پہلے سے لکھ دیا۔

اماں کو حسن کے ملازم ہونے کی مسرت تھی۔ مکان مل جانے کی بھی خوشی ہوئی تھی۔ اپنا آزاد اور پر سکون گھر، ساری عمر دوسروں کی غلامی کرنے کے بعد یہ اک مسرت بخش بات تھی۔ لیکن اپنوں سے چھٹ جانے کا ملال بھی سوہان روح بن گیا تھا۔

بھابی سکینہ تو دل ہی دل میں اماں کے پنڈی جانے سے خوش ہو رہی تھی۔ دو کمرے اماں کے پاس تھے۔

ان کے جانے کے بعد پورے گھر کی مالک و مختار ہوتا تھا۔ اماں بجھے بجھے دل سے تیاری کرنے لگیں۔ پ... یہاں تھا۔ بہن بھائی تھے۔ عزیز و اقارب تھے۔ چنڈی جیسی دور افتادہ جگہ میں تو اپنا کوئی بھی نہ تھا۔

سب سے زیادہ انہیں ثریا سے بچھڑنے کا غم تھا۔ ثریا ان دنوں امید سے بھی تھی۔ جی نہیں چاہتا تھا کہ ... چھوڑ کر اتنی دور جا بسیں۔ جب سے حسن کا خط آیا تھا۔ ثریا کا دل بھی کچھ ڈوب ڈوب رہا تھا۔ آپا کو ا... کا درجہ دے رکھا تھا۔ شادی ہونے پر بھی دوری محسوس نہیں ہوئی تھی۔ جب جی چاہتا انہیں بلا بھیجتی ... سکتیں تو خود پہنچ جاتی۔ اب پردیس کے معاملے تھے۔ دل بیٹھ جاتا تھا۔ الٹے سیدھے خیالات پریشان ک... تھے۔ لیکن بظاہر مسکراتی پھرتی تھی۔ جانتی تھی۔ آپا کا دل پہلے ہی تھوڑا ہو رہا ہے۔

سامان اتنا کون سا تھا۔ دو چار کپڑوں کے صندوق تھے۔ شادی کا سارا زیور ان کے پاس تھا۔ مر... مکان کی رجسٹری بھی تھی۔ پہلے تو سوچا زیور اور رجسٹری یہیں پڑی رہنے دیں۔ پردیس میں لے جانے ... ضرورت ہے۔ لیکن پھر یہ سوچ کر دونوں چیزیں ساتھ رکھ لیں کہ نیا گھر بسانے کے لئے پیسے کی بھی تو ضرور... گی۔ کچھ زیور بیچنا پڑا تو بیچ دیں گی۔ زیور کچھ کم بھی تو نہیں تھا۔

جمعہ کی صبح حسن لدھیانہ پہنچ گیا۔ وہ خوشی خوشی اماں کو لینے آیا تھا۔ لیکن یہاں آ کر اسے بھی فضا ... مغموم سی لگی۔ اماں بجھی بجھی نظر آ رہی تھیں۔ اور ثریا کی آنکھوں میں تو بار بار آنسو آ رہے تھے۔

"کیوں ثریا خالہ......" حسن نے مذاق سے کہا۔ "خیر تو ہے۔ میرا گھر بننے سے دکھ ہوا"۔

"خدا نہ کرے۔ جو مجھے دکھ ہو حسن"۔ وہ سنجیدگی سے بولی۔ مجھ سے زیادہ خوشی کسے ہو گی۔

"پھر یہ کیا؟" حسن نے منہ بسور کر اس کی نقل اتاری۔

"آپا کے چلے جانے کا دکھ ہے بس"۔ وہ گہری سانس لے کر بولی۔ اماں تو جیسے اشارہ ہی چاہتی تھیں ... آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

"پتہ نہیں کیوں میرا دل کہتا ہے حسن...... تمہارے جانے کے بعد...... میں مر جاؤں گی"۔ ثریا دوپٹے ... منہ چھپا کر رو پڑی۔

"ہائے ہائے خیر مانگو بچی"۔ اماں نے ٹپ ٹپ گرتے آنسو پونچھے بغیر کہا۔

"لاحول ولا......" حسن دونوں کو دیکھ کر ہراساں سا ہو گیا۔ لیکن کسی قسم کی کمزوری کا مظاہرہ ماحول کو ... سوگوار بنا دیتا۔ اس لئے ہنستے ہوئے ثریا کے قریب بیٹھ کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر بولا۔ "حد ہو گئی ہے ... کی...... مرنے کا پروگرام کبھی بنا تو فوراً اطلاع کر دینا۔ ہم ہاں پیٹا اڑتے چلے آئیں گے"۔

"کیا بک بک لگا رکھی ہے"۔ اماں نے چیخ کر کہا۔

"یہ آپ کی لاڈلی ہی الٹی سیدھی ہانک رہی ہیں"۔ حسن نے ثریا کی طرف دیکھا اس نے آنسو پونچھ...

http://www.rehanahmed.com

...اس کی چھٹی حس بے قرار کئے جا رہی تھی۔ حسن بھی مضطرب و پریشان ہو گیا۔ اماں اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

"ثریا خالہ" اس نے جلد ہی اپنے آپ پر قابو پا کر کہا۔ "میں نے سوچا تھا۔ کچھ اپنی کہیں گے کسی کی سنیں گے۔ یہاں معاملہ ہی چوپٹ"۔ ثریا نم آنکھوں سے مسکرا دی۔

"شاباش" حسن نے اس کے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا۔ "ہاں اب کہو"۔

"کیا"۔

"کب آؤں تمہارے گھر"۔

"کون تم"۔

"جی میں"۔

"اوں ہوں۔ داخلہ بند"۔

"ہونہہ بند..... میں ابھی جاؤں گا"۔

"بری بات ہے حسن"۔

"کیسی باتیں کرتی ہو ثریا خالہ۔ پورے تین ماہ ہو چکے ہیں۔ صبر کی حد بھی ہوتی ہے"۔

"فضول باتیں نہ کرو"۔

"میں تو جاؤں گا اور ضرور جاؤں گا"۔ سلیم بھائی بھی تو منگنی کے بعد یہاں آیا کرتے تھے۔ میری تو ابھی منگنی بھی نہیں ہوئی۔ صرف بات ہوئی ہے۔ مجھے وہاں جانے کا پورا پورا حق ہے"۔

"میرا کیا ہے جاؤ۔ جس کے لئے جاؤ گے وہ مت آئی تمہارے سامنے"۔

"میرے جذب دل کی کشش دیکھ لینا..... وہ خود ہی چلے آئیں گے پاس میرے"۔ حسن شوخی سے ثریا کو دیکھ کر گانے لگا۔ جھوم جھوم کر گانے لگا۔ "وہ خود ہی چلے آئیں گے میرے پاس"۔

"تم کب جاؤ گی"۔ اس نے یک دم رک کر پوچھا۔ ثریا اسے پیار سے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ حیرانگی سے بولی۔

"کہاں"۔

"گھر"۔

"ابھی جا رہی ہوں"۔

"جاؤ"۔ دس منٹ بعد میں تمہیں ملنے آ رہا ہوں۔ سمجھیں..... میں آؤں گا اور بانو تمہارے کمرے میں ہو گی..... اکیلی سمجھیں..... یہ ماہدولت کا حکم ہے۔

ثریا نے اٹھتے ہوئے اسے ٹھینگا دے کر چڑایا۔ حسن نے حسب عادت اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

"ہائے ہائے...... پاگل کہیں کا"۔ اماں لپک کر قریب آئیں۔ "کیا کر رہا ہے"۔

"اپنی خالہ سے پیار"۔

"باز ہی رہ ایسے پیار سے"۔ اماں نے گھورا۔ اور پھر ثریا سے بولیں۔ "تو بھی اب بچی تو نہیں۔ خیال رکھا کر"۔ ثریا شرماسی گئی۔ حسن کو کچھ احساس ہوا۔ انکشاف عجیب سا انکشاف۔ وہ ثریا کی طرف دیکھ کر رہ پڑا۔ ثریا دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے چہرے پر شرگین مسکراہٹ تھی۔

شام حسن تیار ہو کر گھر سے نکلا۔ فہیم گلی ہی میں مل گیا۔ قدرت نے اس کی مشکل یوں آسان کر دی ورنہ خدا جانے ثریا کی باتوں کا ردعمل تھا یا کوئی اور بات۔ اسے بانو کے گھر جاتے ہوئے جھجک سی آ رہی تھی۔

بی بی نے بڑے تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا۔ سر چوم کر پیار کیا۔ فہیم اسے بیٹھک میں لے کر آیا جہاں دونوں گھنٹہ بھر باتیں کرتے رہے۔ زیادہ تر گفتگو سیاسی نوعیت کی تھی۔ فہیم راولپنڈی میں مسلم لیگ کا زور شور کا حال پوچھ رہا تھا۔ اور حسن یہاں کی سرگرمیوں کے متعلق استفسار کر رہا تھا۔

بی بی بھی آ گئی تھیں۔ حسن ان سے بھی عورتوں کی روئداد سننے لگا۔ عورتیں مستعدی سے سب کام کر رہی تھیں۔ حسن کو بڑا اطمینان ملا۔ ثریا چائے کی ٹرے لے کر آ گئی۔ بی بی نے جلدی میں بھی تین چار چیزیں چائے کے ساتھ منگوائی تھیں۔ حسن آج اک نئی حیثیت سے ان کے گھر جو آیا تھا۔

ثریا کی تازہ دم ہنسی۔ بی بی کی متین باتوں اور فہیم کی بے تکلفانہ گفتگو کے باوجود حسن کچھ مضطرب سا تھا۔ ثریا اس اضطراب کی وجہ جانتی تھی۔ حسن نے کئی بار آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ بھی کیا۔ ثریا نے نفی میں سر ہلا دیا۔

دوسرا دن بھی پورا گزر گیا۔ وہ بانو کو دیکھ تک نہ سکا۔ گھائل کی تڑپ دید کے قابل تھی۔ اسے بانو پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ وہ آج دو دفعہ ان کے ہاں گیا تھا۔ لیکن غیروں کی طرح بیٹھک ہی میں بیٹھ کر چلا آیا تھا۔

تیسری شب اس نے اماں کو لے کر پنڈی واپس جانا تھا۔ آج بانو کے ہاں ان کی دعوت تھی۔ اس الوداعی دعوت میں منگنی کے متعلق بھی طے پانا تھا۔ اس لئے اماں سرِ شام ہی ان کے ہاں چلی گئی تھی۔ ان کا خیال تو گرمیوں میں دھوم دھام سے منگنی کرنے کا تھا۔ گرمیاں نکلنے کا انتظار تھا۔ مئی تو شروع ہو ہی چکا تھا۔ حسن کا حوصلہ تیسرے دن سے آزمایا جا رہا تھا۔ آج اس میں تاب نہ رہی تھی۔ ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر سیڑھیوں پر پڑی۔ بانو نیچے آتے آتے واپس لوٹ گئی تھی۔ حسن گھر والوں کا خیال کئے بغیر لپک کر اس کے پیچھے گیا۔ بانو کو اس نے دوسری منزل کی سیڑھیوں پر ہی جا لیا۔ بازو سے پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے اوپر چھت پر لے گیا۔

مشتعل ہو رہا تھا۔ اس نے بانو کو جھنجھوڑ ڈالا۔ بانو مسکرا رہی تھی۔ اپنا بازو بجلی کی سرعت سے چھڑا کر الگ
ہو گئی۔

"یہ کیا حماقت ہے"۔ اس نے دبی آواز میں غصے سے کہا۔

"جی؟" شوخ ادائی سے بانو اسے دیکھ کر مسکرا دی۔ وہ دیوار سے لگی کھڑی تھی۔

"تم کتنی سنگ دل ہو"۔ وہ دونوں ہاتھ پیچھے کر کے بانو کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"کیوں؟" بانو نے شرمیلی ادا سے اسے دیکھا۔ لیکن اس سے نظر ملانے کی جرات نہ ہوئی۔ حسن سے اتنی
بے تکلف ہونے کے باوجود آج وہ اس سے بے طرح شرما رہی تھی۔

"میں تین دن سے تمہیں دیکھنے کو ترپ رہا ہوں"۔ اس نے صاف گوئی سے کام لیا۔

بانو نے حیا بار نظریں اٹھائیں۔ لیکن جلد ہی جھکا لیں۔ آج وہ اس حسن کا سامنا کر پا رہی تھی۔ جس کے
ساتھ اس کے مستقبل کا تانا بانا باندھ دیا گیا تھا۔

"میں اتنی دور سے صرف تمہیں دیکھنے آیا تھا۔ حسن کا لہجہ غصیلہ اور انداز شاکی تھا"۔ اماں کا کیا تھا۔
انہیں تو اکیلے بھی یہاں سے سوار کرایا جا سکتا تھا۔

بانو خوبصورت اور دلکش انداز میں اپنا نچلا ہونٹ دانتوں سے کاٹنے لگی۔ اس کا انگ انگ مسکرا رہا تھا۔ آج
اس کی حیا آلود اور شرگین مسکراہٹ کا انداز قاتلانہ تھا۔ حسن کو اپنے جذبات پر قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

"بانو"۔

"جی"۔

"میں آج واپس جا رہا ہوں"۔

"جی"۔ بانو نے اس کی طرف دیکھا۔ چند لمحے پہلے مسکراتی نظریں کرب سے دھندلا رہی تھیں۔ حسن
بے کلی سے ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ اس نے جیب سے سگریٹ نکالا۔ سلگایا اور لانبے لانبے کش لیتے ہوئے بانو کو
دیکھنے لگا۔ جو بجلی کی روشنی میں ملول اور اداس نظر آنے لگی تھی۔

بانو سر جھکائے اداس کھڑی تھی۔ اس کی سوچ کے زاویے کسی اور رخ پر مڑ چلے تھے۔ جب سے حسن کا خط
آیا تھا۔ کہ وہ اماں کو لینے آ رہا ہے۔ اس کا دل بیٹھا ہی جا رہا تھا۔ اک غیر محسوس سا اضطراب ہر لمحہ ڈس رہا تھا۔
اب یہاں سے حسن پھر کب آئے گا۔ وہ اسے کب دیکھے گی؟ یہ سوال بے کل کر دیتے تھے۔ خدا جانے کیوں یہی محسوس
ہوتا تھا۔ جیسے وہ حسن سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جائے گی۔ حسن اسے لدھیانہ ملنے پھر کبھی نہیں آئے گا۔

وہ جتنا اس خیال سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرتی۔ اتنا ہی یہ خیال ذہن میں اترتا جاتا۔ وہ ہراساں ہو کر گئی
گزری بھی تھی۔ اپنے آپ کو کاموں میں الجھائے بھی رکھا تھا۔ لیکن وسوسہ تھا کہ ڈستا ہی چلا جا رہا تھا۔ حسن کی

باتوں سے وہ بے چین سی ہو گئی۔ گھبرا کر بولی۔ "پیچھے چلئے"۔

"نہیں" حسن نے پیار سے ڈانٹا۔

"ہائے اللہ۔ پیچھے سب لوگ"۔

"میں کوئی بات نہیں سنوں گا"۔ سمجھیں۔ تین دن میں آج تو ہاتھ آئیں۔ بانو جبراً مسکرا دی۔ انداز جارحانہ لیکن محبوب تھا۔

"تم نے میرے تین دن ضائع کر دیئے۔ جی چاہتا ہے اس کی کڑی سزا دوں تمہیں"۔ اس نے پھینک کر بوٹ سے مسلتے ہوئے کہا۔

"کیا سزا دینا چاہتے ہیں"۔ بانو مسکرائی۔

"جی چاہتا ہے تمہاری گردن مروڑ دوں"۔ حسن نے ہنستے ہوئے شوخ لہجے میں کہا۔

مر گئی تو پھر کیا کریں گے"۔

"نہ رہے بانس نہ بجے گی بانسری"۔ حسن نے بھی شوخی سے کہا۔

بانو نے روٹھنے کا انداز بنایا۔

"بے ایمان کہیں کے"۔ حسن بے اختیار سا ہو گیا۔ "میرا شوق میرا انتظار تو دیکھا ہوتا۔ صرف تم کے لیے تو آیا تھا۔ خدا جانے پھر کب آنا ہو گا"۔

بانو کے چہرے سے مسکراہٹ یوں غائب ہو گئی جیسے جلتی بجلی کا بٹن دبانے سے روشنی غائب ہو جاتی حسن کے چلے جانے کا احساس خنجر کی طرح سینے میں اتر جاتا تھا۔

"حسن" اس نے بیقرار ہو کر اس طرح کہا۔ کہ حسن بھی شوخی بھول گیا۔

"بانو....." وہ ہاتھوں کو بے تابانہ جنبش دیتے ہوئے مضطرب ہوا۔

"آپ آج چلے جائیں گے"۔ وہ تڑپا دینے والی آواز میں بولی۔

"ہاں بانو۔ جانا ہی ہے"۔ وہ گھمبیر لہجے میں بولا۔

"پھر..... پھر....." بانو کی آواز درد کی شدت سے ٹوٹ گئی۔

پھر ستمبر میں آؤں گا"۔ حسن نے اس کی آنکھوں میں شوخی سے جھانکنا چاہا۔ لیکن اس کی خوبصو آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ زیر آب جلتے دیئے بھی کچھ ایسے حسین نہ ہوں گے جتنی بانو کی آنسو بھر آنکھیں تھیں۔

"پگلی" حسن نے اس کے آنسوؤں سے متاثر ہو کر کہا۔ بانو نے انگلی دانتوں میں دبالی۔

"چند مہینے ہی تو ہیں"۔ حسن نے اسے سہارا دینے کو ہنسنا چاہا۔ لیکن اس کی آواز نے ساتھ نہیں دیا۔

پل لمحے دونوں خاموش رہے۔ بے تاب، بے چین اور بے کل۔

"میں ثریا خالہ کو باقاعدگی سے خط لکھا کروں بانو..." حسن نے اضطراب کو یوں مٹانا چاہا۔ لیکن بانو تسکین پا رہی تھی۔

"بانو..." حسن نے اس کی ٹھوڑی کو چھو کر اس کا چہرہ اونچا کیا۔ چمکتے ہوئے آب دار موتی اس کے چکنے گالوں پر تیزی سے پھسلنے لگے تھے۔

"رو رہی ہو بانو..." حسن کی آواز رندھ رہی تھی۔

بانو نے بے اختیار ہو کر حسن کو دیکھا۔ یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ حسن۔ مجھے چھوڑ کر نہ جا۔

"پگلی" حسن گلہ شکوہ شوخی شرارت سب بھول گیا۔ پہلو میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ حوصلہ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ چند لمحے خاموش رہا۔ پھر گلوگیر آواز میں بولا۔ "بانو... میں ستمبر میں آؤں گا۔ پھر دسمبر میں تمہیں ہمیشہ کے لئے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ ان خوبصورت دنوں کے سہانے تصور میں کھو کر ہم جدائی کے دن گزار دیں گے"۔

حسن نے کہنے کو تو کہہ دیا۔ لیکن اسے اپنی ہی آواز بے آواز لگ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اسے کھوکھلے بہلاوے دے رہا ہو۔ طفل تسلیوں سے بہلا رہا ہو۔

بانو دونوں ہاتھوں پہ چہرہ گرائے سسکیاں بھر رہی تھی۔ چند لمحے وہ دیکھتا رہا۔ پھر صبر کی حدیں ٹوٹ گئیں۔ اس نے بانو کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

بانو بے سہارا سی کھڑی تھی۔ حسن کے بازو کے سہارے ڈول گئی۔ حسن نے بے اختیار ہو کر اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا اور پھر شدت جذبات سے یوں سینے میں سمو لینے کی کوشش کی جیسے اس عظیم متاع کو حوادثات سے محفوظ کر لینا چاہتا ہو۔

بانو روئے جا رہی تھی۔ حسن نہیں جانتا تھا بانو نہیں اس کی تقدیر رو رہی ہے۔

"بانو..." تڑپ کر اس نے بازوؤں کا حلقہ تنگ کر کے بانو کو سینے میں چھپا لینے کی مجنونانہ حرکت کی۔

بانو رونے لگی۔ حسن کی قمیص ان آنسوؤں سے نم ہونے لگی۔

"بانو..." اس نے ہونٹ کاٹتے آنکھیں شدت کرب سے بند کر لیں۔ اس کا سر خود بخود جھک گیا۔ اس نے اپنا گال بانو کے بالوں پر عقیدت احترام اور محبت سے ٹکا دیا اور بے خبری کے کئی لمحے یونہی بیت گئے۔

رات روانگی کا منظر بڑا دلفگار تھا۔ اماں اپنے عزیزوں رشتہ داروں سے پہلی بار بچھڑ رہی تھیں۔ پنڈی جاتا یوں لگ رہا تھا جیسے ابد کی حدیں چھونے جا رہی ہوں۔ ثریا کو بار بار لپٹا لپٹا کر پیار کر رہی تھیں۔ بی بی کو اس کے متعلق کئی

ہدایتیں دے رہی تھیں۔ ثریا کو بھی محتاط رہنے کا کئی بار کہہ چکی تھیں۔ بانو کو بھی سر منہ چوم کر پیار کرتے ہوئے رو پڑی تھیں۔

گلی محلے کی عورتیں بھی اماں کو وداع کرنے آئی تھیں۔ اماں آنسو پونچھتے سب سے باری باری گلے مل رہی تھیں۔

لوگ ملازمتوں کے سلسلے میں گھروں سے باہر جاتے ہی ہیں۔ پرانے گھروں سے لاکھ پیار سہی۔ نئے گھروں کی چاہت اور محبت میں یہ پیار دب بھی جاتا ہے۔ نئے گھر ذوق و شوق سے بسانا انسانی جبلت ہے۔ لیکن یہاں معاملہ برعکس تھا۔ سوگوار فضا میں اماں کی سسکیاں ابھر رہی تھیں۔ اور حسن بھی ایک طرف یوں سرنگوں کھڑا تھا جیسے لٹ کر تباہ و برباد ہو گیا ہو۔ بانو کے آنسوؤں کی نمی اسے اپنے سینے پر اب بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی ہچکیوں کا ارتعاش اب بھی چھاتی سے ٹکرا رہا تھا۔ ثریا بھی تو اس کے کندھے سے لگ کر رو پڑی تھی اسے چاروں طرف آنسوؤں ہی کے سیلاب نظر آ رہے تھے۔ بعض اوقات انسان کی چھٹی حس اسے آنے والے سانحوں سے بہت پہلے مطلع کر دیتی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ بچھڑنا اک قیامت کا مرحلہ تھا۔

ملکی حالات دن بدن مخدوش ہوتے جا رہے تھے۔ بہار، گڑھ مکتیشر، الہ آباد اور بمبئی میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ ہندو ذہن کھل کر سامنے آ رہا تھا۔ مسلمانوں سے ہزار سالہ غلامی کا انتقام [illegible] لے رہا تھا۔

انہی فسادات کے ردعمل کے طور پر نواکھلی میں بھی چند مسلمانوں نے ہندوؤں پر جوش انتقام میں حملہ کر دیا۔ تو عدم تشدد کا بہروپیہ، دیوتا اور اہنسا کا جھوٹا پجاری مہاتما گاندھی بلبلا اٹھا دہلی کی بھنگی کالونی سے تڑپ کر اٹھا۔ اور نواکھلی جا پہنچا ۔ مسلمانوں کا خون کئی جگہ بے دریغ بہہ چکا تھا۔ ان کے گھر بار لوٹے جا چکے تھے۔ ان کی آبرو کو تختۂ مشق بنایا جا چکا تھا۔ بھائی چارے اور مساوات کا یہ علمبردار ٹس سے مس نہ ہوا تھا۔ کیونکہ خون مسلم بہا تھا نواکھلی میں ہندوؤں کے قتل سے تیر سیدھا کلیجے میں اتر گیا تھا۔ اس نے وہاں جا کر ایک ایک جگہ دیکھی۔ ننگے پاؤں بستیوں میں گھوما۔ اور پھر آنسو بہا بہا کر ایسے ایسے آتشیں بیان دیئے کہ منافرت، تعصب اور دشمنی کے شعلے لپکنے لگے۔

ادھر خضر وزارت مسلمانان پنجاب کی غیرت کو کھلا چیلنج تھا۔ غیور مسلمانوں نے اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے دشمنوں کو للکار لیا تھا۔ مسلم لیگ خلاف قانون جماعت قرار دی گئی تھی۔ اس کے لیڈروں کو جیلوں میں ٹھونسا گیا تھا۔ لیکن تحریک قیادت سے محروم نہ ہوئی۔ نوجوان شعلوں کی طرح ہر رکاوٹ کو نگل لینے کے لئے بے تاب ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ قوم کی مائیں بہنیں اور بیٹیاں پاکستان جیسے عظیم عزم کو عملی صورت دینے کے لئے اپنے بھائیوں کے دوش بدوش میدان عمل میں آ گئی تھیں۔

گورنر نے وزارت توڑ کر مسلم لیگ کو وزارت کی دعوت دی تھی۔ کانگریس اس پیشکش پر مایوسی کے اندھیروں سے دوچار ہوئی تھی۔ مہاتمائی ذہن نے ایک اور تدبیر سوچ لی تھی۔ مسلم کو گزند پہنچانے کے لئے اس کی نظر انتخاب ماسٹر تارا سنگھ پر پڑ چکی تھی۔

ماسٹر تارا سنگھ نے اس قوم کو للکارا تھا۔ جس کی رگوں میں سراج الدولہ ٹیپو اور تیتو میر کا خون تھا۔ غافل ضرور ہوئی تھی۔ مردہ نہیں تھی۔ اور جس کے تن بیجان میں قائد اعظمؒ کی مسیحائی سے زندگی نئے ولولے، نئی شان اور نئے عزم سے بیدار ہو چکی تھی۔ سکھوں نے نعرہ لگایا۔ ہم مسلم لیگ کی وزارت نہیں بننے دیں گے۔ پنجاب خالصوں کا ہے۔ ہم مسلمانوں کو یہاں نہیں ٹکنے دیں گے۔

غیرت مسلم جوش میں آگئی۔ گاندھی تارا سنگھ کے روپ میں سامنے آیا تھا۔ مسلم قوم کو اس کا جواب دینا ہی تھا۔

سکھوں کی سرگرمیوں کا گہوارہ امرتسر تھا۔ چنانچہ ان کی پہلی بوچھاڑ امرتسر کے نہتے مسلمانوں پر پڑی۔ مسلمان روادار تھے۔ آئین اور اصول کی جنگ لڑ رہے تھے۔ انہوں نے اس نہج پر سوچا ہی نہیں تھا۔ جنگ تو جنگ مدافعت کے لئے بھی کچھ تیاری نہ کی تھی۔ لیکن۔

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

سکھوں کے جارحانہ اقدام کا مسلمانان امرتسر نے بڑے حوصلے سے جواب دیا۔ وہ زیادہ دیر اپنے خون کو بہتے اپنے گھروں کو لٹتے نہ دیکھ سکے۔ خالی ہاتھ مدافعت کو اٹھے اور پھر سکھوں کا اسلحہ ہی چھین کر انہیں یہ سبق دے دیا کہ مسلمان جب مقابلہ کے لئے اٹھتا ہے تو انجام و عواقب سے بے خبر ہو کر اٹھتا ہے۔

ہم اپنی ہزار سالہ مشترکہ تاریخ اٹھا کر دیکھیں۔ تو ہندو کے عزائم روز روشن کی طرح نظر آتے ہیں۔ اس قوم نے مسلمانوں کو ذہنی طور پر کبھی قبول نہیں کیا۔ راجہ داہر کا حملہ مسلمانوں کو معاشی طور پر مفلوج کرنے کی نیت سے تھا۔ راجہ جے پال کا درہ خیبر عبور کر کے سبکتگین کے ملک پر حملہ آور ہونا اس امر کی دلیل ہے۔ کہ مسلمانوں کو سیاسی طور پر مفلوج کر دیا جائے۔ محمد غوری کے دو حملوں سے بھی ان کی اسی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے کہ مسلم امداد کی ضرورت ہو تو طلب کر لیں۔ لیکن جب غوری ہندوستان میں اسلامی مملکت کی بنیاد رکھے تو اسے ظالم گردانا جائے۔ غیاث الدین بلبن کے زمانہ میں راجپوت راجاؤں نے بغاوت کی۔ مبارک شاہ خلجی ایک ہندو جاتی کے لڑکے خسرو کے ہاتھوں قتل ہوا۔

ابراہیم لودھی کا ایک لاکھ کا تربیت یافتہ لشکر بابر کی بارہ ہزار فوج سے شکست کھا گیا۔ حالانکہ یہ لشکر تلوار کے دھنی راجپوتوں پر مشتمل تھا۔ یہ شکست انہی نے دلائی۔ وہ سمجھتے تھے بابر ہر بیرونی حملہ آور کی طرح لوٹ جائے گا۔ لودھی کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر راجپوتوں کے اثر و رسوخ کے لئے میدان ہموار ہو گا۔

عادل شاہ سوری کو ہیمو بقال نے دھوکہ دیا۔ ہیمو پانی پت کے مقام پر بیرم خان کے مقابل آیا۔ اورنگ زیب کی تخت نشینی کے لئے کشمکش شروع ہوئی۔ تو ہندوؤں نے سر اٹھانے کا موقعہ پایا۔ راجہ جسونت سنگھ والئی جے پور خود مختار ہو بیٹھا۔

مغلوں کے دور انحطاط میں مہاراشٹر کے مرہٹوں نے سر اٹھایا۔ پنجاب میں سکھوں نے اقتدار حاصل کرنے کی سعی کی۔ ہماری ہزار سالہ تاریخ شاہد ہے کہ اسلام اور بت پرستی کبھی ایک نہیں ہوئے۔ جب کبھی جہاں کہیں ٹکراؤ ہوا۔ خون کی ندیاں بہہ گئیں۔

انہیں حالات کی روشنی میں ایک آزاد اسلامی ریاست کا تصور ابھرا۔ مسلمان مفاہمت' سلوک اور رواداری سے اپنی آبادی سے بھی کم حصے پر رضامند تھے۔ ہندوؤں سے الگ ایک آزاد خود مختار ریاست کے خواہاں تھے۔

لیکن انگریز کے چلے جانے کے بعد ہندو ذہن مسلم کی غلامی کا خواب دیکھ رہا تھا۔ اسے اقلیت بنا کر کچل دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ برہمو سماج کا قابل نفرت حصہ بنا دینا چاہتا تھا۔ ہندو کی اسلام دشمنی ازل سے چلی آ رہی تھی۔ اس قوم نے اتحاد کی خواہش کبھی نہیں کی۔ اسلام کو ہندومت میں جذب کرنے کی کوششیں بھی ہوئیں۔ رامانند' کبیر' گورو نانک اور شری دھرو غیرہ مذہبی راہنماؤں کی معرفت عمل انجذاب کا اطلاق کیا گیا۔ لیکن اسلام اور جواب تھا۔ وہ جذب نہ ہو سکا۔

تاریخ کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو ہندو ذہن کی منافرت اور تعصب کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ اب بھی ہندو ذہنیت نے جو بھائی چارے کا کانگریس کے توسط سے نعرہ لگایا تھا۔ وہ محض فریب تھا۔ گاندھی' نہرو' پٹیل اور مالویہ سب ایک تھے۔ ان کے ہاتھوں میں چھپے ہوئے خنجر تھے۔ جو وہ دل مسلم میں اتارنے کے حیلے ڈھونڈ رہے تھے۔

مسلمانوں کی ایک بدقسمتی یہ تھی کہ ہندو غیر تھے۔ اپنے مسلمان بھی ہندو سے مل کر غیریت کا سلوک کر رہے تھے۔ مسلمانوں کی مصیبتوں کا واحد حل پاکستان تھا۔ لیکن وہ اس کی راہ میں روڑے اٹکا رہے تھے۔ قرآن ہاتھوں میں تھام کر مسجدوں کے منبروں پر کھڑے ہو کر اس نظریئے کی مخالفت کی جرات کر رہے تھے۔ جس پر تقریباً پوری قوم متحد و متفق ہو چکی تھی۔

بے شک مطالبہ پاکستان پورے ہندوستانی مسلمانوں کی مصیبتوں کا حل نہیں تھا۔ لیکن اس طرح ساڑھے سات کروڑ مسلمانوں کو تحفظ مل سکتا تھا۔ وسیع پیمانے پر آبادی کا تبادلہ ممکن نہ تھا۔ اپنی اقلیتوں کے متعلق یہی خیال تسکین دہ تھا۔ کہ اگر ہمارے تین ساڑھے تین کروڑ مسلمان ہندوستان میں رہ جائیں تو ہندو اقلیتیں بھی تو پاکستان میں ہوں گی۔ اپنی اپنی اقلیت کے تحفظ اور بقا کے لئے دونوں حکومتیں اچھا سلوک روا رکھیں گی۔

مسلمانوں کا جوش و خروش دیکھ کر کانگریس ملک کی تقسیم پر مجبور ہو گئی۔ وہ زبان جو ہند کی تقسیم کو گئو ماتا کے ٹکڑے کہہ رہی تھی۔ وہ آواز جو چیخ چیخ تھی۔ کہ پاکستان بنے گا تو میری لاش پر بنے گا۔ مسلمانوں کے اتحاد اور تنظیم

کے سامنے کچل گئی۔

لیکن عیار ہندو اپنی عیاری سے باز نہ آیا۔ اس نے بنگال اور پنجاب کی تقسیم کا مطالبہ کر دیا۔ جواز یہ تھا کہ جب پنجاب اور بنگال کے مسلمان اکھنڈ بھارت تسلیم کر کے ہندو اکثریت کے دباؤ تلے آنا نہیں چاہتے۔ تو پھر بنگال اور پنجاب کے ہندو بھی مسلمان اکثریت کے غلبے میں نہیں آنا چاہتے۔

حالات اتنے مخدوش ہو چکے تھے کہ مسلم لیگ کے پاس اس تقسیم کو ماننے کے سوا چارہ نہ رہا۔ تین جون کو برصغیر کی آزادی کا اعلان ہوا۔ تقسیم کی حد بندی کے لئے کمیشن بٹھایا گیا۔ ۱۴ اگست کو پاکستان معرض وجود میں آ گیا۔

مسلمانوں کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ سات سال کے قلیل عرصہ میں انہوں نے مطالبہ پیش کر کے وہ مملکت بھی حاصل کر لی۔ انہوں نے مساجد میں نوافل پڑھے۔ چراغاں کیا۔ عید کی خوشیاں منائیں۔ اور اقلیتوں کو تحفظ کی نیک دلی سے ضمانت دی۔

سرحدی کمیشن کا صدر ریڈ کلف تھا۔ جو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے زیر اثر تھا۔ ماؤنٹ بیٹن نہرو کا ذاتی دوست بھی تھا۔ کمیشن کے دو مسلمان اراکین جسٹس دین محمد اور محمد منیر تھے۔ سر ظفر اللہ مسلم لیگ کی جانب سے بطور وکیل پیش ہوئے۔ بھارت نے جسٹس تیجا سنگھ اور جسٹس مہاجن کو اپنا نمائندہ بنایا۔

طویل بحث کے بعد اراکین کمیشن میں سرحد کے تعین میں اختلاف رونما ہوا۔ چنانچہ معاملہ ریڈ کلف کے سپرد کر دیا گیا۔ اس نے ۱۸ اگست کو اپنا ثالثی فیصلہ دے کر وہ عجیب و غریب سرحد متعین کی۔ جو سرحد نہیں آگ اور خون کا دریا بن گئی۔ پاکستان کے کئی اہم اکثریت کے علاقے ہندوستان میں شامل کر کے کشمیر کو بھارت سے ملانے کا راستہ دے دیا۔

یوں ماؤنٹ بیٹن اور ریڈ کلف مسلمانوں کے بدترین دشمنوں نے سر بریدہ پاکستان مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ پاکستان آج تک اس غیر منصفانہ تقسیم کی وجہ سے مشکلات میں گھرا ہوا ہے۔

مسلمانوں کے سینے میں اس طرح خنجر اتار کر ہی دم نہیں لیا گیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے نقل اختیارات میں بھی جعل بازی کی۔ پاکستان کے حصے میں آئی ہوئی فوج تا حال ملک سے باہر تھی۔ پاکستان کا اسلحہ ہندوستان میں پڑا تھا۔ روپیہ پیسہ بھی ہندوستان ہی میں تھا۔ لیکن حصے بخرے کر دیئے گئے۔

یہ ساری ہندو اور انگریز کی مسلمانوں کو کچل دینے کی سازش تھی۔ نئی مملکت پر اتنے وار بیک وقت کر دیے گئے کہ اس کا قائم رہنا ناممکن سا نظر آیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی نظر کرم ہوئی۔ پاکستان نا مساعد حالات میں بھی چٹان کی طرح قائم رہا۔

ماؤنٹ بیٹن اور ریڈ کلف نے ہلاکو اور چنگیز خان سے بھی زیادہ مسلمانوں کی ہلاکت آفرینی کے سامان مہیا

وہ ہندو کو خوش کرنے کی چال چل چکا تھا۔ پندرہ اگست سے پہلے مسلمانوں کو ان کے حصہ کی فوج، گولہ بارود اور روپیہ پیسہ مل جاتا۔ تو یقیناً وہ واقعات پیش نہ آتے۔ جن کو قلمبند کرتے ہوئے مورخ کا قلم بھی لرزتا ہے

۸

چودہ اور پندرہ اگست کی درمیانی شب جب مسلمان پاکستان حاصل کرنے کی خوشی میں گھی کے چراغ جلا رہے تھے۔ ہندو ذہنیت کا آتشیں لاوہ پھوٹ نکلا تھا۔ آگ اور خون کا سیلاب بہ نکلا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن اور ریڈ کلف کی بددیانتی دل مسلم میں خنجر بن کر اتر گئی تھی۔

فسادات سوچی سمجھی سکیم اور تیار کی ہوئی سازش کا نتیجہ تھے۔ نوزائیدہ مملکت پر اتنا گراں بار ڈالنا مقصود تھا کہ یہ مملکت خداداد سہار نہ سکے۔ بھارت کا مسلمان پرامن اور وفادار شہری بن کر بے خبر بیٹھا تھا۔ ہندوستانی فوج اور پولیس غنڈوں کی پشت پر تھی۔ پٹیالہ، نابھہ، کپور تھلہ، بھرت پور اور الور کی ریاستوں سے مسلح فوج مشرقی پنجاب میں پہنچ چکی تھی۔ مسلمان پولیس کو نہتا کر دیا گیا تھا۔ مسلمانوں کے گھروں کی تلاشیوں کے بعد ان سے وہ چیزیں لے لی گئی تھیں۔ جس سے وہ اپنی مدافعت کر سکتے تھے۔

وقت آنے پر فسادات شروع ہو گئے۔ بہت جلد مشرقی پنجاب کے تمام اضلاع اور سکھ ریاستیں اس کی لپیٹ میں آ گئیں۔ ہندو اور سکھ غنڈے وحشت اور بربریت کا طوفان بن کر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ انہیں بے دریغ قتل کیا گیا۔ ان کے گھر جلائے گئے۔ ان کی ماؤں بہنوں کی آبرو لوٹی گئی۔

مسلمانوں کو بے خبری اور رواداری کی کڑی سزا ملی۔ جس قوم نے ایک ہزار سال سے اسے مٹانے کا عمل جاری رکھا تھا۔ اس قوم سے مسلمان رواداری کی توقع کر بیٹھا تھا۔ یہ بے خبری تھی۔ بھول تھی۔ مسلمان نہتا تھا۔ جوش و ولولہ تو ضرور رکھتا تھا۔ لیکن فسطائیت، درندگی اور بہیمیت کا مقابلہ کرنے کے لئے اس کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا۔ دشمن گولہ بارود سے لیس تھا۔ جنگی سامان رکھتا تھا۔ سنگینیں، تلوار، کرپان ہر ہاتھ میں تھی۔ پستولوں اور بندوقوں کی گولیاں چل رہی تھیں۔ مسلمان کا سینہ چھلنی ہو رہا تھا۔

لٹے پٹے مسلمان لاکھوں کی تعداد میں پاکستان کا رخ کرنے لگے۔ لاکھوں گھر اجڑ گئے۔ انہیں کوئی سہارا نہ تھا۔ پاکستان ہی ان کی پناہ گاہ تھا۔ فسادات کی لرزہ خیز داستانیں اور حیاسوز واقعات ہسپتال میں بھی سننے میں آ رہی تھیں۔ لو

ہوئے تھے۔ لیکن ابھی حوصلہ نہیں ہارا تھا۔

جمعہ کو جامع مسجد میں بم پھٹنے سے تین نمازی شہید ہو گئے۔ دس پندرہ شدید زخمی ہوئے بیسیوں کو چوٹیں آئیں۔ اس سانحے سے خوف و ہراس پھیل گیا۔ نہتے مسلمان خوفزدہ ہونے کے سوا کر ہی کیا سکتے تھے۔ نصیر الدین کا گھرانہ مسلم لیگی تھا۔ گھر کے افراد کی عملی سرگرمیوں کی وجہ سے یہ گھرانہ دشمن کی نظروں میں تھا۔ ادھر برادری کے مسلمانوں کی نگاہیں بھی اسی گھرانے پر لگی تھیں۔ ذات برادری کے سرکردہ لوگ نصیر الدین کی بیٹھک میں جمع ہوتے۔ صورت حالات کا جائزہ لیا جاتا۔ تشویش ظاہر کی جاتی۔ لیکن جب آگ کی لپیٹ میں آنے والی صورت حال کا جائزہ لیا جاتا تو سب کے چہروں پر مایوسی پھیل جاتی۔ کوشش کے باوجود فہیم ابھی تک وہ پستول بھی نہ حاصل کر سکا تھا۔ جو اسے ایک مسلم لیگی دوست نے دینے کا وعدہ کیا تھا گھروں میں چارپائیوں کی پائیوں اور سبزی ترکاری کی چھریوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

حالات دن بدن سنگین ہوتے جا رہے تھے۔ تباہی اور بربادی کی لرزہ خیز داستانیں سننے میں آ رہی تھیں۔ گاؤں اور قصبوں میں وحشت جس طرح ناچ رہی تھی۔ ہر فرد ہراساں تھا۔

اس رات نصیر الدین کی بیٹھک میں دس پندرہ آدمی جمع تھے۔ صحن میں بی بی کے پاس بھی آٹھ دس عورتیں چارپائیوں پر بیٹھی تھیں۔

"حالات بڑی تیزی سے خراب ہو رہے ہیں۔ آج شہر میں تین قتل ہوئے ہیں"۔ رفیق احمد نے کہا۔

"سنا ہے محلہ شیخاں میں کچھ مکانوں کو آج لوٹ کر نذر آتش بھی کیا گیا ہے" نے پریشانی کے عالم میں [illegible] ہوئے کہا۔

"سچ ہے یہ۔ ہمارا دھوبی اسی محلے میں رہتا ہے۔ اس کے دونوں لڑکے مارے گئے ہیں۔" عزیز دار نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"ہمیں کچھ تو سوچنا چاہیے" نصیر الدین نے فکر مندی سے کہا۔

"اللہ ہی حافظ ہے۔" تشویش بھری آواز میں جلال الدین بولے۔

"ہمیں واقعی حفاظتی تدابیر تو اختیار کرنا چاہئیں۔" امیر دین نے کہا۔

"سنا ہے پولیس گھروں کی تلاشیاں لے رہی ہے۔ اسلحہ رکھنے کی پابندی عائد کر دی گئی ہے۔" ناصر نے [illegible] کا اظہار کیا۔

"میرا خیال ہے۔ ہم اس محلے سے کسی مسلمان آبادی میں چلے جائیں۔ کم از کم اکٹھے تو ہوں گے۔" رفیق احمد نے تجویز پیش کی۔

سلیم جو اب تک چپ بیٹھا تھا۔ ان کی باتیں سن سن کر مسکرا رہا تھا۔ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ سب نے اس کی طرف دیکھا۔ فہیم کی نظروں میں سرزنش تھی۔ یہی حال نصیر الدین کا تھا۔

"حد ہو گئی بزدلی کی۔" سلیم نے رفیق احمد کی طرف دیکھا
"وقت کی نزاکت کے احساس کو بزدلی کہنا حماقت ہے۔" ڈاکٹر میر نے سلیم سے کہا۔
"میر صاحب آپ لوگ ناحق اتنے پریشان ہو رہے ہیں۔" سلیم مسکراتے ہوئے بولا۔
"طوفان اٹھتا نظر آ رہا ہے سلیم۔" نصیر الدین بولے۔ "امرت سر سے جو خبریں آ رہی ہیں وہ [illegible] ناک ہیں۔ گرد و پیش جس طرح آگ بھڑک رہی ہے۔ اس سے آنکھیں بند نہیں کرنا چاہئیں۔"
"اباجان۔ حقیقت اور افواہ میں بڑا فرق ہے۔ بات کا بتنگڑ بنانا ہم لوگوں کا کام ہے۔ فرقہ وارانہ [illegible] ہے ضرور۔ لیکن یہ جنون وقتی ہے۔ چند دنوں کی بات ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ غنڈہ عنصر ایسے موقعوں [illegible] مانی کرنے پر اتر ہی آتا ہے۔ میں تو کہوں گا۔ یہ سب دیوانگی ہم لوگوں ہی کی پیدا کردہ ہے۔ اس کی [illegible] صریحاً مسلم لیگ پر ہے۔ جس نے صدیوں ساتھ رہنے والے بھائیوں میں نفاق کا بیج بو دیا۔ اور دو قومی نظریہ [illegible] کر کے ملک کی وحدت کو نقصان پہنچایا۔"
"سلیم۔! تمہاری آنکھیں اب تک نہیں کھلیں۔" رفیق احمد ترش روئی سے بولا۔ "خدا کا لاکھ لاکھ [illegible] ہے۔ ہم نہ سہی ہمارے بھائیوں کی کثیر تعداد تو پاکستان میں محفوظ ہو چکی ہے۔ یہ وحشت اور درندگی جو ہو [illegible] رہی ہے۔ سب مسلمانوں پر ٹوٹنا تھی۔"
"ہاں جی۔ تمیں پینتیس کروڑ ہندوؤں کا مقابلہ دس کروڑ کیسے کر سکتے تھے۔"
"شکر الحمد للہ! کہ پاکستان بن گیا۔ ہمارے سات کروڑ بھائی تو ان درندوں سے محفوظ ہو گئے۔"
"قربانی کا جذبہ بہت ہے آپ لوگوں میں۔" سلیم نے طنز کیا۔
"انشاء اللہ یہ جذبہ برقرار رہے گا۔" ڈاکٹر میر بولے۔
"تو پھر تشویش کس بات کی۔ سلیم نے بھرپور طنز کیا۔" پاکستان کے نام پر قربان ہونے کو تیار ہو جائیے۔"
"ہم جانی اور مالی قربانی سے نہیں دہل رہے سلیم۔ جو کچھ سننے میں آ رہا ہے۔ اس سے خوف زدہ ہیں۔ بیٹیوں کی عزت کا سوال ہے۔ تشویش اور سوچ تو اس بات کی ہے۔ نصیر الدین سلیم سے مخاطب تھے۔
"اباجان" سلیم نے سعادت مندی سے کہا۔ "آپ ناحق تشویش کر رہے ہیں۔ انشاء اللہ یہاں [illegible] کسی بات کا خدشہ نہیں ہے۔ پورا محلہ ہم لوگوں کی حفاظت کا عہد کر چکا ہے۔ پنچھ پر قسمیں کھا کر محلے میں [illegible] برقرار رکھنے کا عہد ہوا ہے۔ اس پورے علاقے کی امن کمیٹی بھی بن گئی ہے۔ سردار مہندر سنگھ، لالہ گوپی ناتھ [illegible] لالہ جیون نے اپنے علاقے کے مسلمانوں کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ یہ سب سرکردہ لوگ ہیں۔ نقض امن [illegible] صورت میں جانیں لڑا دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔" سلیم کی باتوں سے سب کا حوصلہ قدرے بندھا۔
"اس کے علاوہ سٹی مجسٹریٹ رادھا کشن میرا عزیز ترین دوست ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات ہی نہیں۔ [illegible] صاحب ڈی ایس پی چڈھا تو آپ کا جگری دوست ہے۔ کیا یہ لوگ بھی نظریں بدل لیں گے۔"
"مذہبی جنون اور وحشت کو آپ نہیں جانتے۔" امیر دین نے کہا۔
سلیم ان لوگوں کی بزدلی پر ہنسا۔
نعیم سر جھکائے بیٹھا تھا۔ آج پٹیالہ سے اس کا دوست آیا تھا۔ وہاں مسلمانوں پر جس طرح تیغ ستم چلائی [illegible]

تھی۔ وہ اس کا چشم دید گواہ تھا۔ لوگوں کے خوف و ہراس کے پیش نظر فہیم نے اس بارے میں کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ تاہم اس نے سب کو خطاب کر کے مختصراً کہا۔

"بہر حال ہمیں اپنے حوصلے مضبوط رکھنے چاہئیں۔ مجھے ہندو کی ذہنیت پر اعتماد نہیں نہ ہی سکھوں سے رحم و کرم کی توقع ہے۔ ہر قربانی کے لئے ہمیں اپنے آپ کو تیار رکھنا چاہئے۔ بزدلوں کی طرح جینے سے بہادروں کی طرح مر جانا مسلمان کی شان ہے۔ ہمارے پاس ہتھیار نہیں ہیں۔ لیکن ہم پر عتاب ٹوٹا تو ہم ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔ خالی ہاتھوں سے کریں گے۔ ہمارے ہاتھوں میں تلوار نہ سہی ہمارے بازوؤں میں بجلیاں تو ہیں۔ ہمیں ان بجلیوں پر پورا بھروسہ ہے۔ اللہ کا سپاہی بے تیغ بھی لڑتا ہے۔"

"بھائی میاں" سلیم نے فہیم کا مذاق اڑایا۔ "اتنے جوش میں آنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے بازوؤں کو وہاں آزمانے کی نوبت نہیں آئے گی۔ سمجھے......"

بیٹھک میں مردوں کی بحث تکرار بن رہی تھی اور اندر صحن میں عورتوں سے بی بی باتیں کر کے ان کے حوصلے بڑھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

بانو کچھ دیر تو عورتوں کی حوصلہ شکن باتیں سنتی رہی۔ سعیدہ اور نسیمہ پر تو اسے غصہ بھی آ رہا تھا۔ ہاتھوں کے طوطے اڑے جا رہے تھے۔ کبھی لدھیانہ سے پٹیالہ جانے کا پروگرام بنا رہی تھیں۔ کبھی لاہور خالہ صفیہ کے ہاں جانے کا۔

بانو کو بھی حالات کی نزاکت کا پوری طرح احساس تھا۔ لیکن حوصلہ ہار دینے سے تو کام بننے کا نہیں تھا۔ پاکستان بنانے کے لئے لوگوں نے ہمیشہ جانی اور مالی قربانی دینے کا عہد کیا تھا۔ بالفرض یہ وقت آ بھی گیا۔ تو بجائے پریشان اور حواس باختہ ہونے کی بجائے عزم و استقلال سے سامنا کرنے کی ضرورت تھی۔ موت کا وقت معین ہے۔ یہ مسلمان کا ایمان ہے۔ اس ایمان پر تو مسلمان جیتا ہے۔ طوفان سے ٹکراتا ہے۔ اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتا ہے۔

بانو جوش میں آ کر عورتوں کو یہ سب باتیں سمجھانے لگی۔ حسن نے پاکستان کے سہانے تصور اسے دیے تھے۔ ان کے سامنے یہ قربانی کچھ بھی تو نہ تھی۔ حسن کی ایک ایک بات اس کے ذہن نشین تھی۔ وہ اسی کے الفاظ دہرانے لگی۔

"پاکستان پاک لوگوں کا پاک وطن ہے۔ وہاں اسلامی نظام حکومت رائج ہو گا۔ ایک صاف ستھرے اور پاکیزہ معاشرے کی تشکیل ہو گی۔ وہاں بھائی چارے اخوت مساوات اور رواداری کا دور دورہ ہو گا۔ کیوں کہ یہی اسلامی معاشرت کے اہم نکات ہیں۔ وہاں منافرت نہیں ہو گی۔ تعصب نہیں ہو گا۔ حق دار کا حق مارنے والا کوئی نہ ہو گا۔ وہاں سب مسلمان بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے درد پر تڑپ جانے کا احساس لئے ہوں گے۔ وہاں عورت کو اس کا وہ مقام ملے گا۔ جو اسلام نے اسے ودیعت فرمایا۔ وہ وہاں جہیز کی سولی پر نہیں چڑھے گی۔ یہ تو ہندوؤں کی اپنائی ہوئی رسم ہے۔"

بانو کے منہ میں حسن کی زبان بول رہی تھی۔ بی بی کا سر فخر سے بلند ہو رہا تھا۔

"ہمیں اس سے کیا......؟" چچی سکینہ نے منہ بنایا۔ "ہم تو مصیبتوں ہی میں رہیں گے۔ ہمارا علاقہ بھی پاکستان میں آ جاتا تو بات تھی۔"

"مسلمان سے انگریز اور ہندو نے عیاری کی ہے چچی۔ پنجاب اور بنگال بھی تقسیم کر دیا کوئی بات نہیں ان دیکھے خدا کی پرستش کرنے والے ہیں۔ ہزاروں میل دور کعبہ کو سجدہ کرنے والی قوم ہیں۔ ہمارا ایمان اعتقاد واضح ہے۔ کفر نے غلبہ کیا تو ہم سرخروئی سے اس کا مقابلہ کریں گے۔ ہمیں اتنی ہی تسکین کافی ہمارے سات کروڑ برادران وطن اسلام کے ابدی اصولوں کو آزمانے کے لئے مقام حاصل کر چکے ہیں

رات گئے تک باتیں ہوتی رہیں۔

حالات کے پیش نظر اس تجویز پر ضرور غور کیا گیا۔ کہ محلے کے سارے مسلمان گھرانے کم از کم رات وقت ایک گھر میں جمع ہو جایا کریں۔ اس طرح ایک دوسرے کی قربت کے احساس سے ڈر خوف بھی زائل ہو گا اور اگر خدانخواستہ غنڈہ عنصر یہاں بھی پہنچ گیا تو اجتماعی مقابلہ بھی کیا جا سکے گا۔

سلیم ان تجویزوں کا مذاق اڑاتا رہا۔ لیکن بالآخر طے پا گیا۔ کہ رات کا کھانا کھانے کے بعد نصیر الدین کے گھر آجایا کریں۔ عورتیں چھت پر اور مرد صحن اور گلی میں سویا کریں۔ ضرورت پڑے تو باری پہرہ بھی دیا کریں۔

فسادات کی آگ تیزی سے پھیلتی جا رہی تھی۔ بہت جلد مشرقی پنجاب کے تمام اضلاع اور سکھ ریاستوں میں شعلے بھڑک اٹھے۔ لٹے پٹے تباہ حال مسلمانوں کے قافلے پاکستان کی طرف کوچ کرنے لگے۔ قافلوں پر بھی حملے ہونا شروع ہو گئے۔ تربیت یافتہ غنڈے منظم طریق اور بنائی ہوئی سازش سے مسلمانوں کو مسلمان ہونے کی سزا دینے لگے۔ درندگی، بربریت اور وحشت نے مسلمانوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

لدھیانہ بھی اس آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ اِکا دُکا فسادات نے بہت جلد ہمہ گیر صورت اختیار کر لی۔ سلیم اپنے دوست سٹی مجسٹریٹ رادھا کشن کے پاس پہنچا۔ تحفظ کے لئے اس کا منہ ہی دیکھنا تھا لیکن سلیم کو ایک دھچکا سا لگا۔ اب اس نے صرف نظریں ہی نہیں پھیر لیں۔ بلکہ سلیم کو درشت لہجے میں دھتکار بھی دیا۔

"رادھا کشن" سلیم نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

"سلیم! مجھے کام بہت ہے۔ تنگ نہ کرو۔ میں تم لوگوں کو بچانے کا ٹھیکہ نہیں لے سکتا۔ اپنی حفاظت آپ کرو۔ مذہبی جنون کے سیلاب کے آگے میں بند نہیں باندھ سکتا۔ یہ تمہارے مسلمانوں ہی کا کیا دھرا ہے۔"

رادھا کشن یوں کورا جواب دے دے گا۔ سلیم کے وہم گمان میں بھی نہ تھا لیکن ہندوؤں پر اس کا اعتماد ختم نہیں ہوا۔ اسے اپنے محلے کے ہندوؤں اور سکھوں پر پورا پورا بھروسہ تھا۔ شام وہ لالہ گوپی ناتھ کے گھر گیا۔ مندر سنگھ اور دیوان لال کے علاوہ محلے کے اور ہندو سکھ بھی جمع تھے۔ شاید کوئی اہم معاملہ زیر غور تھا۔ کیونکہ سلیم کے اندر داخل ہوتے ہی گفتگو ختم ہو گئی۔

"لالہ جی..... حالات بڑے خراب ہو گئے ہیں۔ آج شہر کے مشرقی حصے میں تو آگ اور خون کا طوفان اٹھا ہوا ہے۔ گھر والے سب پریشان ہیں۔"

"بیٹا!..... لالہ گوپی ناتھ جذبات سے عاری لہجے میں بولا۔ "ہم اپنے محلے میں کوئی شرارت نہیں ہونے دیں گے۔ تم مطمئن رہو۔"

"ہمیں اپنی جانوں کا نہیں اپنی آبرو کا تحفظ چاہئے لالہ جی۔"

"سب ہماری بیٹیاں ہیں سلیم۔" گوپی ناتھ کی جگہ مندر سنگھ بولا۔ "ہمیں ان کی عزت اپنی بسنت کور اور بملا دیوی ہی کی طرح عزیز ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو ہم صورت حال کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔"

"مہربانی سردار جی۔" سلیم نے کہا۔

کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں۔ سلیم کو ہر طرح سے حفاظت کا یقین دلایا۔ لیکن خدا جانے ان کے صداقت نہ تھی۔ یا ان کی آنکھوں میں ناچتا شیطان اس نے دیکھ لیا تھا۔ دل برداشتہ سا ہو کر گھر لوٹا۔ وہ حواس باختہ نظر آ رہا تھا۔ اعتماد نے آج زبردست چوٹ کھائی تھی۔

ثریا نے یوں گم صم دیکھ کر بہتیرا اصرار سے پوچھا لیکن اس نے کچھ بتایا نہیں۔ صرف اتنا کہا۔ "ہم جینے مرنے کی قسمیں کھائی ہیں ثریا۔"

ثریا حیرانگی سے اس کا منہ دیکھنے لگی۔ وہ پھر بڑبڑایا۔ اچھا ہوتا۔ جو بانو کی رخصتی کر دی جاتی۔ یہ منگنی رسمیں ہمیں لے ڈوبیں گی۔

"بات کیا ہے۔"؟ ثریا نے پریشان ہو کر کہا۔

لیکن سلیم کے کچھ کہنے سے پہلے ہی صحن میں شور سا مچ گیا۔ دونوں نے لپک کر نیچے دیکھا اور پھر آگے تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئے۔

مارے گئے۔ اجڑ گئے۔ لٹ گئے۔ یہی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ نصیرالدین کے بھائی دیگر رشتہ داروں کی آوازیں تھیں۔ جو بمشکل شہر کے مشرقی حصے سے جہاں آگ ابل رہی تھی بچ کر پہنچے تھے۔ عورتوں کے سر ننگے تھے برقعوں کا ہوش نہیں تھا۔ تین آدمی گنا کرتے لئے بیٹھے لوگ اس تھے۔ ظلم و وحشت کی جو داستانیں ان حواس باختہ لوگوں نے سنائیں۔ دل دہل گئے۔ ننھو کا کہیں پتہ نہ تھا۔ خدا جانے مر گئیں۔ کہ بلوائی اٹھا کر لے گئے۔ ایک قیامت کا منظر تھا۔

فہیم سر نگوں دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ سلیم پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ بی بی ثریا اور کاٹو تو بدن میں لہو نہیں تھا۔ بہادری سے مقابلہ کر کے مر جانا کوئی بڑی اور خوف زدہ کرنے والی بات نہ تھی۔ یوں درندگی کے پاؤں تلے روندے جانا البتہ تصور بھی لرزہ خیز تھا۔

شام تک سارا شہر فساد کی لپیٹ میں آ چکا تھا آگ کے اٹھتے شعلے۔ جتھیداروں کے جھنکارے سری اکال اور واہگورو کے نعرے سنائی دے رہے تھے۔ محلے کے مسلمان گھرانے نصیرالدین کے گھر میں جمع بچے رو رہے تھے۔ مائیں خوف زدہ تھیں۔ ماحول پر موت کی سی سنجیدگی طاری تھی۔ لٹے ہوئے لوگوں کے دل درد بھی سب کو بے چین کر رہا تھا۔

محلے کے سرکردہ ہندوؤں اور سکھوں نے اپنے حفظ امان میں رکھنے کا پورا یقین دلایا۔ لیکن فضا اس متزلزل کر رہی تھی۔ اور جب پچھلی قصائی گلی میں مسلمانوں پر آفت ٹوٹی۔ تو بڑے سے بڑا حوصلہ رکھنے والے اوسان بھی خطا ہو گئے۔

"مقابلہ کے لئے ہمت اور عزم برقرار رکھو۔" فہیم نے گھر میں جمع سب لوگوں سے کہا۔

"پاکستان بنانے کی سزا مل رہی ہے۔" کسی نے کہا۔

"پاکستان بنانے کی نہیں۔" فہیم جوش میں تھا۔ "یہ ہمیں اپنی غفلت کی سزا مل رہی ہے۔ ہم نے کیا اپنی مدافعت کی بھی تیاری نہیں کی۔" یہ وقت آنا تھا۔

سلیم خاموش کھڑا تھا۔ اس پر کوئی طنز کرنے کا موقع نہیں تھا۔ پھر بھی فہیم سے نہ رہا گیا۔ "آپ کا

...ہوگا۔ اب دفاع کی کوئی صورت نکالنی چاہئیے۔

"دفاع کے لئے ہمارے پاس ہے ہی کیا۔"

"جو کچھ بھی بن پڑے کرنا چاہئے۔"

خاندان کے نوجوانوں نے بھی فہیم کی بات کی تائید کی۔ پھر بہت جلد سب نے مل کر گھر میں جو چیز بھی دفاع کے لئے استعمال میں لائی جا سکتی تھی۔ اکٹھی کر لی۔ چارپائیاں توڑ کر پائیاں نکالی گئیں۔ مٹی سے اینٹیں اکٹھی کی گئیں۔ چینی کے برتن بھی ایک جگہ ڈھیر کر دیئے گئے۔

سلیم کو تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ بت بنا کبھی صحن میں ٹہلنے لگتا۔ کبھی چھت پر جاتا۔ کبھی اپنے کمرے میں بستر پر جا گرتا۔ ثریا پورے دنوں سے تھی بیچاری سے اٹھنا بیٹھنا دوبھر تھا۔ سلیم کی حالت سخت متوحش تھی۔ بی بی اور بانو دوسری عورتوں کے ساتھ مل کر قرآنی آیات کا ورد کر رہی تھیں۔ اللہ تعالیٰ سے تحفظ و امان مانگ رہی تھیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے قوموں کے راستے متعین کر رکھے ہیں۔ جب قومیں ان راستوں سے بھٹک جاتی ہیں تو سزا پاتی ہیں۔ اسلام نے ظلم سے دبنے کی کبھی تلقین نہیں کی۔ ظلم سے نپٹنے کو کہا ہے۔ لیکن ہندی مسلمان اس پہلو سے غافل تھا۔ ظلم سے نپٹنے کی مطلق تیاری نہ کی تھی۔

شام گہری ہو رہی تھی۔ جب قیامت نے محلہ گجر مل کر رخ کیا۔ واہگورو کی جے اور ست سری اکال کے نعرے لگاتے سکھ درندے ناچتے ہوئے آ رہے تھے۔ جتھیداروں کی کرپانیں فضا میں لہرا رہی تھیں۔ بلم، سنگینیں اور چھریاں ہاتھوں میں دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک قیامت بپا ہو گئی۔ خونی طوفان آ گیا۔

نصیر الدین کے گھر میں کم و بیش اسی افراد تھے۔ عورتوں اور بچوں نے تو حوصلہ ہار کر رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ نوجوانوں کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ لیکن جب مرنے کا موقع آ ہی پہنچا تھا۔ تو مار کر مرنے کی ٹھان لی تھی۔ بلوائیوں کے جم غفیر نے نصیر الدین کے مکان کو گھیرے میں لے لیا۔ دل ہلا دینے اور فضا کو لرزا دینے والے جیکارے گونجنے لگے۔ گندی اور ماں بہن کی ننگی گالیاں دے کر غیرت مسلم کو للکارا جا رہا تھا۔

گھر کے دروازے مقفل کر کے ان کے آگے بڑی بڑی پیٹیاں رکھ دی گئی تھی عورتوں اور بچوں کو چھت پر بھیج دیا گیا تھا۔ کچھ عورتیں پچھلے کمرے میں بند ہو گئیں تھیں۔ مرد قیامت کا سامنا کرنے کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو چکے تھے۔ بلوائیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ کچھ ہندوستانی فوج کے سپاہی بھی نظر آ رہے تھے۔ ہندو پولیس بلوائیوں کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔

حالات کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے سلیم نے آخری بار محلے کے سرکردہ لوگوں کو پکارنا چاہا۔ وہ دوڑا ہوا چھت پر گیا۔ کھڑکی کی اوٹ سے گلی میں جھانکا۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ لالہ گوپی ناتھ اپنی چھت پر کھڑا ہنس ہنس کر بلوائیوں کو اشتعال دلا رہا تھا۔ مہندر سنگھ بھی اپنی دوسری منزل کی کھڑکی سے آدھا دھڑ لٹکائے بلوائیوں کو حملے کے لئے اکسا رہا تھا۔ ایک طرف گیان جتھیداروں کو اشارے سے نصیر الدین کا دروازہ توڑ دینے کو کہہ رہا تھا۔ محلے کا غنڈہ ایشور بلم دروازے پر مارتے ہوئے چلا رہا تھا۔ لدھیانے کا حسن اس گھر میں ہے۔ لوٹ لو، اٹھا لو۔ توڑ ڈالو دروازہ۔ بڑا مال ہے اندر۔"

سلیم نے پھر گلی میں جھانکا۔ کسی بلوائی کی نظر اس پر پڑ گئی۔ "نیچے آ۔ تجھ سے نپٹ لیں گے۔ اس کے ساتھ ہی گندی اور حیا سوز گالیوں کی بوچھاڑ آئی۔ سلیم کا خون کھول اٹھا عورتوں کے کھینچنے کے باوجود اس نے

کھڑکی کھول کر بلوائیوں کو بے نقط سنائیں۔

"دروازہ کھول۔" ایشور سنگھ نے قہقہہ لگایا۔ بپھرا ہوا ہجوم دروازے پر ٹوٹ رہا تھا۔ "بچو
برات آئی ہے۔ توا اوپر کھڑا ہے۔ ڈولہ لینے آئے ہیں بانو کا۔" ہجوم میں سے آوازیں اٹھنے لگیں۔
آئے ہیں تیری بہن کا۔"

سلیم کا خون کھول گیا۔ بہن کی آن پر مرمٹنے والی بھائی کی رگ حمیت پر یہ کاری ضرب تھی۔ عورتیں
روکتی رہیں۔ لیکن وہ جوش غیظ و غضب میں انہیں دھکیلتا سیڑھیاں پھلانگتا نیچے اتر گیا۔

بلوائی دروازہ توڑنے میں کامیاب ہو گئے بپھرے ہوئے بھیڑیوں کا ہجوم کرپانیں ' بلمیں 'اور
اندر گھسا۔ اب دوبدو لڑائی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ نوجوانوں نے بھی ڈنڈے مارے اور چارپائیوں کی
سنبھال لیں۔

جھنیار جیکارے لگاتے تیز دھار چاقو، چمکتی کرپانوں اور چھریوں اور کلہاڑیوں سے حملہ آور ہو رہے
تھے۔ فحش اور ذلیل گالیاں بھی بک رہے تھے۔ خون مسلم میں ابال آ گیا تھا۔ مقابلہ جواں مردی سے ہوا۔
تکبیر گونجا...... جوانوں نے کئی بلوائیوں سے کرپانیں اور بلمیں چھین لیں۔ قیامت خیز سماں تھا۔ خون ہی
تھا۔

اوپر چھت پر عورتیں سینہ پیٹ رہی تھیں۔ بال نوچ رہی تھیں۔ بچے خوف زدہ ہو کر چیخ رہے تھے۔
حالت خراب تھی۔ سلیم بلوائیوں میں گھرا وار سہ سہ کر وار کر رہا تھا اس کے سر سے خون نکل رہا تھا۔ ثریا
جنگلے کے گرد دوڑ رہی تھی۔ بانو اور بی بی کی حالت بھی دیوانوں کی سی تھی۔

نعیم کے ہاتھ نرنجن کی کرپان آ گئی۔ وہ انتقام مجسم بنا ہر سامنے آنے والے کو للکار رہا تھا۔ تین چار بلوائی
کرپان سے اوندھے گر چکے تھے۔ نصیرالدین بھی بلم ہاتھ میں آ جانے سے بلوائیوں کے پیٹ چیر رہے تھے
میدان شاید ان کے ہاتھ میں آ جاتا۔ کہ اچانک تازہ دم بلوائیوں کا گروہ صحن میں آ گیا۔ آندھی اور طوفان
نہتے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا۔

سلیم دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ دانت پیستے ہوئے بار بار کہہ رہا تھا۔ "میری بہن کا نام لینے والو! میں تمہیں
جاؤں گا۔" وہ اندھا دھند وار کر رہا تھا۔ لیکن کب تک! کسی بلوائی کی سنگین سینے کے آر پار ہو گئی۔ خون
چمکتے ہوئے خون کا فوارہ چھوٹ گیا۔ وہ منہ کے بل صحن کے وسط میں گرا۔

"ہائے میرا بچہ...... میرا بچہ...... بی بی نے سینے پر زور سے دو ہتڑ مارا۔

"سلیم بھائی۔" بانو فرش پر مرغ بسمل کی طرح لوٹنے لگی۔

"سلیم...... "ثریا چیخی۔ لپک کر سیڑھیوں کی طرف گئی۔ عورتوں نے دروازہ بند کر رکھا تھا۔

"کھول دو۔ کھول دو۔ سلیم۔ سلیم۔" بدحواس ہو کر وہ چیخ گئی۔ دروازہ نہ کھلا تو دوڑ کر جنگلے کی
آئی۔ نیچے جھانکا بلوائی سلیم کی لاش کا قیمہ کر رہے تھے۔

"سلیم" ایک چیخ گونجی۔ دوسرے لمحے عورتوں کے پکڑنے کے باوجود ثریا صحن میں کود کر سلیم کی لاش پر
گری تھی۔ بلموں کے وار اس پر بھی ہوئے۔ لیکن وہ ایک ساتھ جینے اور ایک ساتھ مرنے کا عہد نبھا چکی تھی۔
ایک درندے نے اس کے پھولے ہوئے پیٹ میں بلم ماری۔ دوسرے لمحے اس کا ہونے والا بچہ نوک

ہے پاکستان۔ دیکھو پاکستان۔" وہ وحشی درندہ بچے کو بلم پر لٹکائے ناچنے لگا۔ مقابلہ ہوتا رہا۔ لیکن لاشیں گرنے لگیں۔ گھنٹہ بھر صحن میں ہر طرف مقابلہ ہوتا رہا۔ لیکن لاشوں پر ہی لاشیں نصیر الدین 'ندیم' نعیم اور کنبے کے کئی افراد ختم ہو چکے تھے۔

فہیم' ڈاکٹر میر اور رفیق رہ گئے۔ بلوائیوں کا رخ اب سیڑھیوں کی طرف تھا۔ یہ تینوں مقابلہ کرتے ہوئے سیڑھیوں اوپر چڑھ رہے تھے نا امیدی ہی نا امیدی تھی۔ تینوں اس کوشش میں تھے کہ چھت کے اوپر پہنچ کر کم از کم لڑکیوں کو اپنے ہاتھوں موت کی نیند سلا دیں۔

"شاباش...... شاباش اوپر مال ہے بڑا۔ جلدی پہنچو۔ سامنے کوئی للکار رہا تھا۔

والے کمرے میں بھی عورتیں ہیں۔ کوئی اور آواز آئی۔ کچھ بلوائی کمرے کی طرف لپکے دروازہ توڑ ڈالا۔ ان کو گھسیٹ کر باہر نکالا۔ آہ فریاد۔ نالہ بکا درندوں کے قہقہوں میں ڈوب گئے۔ اور پھر بھائیوں' اور شوہروں کی لاشوں کے درمیان عورتوں پر جو بیتی۔ فضا کانپ کانپ گئی۔ نسوانیت کی دھجیاں اڑا گئیں۔ عصمتوں کے پرخچے سرعام اڑے۔ سیڑھیوں پر مقابلہ بڑا سخت تھا۔ تین آدمی بھلا اتنے مشتعل لوگوں کو کیوں کر روک لیتے۔ ڈاکٹر میر کی گردن پر ایشور سنگھ کی کرپان پڑی۔ وہ تیورا کر گرا۔ بلوائی اسے روندتے ہوئے بڑھے۔ اس کی بہن اوپر ہے۔ جلدی کرو جوانو۔ یاد کرو گے کیا چیز ہے۔ نخنصے لگا؟ ایشور سنگھ اپنے بلوائیوں کو کہہ رہا تھا۔ فہیم کا خون کھول رہا تھا۔ وہ تڑپ تڑپ کر اوپر آنے والے بلوائیوں پر کرپان چلا رہا تھا۔ ڈاکٹر میر کے بعد رفیق بھی شہید ہو گیا۔ فہیم کی آنکھوں میں سیاہیاں لہرانے لگیں۔ ہجوم اوپر آ گیا۔ فہیم گھر گیا تھا۔ زخموں سے خون بہہ رہا تھا۔ تاہم مقابلہ جوانمردی سے کر رہا تھا۔

"شاباش۔ شابا۔ شابا۔" ایشور للکار رہا تھا۔ "بانو اوپر ہے۔ جلدی پہنچو۔" فہیم تڑپ گیا چیخ کر پکارا ...ل ہمت ٹوٹ رہی تھی۔

"بی بی۔ مار ڈالو۔ بی بی بانو کا گلا گھونٹ دو۔ گلا گھونٹ دو۔ اس کی چیخیں بلوائیوں اور حملہ آوروں کے قہقہوں میں ڈوب رہی تھیں۔ وہ الٹے قدموں اوپر چڑھا آخری سیڑھی تک جا پہنچا تھا۔ دروازہ بند نہ ہوتا تو وہ بجلی کی طرح بانو کو اسی کرپان سے ختم کر ڈالتا۔ لیکن دروازہ بند تھا۔ اور وہ لہراتی کرپانوں سنگینوں میں گھر چکا تھا چند ہی لمحوں بعد وہ بھی اپنے قربان ہونے والے بھائیوں کے ساتھ جا ملا۔ بلوائیوں نے اس کی لاش اوپر والی سیڑھی سے لڑھکا دی۔ وہ نصیر الدین کی لاش پر آن گری۔ بی بی اور بانو متوحش ہراساں اور چیختی چلاتی دوڑتی بھاگتی ...وں کو چیرتی ہوئی جنگلے پر لٹک لٹک کر بچھڑنے والوں کا ماتم کر رہی تھیں۔

بلوائی تیزی سے ممٹی کا دروازہ توڑ رہے تھے۔

چھت پر کہرام مچا تھا۔ قیامت بپا تھی۔ عورتیں اپنے زندگی کے سہاروں اور جگر گوشوں کی لاشیں د
کر سکتے میں آ گئی تھیں۔ کچھ بے تیغ سینہ پیٹ رہی تھیں۔ بی بی اور بانو دیوانہ ہو رہی تھیں۔ "ہم
لوگو۔" چیخ و پکار اور نالہ و فریاد سے کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔

بانو سرتاپا کانپ رہی تھی۔ سلیم اس کی آنکھوں کے سامنے شہید ہوا تھا۔ فہیم اور ندیم کو بھی اس
کھاتے دیکھا تھا۔ بھائی اس کی حرمت کے لئے قربان ہو گئے تھے۔ ۔ نصیرالدین اور فہیم بھی لڑتے لڑتے
گئے تھے۔ فہیم کو اوندھے منہ گرتے اس نے دیکھا تو چکرا کر جنگلے کے ساتھ گری۔ بی بی کی حالت بھی ناگفتہ
چیخ چیخ کر گلا بیٹھ گیا تھا۔ حواس جواب دے رہے تھے۔

اب بلوائی دروازہ توڑ رہے تھے۔ شکاری کے ہاتھوں نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ دو لڑکیاں ممٹی پر چڑھ
گلی میں کود کر جان دے دی۔ بانو نے انہیں کودتے دیکھا تو وہ بھی ادھر لپکی۔ بی بی اس کے پیچھے بھاگی۔

لیکن ممٹی پر چڑھنے سے پہلے ہی ساتھ والی دیوار پھاند کر مہندر سنگھ کا بڑا بیٹا راجندر سنگھ چھت پر آ
اس کے ساتھ جیون لال کا بھائی گیان بھی دیوار پھاند کر اتر آیا۔ عورتیں اور بچے انہیں دیکھ کر جانیں
ادھر ادھر بے تحاشا بھاگنے لگے۔ کوئی دیوار پر لپکنے لگا کوئی نیچے دوڑنے لگا۔

"ماسی۔ ماسی بی بی۔" راجندر سنگھ نے دو تین آوازیں دیں۔

"وہ ہے ماسی بی بی۔" گیان ممٹی کی طرف لپکا۔

"ماسی! بانو کہاں ہے۔" راجندر سنگھ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ بانو دیوار کے ساتھ کھڑی او
کی کوشش کر رہی تھی۔ راجندر نے خود ہی اسے دیکھ لیا۔ ۔ گیان بھی ادھر دوڑا۔

راجندر نے لپک کر اس کی کلائی پکڑ لی۔ گیان نے بی بی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"ظالمو... ظالمو" بی بی چلائی۔ بانو چیخی۔ دونوں پر جیسے غشی طاری ہو رہی تھی۔

"ماسی۔ جلدی کرو۔ یہاں سے نکل بھاگو۔ ہم تمہیں یہاں سے نکالنے آئے ہیں۔ ۔" راج
پھولے سانس سے کہا۔

"راجندر۔" بی بی حواس باختہ تھیں۔ جسم ٹھنڈے پسینوں میں ڈوب رہا تھا۔

"جلدی کرو۔ اور تو کوئی بچ نہ سکا۔ بانو بہن کو یہاں سے نکال کر لے چلو۔ ورنہ کوئی دم میں غنڈے اوپر آجائیں۔" گیان دیوار کودتے ہوئے بولا۔

راجندر بھی دیوار پر چڑھا۔ کچھ عورتیں اور بچے چیختے چلاتے دیوار پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔ ۔ بانو کو راجندر نے دیوار کے پار کھینچا۔ بی بی کو بھی گیان اور راجندر نے دوسرے کوٹھے پر کھینچ لیا۔ کچھ اور لوگ بھی کودیں۔ بلوائی اب چھت پر آگئے تھے۔ ناچتے ہوئے چکر لگا رہے تھے۔

"آواز نہ نکالو۔ ماسی بی بی۔ خاموشی سے دونوں ہمارے ساتھ نکل چلو۔ غنڈے بانو۔" راجندر نے ...ک لی۔ گیان نے بھی دبی آواز میں کہا۔ اندھیرے میں دونوں کو سیڑھیوں پر گھسیٹتے لے گئے۔

بی بی اور بانو کو ہوش ہی کہاں تھا۔ زندہ لاشیں تھیں۔ جوان دونوں کے ساتھ ساتھ جا رہی تھیں۔ بلوائی ... پیچھے چھت پر بھی کود پڑے تھے۔ ایک قیامت کا ہنگامہ تھا۔ لیکن وہ دونوں دوسری گلی میں پہنچ چکی

ایشور سنگھ بھی اوپر آگیا تھا۔ وہ بانو کو تلاش کر رہا تھا۔ لیکن بانو نہیں ملی۔

"کہاں ہے وہ مال جس کی دہائی دے رہے تھے۔ ایک سفاک نے پوچھا۔

"گلی میں کود گئی شاید۔ لاجواب شے تھی یار..... "ایشور سنگھ خونی کرپان فضا میں لہراتے ہوئے ریشماں ... بولا۔ ۔ "یہ کیا کم ہے۔ کشمیر کا سارا حسن اس خاندان میں جمع تھا۔"

ریشماں نے آنکھیں بند کر کے کانوں پر ہاتھ رکھ کر دلفگار چیخیں ماریں۔ دونوں درندے اس کے ...ے ہو کر قہقہے لگانے لگے...... کرپان کی نوک سے اسے اخلاق سوز طریق سے چھیڑنے لگے۔ وہ چیخنے

"چل میری۔" ڈھاٹہ بندھے سکھ نے ریشماں کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔

"ہاہا..... کسی اور کو پکڑ لے۔" دوسرے نے پہلے کو دھکا دے کر ریشماں کو اپنی طرف گھسیٹ لیا۔

...خوف سے بے ہوش ہوگئی۔ ۔ لیکن ہوس ناچنے لگی۔

اور یوں ناچنے لگی کہ بے غیرتی نے بھی آنکھیں بند کر لیں۔

راجندر اور گیان ماں بیٹی کی زندہ لاشوں کو گھسیٹتے پچھلی تنگ اندھیری گلی سے ہوتے ہوئے اک ٹوٹے پھوٹے ...میں داخل ہوئے اور پھر دوسری جانب نسبتاً کشادہ گلی میں جا پہنچے۔ ایک خالی مکان میں ماں بیٹی کو دھکیلا۔ ...ے دروازہ بند کر لیا۔ راجندر اور گیان دونوں ہانپ رہے تھے۔ یہ محلہ ان مسلمانوں کا تھا جو قیامت کا ...چکے تھے۔ کچھ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوئے تھے کچھ کٹ مرے تھے۔

...و اور بی بی بت بنی تھیں۔ ۔ رونے کا ہوش تھا نہ بات کرنے کا صدمات کے پہاڑیوں ٹوٹے تھے کہ ...ہیں کھا کر بے حس ہو گئے۔

"ماسی بی بی۔" راجندر نے اپنی گلے میں لٹکتی پگڑی کھولتے ہوئے کہا۔ اس کا جوڑا بھی کھل گیا تھا۔ اور ...پر بکھر گئے تھے۔

"تم دن نکلتے تک یہاں رہو ماسی بی بی۔ صبح" بانو نے ایک کلیجہ شق کر دینے والی چیخ ماری۔ گیان نے ...اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"بانو دیوی۔" وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔ "بھگوان کے لئے آواز نہ نکالو۔"

گیان نے بانو کو ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر بٹھا دیا۔ جہاں وہ گرتے ہی بے ہوش ہو گئی۔ بی بی کو جھنجھوڑ کر راجندر نے بیدار کرنے کی کوشش کی۔ ماں بیٹی پر غشی طاری ہو گئی۔

راجندر اور گیان دونوں کو ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگے۔ ادھر بلوائی من مانی کر رہے تھے۔ مرد مقابلہ کر کے شہید ہو چکے تھے۔ آٹھ دس بلوائی بھی مارے گئے۔ نصیر الدین کے صحن میں لاشیں پڑی تھیں۔ کسی کا سر تن سے جدا تھا۔ تو کسی کے پیٹ کی آنتیں باہر نکل رہی تھی۔ کوئی اوندھا پڑا تھا، تو کسی بچوں کی ٹانگیں الگ تھیں۔ بازو الگ۔ کسی کی گردن نالی میں تھی۔ تو کسی کا دھڑ چارپائی پر۔ خون کی ایسی ارزانی پر ظلم بھی سرنگوں تھا۔

اوپر چھت پر بھی یہی حال تھا۔ جو عصمت مآب عورتیں شوہروں اور بچوں کو بے دریغ ذبح ہوتے دیکھ کر بھی حیات کا ساتھ دے رہی تھیں۔ بے دوش لٹ جانے اور عصمتوں کے چرکے کھانے کے بعد دم توڑ چکی تھیں۔ یہاں نسیمہ کی لاش بھی تھی جس نے دیوار کے ساتھ سر ٹکرا ٹکرا کر اپنی لٹی ہوئی آبرو کا ماتم کرتے ہوئے جان دی تھی۔ اور یہاں ریشماں کی بے گور و کفن لاش بھی تھی۔ جسے ایک نہیں کئی درندوں نے جھنجھوڑا تھا۔ کی لاش کی بے حرمتی کرنے میں بھی حیوانی جذبوں نے تسکین پائی تھی۔

گھر بار لوٹا گیا۔ ناچتے گاتے اور جےکارے لگاتے بلوائی اب کسی اور مسلم آبادی کی طرف چلے گئے۔ انسانیت دم توڑ چکی تھی۔ مذہبی جنون درندگی کا بے روک ٹوک مظاہرہ کر رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود راجندر اور گیان جیسے نوجوان بی بی اور بانو کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کا دل انسانی خون کی ارزانی پر خون کے آنسو رو رہا تھا۔ وہ امنڈتے سیلاب کے سامنے بند تو نہ باندھ سکتے تھے۔ بمشکل بانو کو بچا لائے تھے۔ گیان نے تو بلوائیوں سے الجھنے پر بازو پر زخم بھی کھایا تھا۔ اور راجندر نے اپنے باپ سے گالیاں بھی سنی تھیں۔ لیکن دونوں سلیم کے دوست تھے۔ باپ اور بھائی کے کئے ہوئے وعدوں کو نبھانے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اپنی پوری قوت صرف کر کے صرف ماں بیٹی کو بچانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔

دونوں بے ہوش ماں بیٹی کو ہوش میں لانے کی کوشش کرتے رہے۔ بی بی تو کچھ دیر بعد ہوش آ گیا۔ بانو ساری رات بے خبر پڑی رہی۔

بی بی کا کلیجہ پھٹ رہا تھا۔ شوہر اور بیٹے آنکھوں کے سامنے شہید ہوئے تھے۔ بہو اور اس کا حوصلہ بے دردی سے روندا گیا تھا۔ بی بی کا کلیجہ شق نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ آنسوؤں کا طوفان سینے میں اٹھ رہا تھا۔ راجندر اور گیان اسے حوصلہ رکھنے کی تلقین کر رہے تھے۔ بی بی پانی سے نکلی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔

"جو ہونا تھا ہو چکا ماسی۔ قسمت میں یہی لکھا تھا۔" راجندر نے سر جھکا کر کہا۔

"کاش ہم سلیم کو بھی بچا سکتے۔" گیان نے اس طرح کہا۔ گویا بلوائی نہیں وہ ان ساری باتوں کا ذمہ دار ہے۔

انسان مر گیا ہے۔" راجندر نے آہ بھری۔

"بی بی شکر کرو۔ بانو دیوی غنڈوں سے بچ گئی..... ورنہ شہر میں جو کچھ ہو رہا ہے بھگوان چھما کرے۔"

بی بی خالی خالی آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ کچھ محسوس کرنے کی طاقت ہی نہ رہی تھی۔

شہر میں فوج آ گئی۔ فوج نے بھی مسلمانوں کو تہ تیغ کرنے میں عملی حصہ لیا۔ لیکن چند انسان ابھی زندہ تھے۔ ...کو شہر سے نکالنے کی جدوجہد میں لگ گئے۔ شہر سے باہر ریفیوجی کیمپ لگا دیا۔ اور لدھیانے کے وہ ...انہوں نے ہند سرکار کا پرامن شہری بن کر رہنے کا عہد کیا تھا۔ بے خانماں برباد ہو کر کیمپ میں پہنچے ...قصبوں اور دیہاتوں میں بھی خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ آگ جیتی جاگتی بستیوں کو راکھ کے ڈھیروں میں ...رہی تھی۔ چشم فلک نے ایسے ہولناک مناظر دیکھے۔ کہ انہیں قلمبند کرنے کی تاب نہیں۔ ہندو کا خونخوار ...سکھوں کی وساطت سے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا خون بے دریغ بہا رہا تھا۔

راجندر ماں بیٹی کے پاس ہی ٹھہرا رہا۔ اور گیان شہر کے حالات کا جائزہ لینے باہر نکل گیا۔ دو گھنٹے بعد وہ ...لوٹا تو اس کے ساتھ فوج کے دو سپاہی تھے۔ گیان نے دونوں کو سنگین حالات دیکھتے ہوئے کیمپ میں ...کا بندوبست کر دیا تھا۔ حفاظت کے ضروری اقدام کے طور پر دو فوجیوں کو بھی ساتھ لے آیا تھا۔

"...ماسی بی بی۔" راجندر نے پگڑی سے اپنے امنڈتے آنسو روکنے کی کوشش کی۔ اس کی آواز بھرا کر ٹوٹ ...جب بی بی نے پوچھا۔ کہاں؟" تو وہ بی بی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر رو دیا۔

...کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے۔ بی بی اور بانو ٹکٹکی انہیں دیکھے گئیں۔ بی بی اور بانو کے سر پر دوپٹہ ...راجندر نے اپنی پگڑی پھاڑ کر آدھی بی بی اور آدھی بانو پر ڈال دی۔ انسان نے انسانیت کو ڈھانپ لیا

...سے ننگی اور سر پر راجندر کی پگڑی اوڑھے ماں بیٹی گھر سے نکلیں۔ فوجیوں نے رائفلیں اٹھا رکھی ...راجندر اور گیان سر جھکائے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

...اللہ جن چیزوں پر کبھی غیروں کی نظریں نہ پڑی تھیں۔ یوں کھلے سر عام جا رہے تھے۔ دروازوں میں ...عورتیں ان پر قہقہے لگا رہی تھیں۔ مرد فقرے کس رہے تھے۔ کچھ تماشائی پیچھے پیچھے چل پڑے تھے۔ ...کے طعنے ہر زبان سے مل رہے تھے۔

...گلی کی نکڑ پر پہنچتے ہی بی بی اور بانو بے اختیار ہو گئیں۔ تڑپ کر اپنے گھر کی جانب دوڑنے کو تھیں۔ کہ ...لے کر سامنے آ گیا۔

"جلدی کرو۔ کیمپ تک پہنچنا ہے۔"

...! " بی بی نے سینہ پیٹ لیا۔ چیختے ہوئے کہا۔ مجھے اپنے بچوں کو آخری بار تو دیکھ لینے دو۔ ان کی

پیشانیاں تو چوم لینے دو۔ ان بے گور و کفن لاشوں پر آنسو تو بہا لینے دو۔ اس بد نصیب بیٹی کو گھر سے ود[illegible]
سے پہلے باپ کا پیار تو لے لینے دو۔"

"ابا جان۔ بھائی جان۔" بانو چیخ چیخ کر پکار رہی تھی۔ ماں بیٹی کی آہ و زاری پر فضا لرز رہی تھی۔ [illegible]
شعلے انگار رہے تھے۔ فوجیوں نے انہیں ہانک کر کیمپ کیطرف دھکیلا بلوے کا قدم قدم پر خطرہ تھا۔ ماں بیٹی [illegible]
دھوتی چل دیں۔ مڑ مڑ کر گھر کی دیواروں کو سلام کرتی گئیں۔

وہ دونوں تڑپ تڑپ کر رو رہی تھیں۔ رو رو کر تڑپ رہی تھیں۔ شہیدوں کے لہو کو نگاہوں سے [illegible]
گئیں۔ زینبؓ بھی کچھ یونہی ماتم کناں کوفے کے بازاروں سے گزری ہوں گی۔ کیمپ میں پہنچانے [illegible]
اپنے کام چلے گئے۔ راجندر اور گیان نے روتی آنکھوں سے بی بی کے چرن چھوئے۔ "بھگوان کرے [illegible]
سے پاکستان پہنچ جاؤ" کہتے ہوئے دونوں واپس لوٹ آئے۔ بی بی نے لرزتے ہاتھ ان کے سروں پر [illegible]
تھے۔

کیمپ میں بھی قیامت کا سماں تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں تباہ حال لوگ جمع تھے۔ اردگرد کے [illegible]
لوگ آ آ کر شامل ہو رہے تھے۔ ہر فرد اک خونچکاں داستان تھا۔ ہر ذی روح اک زہرہ گداز کہانی تھا۔

خستہ حال لوگ جمع ہو رہے تھے۔ کوئی انتظام تھا نہ بندوبست۔ ان لوازمات کا ہوش بھی کسے تھا [illegible]
سے خون ابھی تو اس تیزی سے بہہ رہا تھا۔ کہ اس خون کے سوا کسی بات کا کسی کو ہوش نہ تھا۔ آہ و بکا تھی [illegible]
زاری تھی۔ درد تھا۔ کرب تھا۔ کبھی ایک طرف سے رونے پیٹنے کی صدا آتی' کبھی دوسری طرف [illegible]
کیمپ میں وہ بھی تھے جو پورا پورا خاندان کٹا کر آئے تھے۔ وہ والدین بھی تھے جو جوان بیٹیوں کو درندوں [illegible]
آنے کی بجائے اپنے ہاتھوں ختم کر کے آئے تھے۔ اس کیمپ میں وہ شوہر بھی تھے جنہوں نے اپنی بیویوں [illegible]
میں دھکیلا تھا۔ وہ بھائی بھی تھے۔ جنہوں نے بہنوں کے حلقوں میں اپنے ہاتھوں زہر ٹپکایا تھا۔ وہ بچے بھی [illegible]
باپ کی خون میں لتھڑی لاشوں سے خوف زدہ ہو کر گھروں سے بھاگ نکلے تھے۔ وہ نوجوان بھی تھے۔ [illegible]
ہی سے اسلحہ چھین کر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مقابلہ کرتے رہے۔ وہ بد نصیب لڑکیاں بھی [illegible]
جن کے ماں باپ بچے تھے نہ بھائی۔ ماضی رہا تھا۔ نہ حال۔ تباہ و برباد کیمپ میں آ گئی تھیں۔

اک ہنگامہ بپا تھا۔ اک قیامت ٹوٹی تھی۔ آہ و بکا سے سینے پھٹے جا رہے تھے۔ ان حرماں نصیبوں کے [illegible]
اور بی بی بھی تھیں۔

تیسرے دن کیمپ کے باسیوں کو فوج کے چند سپاہیوں کے قافلے کی صورت میں کوچ کرنا پڑا۔ [illegible]
کون تھا۔ قافلہ کس راستے جا رہا تھا۔ یہ کسی کو علم نہ تھا۔ تباہ و برباد انسانوں کا اتنا بڑا ہجوم سوئے پاکستان [illegible]
ایک سیلاب تھا۔ جو خود بخود نشیبی علاقے کی طرف بہہ رہا تھا۔

http://www.rehanahmed.com

...نے اپنے چھوٹے سے گھر کو بڑی نفاست سے ترتیب دیا تھا۔ اماں بھی بیٹے کی خوشیوں میں شریک تھیں۔
...ا تھا۔ خوبصورت فرنیچر۔ قالین پردے' نفیس برتن بیٹے کی خواہش کے مطابق ہر چیز خریدی تھی۔
...ایک مقامی عورت کو نوکر رکھ کر بڑے سکون سے زندگی کا آغاز کر رہے تھے۔ اماں کو ہر خوشی حاصل
...صرف عزیزوں کے چھوٹ جانے کا۔ ثریا کے خط آتے جاتے تھے۔ لیکن پھر بھی تسکین نہ ہوتی۔
...کہتیں۔

...تو مت جلد تیزی شادی کر کے بہو لے آؤں گی۔ پھر تو جانے تیرا کام میں تو لدھیانہ چلی جاؤں گی۔
...کٹ کر مجھ سے تو دن نہیں گزارے جاتے۔"

...حسن ہنس کر کہتا۔ "مجھ سے کٹ کر دن گزار لیں گی۔ عزیزوں سے الگ ہو کر نہیں گزار
...مجھ سے زیادہ پیار ہوتا اپنے بہن بھائیوں سے۔"

...بات کہاں کی لے کدھر جاتا ہے۔" اماں جلدی سے کہتی۔ "تیرے سوا میرا کون ہے بیٹا۔"

...ممانیاں۔ ثریا خالہ...... اور...... اور......" حسن اماں کو چھیڑتا۔

...اپنی جگہ...... تو اپنی جگہ۔" اماں جواب دیتی۔ بھرے پرے کنبے میں رہنے کی عادت ہو گئی ہے نا۔
...کو دوڑتی ہے۔

...دور کرنے کا تو ایک ہی علاج ہے اماں" حسن شوخی سے کہتا۔

..." اماں تجسس سے پوچھتیں۔

...لے آؤ یہاں۔" کھلکھلا کر ہنس دیتا۔

...بھی مسکرانے لگتی۔ ماں بیٹے میں اکثر ایسی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ حسن بانو کی یاد کی کوفت اسی انداز سے
...تھا۔ کچھ ثریا خالہ کی مہربانی بھی تھی۔ ہر خط میں بانو کے متعلق پوری تفصیل سے لکھا کرتی۔ وہ بھی جواب

ثریا کے نام بانو ہی کو لکھا کرتا۔ دل کی بے تابیاں یونہی تسکین پالیتی تھیں۔

جوں جوں وقت گزرتا جارہا تھا۔ اماں کا دل بہلنے کی بجائے اچاٹ ہی ہوتا جارہا تھا۔ بیٹے کی خاطر کچھ کر سکتیں۔ ورنہ ان کا جی تو چاہتا پر لگا کر اڑیں اور لدھیانہ پہنچ جائیں۔

کچھ اسی جذبہ فرار کا اثر تھا۔ جو اس دن حسن دفتر سے آیا۔ تو اماں بولیں۔ "منگنی کی تقریب ٹھہر پائی تھی نا۔"

"ہاں اماں۔"

"کیا ضرور جو ستمبر ہی میں رسم ادا ہو۔"

"یعنی"

"ابھی کیوں نہ کر دیں۔"

"گرمی بہت ہے اماں۔ اسی لئے تو ستمبر میں بات آپ نے خود ہی طے کی تھی۔"

"کوئی گرمی نہیں۔ ستمبر اکتوبر میں تو شادی ہو جانا چاہئے۔"

"آپ لگتا ہے، بہت اداس ہو رہی ہیں۔"

"اداسی کی بات نہیں۔"

"تو پھر جولائی سے ستمبر تک انتظار نہیں کیا جا سکتا کیا۔ آج جولائی بھی ختم ہو رہا ہے۔"

"ستمبر میں کونسا سردی اتر آئے گی۔ ان دنوں بھی تو گرمی کا زور ہوتا ہے۔ میرے خیال میں ثریا کو اطلاع... اگلے ہفتے چلے چلتے ہیں۔"

حسن ہنس پڑا۔ "آپ کا جی نہیں لگتا یہاں نا۔"

اماں نے اصرار کیا۔ کہ اگلے ہفتے لدھیانہ جا کر منگنی کی رسم ادا کر دی جائے۔ انہیں تیاری بھی کرنا تھی۔ کنگن تو ان کے پاس تھے ہی۔ خوبصورت سی انگوٹھی اور لال اوڑھنی ہی لینا تھی۔

لیکن ان کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ ملکی حالات کی تیزی سے بدلنے والی صورت میں نوکری پیشہ... عمل میں آرہے تھے۔ حسن کا تبادلہ بھی لاہور ہو گیا۔

"لو اماں مبارک ہو۔ آپ لدھیانے کے قریب ہو گئیں۔ پنڈی تو بقول آپ کے کالے کوسوں... لدھیانہ سے......"

اماں کو بھی اک گونا اطمینان ہوا۔ تسلی اس بات سے بھی تھی۔ کہ صفیہ لاہور ہی میں رہتی ہے۔... عزیز بھی لاہور میں تھے۔ پنڈی میں تو ان کا کوئی بھی نہ تھا۔ ہفتہ بھر کی چھٹی ملی حسن اور اماں نے نوکرانی اور ا... شوہر کی مدد سے پورے گھر کا سامان بڑے سلیقہ سے باندھ کر رکھ دیا۔

حسن کے دو تین عزیز دوست بھی لاہور ہی میں تھے۔ حمید بھی ان دنوں وہیں تھا۔ سب کو اس نے اپنے تبادلے کی اطلاع دے دی۔ مکان تلاش کرنے کی بھی تاکید کر دی۔ حمید کا واپسی خط آیا۔ جب تک مکان نہ ملے اس نے اپنے گھر کے ایک حصہ میں ٹھہرنے کی دعوت دی تھی۔

حمید اس کا عزیز ترین دوست تھا۔ پردیس میں اس کا سہارا کافی تھا۔ ویسے ٹھہرنے کو تو اماں صفیہ کے پاس بھی ٹھہر سکتی تھی۔ لیکن حسن نے مکان ملنے تک حمید کے ہاں رکنا مناسب سمجھا۔

حسن نے اپنی تبدیلی کی اطلاع ثریا خالہ کو بھی کر دی۔ لیکن اس کا خط منزل مقصود پر پہنچ نہ پایا۔ چودہ اگست کی خوشی پوری طرح منائی بھی نہ جا سکیں۔ کہ فسادات کی اڑتی اڑتی خبریں مغربی پنجاب میں پہنچنے لگیں۔

اس شام حسن بڑا گھبرایا ہوا گھر آیا۔ اماں محلے کی عورتوں سے پہلے ہی سن چکی تھیں۔ کہ امرت سر میں بڑا بھاری فساد ہوا ہے۔ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد پاکستان آ پہنچی ہے۔ امرت سر میں کافی دیر پہلے بھی فساد ہو رہے تھے۔ لیکن لوگ بڑی ہمت سے بلوائیوں سے نپٹ رہے تھے۔ ایسے بہادروں کا ہجرت کر کے چلے آنا سنگین حالات کی نشان دہی کر رہا تھا۔

حسن اماں کو کچھ بتا کر ہراساں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اماں نے پہلے ہی سب کچھ کہہ دیا۔

"اللہ خیر کرے۔ میرا تو دل بیٹھا جاتا ہے۔ لدھیانہ میں تو خیریت ہے نا۔ تار ہی دے دو۔ کچھ تو پتہ چلے ان کا۔"

"تار دیا ہے شاید کل جواب آ جائے۔"

لیکن وہ کل نہ آیا جو لدھیانہ والوں کی خیریت کا تار لاتا۔ اڑتی اڑتی خبریں حقیقت بن کر سامنے آنے لگیں۔ ظلم والوں کی داستانیں پھیلنے لگیں۔ مظالم کی داستانیں پاکستان کی سرزمین پر بکھرنے لگیں۔

حسن نے دوسرا ارجنٹ تار دیا۔ کوئی جواب نہ ملا۔ ڈاک اور تار کا سلسلہ درہم برہم ہو چکا تھا۔ لیکن ابھی تک مشرقی پنجاب کے لوگوں تک خون کی جو ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ اس کے چھینٹے نہ پہنچے تھے۔ حسن پریشان سے پریشان تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس دن تو اس نے اماں سے کہا۔

"میں خود ہی نہ چلا جاؤں لدھیانہ۔ خدا جانے وہاں حالات کیسے ہیں۔"

"اللہ کرے سب خیریت سے ہوں۔ مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ میرا تو دل بیٹھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ ثریا کا اللہ جانے کیا حال ہو گا۔"

رات یوں توں گزری۔ صبح حسن نے لدھیانہ جانے کی تیاری کی۔ لیکن سٹیشن پر پہنچ کر پتہ چلا۔ کہ اب وہاں جانا بہت مشکل ہے۔ سارے راستے مخدوش ہیں۔ اور مہاجروں کی ایک بڑی تعداد مغربی پنجاب پہنچ رہی ہے۔

حسن کا دل بیٹھ ہی تو گیا۔ ڈاک خانہ پہنچا۔ ٹیلی فون کرنے کی کوشش کی لیکن مایوسی ہوئی۔ ٹرنک کال ہو چکی۔ کئی جگہ سے اس نے ٹیلیفون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

تھکا ہارا پریشان گھر پہنچا۔ تو اماں کو روتے پایا۔ طبیعت بوجھل پہلے ہی ہو رہی تھی۔ مایوسی میں کئی گنا گیا۔ اماں کو چپ کرانے کا حوصلہ ہی نہ رہا۔ چپ چاپ اپنے کمرے میں جا کر بستر پر اوندھا گر گیا۔

پوری رات عالم اضطراب میں کٹی۔ دل کا کوئی گوشہ بے طرح دکھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے کوئی رہی ہو۔ ہوک کا دم رک رہا ہو۔ ساری رات اٹھ اٹھ کر پھرتا رہا۔ چھاتی پر ہاتھ مار مار کر دلِ مضطرب رہا۔ بے چینی بڑھتی ہی گئی۔ صبح پھٹ جانے کو بیتاب ہوتی رہی۔

صبح وہ حمید کو ساتھ لے کر سٹیشن پہنچا۔ آج کسی نہ کسی طرح اس نے لدھیانہ جانے کی ٹھانی تھی۔ سٹیشن پر کہرام مچا تھا۔ اک قیامت بپا تھی۔ مہاجرین کی کٹی پھٹی پہلی گاڑی لاہور ریلوے سٹیشن پر پہنچ چکی تھی۔ گاڑی میں لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ یا جما ہوا خون۔ لاشوں کے درمیان پڑے کچھ زخمی بھی تھے۔ جو ظلم کی داستان سنانے کو زندہ بچ گئے تھے۔ ان کی چیخ و پکار دل ہلا رہی تھی۔ نالہ و شیون سے دل بیٹھے جاتے تھے۔

حسن کا تو دل ہی ڈوب گیا۔ آگ اور خون کے ایسے طوفانوں سے اپنے عزیزوں کے بچ نکلنے کی امید نہ رہی۔ حواس مختل سے ہو گئے۔ حمید سہارا نہ دیتا۔ تو شاید وہ تیورا کر گر جاتا۔

اہل لاہور کو ان تباہ حال لوگوں کی خبر مل چکی تھی۔ یہ گاڑی صبرِ مسلم کو کھلا چیلنج تھی۔ جوش و ولولہ بننے لگا۔ نعرہ تکبیر سے سٹیشن گونجنے لگا۔ حالات منٹوں میں کچھ سے کچھ ہو گئے۔

بپھرے ہوئے لوگ شہر کی طرف لپکے۔ فسادات کی آگ یہاں بھی بھڑکنے لگی۔

ایسے حالات میں کون حسن کو بچھڑنے والوں کے متعلق بتاتا۔ کون بانو کا پیغام لاتا۔ کون ثریا کی کہاں سے وہ فہیم کے متعلق سنتا۔ کدھر سے وہ باقی عزیزوں کا پتہ پاتا۔

اماں کا پورا کنبہ لدھیانہ میں تھا۔ دن رات ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہی تھیں۔ حمید اور اس والے اس بدنصیب ماں بیٹے سے دلی ہمدردی کا اظہار کر رہے تھے۔ کھانا پینا ان پر بھی حرام ہو چکا تھا۔ لیکن دکھ بڑا گہرا تھا۔ مداوا کہاں ہو سکتا تھا۔

حسن کے ساتھ حمید بھی سارا سارا دن سٹیشن پر رہتا۔ پاکستان پہنچنے والی گاڑیوں کے ایک ایک ڈبے آنے والے ایک ایک مسافر سے پوچھتا لیکن مایوسی کے سوا کچھ نہ ملتا۔

مہاجرین کی ایک بہت بڑی کھیپ واہگہ سے پاکستان پہنچی تھی۔ حسن وہاں بھی گیا۔ لاکھوں سیلاب تھا۔ جو کس مپرسی اور افراتفری کے عالم میں بہہ رہا تھا۔ حسن کی جستجو ناکام ہی رہتی۔ کوئی شناسا نہ آئی۔ کوئی آشنا چہرہ دکھائی نہ دیتا۔

اس کی حالت دن بدن خراب ہوتی گئی۔ کھانے پینے کا ہوش تھا نہ کپڑے کا۔ دن کی فکر تھی نہ رات کی۔
زندگی قید بے معنی سی ہو گئی تھی۔ مارا مارا سارا سارا دن کبھی واہگہ کبھی والٹن کیمپ اور کبھی سٹیشن پر پھرتا
رہا۔ حمید نے اس کے راولپنڈی دفتر میں بھی اطلاع کروادی تھی۔ وہاں بھی لدھیانہ سے کوئی اطلاع موصول نہ
ہوئی۔

ریڈیو پر نشر کروایا۔ اخبارات میں پیغام دیئے۔ لیکن مایوسی کے اندھیرے دن بدن پھیلتے ہی چلے گئے۔
اب خون کے آنسو رو رہی تھیں۔ اور حسن۔ حسن کے تو ساری ہستی غم بن چکی تھی۔

قافلہ سوئے پاکستان رواں تھا۔ لوگوں کا ایک جم غفیر تھا۔ جو کسی کشش کے تحت کھنچا چلا جا رہا تھا۔
بد نصیبوں پر جو قیامت ٹوٹی تھی۔ قدم اٹھانے کی بھی سکت نہ رہی تھی چہ جائیکہ میلوں پیدل چل آئے۔

قافلے میں بے سروسامانی کا عالم تھا۔ کوئی عزیزوں کو پکار رہا تھا۔ کوئی کھوئے ہوئے رشتہ داروں کو
رہا تھا۔ کسی کے ہاتھ میں عمر بھر کی کمائی پوٹلی میں بندھی تھی۔ کوئی بچا کھچا اثاثہ کندھوں پر اٹھائے تھا
میں کئی بستیوں سے لوگ اس قافلے میں آن ملے تھے۔ کچھ چھکڑے تھے۔ جن پر گھروں کا سامان اور
تھے۔ کچھ گھوڑے بھی تھے۔ جن پر پیدل نہ چل سکنے والوں کو ڈال دیا گیا تھا۔

اگست کی دم گھٹنے والی گرمی اور حبس۔ اس پر یہ افتاد۔ کئی لوگ سفر کی صعوبت سے دم توڑ گئے تھے۔
بھوک اور پیاس سے بلک بلک کر مر گئے تھے۔ لوگ خود رو گھاس۔ درختوں کے پتے اور جنگلی پودے کھا
پیٹ کا دوزخ بھر رہے تھے۔ گندے گڑھوں میں مدتوں کا ٹھہرا ہوا پانی آب حیات سمجھ کر پی رہے تھے۔

بی بی اور بانو بھی اس قافلہ کے ساتھ چل رہی تھیں۔ ننگے پاؤں چھالوں سے زخمی ہو گئے تھے۔ بانو کو
کا بخار بھی تھا۔ بچی ہی تھی نا۔ اتنے مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹے تھے۔ کہاں تک برداشت کر پاتی۔
حواس تو جیسے ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ بانو کو بار بار گلے لگا کر دیوانہ وار پیار کرتی۔ پاگلوں کی طرح سینے سے
جانے اپنے جلتے سینے کو ٹھنڈک پہنچاتی۔ یا بانو کے بخار کی حدت سے کھولتے بدن کو ٹھنڈک پہنچانے
کرتی۔ تیسری رات قافلے نے ایک ندی کنارے پڑاؤ ڈالا۔ ندی کے پار ایک بستی جل رہی تھی۔ آگ کے
لپک رہے تھے۔ چیخ وپکار کی آوازیں کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ ایسے سے قافلے کا ندی پار جانا خطرناک
جاں بلب لوگ اسی کنارے رک کر تباہی اور بربادی کی المناک تصویر دیکھنے لگے۔ ہر دل ہراساں تھا۔
تھی۔ لوگ اس قیامت کا سامنا کر چکے تھے۔ اس لئے اس کی ہلاکت آفرینی سے متوحش نظر آ رہے تھے۔

ہزاروں خستہ حال لوگ ننگی زمین پر کھلے آسمان تلے بے یار و مددگار پڑے تھے۔ کسی آن کسی لمحے

دل اس خدشے سے کانپ رہا تھا۔ اک دل جلا نستاپا نوجوان اپنے حلقے کے لوگوں کی ہمت بندھا رہا تھا۔

"مسلمانو! تم جل چکے' راکھ ہو چکے۔ لیکن گھبراؤ نہیں۔ اس جلی ہوئی راکھ کو پاکستان پہنچ لینے دو۔ اس راکھ سے وہ زندگی ابھرے گی۔ جو اس نار و ظلم سے ٹکرا جائے گی۔ اس راکھ سے وہ شعلے پیدا ہوں گے۔ جو جبرو ظلم کو جلا کر خاکستر کر ڈالیں گے۔ ہم مسلمان ہیں اور یہ ایمان رکھتے ہیں کہ موت کا ایک دن معین ہے۔ جگر گوشوں کو' باپوں بھائیوں کو' ماؤں بہنوں کو موت یاد آ گئی۔ ان کا یہی دن مقرر تھا۔ گھبراؤ نہیں۔ ہمت اور حوصلے سے طوفانوں کے سامنے ڈٹ جاؤ۔ اپنے اسلاف کی طرح اپنے آباؤ اجداد کی طرح۔"

بخار سے غنودگی سی طاری تھی۔ تاہم یہ مترنم آواز اس کے کانوں میں پہنچ رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے حسن اس کی ڈھارس بندھا رہا ہے۔ سلیم اس میں قربانی کا جذبہ پیدا کر رہا ہے۔ فہیم اسے نامساعد حالات سے نباہ کر لینے کی تلقین کر رہا ہے۔ نصیر الدین اسے موت سے کھیل کر زندگی کا سبق سکھا رہے ہیں۔

بی بی اٹھ کر اس نوجوان کے قریب گئی۔ اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ "مائیں تم جیسے بیٹوں پر ہمیشہ فخر کریں گی۔"

نوجوان نے سر جھکا دیا۔ اس تعظیم سے جیسے وہ اپنی ماں کے سامنے کھڑا ہو۔

"میرے بچے..." بی بی کی آواز رندھ گئی۔

"ماں۔" وہ بھی بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"میرا کوئی بھی نہیں بچا بیٹے۔ اس بچی کے سوا۔" بی بی نے بانو کی طرف اشارہ کیا۔ "تم نے اسے اب بھائی بن کر پاکستان پہنچانا ہے۔ تم ہی اس کے لئے سلیم فہیم نعیم اور ندیم ہو۔"

"ہم سب ایک ہی خاندان کے ہیں ماں جی۔" نوجوان نے گرد و پیش پھیلے ہوئے ہزاروں مہاجروں کی طرف اشارہ کیا۔ "ہم بہنوں کی حرمت پر کٹ مرنے والے لوگ ہیں آپ فکر نہ کریں۔"

بی بی بانو کو بھی اس نوجوان کے قریب لے آئی۔ اس کی خونچکاں داستان سنی۔ اپنی زہرہ گداز کہانی سنائی۔ نوجوان بے اختیار ہو کر روتی رہی۔ لیکن بی بی کی آنکھیں بنجر ویرانوں کی طرح تھیں۔

رات کو کون سو سکا تھا۔ غیر محفوظ لوگ آنکھیں بند کرتے تو وہم کا۔ وسوسہ اور اندیشہ آنکھیں کھول لیتا۔ نیند تو اطمینان کی نشانی ہے۔ یہ چیزیں تو ان حرماں نصیبوں کے حصے میں رہی ہی نہ تھیں۔ اٹھتے بیٹھتے تڑپتے بلکتے رات کا آخری حصہ آن پہنچا۔

اچانک مشرقی سمت سے دھول کے بادل سے اٹھتے نظر آئے۔ خوف و ہراس کی لہر سی ہر دل میں دوڑ گئی۔ لوگ قیاس آرائیاں ہی کر رہے تھے۔ کہ ست سری اکال اور واہگورو کی جے کے نعرے سنائی دینے لگے۔

الٰہی اللہ قیامت بھی کیا ہوگی۔ جو ان بدحال لوگوں پر موت ٹوٹی۔ نہتے زخمی بیماروں اور لٹے پٹے لوگوں پر

http://www.rehanahmed.com

جتھیداروں نے حملہ کر دیا۔ خون کی چاٹ منہ کو لگی تھی۔ جو سامنے آیا۔ مولی گاجر کی طرح کاٹ کر
دیا۔ چیخ وپکار سے کان پھٹنے لگے۔ ہراساں لوگ جانیں بچانے کو بے تحاشا ادھر ادھر دوڑنے لگے بیسیوں
ماب لڑکیاں ندی میں کود گئیں۔

بی بی اور بانو تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ بانو نے تو آنکھیں میچ رکھی تھیں۔ خون ہی خون تھا۔ قافلے کے کئی
مرد مقابلہ کر رہے تھے۔ لیکن بلوائی اسلحہ سے لیس تھے۔ بندوقیں اور رائفلیں بھی اٹھا رکھی تھیں۔

بے یار و مددگار، بے آسرا لوگ آسمانوں کے مالک کو چیخ چیخ کر پکار رہے تھے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ معرکہ
رہا۔ لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ زمین کی رنگت خون سے سرخ ہو گئی۔

بی بی نے بانو کا ہاتھ سختی سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ اجنبی نوجوان ان کے سامنے ڈھال بن کر کھڑا تھا۔ چند بلوائی
ادھر کو لپکے کسی کی بانو پر نظر پڑ گئی۔

"دیکھ بے دیکھ کیا چیز ہے۔" ایک گھوڑ سوار نے بانو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دوسرے سے کہا۔

"اڑا لے جاؤ۔" وہ بولا۔

"لے گورو کا نام۔"

"جو بولے سو نہال"

"ست سری اکال۔"

"تین چار بلوائی بانو پر جھپٹے۔

بی بی اور بانو چیخیں۔ نوجوان بجلی کی طرح تڑپ کر بلوائیوں کے سامنے آ گیا۔

"اپنی موت کو آواز نہ دو۔ ہٹ جاؤ ہمارے راستے سے۔ چلو تمہیں جان بخش دی۔ لڑکی ہمارے حوالے
دو۔"

بلوائی گھوڑے سے اتر کر بانو پر ہاتھ ڈالنے کو لپکا۔ نوجوان نے اس کی گردن پکڑ لی۔ اس کی آنکھوں میں خون
اتر رہا تھا۔ خالی ہاتھوں سے مقابلہ کر رہا تھا۔ لیکن وہ اکیلا تھا۔ چاروں طرف سے بلوائی اس پر ٹوٹ پڑے۔
لمحوں بعد اس کی لاش زمین پر تڑپ رہی تھی۔

"سلیم پھر کٹ مرا۔ میرا سلیم پھر کٹ مرا۔" بی بی دیوانہ وار چیخنے لگی۔ بانو کی فلک شگاف چیخوں سے فضا
رہی تھی۔

"اٹھا لے اسے۔"

"ڈال اسے گھوڑے پر۔"

"کیا شے ہے"

...ا کرو گے۔"

...ل کی تڑپ اور ماں بیٹی کی چیخوں سے متاثر ہوئے بغیر آگے بڑھے۔ اک خونخوار بھیڑیے نے بانو کی ...۔ بانو مچھلی کی طرح تڑپی۔ بی بی نے اس کا بازو سختی سے پکڑے پکڑے ظلم کی دہائی دی۔ لیکن کسی کو ان پر ...۔ ماں بیٹی کو گھسیٹا۔ اور گھوڑے کی طرف بڑھے۔ بی بی کا ذہنی توازن بگڑ گیا۔ بیٹی کے بازو پر گرفت ...۔ درندے نے دونوں کو گھوڑے پر لادا۔ اور گھوڑا سرپٹ دوڑا دیا۔ چاروں گھوڑ سوار بھی اس کے ...

...قیامت سے دوچار رہا۔ زندگی موت سے منہ چھپاتی پھری۔

...اور بانو کو لئے وہ پانچوں درندے بہت دور نکل گئے۔ سپیدی سحر پھوٹ چکی تھی۔ عروس مشرق کی سنہری ...تھی۔ اس کے معمول میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ شرمیلی شرمیلی سی مسکراہٹ کا نور اندھیروں کو ملگجی بنا رہا

...کو احتیاط سے پکڑ کر اور بی بی کو گھسیٹ کر گھوڑوں سے اتار لیا گیا۔ درختوں کے گھنے جھنڈ تلے شیطان ناچ رہا ...ماں بیٹی کے گرد گھیرا ڈالے بھنگڑا ڈال رہے تھے۔ بے اختیار اور بے بس چیخیں گونج رہی تھیں۔

"...ج قسمت اچھی تھی۔ کیا مال ملا ہے۔" ایک درندہ بولا۔ کرپان کی نوک سے بانو کا کرتا چیر ڈالا۔ سینے پر ...کر بانو گٹھڑی بن کر چیخے گئی۔ بی بی تڑپ تڑپ کر بیٹی کو سینے میں چھپا لینے کو لپکی۔ اس کا گلا بالکل بیٹھ ...دیوانوں کی طرح سب کے آگے ہاتھ جوڑ جوڑ کر بیٹی کی آبرو کی بھیک مانگ رہی تھی۔

"اس بڑھیا نے تنگ کر دیا ہے۔"

"باندھ دو اسے درخت کے ساتھ۔"

"...ٹھیک کہا۔"

"...تو تم بیٹی سے نپٹو۔ میں ماں کو پاکستان کی سیر کرا دوں ذرا۔"

"ہاں ہاں۔"

...ک بلند اور جگر خراش قہقہہ پڑا۔ بی بی کو درخت سے باندھ کر غنڈے اسے حیاسوز طریق سے چھیڑنے لگے۔ ...پھٹی پھٹی نظروں سے بانو کو دیکھ کر اپنے سر کو درخت سے پٹخ رہی تھی۔ بانو جس حیوان کے قبضے میں آئی تھی۔ وہ دیو ...تھا۔ مدافعت کب تک ممکن تھی۔ درندے نے ہنس ہنس کر اسے نوچا۔ ٹھٹھے لگا کر بھنبھوڑا۔

...کے حواس مختل تھے۔ بس اس کی چیخیں تھیں۔ جو فضا میں گم ہو رہی تھیں۔ گھنے درختوں سے ٹکرا رہی ...چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں۔ "زمانے کی آنکھیں پھوڑ ڈالو۔ وقت کے کانوں میں سیسہ بھر دو۔ تاکہ میرے ...کچھ ہو رہا ہے اسے کوئی نہ دیکھ سکے۔ کوئی نہ سن سکے۔"

لیکن زمانے کی آنکھیں اندھی ہوئیں۔ نہ وقت کے کان بہرے ہوئے۔ بچیاں بے دوش لٹ گئیں
نے تھیں۔ پانچوں غنڈوں نے باری باری آبرو کی دھجیاں اڑائیں۔ اور تو اور اس عورت کو بھی نہ
صرف بانو کی ماں نہیں۔ ان کی بھی ماں تھی۔

ماں سب کی ایک ہوتی ہے۔ یہ تو سانجھ کا رشتہ ہے لیکن درندے اسے کیا سمجھ سکتے تھے۔

حسن نے اک دل فگار چیخ ماری اور بستر میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ سارا وجود کانپ رہا تھا۔ اپنا سر اس نے دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔

"کیا ہوا؟ کیا ہوا؟" اماں اور حمید کی والدہ مصلے پر بیٹھی تھیں۔ چیخ سن کر بھاگی آئیں۔

"حسن بیٹے! حسن بیٹے" حمید کی والدہ نے حسن کا کندھا جھنجھوڑا۔ اس کے ہاتھوں میں تسبیح تھی۔ صبح کی نماز کے بعد وہ وظیفے میں مصروف تھی۔ حسن کی چیخ سے حواس باختہ ہو کہ ادھر دوڑی۔

اماں بیچاری تو دکھوں کے بارے اس طرح دب گئی تھی۔ کہ آواز بھی نہ نکل سکی۔ اک آنسو تھے، جو بات بے بات ٹپک پڑتے تھے۔

اگست کے آخری دن تھے۔ کل رات بارش ہونے سے موسم خوش گوار ہو گیا تھا۔ لیکن اس سال حالات ایسے سوگوار تھے کہ موسم کے حسن میں کوئی کشش ہی نہ رہی تھی۔ حسن حمید کے گھر ہی رہ رہا تھا۔ فی الحال اس مکان میں منتقل نہیں ہوا تھا۔ جو ایک ہندو دوست نے دہلی جاتے ہوئے حمید کے سپرد کیا تھا۔

کھلے صحن میں چارپائیاں بچھی تھیں۔ حسن اور اماں مشرقی حصے میں تھے۔ جعفری سے یہ حصہ بڑے صحن سے الگ تھا۔ لیکن آنے جانے کو کھلا راستہ تھا۔ حمید کی والدہ صبح کی نماز اسی طرف اماں کے ساتھ ہی پڑھا کرتی تھیں۔ حسن سرنگوں بیٹھا تھا۔ حمید کی والدہ کے بار بار پوچھنے پر بھی اس نے کچھ نہیں بتایا۔

"کوئی خواب دیکھا ہے۔" وہ اماں کو مخاطب کر کے بولیں۔

"ساری رات تو پھر تا رہا ہے۔ ابھی کچھ دیر ہی پہلے لیٹا تھا۔" اماں نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

"چیخ شاید حمید نے بھی سن لی تھی۔ آنکھیں ملتے ہوئے ادھر ہی آ گیا۔

"کیا بات ہے حسن" اس نے جمائی لیتے ہوئے پوچھا۔

"خدا جانے کیا ہوا بس چیخ ماری۔ اب تھر تھر کانپ رہا ہے۔ سارا بدن پسینے سے شرابور ہو رہا ہے۔" حمید کی

والدہ نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔
"پانی لاؤں۔" حمید گھبرا کر بولا۔ اور پھر لپک کر سامنے ہی رکھی مٹی کی گھڑی سے تانبے کا کٹورہ بھر کر لے آیا۔ حسن نے پانی نہیں پیا۔
"تھوڑا سا پی لو۔" حمید چارپائی پر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اماں دوپٹے سے منہ ڈھانپ کر سسکیاں بھرنے لگی تھیں۔
"خالہ جان! آپ حوصلہ رکھیے۔" حمید نے اماں سے لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔ پھر حسن کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔
"حسن۔ یوں تو نہ کرو بھائی۔ اماں تو عورت ہیں۔ پہلے ہی آزردہ خاطر ہیں۔ تم نے بھی حوصلہ چھوڑ دیا۔ ان کا کیا بنے گا؟"
وہ حسن کو بچوں کی طرح بہلانے لگا۔ اس کی ماں بھی حسن کی پشت پر پیار سے ہاتھ پھیرتی رہی۔
"اف!" حسن کافی دیر کے بعد جیسے اپنے آپ میں آیا۔
"کیا ہوا۔ کوئی خواب دیکھا تھا" حمید نے پوچھا۔
"شاید۔ خواب ہی تھا۔" حسن بڑبڑایا۔
"ساری عمر اب خواب ہی دیکھیں گے بیٹا۔" اماں بین کے انداز میں رو دیں۔ "بچھڑ گئے۔"
"اللہ اللہ کرو بس۔" حمید کی ماں نے جلدی سے کہا۔ "ایسی مایوسی گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ بڑا رحیم ہے۔ بچھڑوں کو ملانے کی بھی طاقت رکھتا ہے۔ ابھی تو لوگ ہندوستان سے لاکھوں کی تعداد میں آ رہے ہیں۔ اللہ کرے گا آپ کے عزیز بھی آ جائیں گے۔"
حسن نے اک گہری دل دوز آہ بھری۔ آج اس نے جو خواب دیکھا تھا مایوس کن تھا۔ "کوئی نہیں آئے گا اماں۔ اب کوئی نہیں آئے گا۔" اماں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ حمید کی ماں کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں۔
"میں نے بڑا خوفناک خواب دیکھا ہے حمید" اماں کے آنسوؤں میں ڈوب کر حمید سے گویا ہوا۔ "میں نے دیکھا ہے۔ لمبے لمبے دانتوں والی کالی سی خوفناک بلا نے بانو کو گردن سے پکڑ رکھا ہے۔ بانو چیخ رہی ہے۔ تڑپ تڑپ کر چیخ رہی ہے۔"
حسن خواب کے تصور سے لرزاں تھا۔
"میں نے اس کی چیخیں سنی ہیں۔ میں سویا نہیں جاگ رہا تھا۔ میں نے اس کی چیخیں سنی ہیں۔ میں اس کی آواز لاکھوں آوازوں میں پہچان سکتا ہوں۔" حسن عالم اضطراب میں ہاتھوں کو مروڑنے لگا۔ وہ اتنا نڈھال اتنا پریشان اور اتنا خوف زدہ تھا۔ کہ چند لمحے حمید کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

"نہیں بانو...... نہیں وہ......" حسن نے تڑپتے ہوئے کہا۔ اس کا اندیشہ حمید نے سمجھ لیا۔

"اتنے مایوس نہ ہو حسن۔ یہ خواب نہیں تھا۔ تمہارے ذہنی انتشار کی وجہ سے ایسے ہوا۔ رات گئے تک تم لڑکیوں کی داستانیں سنتے رہے تھے نا۔ خدا نہ کرے جو بانو کو حسن۔"

"خدا نہ کرے۔ خدا نہ کرے۔" حسن نے بچوں کی سی معصومیت سے دہرا دیا۔

حمید اور اس کی ماں بڑے حوصلے سے اس کا حوصلہ بندھاتے رہے۔ حسن وقتی طور پر اپنے حوصلے کو مضبوط بنا لیتا۔ لیکن دل تھا۔ کہ اندر ہی اندر بیٹھتا چلا جا رہا تھا۔ اس خوفناک خواب کا اثر اس نے بہت شدت سے لیا تھا۔ وہ پہروں اس خواب کی روشنی میں بانو کے متعلق سوچتا رہتا۔ اگر ایسا ہو گیا۔ تو کیا ہو گا۔ سوچتے اس کا دماغ ...الت ہو جاتا۔ اس کے لبوں پر ایک ہی دعا تھرا جاتی۔ "یا اللہ ایسے حالات میں بانو کو موت دے دینا۔"

یہی عشق کا اک مقام تھا۔ دن گزرتے جا رہے تھے۔ ہر دن نیا اضطراب لے کر طلوع ہو رہا تھا۔ حسن اب کبھی واہگہ ریلوے سٹیشن اور والٹن کیمپ کے کسی آوارہ روح کی طرح چکر کاٹ رہا تھا۔

قدرت کو اس کی حالت پر شاید رحم آ گیا۔ اس سہ پہر وہ واہگہ میں لاکھوں بے خانماں برباد لوگوں میں گھوم گھوم کر کوئی شناسا صورت ڈھونڈ رہا تھا۔ حمید اس کے ساتھ تھا۔ اک درخت تلے اسے دیکھی بھالی صورت دکھائی دی۔ تڑپ کر اس تک پہنچا۔ حمید بھی اس کے پیچھے لپکا۔

وہ رکھو دھوبن تھی۔ توری کی طرح بچی اب بھی اس کے کندھے سے لٹک رہی تھی۔

"رکھو۔ رکھو۔" حسن نے پکارا۔ تجسس سے اس کا دل تھم جانے کی حد تک دھڑک رہا تھا۔ وہ اس مجرم کی طرح تھا۔ جسے جج کا آخری فیصلہ سننا تھا۔ اور جو موت طویل قید...... یا رہائی۔ تینوں صورتوں کے درمیان امید و بیم کی حالت میں لٹک رہا تھا۔ حمید نے اس کا بازو پکڑ کر سہارا دیا۔ "یہ ہماری دھوبن ہے حمید۔" حسن کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔

رکھو حواس باختہ سی تھی۔ میل سے اٹے کپڑے۔ بکھرے بال۔ زخمی پاؤں اور زخمی دل و جگر۔ پہلی نظر میں حسن کو پہچان نہ پائی۔ حسن بھی تو دیوانہ سا ہو رہا تھا۔

"رکھو۔ رکھو۔ میں حسن ہوں۔" حسن گھٹنے کے بل زمین پر اس کے قریب جھک گیا۔

"ہمارے گھر والوں کی کہو...... وہ......"

رکھو اس کی بات ختم کرنے سے پہلے ہی اسے پہچان کر چیخی۔ اور پھر سینہ کوبی کرتے ہوئے بولی۔ "مر گئے سب بابو...... مر گئے سب...... سبھی مر گئے۔ میں رکھو ہی بچ گئی۔ ایک بھی نہ بچ سکا۔"

یہ صدمہ متوقع ہوتے ہوئے بھی غیر متوقع تھا۔ حسن کو زمین و آسمان گھومتے ہوئے محسوس ہوئے۔ ثریا، سلیم، بانو، نسیم، بی بی، ماموں، ممانی، نصیر الدین سب کی شکلیں نظروں میں چکروں کی صورت گھومنے لگیں۔ پھر

http://www.rehanahmed.com

اسے ہوش نہ رہا۔ کہ وہ کہاں ہے؟

اس دن اماں کی حالت بھی دیکھی نہ جاتی تھی۔ رونے دھونے اور غم زدہ ہونے کے باوجود امید کی ٹمٹماتی کرن سہارا دے رہی تھی۔ رکھو دھوبن نے یہ سہارا توڑ دیا۔ اور پھر ظلم و تشدد کا جو نقشہ اس نے کھینچا۔ فولاد و آہن کا دل بھی پگھل پگھل گیا۔

آج اماں بچھڑنے والوں کا گھٹے گھٹے دل سے نہیں پورے ارمانوں سے ماتم کر رہی تھی۔ محلے کی عورتیں جمع ہو گئی تھیں۔ حمید کی ماں اور بہنیں بھی شریک غم تھیں۔ آج ان کے پاس تسلی دینے کو کوئی الفاظ نہیں رہے تھے۔ حمید حسن کے قریب تھا لیکن غم سے ساکت مجسمے کو دیکھ دیکھ کر تڑپ رہا تھا۔

کئی دنوں بعد جب حسن کے حواس کچھ بجا ہوئے تو بارگاہ ایزدی میں سربسجود ہو گیا۔ اس نے بانو و ثریا کے مر جانے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ اب خواب کا اثر اس کے ذہن سے زائل ہو گیا تھا۔ لیکن غم کی آگ اندر ہی اندر جلا رہی تھی۔ شکرانے کا حیلہ بھی تسکین نہ دے سکا۔ وہ اندر ہی اندر گھلنے لگا۔ کچھ ہی دنوں میں وہ بستر پر گیا۔ اور اس طرح پڑا۔ کہ اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔

شام ڈھل رہی تھی۔ آفتاب کی آنکھوں سے رستا خون مغربی آسمان پر تیر رہا تھا۔ ہوا دم بخود تھی۔ شجر و حجر ساکت تھے۔ جنگلی طیور بھی دم سادھے شاخوں پر سرنگوں بیٹھے تھے۔ بانو ایک گھنے درخت تلے برہنہ پڑی تھی۔ اس کا تار تار کرتا خود رو پودوں سے الجھا ہوا تھا۔ اس کا دوپٹہ اس کا سر ننگا کر کے کہیں اڑ گیا تھا۔ سامنے درخت کے ساتھ بی بی کی نیم عریاں لاش بندھی تھی۔ بی بی کی گردن ایک طرف کو ڈھلک چکی تھی۔ بالوں میں خون جم گیا تھا۔ پھوٹے سر کا زخم کھلا ہوا تھا۔ اور خون کی پتلی پتلی لکیریں گردن اور سینے پر جم کر سیاہی رنگت کی ہو گئی تھیں۔

بانو نے آنکھیں کھولیں۔ ارد گرد دیکھا۔ دماغ میں سوچنے سمجھنے کی قوت ہی نہ تھی۔ پھر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ چت پڑی تھی۔ جسم لکڑی کی طرح اکڑا ہوا تھا۔ کروٹ بھی نہ بدل سکی۔ گھبرا کر پھر آنکھیں .... اس نے کئی بار گرد و پیش دیکھا۔ اب بھی نہ سمجھ سکی۔ کہ وہ کہاں ہے؟ اور کیوں ہے؟

اسے یوں لگا جیسے وہ خواب دیکھ رہی تھی۔ کئی لمحے وہ ساکت پڑی رہی۔ لیکن اب اس کے جسم میں زندگی بیدار ہو رہی تھی۔ بیہوشی ٹوٹ رہی تھی۔ داخلی اور خارجی کیفیات ایک دوسرے سے متصادم ہو رہی تھیں۔

گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے اس نے دل سے سوچنا چاہا کئی بار آنکھیں کھولیں۔ کئی بار بند کیں۔ بڑی مشکل سے سر قدرے اٹھایا۔ اپنے سراپا پر نظر پڑی۔ تو شرم سے جھرجھری سی آ گئی۔ بمشکل اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سامنے دیکھا بی بی بھی کچھ اسی کی سی حالت میں درخت کے ساتھ بندھی تھی اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو سہلایا۔

"کیا یہ خواب ہے یا..... ایسے تو خواب سے بھی شرم آنے لگے"

بانو نے سر دونوں ہاتھوں پر گرا لیا۔ لیکن اب ساکت و صامت ذہن کو جھٹکے سے لگنے لگے۔ اس نے اپنا جسم سمیٹ لینے کی کوشش کی۔ کبھی اپنے بازوؤں کو چھوتی کبھی گالوں پر ہاتھ پھیرتی۔ کبھی رانوں کو ٹٹولتی۔ یہ سب کیا تھا؟

اور جب کئی لمحوں کی ذہنی اور دماغی کاوش کے بعد وہ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوئی تو تیورا کر یوں گری جیسے قابل خوفناک زلزلے سے بڑی بڑی عمارتیں زمین بوس ہو جاتی ہیں۔ وہ بیہوش نہیں ہوئی۔ خونچکاں عا... کڑیاں سلسلہ وار جڑنے لگیں۔ خونی حقیقت کا احساس ہوا۔ کانوں میں تیزاب ٹپکنے لگا۔ اس کے ساتھ کیا بیت چکی تھی۔ اس کا خیال قیامت سے کم نہ تھا۔

"نہیں۔ نہیں...... نہیں" تلخ احساس سے بے کل ہو کر چیخی۔ اور پھر جوں جوں حقیقت کا... گیا۔ اس کی چیخیں فلک شگاف ہوتی گئیں۔

وہ تیزی سے اٹھی اور دوڑ کر بی بی کی لاش سے لپٹ گئی "یہ کیا ہو گیا بی بی۔ کچھ تو بولو۔ یہ کیا ہو گیا۔ ... تم نے دیکھا بی بی۔ تم اندھی کیوں ہو گئیں۔ بہری کیوں نہ ہوئیں۔ بیٹی کے لٹتے...... نہیں نہیں نہیں۔"

بانو نے بی بی کی لاش کو چھوڑ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور کانوں پر ہاتھ رکھ کر فلک شگاف اور زہر گداز... مارتے ہوئے مڑی۔ یوں وہ اس حقیقت سے انحراف کرنا چاہتی تھی۔ جو اس پر بیت چکی تھی۔ اس احساس... فرار چاہتی تھی۔ جو اس کی نسوانیت کی دھجیاں بکھیر رہا تھا۔

وہ بے بس و بے اختیار ہوتی گئی اپنے آپ کا ہوش نہ رہا نہ گردوپیش کا۔ کسی آوارہ روح کی طرح درختوں کے گرد چکر لگاتی خودرو پودوں کو روندتی کانٹوں سے الجھتی "نہیں نہیں" چلاتی سرپٹ دوڑتی گئی۔

سردار گوبند سنگھ لنیپے کا ملگجا سا تہبند اور موٹے کھنڈی کی کھدر کا کرتا پہنے سر پر ململ کی پگڑی رکھے ... درانتی لئے کھیتوں سے گھر کی جانب جا رہا تھا۔ سردار گوبند سنگھ نہیں انسان تھا۔ آجکل ملک میں جو حالا... درپیش تھے وہ ان سے پوری طرح باخبر تھا۔ اس کے اپنے گاؤں میں بھی یہ قیامت گزر چکی تھی۔ مسلمانوں کے چند گھرانے تھے۔ جنہیں تحفظ اور پناہ کا عہد دینے کے باوجود تباہ و برباد کر دیا گیا تھا۔ سردار گوبند سنگھ نے گاؤں میں امن و امان رکھنے کی پوری کوشش کی تھی۔ لیکن غنڈے اور فسادی بپھرے ہوئے تھے۔ انہوں نے ... سنگھ کو دھمکی دی تھی کہ اگر وہ ان کے راستے میں حائل ہوا تو اس کی بہنیں روپ اور لاجو کو اٹھا کر لے جائیں گے۔

گوبند سنگھ کا دل انسانی خون کی بے دریغ قربانی پر کڑھتا تھا۔ لیکن آندھی و طوفان کے آگے بند باند... سعی بیکار تھی۔ اپنے گرو کے آگے بنتی کرتا رہتا کہ ان درندوں کو انسان بننے کی توفیق دے۔ زینبے گاؤں کی حسین ترین لڑکی تھی۔ جس کا وحشیوں نے مکروہ ترین انجام کیا تھا۔ گوبند سنگھ کے سینے میں پھانس سی اٹک گئی تھی وہ زینبے کو نہ بچا سکا تھا دل اسی خلش سے دوچار رہتا۔ لیکن اس کے دل کا اضطراب اور اس کے ... مداوا نہیں تھے۔

بجھے بجھے دل سے وہ کام میں لگا رہتا۔ گاؤں اب مسلمانوں سے خالی ہو چکا تھا۔ صدیوں سے آباد گھر لوٹ...

http://www.rehanahmed.com

ذر آتش کیے جا چکے تھے۔ ان کی لہلہاتی کھیتیوں کو خون میں ڈبو دیا گیا تھا۔ بے اختیار اس کا جی چاہا۔ کہ اپنی بہنوں اور ماں کو لے کر کسی دور دیس چلا جائے۔ جہاں صرف انسان ہی بستے ہوں۔ لیکن ارد گرد کے حالات سن سن کر مایوس ہو جاتا تھا۔ امن اور شانتی کی دیوی شاید روٹھ گئی تھی۔

آج کھیتوں پر زمیندار کے بیٹے سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ صبح ہی دلی سے آیا تھا۔ جو جو باتیں اس نے سنائی تھیں گوبند سنگھ کانپ کانپ کر رہ گیا تھا۔

اس وقت بھی وہ دل برداشتہ سا گھر کی جانب چلا جا رہا تھا مغموم اداس اور پریشان سا نظر آ رہا تھا۔ نظریں پگڈنڈی پر جمائے سوچوں میں الجھا ہوا وہ تیز قدم اٹھا رہا تھا اس کی لال کھل کی لمبی نوک والی جوتی پر گرد کی موٹی تہہ جم چکی تھی اس کا تنومند جسم تھکا تھکا سا تھا۔

اچانک اس کی نظر پگ ڈنڈی سے پھسل کر دائیں ہاتھ والے کھیت پر پڑی۔ خاصہ قوی ہیکل ہونے کے باوجود اس کے بدن میں جھرجھری آ گئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے حواس مجتمع کیے غور سے دیکھا۔ ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپے کوئی برہنہ عورت سرپٹ بھاگتی چلی جا رہی تھی۔

گوبند سنگھ ادھر کو لپکا۔ برہنہ پیکر برق رفتاری سے بھاگ رہا تھا۔

”کون ہو تم۔ رک جاؤ“ گوبند سنگھ چلا رہا تھا لیکن وہ رکی نہیں۔ سردار گوبند سنگھ نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ کچھ ہی دیر بعد ہانپتے ہوئے اس نے برہنہ پیکر کو کندھے سے پکڑ لیا۔ جو منہ ڈھانپے چیخ رہی تھی۔ ”نہیں نہیں نہیں.......“

لڑکی نے ہاتھ چہرے سے ہٹا کر گوبند سنگھ کی طرف دیکھا تو اس کی خوف و ہراس سے چیخیں بلند ہوتی گئیں۔ گوبند سنگھ نے اسے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ اپنی پگڑی اتار کر اس کی ستر پوشی کی کوشش کی۔ لڑکی چیختے چیختے بیدم ہو کر لہرائی۔ اور تیورا کر گوبند سنگھ کے سنبھالنے سے پہلے ہی زمین پر گر گئی۔ لڑکی کی حالت سے گوبند سنگھ نے بہت جلد اندازہ کر لیا تھا کہ وہ کشتہ جور و ستم ہے۔ وہ بہیمیت کی مسخ کی ہوئی تصویر ہے شرم و ندامت سے گوبند سنگھ کا سر جھک گیا منہ موڑ کر اس نے اپنا موٹا کھدر کا کرتا اتارا اور لڑکی پر ڈال دیا۔

پھر بڑی عقیدت اور احترام سے اسے بازوؤں پر اٹھایا اور گھر کی جانب لے چلا۔ وہ گاؤں والوں کی ذلیل ذہنیت اور منافرت اور تعصب کی وقتی آندھی سے باخبر تھا اس لئے چھپتے چھپاتے لڑکی کو گھر کی جانب لے جا رہا تھا۔

صحن تیزی سے عبور کر کے وہ سامنے کچے دالان کی طرف بڑھا۔ جہاں مٹی کے دیئے کی دھیمی سی لو کانپ رہی تھی اور اس کی بہن روپو بیٹھی سوت کی انٹیاں برابر کر رہی تھی۔

”یہ کیا ہے بھاجی؟“ روپو نے حیرت زدہ ہو کر بھائی کی طرف دیکھا وہ لاش سمجھ کر ڈر گئی۔ چیخ مارنے کو

تھی کہ گوبند سنگھ نے دھیمی آواز میں کہا۔

"یہ چارپائی بچھادے روپو۔ پنکھا بھی لے آ۔ پانی بھی۔"

"یہ کون ہے بھاجی۔" روپو اب بھی دھڑکتے دل کو تھامے کھڑی تھی۔

"چارپائی بچھادے۔" گوبند سنگھ نے ذرا تلخی سے کہا۔

روپو نے چارپائی بچھادی۔ گوبند سنگھ نے بہن سے پوچھا "لاجو کہاں ہے؟"

"ماں اور وہ اوپر کوٹھے پر ہیں۔" وہ بولی۔

"جا اپنے کوئی کپڑے لے آ اور اسے پہنا دے۔ میں ماں کو بلاتا ہوں۔"

روپو ساتھ والی کچی کوٹھڑی میں چلی گئی۔ گوبند سنگھ صحن میں نکل آیا۔ لاجو کوٹھے کی منڈیر پر بیٹھی تھی۔

"بھاجی اوپر ہی آجاؤ۔ نیچے تو بڑی گرمی ہے۔ بھوجن اوپر ہی رکھا ہے۔"

"ماں جی کہاں ہیں"۔

"اوپر"۔

"انہیں نیچے بھیج دو ذرا۔ تم بھی آؤ۔"

"کیوں"؟

"جرح کرتی جا بات نہ سننا"۔ گوبند سنگھ نے جھلا کر کہا۔ "ماں کو نیچے بھیج دو۔

گوبند سنگھ ہاتھ ملتے ہوئے چوکی پر بیٹھ گیا تھوڑی دیر بعد ماں اور لاجو نیچے آگئیں۔

"لاجو باہر کا دروازہ بند کر دو۔" گوبند سنگھ ہاتھ ملتے ہوئے چوکی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ماں اور لاجو نیچے آگئیں۔

"کوئی مسلمان لڑکی ہے ماں۔ بخار سے تپ رہی ہے۔ بیہوش پڑی ہے۔"

"ہائے۔ ہائے" ماں نے سینے پر ہاتھ مارا۔ "لیکن تو اسے کیوں اٹھالایا۔ زینتے کا حشر بھول گیا تجھے؟ گاؤں والے چھوڑیں گے اسے؟"

"اس کے متعلق بھی سوچ لوں گا۔ فی الحال تو وہ بے ہوش پڑی ہے۔" گوبند سنگھ سوچتے ہوئے بولا۔ "احتیاط صرف یہ برتنا کہ کسی کو پتہ نہ چلے لاجو تیری زبان بڑی لمبی ہے۔"

ماں اور بیٹی اندر چلی گئیں۔ روپو نے اپنا جوڑا اسے پہنا دیا تھا۔

"۔ ہائے ہائے یہ بھی کسی کی لاجو ہوگی۔ کسی کی روپو ہوگی"۔ ماں نے دیے کی روشنی میں لڑکی کو دیکھا۔ اور پھر پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اس کا دل لڑکی کی حالت پر کڑھنے لگا۔ روپو نے گرم گرم دودھ کی چمچیاں اس کے منہ میں انڈیلیں۔ لاجو نے دوپٹا گیلا کر کے اس کا ماتھا سہلایا۔

جانے کون ہے کہاں کی رہنے والی ہے۔" ماں نے سر تشویش سے ادھر ادھر جھٹکاتے ہوئے

انہیں کون بتاتا کہ یہ بانو ہے۔

جس کے دامن کی طہارت پر حوریں بھی سجدہ کرتی تھیں۔

دونوں بہنیں اور گوبند سنگھ بانو کے سرہانے بیٹھ کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتے رہے۔ صبح ہوش آیا بھی تو صرف اتنا کہ تڑپ تڑپ کر ماں باپ بھائیوں بھاوج اور حسن کو آوازیں دینے لگی۔

گوبند سنگھ کی انتھک کوشش کے باوجود گاؤں والوں سے یہ بات پوشیدہ نہ رہ سکی کہ اس نے گھر میں ایک مسلمان لڑکی رکھی ہے۔ ایک دو دن تو دبی دبی افواہ گشت کرتی رہی لیکن تیسرے دن ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ کہ گوبند سنگھ لڑکی گاؤں والوں کے حوالے کر دینے کا مطالبہ زور شور سے بلند ہونے لگا۔ "صبح لڑکی ہمارے حوالے نہ کی تو اس کے گھر پر ٹوٹ پڑیں گے۔"

گوبند سنگھ حیران و پریشان گھر لوٹا۔ بانو کے حواس پوری طرح بجا نہ تھے بخار بھی ابھی نہیں ٹوٹا تھا ایسی حالت میں گاؤں والوں کے حملے کا ڈر۔ ماں بہنوں سے مشورہ کیا لیکن کچھ سمجھ نہ پایا کہ کیا کرے۔ وہ بانو کو بچا کر مسلمانوں میں پہنچانا چاہتا تھا لیکن کیوں کر۔ یہ سمجھ نہ آرہا تھا۔

بھجن سنگھ اس کا عزیز دوست تھا۔ رات گئے وہ اس کے پاس گیا گرو گرنتھ کی قسمیں دے کر بانو کی سلامتی مانگی۔ بھجن سنگھ بھی قتل و غارت کو انسانیت کی توہین سمجھتا تھا بانو کو بچانا اب گوبند سنگھ کا نہیں اس کا بھی ایسے ہی مسئلہ توجہ طلب تھا۔ گاؤں کے لوگوں میں ایک بار پھر وہی سفلانہ جذبات اور ابال آگیا تھی دونوں دیر تک سر جوڑے منصوبے بناتے رہے۔

آخر طے یہی پایا کہ بانو کو جالندھر ریلوے سٹیشن پر کسی طرح پہنچایا جائے۔ مہاجروں کی کئی گاڑیاں پاکستان جا رہی ہیں۔ بانو کو بھی کسی گاڑی میں دیا جائے۔ اپنے دیس میں تو پہنچ جائے گی۔ اپنے لوگوں میں ہوگی۔

رات کے پچھلے پہر گوبند سنگھ نے بھجن سنگھ کی وساطت سے ایک گھوڑا لیا۔ بانو کو رات کی تاریکی میں گھر سے رخصت کرتے ہوئے ماں نے گورو گرنتھ کے شبد پڑھ کر اس پر حفاظت کے لئے پھونکے۔ بانو لاش کی طرح دونوں کے ساتھ چل پڑی۔

دن چڑھے وہ جالندھر ریلوے سٹیشن پر پہنچ گئے۔ اور اتفاق ہی تھا جو اسی وقت مہاجرین سے لدی پھندی ایک گاڑی پلیٹ فارم پر آگئی تھی گوبند سنگھ نے ایشور کا شکر ادا کیا اپنے ہاتھوں پوری حفاظت سے اس نے ایک ڈبے میں بانو کو سوار کرا دیا۔

لٹے پٹے لوگوں سی تباہ حالی بھی دید کے قابل تھی۔ گوبند سنگھ نے بانو کو ایک ادھیڑ عمر عورت کے قریب بٹھا

"بی بی...... یہ تنہا ہے۔ لیکن تمہاری قوم کی بیٹی ہے اسے ساتھ ساتھ رکھنا۔" پھر گوبند سنگھ

سے ہاتھ بانو کے سر پر پھیرا۔

"جا من۔ تیرا رب راکھا۔"

بانو نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اور غور سے اس ہاتھ کو دیکھنے لگی۔

"ہاتھوں کی ساخت تو سب کی ایک جیسی ہوتی ہے۔ لیکن کئی ہاتھ زندگی چھین لیتے ہیں اور کئی ہاتھ

بخش دیتے ہیں۔"

بانو اس کا ہاتھ پکڑے شاید یہی سوچ رہی تھی

بانو کی حالت دیکھ کر گوبند سنگھ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کندھے پر پڑے انگرچھے سے آنسو

سے باہر نکل آیا۔

جالندھر سے تیس پینتیس میل دور پکی سڑک سے نکلنے والا کچا راستہ اکال گاؤں کو جاتا تھا فسادات کی لپیٹ میں معمولی سی اقلیت بھی بری طرح آ کر معدوم ہو چکی تھی۔ کچھ لوگ جانیں بچا کر بھاگ نکلے تھے۔ کچھ پاکستان کی بنیادوں کے استحکام کے لئے خون دے کر ختم ہو گئے تھے۔

بسنت سنگھ اس گاؤں کا نامی غنڈہ تھا چھ سوا چھ فٹ کا چوڑا چکلا آدمی۔ جس کے گھنے کیس اور پھیلی ہوئی گھنی داڑھی اس کے چہرے کی ہیبت میں اضافہ کرتی تھی۔ تانبے کی طرح رنگت موٹے موٹے بھدے ہونٹ۔ پیلے پیلے دانت لال لال مسوڑھے اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں۔ جن میں شیطانیت ہر وقت برہنہ رقص کرتی تھی۔ مکروہ صورت والا بسنت سنگھ گاؤں والوں کی نظر میں معتوب تھا۔ آئے دن ڈاکے ڈالنا اس کا کام تھا۔ لیکن جب تقسیم ہند کے بعد فسادات کی آگ بھڑکی تو بسنت سنگھ اپنا پرانا پیشہ ترک کر کے بلوائیوں فسادیوں۔ اور شرپسندوں کے گروہ میں مل گیا۔ اس نے ہنستی مسکراتی بستیاں تاخت وتاراج کر ڈالیں۔ اس نے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی۔ ان پر آگ برسائی۔ ان پر قہر توڑا۔ ان کا مال وزر لوٹا۔

ان کارہائے نمایاں کی وجہ سے بسنت سنگھ کی اہمیت وحیثیت گاؤں والوں کی نظر میں بالکل بدل گئی وہ اس کی ذات پر فخر کرنے لگے۔

"آدمی ہو تو ایسا ہو۔ کیا گھبرو جوان ہے۔ ہند ماتا کا جیالا سپوت ہے۔ مولی گاجر کی طرح کاٹ ڈالا مسلوں کو [...] نے اکیلے سارے پاپ بخش دیے ہیں۔"

بسنت سنگھ نے مال غنیمت سے بھی اپنا گھر بھر لیا تھا۔ ہر پھیرے وہ لوٹ مار کا بیش قیمت مال لے کر گھر لوٹتا [...] ایک بار تو چھکڑوں پر لاد کر چیزیں لایا۔ اس کی ماں مائی جیونی خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی۔ اس کی بیوہ بھاوج [...] سے مان سے اس کا نام لے رہی تھی۔ بوڑھا اندھا باپ تو جیسے آنکھوں کے بغیر ہی زندگی کی چکاچوند دیکھ رہا تھا اور اس کی بہن دلجیت کور کا تو زمین پر پاؤں نہ پڑتا تھا۔

گاؤں کے مغربی نسبتاً سنسان نکڑ میں بسنتے کا ٹوٹا پھوٹا مکان تھا۔ بڑے سے کچے صحن میں ایک ٹوٹی چوکی پر اس کا اندھا باپ کبوتر کے پروں کی طرح اپنے لال پپوٹوں کو پھڑپھڑاتا مالا جپتا رہتا تھا۔

دائیں ہاتھ دالان تھا۔ جس کے کچے فرش پر مائی جیونی پرانا چرخہ لے کر سوت کاتا کرتی تھی۔ کوٹھڑیاں تھیں۔ ایک میں بسنتے کی چارپائی ہوتی اور دوسرے میں ٹوٹا پھوٹا سامان۔ لیکن فسادات کے دنوں میں اس گھر کا نقشہ بدل گیا تھا۔

صحن کی ٹوٹی پھوٹی چوکی توڑ کر جلانے کے لئے رکھ دی گئی تھی۔ نئی رنگین پایوں والی چوکی جو کسی مسلمان میں نماز کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ ڈال دی گئی تھی نیا چوکور خانوں والا کالا کھیس اور ساٹن کے غلاف تکیہ اس پر رکھ دیا گیا تھا باپو کے میلے کچیلے کپڑے بھی اب نظر نہ آتے تھے۔ بسنتا بے شمار کپڑا لوٹ میں لایا تھا۔

دالان میں بھی نئے رنگین پلنگ ڈال دیے گئے تھے۔ جن پر خوب صورت سوزنیاں بچھی رہتی تھیں۔ جیونی اس کی بہو اور بیٹی نے مل کر کمروں کا لیپ پوت کر لیا تھا۔ دیواروں پر سبز اور فیروزی رنگ کی سفیدی بھی تھی۔

بسنتے کی کوٹھڑی بھی اب خاصہ کمرہ بن گئی تھی۔ شیشوں کے تکیے والا نواڑی پلنگ ڈال دیا گیا تھا پر سفید لٹھے کی کاڑھی ہوئی چادر ڈال دی گئی تھی۔ فیروزی کچی دیواروں پر رنگ برنگی تصویریں بھی آویزاں کر دی گئی تھیں۔ بسنتا جالندھر سے گورو گرنتھ گورو نانک اور بانیاں پڑھتے ہوئے سکھوں کی تصویریں لے آیا تھا۔ دیواروں پر قطاروں کی صورت میں اس کی بہن نے یہ تصویریں جوڑ دی تھیں۔ فرش کی لپائی اس کی جیتاں ہر روز بڑی ہی پریت سے کرتی تھی۔

جیتاں ان دنوں اٹھلاتی پھرتی تھی۔ کہاں تو ڈھنگ سے پہننے کا ایک کپڑا بھی نہ تھا کہاں سوٹ کیسوں کیس بھرے پڑے تھے۔ ریشمی جھل مل جھل مل کرتے کپڑے دیکھ دیکھ کر اس کے من میں جوانی جاتی تھی۔ زیوروں کا بھرا پورا ڈبہ بھی آ گیا تھا۔ رنگ برنگے زیورات اس نے کئی کئی بار پہن کر دیکھے تھے۔ اب اس کے بیاہ کی بات آگے ٹالنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اس نے گوٹے کناری سے بھرا سرخ دوپٹہ بھی کوٹھڑی میں چھپ چھپ کر کتنی ہی بار اوڑھا تھا خدا جانے کون بدنصیب اجڑی تھی جس سے جیتاں بس جانے کی تمنا پوری کر رہی تھی۔

گلی محلے کی عورتیں اب اکثر بسنتے کے صحن میں مائی جیونی کے پاس بیٹھی نظر آتی تھیں۔ گاؤں کے بزرگ بھی اس کے اندھے باپ کی وقت گزاری کے لئے شام کو آ بیٹھتے۔ بسنتے جیسے بیٹے کی ماں اور باپ دونوں کو مبارک بادیں دیتے۔

بسنتا ہر روز نیا معرکہ کرتا۔ اور سرخرو ہو کر لوٹتا تھا کبھی کسی گاؤں کا رخ کرتا کبھی جالندھر شہر کے کسی محلے پر یورش کر کے لوٹتا۔ کبھی سوئے پاکستان رواں اجڑے لوگ اس کے تختہ مشق بنتے۔ تو کبھی تباہ حال لوگوں سے بھری ہوئی گاڑیاں اس کا نشانہ ستم بنتیں۔

بسنتا دو دو تین تین دن گھر سے باہر رہتا۔ لیکن جب لوٹتا تھا تو اک فاتح کی شان سے لوٹتا۔ آج اسے گئے تین دو دن ہو چکے ہیں۔

"بھائی آج بھی نہیں آئے ماں۔" جیتاں نے کچھ وشواش ظاہر کیا۔

"ہاں آج اسے آجانا چاہئے تھا۔ ماں بولی۔

"مجھے تو بڑا ہی فکر ہو رہا ہے۔" جیتاں نے کہا۔" اب تو بھاجی کو دنگے فساد چھوڑ دینے چاہئیں۔"

"اے ہے پتری" سوہن سنگھ کی بیوی بولی۔ "اس کی رکھیا بھگوان کرنے والا ہے۔ فکر مند ہونے کی کیا بات ہے۔ پاپی ملیچھوں سے اپنی زمین کو خالی کر رہا ہے وہ۔"

"یہ تھوڑا کام ہے کیا؟"

"ہاں جی۔ ٹھیک کہتی ہو۔ لیکن لڑائی میں کہیں بھا پا جی۔" وہ متفکر تھی۔

"اے ناشدنی۔ منہ سے اچھی بات نکال۔" ماں نے جلدی سے کہا۔

جیتاں منہ بنا کر اندر چلی گئی۔

بسنتا اس رات بھی نہیں لوٹا تھا۔ تو ماں کو بھی فکر ہوا۔ باپ بھی مضطرب رہا۔ دونوں بیٹے کی سلامتی کی دعا کے لئے پرتھنا کرنے لگے۔

دوپہر خوب سر آ گئی تھی حدت اتنی بڑھ گئی کہ سانس لینا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ گاؤں کے لوگ درختوں کے نیچے بیٹھے حالات حاضرہ پر تبصرہ کر رہے تھے مسلمانوں کے قتل عام پر خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ خالصوں کی بہادری کے قصیدے پڑھے جا رہے تھے پنجاب سکھوں کا ہے۔ ماسٹر تارا سنگھ کے اس اعلان کی داد دی جا رہی تھی کہ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز آئی۔ لوگ سر اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگے۔ بسنتا آ رہا تھا۔ لوگ استقبال کے لئے یوں کھڑے ہو گئے جیسے کوئی فاتح میدان مار کر آیا ہو۔

"سردار بسنت سنگھ"۔ کسی منچلے" نے نعرہ لگایا۔

"زندہ باد" کئی آوازیں گونجیں۔

بسنتے نے گھوڑے کا رخ ان کی طرف پھیر لیا وہ گھوڑے پر اکیلا نہیں تھا۔

"یہ کون ہے؟" لوگوں نے بے صبری سے پوچھا۔

"تمہاری بھابی۔ تمہاری بہو۔" بسنتے نے ہنس کر کہا۔

"واہ واہ واہ"۔ سب اٹھ اٹھ کر اس کے گرد جمع ہونے لگے۔

"کوئی مسلی ہے" کسی نے پوچھا۔

"ہاں" بسنتے نے سینہ تان کر جواب دیا۔

"بے ہوش ہے" گھوڑے کی گردن پر لڑکی کی ڈھلکی گردن دیکھ کر حاضرین میں سے کسی نے کہا۔

"تو گھر لے چلو اسے جلدی سے"۔ کسی بزرگ نے کہا۔

"ویدجی کو ذرا گھر لیتے آنا۔ اس کو بخار بھی ہے۔ بخار ہی سے بے ہوش ہے۔

جلدی سے ویدجی کو لے آؤ۔ بسنتے نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔

اور گھر کی طرف چل پڑا۔ لوگ مال غنیمت کو دیکھنے کو پیدل ہی اس کے گھر کی طرف چل دیئے۔ ...

بلانے دوڑے۔ ہر زبان پر بسنتے کی بہادری کا نام تھا۔ گھوڑے سے اتر کر بسنتے نے بے ہوش بانو کو

پر ڈالا۔ اور گھر کے اندر لے آیا۔ ماں بہن اور بھاوج اسے دیکھتے ہی اس کی طرف بھاگیں۔

"یہ کون ہے" سب نے یک زبان ہو کر پوچھا۔ بسنتے نے بانو کو صحن میں پڑی چارپائی پر ڈال دیا۔

"تمہاری بہو ہے ماں"۔ بسنتے نے ہنس کر کہا۔ "جیتاں دیکھ اپنی بھابی۔"

"کتنی سندر ہے"؟ جیتاں نے اس کی طرف پیار سے دیکھا۔ کون ہے بھاجی..... کہاں سے ملی"

"مسلی ہے؟" ماں نے پوچھا۔

"ہاں ہاں بسنتا فخر سے سینہ تان کر بولا۔

" "کہاں سے ملی" بھاوج بولی۔

"جالندھر سے گاڑی پاکستان جا رہی تھی دس میل بھی نہ گئی تھی۔ کہ ہم نے گاڑی روک لی۔ ...

دولت تو نہ ملی۔ یہی اٹھا لایا۔

"اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دو" ہوش تو آئے۔

"ابھی ویدجی آتے ہیں۔ "اسے بڑا سخت بخار ہے۔"

"بسنتے پتر!" اندھے باپ نے ساری باتیں سننے کے بعد اسے بلایا۔

"کوئی لڑکی ہاتھ لگی ہے آج"۔

"ہاں بابو۔ مسلی ہے۔ بڑی سندر ہے۔ میں نے اس سے بیاہ کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔"

"مسلی سے بیاہ۔

"نہیں بابو اسے سکھ بناؤں گا۔"

"واہ گورو کی..... تیرے سارے پاپ جھڑ جائیں گے پتر۔"

[illegible] ہم بھی تیرے اس شدھ کام سے سورگ میں جائیں گے۔ باپو سے اشیرباد لے کر بسنتا مسکراتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد گاؤں کے کئی لوگ بسنتے کے صحن میں جمع ہو گئے۔ خبر آگ کی سی تیزی سے سب طرف پھیل گئی۔ گاؤں کی عورتیں منڈیریں پھلانگ پھلانگ کر بسنتے کے گھر آ گئیں۔ کئی چھتیں پھاند کر صحن میں اترنے والی سیڑھیوں پر دوڑتی آئیں۔ لوگ بسنتے کو ودھائیاں دے رہے تھے۔ بیہوش بانو کو دیکھ دیکھ کر فخر سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ کئی منچلوں نے تو بھنگڑا ڈالنا شروع کر دیا تھا۔

بسنتے کے کپڑے خاک و خون سے اٹے تھے۔ جیتاں اس کے لئے نیا جوڑا نکال کر لائی۔ صحن کے ایک طرف چارپائی کھڑی کر کے بسنتا نہانے لگا۔ کچھ دیر بعد نئے کپڑے پہن کر لوگوں کے درمیان اک شان سے آ بیٹھا۔ لوگ اس معرکے کے متعلق اس سے سوال کرنے لگے۔

آج ہم نے گاڑی روکی تھی۔ بڑا مزہ آیا وہ پاکستانی فوج کے سپاہی نہ آ جاتے تو ایک مسلا بھی زندہ نہ بچتا۔ اپنا تو معاملہ کرپان اور سنگینوں سے ہی نمٹیں۔ گولیوں سے بھی ہوا۔ بسنتے نے چارپائی پر اکڑوں بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کے گھنے کیس کھل کر پشت پر پھیلے ہوئے تھے۔ پانی رس رس کر اس کے نئے کرتے کو گیلا کر رہا تھا۔

"ہائے بھاجی" جیتاں نے چھاتی پر ہاتھ مارا "گولیاں چلیں۔ آپ کو ڈر نہیں لگا۔"

ڈر اور بسنتا؟ ہاہاہا۔۔۔۔ بسنتے کے منہ سے تھوک کے ذرے اڑنے لگے۔

کچھ دیر بعد لوگوں کو باتیں سناتا رہا۔ لوگوں کی نظروں میں وہ اک ہیرو کی طرح عظیم اور معتبر تھا۔

"ارے کوئی وید جی کے پاس بھی گیا یا نہیں۔" بسنتے نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا۔

"کہیں بیہوشی ہی نہ جائے۔ ساری خوشی کرکری ہو جائے گی۔ ماں دیکھنا سانس تو لے رہی ہے نا۔"

ماں نے بانو کے نتھنوں کے آگے ہتھیلی کر دی۔ پھر مسکرا کر بیٹے کو دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

"چاچی اسے پنکھا کرتی رہو۔ بخار سے پھنک رہی ہے۔" بسنتے نے ہرنام سنگھ کی بیوی سے کہا۔

"بڑا خیال ہے ابھی سے اس کا" چاچی نے پیار سے بسنتے کی طرف دیکھا۔ "دھرم پتنی بن گئی۔ تو جانے کیا کیا کرتا پھرے گا۔"

بسنتا مسکراتے ہوئے بانو کے سرہانے آن کھڑا ہوا۔ بیہوش بانو کے چہرے پر اس کی گرسنہ نظریں پڑتے گئیں۔ اس کی آنکھوں میں ننگا شیطان ناچنے لگا۔

http://www.rehanahmed.com

"ویدجی اسے تو آج بھی ہوش نہیں آیا تیسرا دن جا رہا ہے" بسنتے نے تشویش بھری نظروں سے بانو کو دیکھتے ہوئے کہا۔

ویدجی نے متفکرانہ انداز میں سر ہلایا اور پھر اپنی جڑی بوٹیوں کے تھیلے میں کوئی چیز تلاش کرنے لگا۔ رنگ برنگی دوائیوں کی صندوقچی بھی اس نے چارپائی پر رکھی تھی۔

بانو بسنتے کے نواڑی پلنگ پر صاف ستھرے بستر پر پڑی تھی۔ جسم توے کی طرح جل رہا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ اور خوب صورت نتھنے پھڑک رہے تھے قریب ہی ایک لکڑی کی دیسی ساخت کی کرسی پر ویدجی بیٹھے تھے۔ ہرے رنگ کی کلف دار پگڑی اور سفید جوتے میں ملبوس تھے۔ تیسرے دن سے وہ بانو کا علاج کر رہے تھے۔ لیکن تا حال کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ متفکر وہ بھی تھے نا امید نہیں تھے۔

بسنتے کو بانو میں جانے کون سی طلسماتی کشش نظر آئی تھی جو بوبے فساد بھول کر اسی کے سرہانے آن بیٹھا تھا۔ ویدجی کی ہدایات پر پوری طرح عمل کر رہا تھا لیکن پھر بھی بانو ہوش میں نہیں آ رہی تھی۔

"ویدجی۔ یہ مر تو نہ جائے گی۔" بسنتے نے فکرمندی سے پوچھا۔

"نہیں بسنت سنگھ جی۔ فی الحال تو میں مایوس نہیں ہوں۔ اسے بہت صدمہ پہنچا ہے۔ بخار بھی اسی صدمے کی وجہ ہے۔ آپ دوائی باقاعدگی سے دیتے جائیں۔ لوگوں کو بالکل اس کے پاس نہ آنے دیں۔ خاموشی اور سکون سے حالت جلد سنبھل جائے گی۔"

"وہ تو میں نے پہلے ہی سب کو منع کر دیا ہے۔ اس کے پاس میں ہوتا ہوں یا جیتاں۔ لوگوں کو تو صحن میں بھی نہیں آنے دیتا۔ دوائی بھی دے رہا ہوں"۔

"فکر نہ کرو سردار جی۔ یہ نئی دوائی دے رہا ہوں۔ اس سے امید ہے۔ جلد ہی ہوش میں آ جائے گی۔ دودھ چمچ منہ میں ضرور ڈالتے رہنا۔"

...دے رہے ہیں۔

"فکر کی بات نہیں یہ دوائی اب دودھ میں ملا کر دے دو۔ شام کو میں پھر پتہ کروں گا۔"

"...میں آپ کی بڑی سیوا کروں گا"۔ بسنت سنگھ نے ہاتھ جوڑ کر ویدجی سے کہا۔

...اطمینان سے مسکرانے لگے۔ "بھگوان کرے یہ ٹھیک ہو جائے۔ پھر تیرے ویاہ پر خوب

..."

...ضرور ویدجی۔ وہ تو دیکھا جائے گا۔ پہلے اس کو ہوش آنے دو ہاں جب اس کو ہوش آ جائے تو اس کی ...دلجوئی کرنا ضروری بات ہے کہ وہ اپنوں کو یاد کر کے روئے گی تڑپے گی۔ بس تم اسے رونے نہیں ...کوئی ایسی ویسی بات نہ۔ ...... زیرلب مسکراتے ہوئے ویدجی نے آنکھوں کے اشارے سے بستے

...

...ویدجی۔" بستے نے معصوم ہنسی ہنستے ہوئے کہا "میں نے اس سے بیاہ کرنے کا پکا ارادہ کیا ہے ...بے فکر رہیں۔"

..."اچھا" ویدجی نے اٹھتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ تم اب خاصے سمجھ دار ہو گئے ہو۔"

...پڑیاں بستے کو دے کر ویدجی کمرے سے نکل گئے۔ بستا بانو کے سرہانے بیٹھ کر اسے پنکھا ...بڑی حریصانہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ جب یہ بانکی نار اس کی دلہن بنے گی تو کیسی

...پہر ڈھل رہی تھی۔ سورج کی بے دم کرنیں گوردوارے کے سنہری کلس سے الجھ رہی تھیں بارش ...موسم قدرے خوش گوار ہو گیا تھا ستمبر کا آغاز تھا یوں بھی رت کافی بدل چکی تھی۔ بستا بانو کے ...پنکھا کر رہا تھا۔ جیتاں قریب کھڑی ایک ٹک بانو کو دیکھ رہی تھی۔

...بے ہوشی کو آج ساتواں دن تھا۔ بستا جالندھر سے ایک ڈاکٹر کو لے کر آیا تھا۔ اس نے لڑکی کو ...دیکھا بھالا تھا۔ انجکشن دیئے تھے۔ مکسچر اور پاؤڈر بھی تجویز کئے تھے۔ دو دن سے اس ڈاکٹر کا ...ویدجی کی دواؤں کا اثر تھا یا ڈاکٹری ادویات کا۔ آج بانو کا بخار کم تھا صبح ہی سے ٹھنڈے ...رہی تھی۔ بستے کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ لیکن ڈاکٹر نے بھی یہی ہدایات دی تھیں کہ ...لڑکی کی ہر طرح سے دل جوئی کی جائے رونے دھونے سے نہ روکا جائے۔ ورنہ دماغ خراب ہونے

...

...نے ہائے کی پھر اس کی پلکیں پھڑپھڑائیں۔ کروٹ بدلنے کی کوشش میں اس نے اپنا دایاں بازو ...کی۔

جیتاں! یہ ہوش میں آ رہی ہے۔ اب دیکھو تو پلکیں بھی پھڑپھڑا رہی ہے" بسنتے نے خوشی ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھابی۔ میں تو اسے ہی دیکھ رہی ہوں۔ کتنی سندر ہے۔ پلکیں تو دیکھو کالی کالی ہیں ہے۔"

پانی لاؤ جیتا۔ !ہاں وہ چمچ بھی پکڑاؤ۔" جیتاں پانی کا گلاس اور چمچ لیکر آئی بسنتا اٹھا اور بانو کے سوکھے ہونٹ تر کرنے لگا۔

"بی...... بی" "بانو کے منہ سے کراہتے ہوئے آج کوئی لفظ نکلا۔"

"ماں کو لاؤ جیتا۔ بھاگ کر بلا لاؤ۔ دیکھو تو ہوش میں آ رہی ہے۔"

جیتاں ماں کو بلانے چلی گئی۔ بسنتا انتہائے شوق سے بے قابو ہو تا گیا۔ اس نے کئی بار اپنے کھردرے ہاتھ بانو کے گالوں پر پھیرے کئی بار اپنی موٹی موٹی انگلیوں سے بانو کے ہونٹوں کو ٹٹولا۔ اس کا بس چلتا تو شوق میں اندھا ہو کر اسی وقت بہت گستاخیاں کر بیٹھتا۔ لیکن ویدجی اور ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل کرنا ضروری تھا۔ اٹھاتے وحشیانہ جذبات کو دبائے بانو کے ہونٹوں کو پانی سے تر کرتا رہا۔

" ہائے۔ بانو کے وجود میں پھر حرکت ہوئی بسنتے نے بڑی احتیاط سے سہارا دے کر اس کی کروٹ بدل دی۔ بانو کا سر اب پلنگ کی پٹی پر تھا اور وہ اسی کے سامنے بیٹھا تھا۔ ماں اور جیتاں بھی آ گئیں۔ جیتاں پلنگ کے سرہانے والے پائے کے پاس کھڑی تھی۔ اور ماں پٹی پر بیٹھی بانو کے بازو پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

بانو نے کروٹ بدلی۔ چت لیٹی وہ سر کو بار بار ادھر ادھر پٹخنے لگی۔ سب متجسس اسے دیکھ رہے تھے۔ بسنتے کی حالت دیدنی تھی۔

"ماں اسے ہوش آئے تو ماں بن کر پیار کرنا۔ ڈاکٹر کہتا تھا۔ اس کا دماغ خراب ہونے کا خطرہ ہے۔ دلاسا دینا بہت ضروری ہے۔"

" میں خود سمجھتی ہوں۔" مائی جیوئی نے کہا۔

"جیتاں تم بھی سمجھیں ناں۔ کسی طرح بھی اس پر یہ ظاہر نہ ہونے دینا کہ وہ اپنوں میں نہیں ہے۔ اسے ہر طرح سے......"

"اچھا بھابی۔" میں تو اسے سہیلی بنا لوں گی۔ ذرا ہوش تو آ لے۔ ایسی من موہنی بھابی بھلا کہاں ملنا تھی۔

" بسنتا مطمئن ہو کر پھر بانو کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جواب پلکیں تیزی سے جھپکا رہی تھی۔

... جانب اٹھایا تھا دوسرے سے پٹی کو پکڑ لیا تھا۔ اس کے حواس اب بیدار ہو رہے تھے۔
... ہدایات کے مطابق بسنتے نے سفید سفوف کی پڑیا پانی میں گھولی۔ اور قطرہ قطرہ بانو کے حلق میں ... لگا۔

... اور شوق کے لمحے رینگ رہے تھے۔ بانو نے آنکھیں کھول کر پھر بند کر لی تھیں۔ اب وہ ہائے وائے ... رہی تھی۔ کئی بار اس کے ہونٹوں پر بی بی کا لفظ تھرکا تھا۔ بھابی کو بھی اس نے آہستہ آہستہ دو تین بار پکارا ...

... ی" بانو نے کروٹ کے بل ہوتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ مائی جیونی پانی کا گلاس لے کر اس ... آ گئی۔

"... لو"۔ مائی جیونی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
... آنکھیں ایک دم پوری طرح کھل گئیں۔ وہ ایک ٹیک مائی جیونی کو دیکھنے لگی۔ اس کی حیران آنکھیں ... کی حد تک کھل گئیں۔
"... لو بی بی" مائی جیونی نے گلاس اس کے ہونٹوں سے لگانا چاہا۔ بانو نے سر کو جھٹکا دیا۔
"... ماں میں پلاتی ہوں" جیتاں بانو کے سامنے آ گئی۔
"... جیتاں گلاس لے کر آگے بڑھی بانو اب نگاہیں اس پر جما کر رہ گئی۔
"تھوڑا پانی پی لو۔ تمہارا حلق خشک ہو رہا ہے۔ جیتاں نے مسکرا کر کہا۔
بانو کبھی جیتاں اور کبھی مائی جیونی کو دیکھنے لگی۔ مائی جیونی ہٹ کر دوسری چارپائی پر جا بیٹھی۔ بانو کی نظر ... پڑی۔ وہ اب تک سوچنے سمجھنے کی قوت سے اپنا ذہن خالی پا رہی تھی۔
... بھر اسی کیفیت میں گزر گیا بانو کبھی کروٹ بدلتی۔ کبھی چت لیٹ جاتی۔ کبھی آنکھیں بند کر لیتی۔ ... وہ نظروں سے گرد و پیش کو گھورنے لگتی۔
"... میں کہاں ہوں۔" مشکل وہ اتنا کہہ پائی۔
"... میں ہو۔ گھبراؤ نہیں۔" بسنتے نے حلیمی سے کہا۔ وہ اس کی ہمت بندھانے کو اس کے قریب ... قریب آ کر جھکتے ہوئے بانو کو تسلی دے رہا تھا۔
اس کا بدہیئت اور خوف ناک چہرہ دیکھ کر بانو نے ایک خوف ناک چیخ ماری۔ اس پر پھر بے ہوشی طاری ... ہو گئی تھی۔
ساری رات یونہی گزر گئی وید جی نے آ کر بانو کو دیکھا اس کی حالت تسلی بخش تھی۔ خطرناک حدود سے وہ ... بخار بھی ٹوٹ چکا تھا۔ لیکن ہذیانی کیفیت طاری تھی۔

وہ بار بار اپنے گھر والوں کے نام لے رہی تھی۔ حسن کو پکار رہی تھی کبھی چیخیں مارتی۔ کبھی بڑبڑاتی۔ اور کبھی "نہیں...... نہیں...... کی رٹ دل دوز انداز میں لگاتے ہوئے سر پٹخنے لگتی۔

ول میں آنے کے بعد کئی دن بانو پر بے ہوشی ہی کی سی کیفیت رہی۔ کسی کسی وقت تو بالکل سدھ بدھ نہ توازن بگڑ جاتا۔ اٹھ اٹھ کر رونے لگتی۔ چیخ چیخ کر ان کو بلانے لگتی جو ازل و ابد کی حدیں پھلانگ کر وادیوں میں گم ہو چکے تھے۔ حسن کو پکارنے لگتی۔ جو اس کی موت پر شکرانے کے دو نفل ادا کر چکا تھا۔ کی ہدایات کا اثر تھا۔ یا گوردوارے کے گیانی کی باتوں سے متاثر ہو کر بسنتا اپنے شوریدہ سر جذبات کو بوری سے سارادیے بانو کی تسلی و تشفی میں مصروف تھا۔

اب ہوش میں ہوتی تو اس کی آنکھوں سے خون آنسو بن کر ٹپکنے لگتا۔ اس طرح بے کل اور بے قرار ہو کہ پتھریلے در و دیوار بھی کانپ کانپ اٹھتے جیتاں تو اس کے ساتھ آنسو بہانے لگتی۔ روتے ہوئے اسے ی کوشش کرتی۔

ں کی سیلی گو بندی بھی بانو کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھنے لگی تھی۔ اک ناری کی ایسی بے حرمتی اس سے بھی ہو پاتی رونے دھونے سے بانو کا جی ہلکا ہو جاتا۔

کئی دن گزر گئے۔

ی کی ہمدردیوں۔ جیتاں کی محبت اور بسنتے کی دیکھ بھال سے بانو ہوش میں رہنے لگی۔ غم سینے میں کی طرح سلگ رہا تھا۔ جو پہاڑ اس پر ٹوٹے تھے۔ انھیں سہارا جانا آسان نہ تھا۔ پھر بھی انسان کی سخت سہار ہی لیتی ہے بانو کے غم بھی منجمد ہو گئے تھے۔ آنکھیں آنسو بہا بہا کر خشک اور ویران ہو چکی تھیں۔ حوصلہ اور ہمت ٹوٹ جائے تو ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگتی۔ ورنہ عام طور پر وہ مٹی کے پتھرائے جان بت کی طرح نظر آتی۔

وں کے گھور اندھیروں میں اگر کوئی چمک تھی تو وہ حسن کی ذات۔ لیکن یہ چمک بھی اس سوچ سے یلغار کی نظر ہو جاتی۔ کہ اب حسن پر اس کا کوئی حق تھا۔ یا کہ نہیں۔ اس خیال ہی سے اس کا سینہ

پھٹنے لگتا تھا اور اس پر مجنونانہ سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ وہ اپنے بال نوچ لیتی اپنی چھاتی پیٹ لیتی۔ گھائل دیکھنے کے قابل ہوتی۔

ایسے ناقابل برداشت لمحات میں اک گوبندی تھی۔ جو پورے خلوص کے ساتھ اس کا ساتھ دیتی تھی۔ جیتاں کو اب بانو سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ ہروقت نالہ و فریاد سن سن کر اس کے کان پک گئے تھے۔ وہ بھی اب بانو کے واویلے پر ناک بھوں چڑھاتی تھی۔

بسنتے تو بھی ذرا پاگل ہے اس پگلی کے یوں ناز نخرے اٹھاتا پھرتا ہے۔ یہ ٹھیک ہونے سے رہی۔ وہ واویلا کرتی ہے تو چار بے ہوشی کی۔ کیا کرے گا اسے۔ تو حامی بھر تو دیکھ۔ تیرے لئے میں کیسی خوب صورت لڑکی لاتی ہوں۔"

ماں میں تو بیاہ اسی سے کروں گا پہلے سے کافی بہتر ہو گئی ہے۔"

"مسلی سے بیاہ کرنے کا کیا فائدہ۔"

"تم نہیں جانتی ماں۔" اسے سکھ بنانے کے کارن مجھے کتنا ثواب ہے۔ گیانی جی کہہ رہے تھے سارے پاپ جھڑ جائیں گے۔ یہ دھرم کی سیوا ہے ماں۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن اس پگلی کو پلے باندھ کر سکھ کیا پاؤ گے۔"

"پگلی ٹھیک ہو جائے گی۔ کچھ دن اور صبر کرنا ہے بس۔"

بسنتے نے بڑے فریب سے بانو کو اپنے اعتماد میں لے لیا تھا وہ بھی ماضی کے چرکوں سے تڑپتی اور دلاسا دیتا تھا۔

"جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب تم کر بھی کیا سکتے ہو۔ تم بہت عظیم ہو۔ تمہارے گھر والے جنت میں ہیں۔ تم ایک بہادر قوم کی بیٹی ہو۔ تم لوگ اپنے عزم کے لئے کٹ مرے۔ رو دھو کر اس قربانی کو نہ بنایا کرو۔ تمہارے شہیدوں کی روحیں اس طرح تڑپ جایا کرتی ہیں۔ تم ان روحوں کا چین نہ گنوا۔

بانو بسنتے کی باتیں غور سے سنتی اور پہروں اس کے بارے میں سوچتی رہتی۔ واقعی وہ ایک بہادر تھی۔ جس نے اپنے عزم کے لئے اتنی بڑی قربانی دی تھی۔ موت سب کو آنا ہوتی ہے۔ لیکن عظیم ہے وہ کسی مقصد کے حصول میں آئے۔ بانو کے ذہن میں بسنتے کی باتیں بیٹھ جاتیں۔ ان باتوں کو سہارا ان باتوں سے ملتا۔ جو وہ وقتاً فوقتاً بانو سے کہتا رہا کرتا تھا۔ ان باتوں کی گونج بانو کے ذہن میں بار بار اٹھنے لگی۔

بسنتے نے سب سے بڑا فریب بانو کو یہ کہہ کر دیا تھا۔ کہ وہ اسے پاکستان پہنچا دے گا۔

کب پاکستان پہنچاؤ گے مجھے۔" وہ بے قرار ہو کر پوچھتی۔

"ابھی راستے محفوظ نہیں ہیں۔ تم فکر نہ کرو جوں ہی راستے کھل گئے میں خود تمہیں پاکستان چھوڑ

اچھے ہو۔" بانو کی نظریں اظہار تشکر سے بوجھل ہو جاتیں۔ میں کیا میری قوم تمہاری احسان مند

سان مندی کا کیا سوال۔ یہ انسانی تقاضا ہے۔ لیکن تم پاکستان جاؤ گی کس کے پاس۔"

وہاں محسن ہے۔ وہ رندھے ہوئے گلے سے جواب دیتی لیکن پھر خود اپنے حوصلے کو تقویت دیتے ہوئے پاکستان میں میری قوم بستی ہے؟ وہاں ایک نہیں میرے لاکھوں بھائی ہیں۔ وہاں میں اکیلی نہیں رہوں

ایک ماہ یونہی گزر گیا اب رت کافی بدل چکی تھی بانو بھی کچھ اپنے آپ میں آ چکی تھی تقدیر پر شاکر بھی کر رہی تھی۔ پاکستان پہنچنے کی لگن کے سہارے زندگی سے سمجھوتہ کر رہی تھی۔ بسنتے میں وہ پوری طرح آ چکی تھی۔

اب بیاہ کی تیاریوں میں لگ گیا تھا۔ چوپال پر گاؤں کے بزرگوں سے صلاح مشورہ کرتا رہتا۔ گیانی جی میں حاضر ہو کر بھی شبھ گھڑی کے بارے میں پوچھتا رہتا۔ گاؤں والے بے انتہا خوش تھے۔ وہ بیاہ کی تیاریاں بڑے ٹھاٹھ سے کر رہے تھے۔ یہ بیاہ نہیں ایک مذہبی فریضہ تھا۔ جسے بڑی اہمیت دے تھا۔

گاؤں کے ایک معتبر گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس کا باپ کھاتا پیتا آدمی تھا۔ ایک بھائی تھا جو پڑھنے کے لئے تھا۔ ماں بچپن میں مر گئی تھی۔ باپ بیٹی بڑے سے گھر میں بڑے سکون سے رہتے تھے۔ اس کا باپ بڑا تھا۔ جب سے بسنتے نے بانو کو گھر میں ڈال رکھا تھا؟ وہ اس بدنصیب لڑکی کے متعلق اکثر سوچتا رہتا کو بھی اس نے بانو سے دوستانہ مراسم قائم کرنے کی تاکید کی تھی۔ اس کشتہ غم کو سہارا دینے کے لئے کہتا رہتا۔

گاؤں میں بانو کو سکھ بنا کر بسنتے کی دھرم پتنی بنانے کے چرچے زوروں پر تھے۔ گوبندی نے بھی اپنے بات سنی۔ شک تو انہیں پہلے تھا لیکن یقین نہ تھا بسنتے نے بانو سے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی کو تقویت پہنچاتی۔

اب بات ڈھکی چھپی نہ رہی تھی۔ گوبندی کی ہمدردیاں بانو سے بہت زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ اور ایک دن گوبندی سے کہہ رہی تھی۔

"گوبندی میں پاکستان جا کر تمہیں نہیں بھولوں گی۔ میرے زخموں پر تم نے جس ہمدردی اور محبت سے ہیں۔ وہ میں بھول نہیں سکتی۔ بسنت سنگھ کے احسان بھی بھلا نہ سکوں گی۔"

"بانو" گوبندی نے اس کی بات اچک لی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔

"گوبندی" بانو حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ کیا بات ہے گوبندی۔ اب تو میں نہیں روتی ... چکی ہوں۔"

گوبندی نے آنسو پونچھتے ہوئے بانو سے بسنتے کے ارادے کا ذکر کر دیا۔

"نہیں" نہیں گوبندی نہیں۔ تو غلط کہتی ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔" پاگلوں کی طرح ... جھنجھوڑ ڈالا۔ قریب تھا کہ وہ پھر ذہنی توازن کی حدود پھلانگ جاتی۔ کہ گوبندی نے اس کے گلے میں ... دیں۔ اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

بانو گوبندی آہستہ آہستہ بولی۔ "بسنتا بڑا چالباز آدمی ہے۔ گاؤں کا نام نہاد غنڈہ تھا ... خون بہا کر اب بڑا معتبر بن بیٹھا ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ فریب ہے۔ جھانسا ہے"۔ وہ تمہیں سکھ بنا کر تم سے شادی کرے گا ... اس ایک شادی کی خوشیاں منانے کی تیاری کر رہا ہے۔

"گوبندی۔" بانو کا دماغ ایک دم تپنے لگا۔

"حوصلہ نہیں ہارو۔ بانو۔ ہمت سے کام لو۔ کسی نہ کسی طرح یہاں سے نکل جاؤ بس ایسے ... ہے۔" "لیکن جاؤں گی کہاں گوبندی بانو نے اس کرب سے کہا۔ کہ گوبندی بولی۔ باپو کہہ رہے تھے ... اغوا شدہ لڑکیوں کے چھٹکارے کے لئے پاکستان سرکار نے آدمی بھیجے ہیں۔ بانو کا سر چکرانے لگا ... سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں جواب دے چکی تھیں۔ گوبندی اسے فرار کی راہیں بتانے لگی۔ لیکن ... کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی اس کا جی چاہا۔ حسن کو چیخ چیخ کر پکارے۔ اتنی زور سے کہ اس کی چیخیں ... کی حدیں توڑ کر حسن تک پہنچ جائیں اسے یاد آ رہا تھا۔ حسن سے بچھڑنے سے پہلے وہ کس طرح ... روئی تھی۔ کوئی چیز اس کے اندر ٹوٹ رہی تھی۔ اسے یوں لگا تھا حسن اس سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ رہا ... ہے اس نے کہا تھا "مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ حسن حسن" "حسن" وہ بے تاب ہو ہو کر پکا... اس کا دماغ پھٹنے لگا۔ اس کے اور حسن کے درمیان صدیوں کے فاصلے حائل ہو گئے تھے۔ گوبندی ... تسلیاں دینے لگی۔ لیکن اب وہ ان حدود سے بہت دور جا چکی تھی۔

فرار ہونے کی کوشش ناکام ہو گئی۔ گھر سے نکلنے میں تو بانو کامیاب ہو گئی۔ لیکن دھنی رام کے کھیتوں کو سر دوڑ کر عبور کرتے وہ پکڑی گئی۔ دھنی رام نے اسے بالوں سے پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے بسنتے کے گھر لے گیا۔ بانو کی چیخیں سن سن کر کئی اور لوگ بھی جمع ہو گئے تھے۔ بسنتے کی ماں ابھی ابھی گائے کا دودھ دوہنے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس کا باپ چوکی پر بیٹھا مالا جپ رہا تھا۔ گورو گرنتھ کی بانیاں اونچی آواز میں پڑھ رہا تھا۔ وہ آپ ہی آپ جھوم رہا تھا۔ گورو انگر جی کے اس اشلوک کو وہ بار بار دہرا رہا تھا۔

سر سائیں نہ نویں سو سر دیجے ڈار
جس پنجر میں رہا نہیں سو پنجر لے جار

بسنتا ابھی نیند سے بیدار نہیں ہوا تھا۔ اس کی بھاوج مکھی چولہے چوکے کے گرد ہو رہی تھی۔ جیتاں ابھی لیٹی پڑی تھی۔

اچانک لوگوں کے شور سے جیتاں نے چار پائی سر سے اٹھا کر دیکھا۔ دھنی رام کسی کو گھسیٹتا ان کے دروازے تک لے آیا تھا شور سن کر مائی جیونی اور مکھی دروازے کی طرف بھاگیں۔

"......" مائی جیونی نے بانو کو حیرت سے دیکھ کر کہا۔

"بھاگ نکلی تھی تیری بہو جیونی۔" دھنی رام نے دھکا دے کر بانو کو مائی جیونی کے قدموں میں گرا دیا۔

"ہے گرو۔" مائی جیونی اور مکھی کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

"وہ تو اتفاق سے میں کھیتوں میں تھا جو اسے پکڑ لیا ورنہ بھاگ نکلی تھی۔" دھنی رام نے بسنتے کے باپ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

مائی جیونی نے گندی گالیوں سے بانو کو ڈانٹتے ہوئے اسے بازو سے گھسیٹتے صحن کے عین وسط میں لا گرایا۔ شور سے بسنتے کی آنکھ بھی کھل گئی۔ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا صحن میں کافی لوگ جمع ہو گئے تھے۔ شور و غل تھا۔ بسنتا پہلے تو کچھ سمجھ نہ سکا۔ حیران ہو ہو کر لوگوں کو دیکھتے ہوئے آنکھیں ملنے لگا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے"۔ ڈاڑھی بھی بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی تھی۔ خوفناک سی شکل لئے وہ چارپائی سے اٹھا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے انگڑائی لے کر پوچھا۔

"تیری جورو بھاگ گئی تھی بسنتے۔ کسی نے ہنس کر کہا۔

"کیا؟" وہ تقریباً چیخ اٹھا۔

"وہ جو مسلی گھر میں ڈال رکھی ہے بھاگ گئی تھی۔ آج بھلا ہو لالہ دھنی رام کا۔ جس نے پیچھا کر کے اسے پکڑا تھا۔ ورنہ نکل گئی ہوتی۔ تیرے ہاتھوں سے۔" کسی نے چڑ چڑا کر کہا۔

"بھاگ گئی تھی۔ ؟ بھاگ کے کہاں جا سکتی ہے۔" وہ اٹھ کر ادھر ہی آ گیا۔

مائی جیونی بانو کے بال پکڑے جھنجھوڑ کر کہہ رہی تھی تیرے نخرے دیکھ دیکھ کر تجھے سر پر چڑھا لیا ہے۔ دیکھ تجھے کیسے سیدھا کرتی ہوں۔"

مائی جیونی نے ایک دوہتڑ بانو کی کمر پر مارا۔ اور ننگی اور اخلاق سوز گالیاں بکنے لگی۔ بانو مٹی کے بے حس تودے کی طرح تھی۔ ماں نے دوسرا دوہتڑ مارنے کو ہاتھ اٹھایا۔

"ٹھہر ماں۔" بسنتے نے ماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"چل بے جا۔ تو نے ہی اس کا دماغ خراب کر دیا ہے ناز برداریاں کر کے۔ یہ اس طرح تیرے پاس نہیں ٹکنے کی۔ چکمہ دے کر بھاگ جائے گی۔" مائی جیونی نے ہاتھ چھڑا کر قہر آلود نظروں سے بانو کو دیکھ کر پاؤں کی ٹھوکر لگائی۔

بسنتے نے بانو کا ہاتھ پکڑ زمین سے اٹھایا۔ "ویرو۔ بہنو۔ تم سب جاؤ میں اس سے خود ہی نپٹ لوں گا" بسنتے نے لوگوں سے کہا۔ پھر لالہ دھنی رام سے پوچھا یہ کدھر جا رہی تھی؟

"بڑی سڑک کی طرف" لالہ دھنی رام نے کہا۔ "میری نظر پڑ گئی۔ میں نے بڑی ہمت کی تم جانتے ہو اس عمر میں دوڑ کہاں جا سکتا ہے لیکن بھگوان کی کرپا ہوئی میں نے اسے پکڑ ہی لیا۔"

لالہ دھنی رام کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بسنتے نے بانو کو بازو سے پکڑ کر کھینچا۔ سامنے والی کوٹھڑی میں لے گیا۔ اسے چارپائی پر دھکا دیتے ہوئے دروازہ بند کر لیا۔ کچھ لوگ تو بسنتے کے کہنے پر چلے گئے تھے۔ کچھ کوٹھڑی کے دروازے سے کان لگا کر کھڑے ہو گئے کچھ کھڑکی کی سلاخیں پکڑ کر اندر جھانکنے لگے۔

بسنتے کو بانو کی حرکت پر اشتعال تو بہت آیا تھا۔ لیکن غصہ پی کر اس نے صرف دھمکی سے کام لیا۔ میں نے تو تجھے چھوڑ دیا ہے لیکن یاد رکھنا پھر کبھی ایسی حرکت کی۔ تو جان سے مار دوں گا۔"

"وہ دن میری رہائی کا ہو گا۔" بانو نے بڑے صبر و تحمل سے جواب دیا۔

"اچھا یہ بات ہے۔ تو یاد رکھ تجھے میں لمحے لمحے کی موت ماروں گا۔ پھر بھاگنے کی سزا بڑی کڑی ہو گی۔ اچھی طرح سوچ سمجھ لے۔"

"سب سوچ لیا ہے۔"

"تیرے ارادے خطرناک ہیں۔"

"تیرے ارادے بھی کم خطرناک نہیں" بانو غرائی "میں نے تجھ پر بھروسہ کیا تھا۔"

"اور تجھے پتہ چل گیا ہے میں تجھ سے شادی کروں گا۔"

"تیرا یہ خواب کبھی پورا نہ ہو گا۔"

"دیکھ لوں گا۔"

"میں مسلمان لڑکی ہوں بسنتے۔ میں موت سے نہیں ڈرتی۔"

"میری مرضی کے بغیر تو مر بھی نہیں سکتی۔ یہ اچھی طرح جان لے۔"

"سب جان لیا ہے۔"

بسنتے نے اس دن صرف پھنکار اور دھمکیوں ہی سے کام لیا۔ لیکن بانو کے لئے زندگی عذاب سے کم نہ تھی۔ خود کشی حرام سہی لیکن اس عذاب سے چھٹکارا کی یہی راہ تھی۔ اپنی آبرو اپنے عقائد اور اپنے ایمان کے لئے جان پر کھیل جانا خود کشی نہیں۔ یہ موت کی عظمت ہے۔ بانو اس عظمت سے ہمکنار ہونے پر ذہنی جسمانی اور روحانی طور پر تیار ہو گئی۔

لیکن فرار کی طرح خود کشی کی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ تقدیر نے جانے کس وقت کا بدلہ بانو سے لینا تھا۔ وہ عصمت مآب لڑکی کی رسوائیوں کے سامان کر رہی تھی۔ موت کے سامنے بھی راستہ روک کر کھڑی ہو گئی تھی۔

ایک بار نہیں بانو نے تین بار خود کو ہلاک کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ناتواں سی لڑکی ایسی سخت جان تھی۔ کہ ہر بار بچالی گئی۔

بانو پر مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ مائی جیونی تو اس سے جیسے کسی پچھلے جنم کا بدلہ لینا چاہتی تھی۔ لاتوں مکوں اور گھونسوں سے ادھ موا کر دیتی۔ بسنتا بھی رواداری اور محبت کا چولا اتار کر درندہ بن گیا تھا۔ بانو کو جانوروں کی طرح زدوکوب کیا۔ اتنا مارا کہ اس کے سپید بدن پر نیل ہی نیل پڑ گئے۔ اسی مار پر ہی اکتفا نہ کیا۔

دوسری بار جب بانو بھاگتے ہوئے پکڑی گئی تو لوہے کی سلاخیں گرم کر کے اس کے پاؤں کے نازک اور
داغ دیا۔

نکمی اور جیتاں بھی اُس سے نفرت کا برملا اظہار کرنے لگی تھیں۔ گالیاں بکنا ان کا معمول بن گیا تھا۔

وہ بانو جو ایک معزز گھرانے کی پاکباز بیٹی تھی۔

وہ بانو جو نصیر الدین کی آنکھوں کا نور تھی۔

جو بی بی کے کلیجے کی ٹھنڈک تھی۔

جو بھائیوں کے وقار کی علامت تھی۔

جو عزیزوں کے مان کا نشان تھی۔

اور جو حسن کا پیار تھی۔ عشق تھی امانت تھی۔ غیروں کے ہاتھوں اذیتیں سہہ رہی تھی۔ ......
موت مر رہی تھی۔ کس لئے؟ صرف اس لئے کہ وہ مسلمان تھی۔ اور مسلمان قوم نے اپنے لئے ایک
حاصل کر لیا تھا۔ یہ مسلمان ہونے کی سزا تھی۔ یہ اس خطہ ارضی کے حصول کے جرم کی پاداش تھی۔
ہونٹوں پر چپ کی مہر لگ گئی تھی۔ بڑے سے بڑے عتاب پر بھی اس کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلتا تھا۔ اسے
جانی کا یقین ہو گیا تھا۔ خاموش نظریں خلا میں جمائے ماضی کے دھندلکوں میں کھوئی رہتی۔

ماضی! جو زندگی سے بھرپور تھا۔ جو خوشیوں کا گہوارہ تھا۔ جس میں اس کا ایک پر سکون ماحول
گھر تھا۔ جس میں اس کی معصوم اور پاکیزہ محبت تھی۔ اس کے مستقبل کے سہانے اور دلفریب تصور تھے۔
اب یہ ماضی خون ہی خون تھا۔ بانو اب اس خون سے مانوس ہو گئی تھی اسکی آنکھوں سے اس خون کے
اشک نہ ٹپکا۔ اپنے گھر کے در و دیوار یاد کر کے اس نے بھی آہیں نہ بھریں۔ سلام ان در و دیواروں کو جنہوں
آن پر جانیں قربان ہوتے دیکھی ہیں۔ سلام اس لہو پر جو سات کروڑ مسلمانوں کے تحفظ کے حصار کی
مضبوط کرنے کو بہا تھا سلام ان شہیدوں کو جنہوں نے ظلم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مقابلہ
ہوئے جانیں دے دیں اور سلام ملت کی ان بیٹیوں پر جن کی عصمتیں پاکستان کی خاطر تار تار ہو گئیں۔

گاؤں کے گوردوارے پر سہ رنگا خالصائی جھنڈا لہرا رہا تھا۔ سورج کی تازہ دم کرنیں سنہری کلس سے پھسل کر گول گنبد پر پڑ رہی تھیں موسم بڑا ہی خوش گوار تھا۔

گاؤں کے لوگ رنگ برنگے نئے کپڑے پہنے گوردوارے کے اندر داخل ہو رہے تھے مردوں نے رنگ دار کرتے اور کلف والی پگڑیاں پہن رکھی تھیں عورتوں نے بھی جی بھر کر بناؤ سنگار کیا تھا۔ شادی بیاہوں والے گوٹے کناری سے چمکتے کپڑے پہنے تھے بچوں نے بھی رنگا رنگ لباس پہن رکھے تھے۔ بڑی بوڑھیوں نے بھی آج دوپٹے اتار کر کیسری گلابی اوڑھنیاں سر پر رکھی تھیں۔

کسی بہت بڑے مذہبی تہوار کا گمان ہوتا تھا۔ لوگ ہنس کھیل رہے تھے باتیں کر رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔ آج بانو کا مذہب تبدیل کروا کے اسے بسنتے کی دھرم پتنی بنایا جاتا تھا۔ گاؤں کے لوگ اکٹھے ہو چکے تھے لیکن ابھی تک بسنتا اور اس کے گھر والے نہیں پہنچے تھے۔ ہر کوئی انہیں کے متعلق استفسار کر رہا تھا۔

بسنتے کے گھر میں تیاری تو صبح ہی صبح ہو چکی تھی۔ آج مائی جیونی نے گوٹے والا کیسری جوڑا پہنا تھا۔ کبھی گلابی کپڑے تھے جیتاں نے بھی لوٹ مار میں آیا ہوا کامدانی کام سے جگمگ جگمگ کرتا سوٹ پہنا تھا۔ کانوں میں بڑے بڑے طلائی بالے اور ہاتھوں میں جڑاؤ کنگن پہنے اٹھلاتی پھر رہی تھی۔

بسنتے کے باپ نے بھی سپید کھدر کے بے داغ کپڑوں پر کیسری ململ کی کلف اور ابرک لگی پگڑی باندھی تھی لاٹھی بھی بسنتا اس کے لئے لایا تھا۔ بسنتے نے بھی جی کھول کر سج دھج نکالی تھی۔ فیروزی ریشمی لاچا ململ کا کرتا اور بسنتی پگڑی کے ساتھ پاؤں میں تلے والا دساوری جوتا تھا۔ شیشے اور تلے کے کام کی واسکٹ بھی پہنی تھی ریشمی دھاری دار انگرچھا بھی کندھے پر رکھا تھا۔ سب تیار تھے کچھ رشتہ دار عورتیں بھی صحن میں جگمگاتے اور رنگین ریشمی کپڑے پہنے پھر رہی تھیں۔ دیر صرف بانو کی وجہ سے ہو رہی تھی۔

گوٹے سے بھرا بسنتی جوڑا چارپائی پر پڑا تھا۔ زیور کے ڈبے بھی کھلے پڑے تھے۔ بانو دیوار کے ساتھ سر

بھبو ڈائنے زمین پر گری تھی۔ دو تین عورتیں جیتاں کے ساتھ اسے کپڑے پہنانے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن وہ ان کی کوشش کو بار آور نہیں ہونے دے رہی تھی۔ آج لبوں کی مہر خاموشی ٹوٹ گئی تھی۔ بانو کی آنکھوں سے خون اتر رہا تھا۔ وہ قریب آنے والی عورتوں پر وحشیانہ طور پر جھپٹ رہی تھی۔ عورتیں اپنا لباس اور زیور بچا کر پیچھے ہٹ جاتی تھیں۔

"میں مسلمان ہوں۔ میں مسلمان ہوں تم مجھے سکھ نہیں بنا سکتے۔ میں ایک خدا کو ماننے والی ہوں۔ میں رسول عربیؐ کی نام لیوا ہوں۔ میں کعبے کو سجدہ کرنے والی ہوں۔ تم مجھے سکھ نہیں بنا سکتے۔ تم مجھے سکھ نہیں بنا سکتے۔" وہ خونی شیرنی کی طرح گرج گرج کر چیخ رہی تھی۔ عورتوں پر جھپٹ رہی تھی وہ چیخیں مارتے پیچھے ہٹ گئیں۔

شور سن کر بسنتا اندر آگیا۔

"ابھی نہیں پہنے اس نے کپڑے" اس نے پوچھا

"نہیں"

"تم اتنی بہت ایک لڑکی سے نپٹ نہیں سکتیں"

"وہ لڑکی تھوڑا ہی ہے بلا ہے۔ دیکھو تو کس طرح کپڑے پھاڑنے کو دوڑ رہی ہے پاگل ہو رہی ہے بالکل۔ اسے قابو کرنا کونسا آسان ہے۔"

"تم ہٹو میں اس سے بات کرتا ہوں"

عورتیں ایک طرف ہو کر کھڑی ہو گئیں بسنتا بانو کے سامنے آگیا۔

بانو نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ اس کے بال بکھرے تھے۔ آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔

"بسنتے...... ! بسنتے...... ! تم...... ! تم مجھ پر اتنا ظلم نہ ڈھاؤ بسنتے...... میں مسلمان ہوں مجھے تم کیا دنیا کی کوئی طاقت بھی سکھ نہیں بنا سکتی۔"

بسنتے نے اک قہقہہ لگایا "اچھا اچھا یہ تو بعد میں دیکھیں گے۔ پہلے کپڑے پہن لو دیکھو تو کتنا خوبصورت جوڑا ہے تمہارے سہاگ کا۔"

بسنتے کے ساتھ اور عورتوں نے بھی قہقہہ لگایا۔ بانو پیچ و تاب کھا کر اٹھی۔ کپڑوں پر جھپٹی۔ بسنتے کے چھڑاتے چھڑاتے اس نے دوپٹہ نوچ لیا۔ دانتوں سے ہاتھوں سے ناخنوں سے دوپٹہ نوچتے ہوئے چیخی۔ یہ میرے سہاگ کا دوپٹہ نہیں ہے۔ وہ تو سرخ نگوں والا دوپٹہ تھا۔ سرخ سرخ نگوں والا...... دوپٹہ...... جسے حسن نے چھوا تھا۔ جسے حسن نے چھوا تھا۔ وہ چیختے ہوئے بار بار کہہ رہی تھی۔ یہ میرے سہاگ کا دوپٹہ نہیں ہے۔ وہ

...تھا۔ وہ تو سرخ تھا۔

"پاگل ہو رہی ہے بسنتے یہ تو!...... کسی طرح رام کرنے کی کوشش کرو۔ لوگ گوردوارے میں جمع ہو جائیں گے" بھاگ بھری نے بانو کی فریاد سے متاثر ہوئے بغیر کہا۔

بسنتے نے ایک دم رویہ بدلا۔ پیار اور محبت سے کام لینے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن بانو دیوانگی کے عالم میں پکار رہی تھی "۔ مجھے مت چھیڑو بسنتے!۔ مجھے مت کچھ کہو۔ مجھے چھوڑ دو۔ سکھ بنانے کا خیال چھوڑ دو۔ ظلم کر کے تم اپنی موت کو آواز دو گے۔ تم نہیں جانتے میں کس قوم کی غیرت ہوں۔ تا مجھو تم نہیں جانتے کہ وہ بہن ہوں جس کی فریاد پر دمشق کے ایوان لرزہ براندام ہو گئے تھے۔ لاکھوں میل سے محمد بن قاسم تڑپ کر اپنی بہن کی مدد کے لئے آیا تھا۔ ظلم کو یوں ہوا نہ دو۔ میرے پاکستان کے محمد بن قاسم تو اتنی دور بھی نہیں۔ مجھے اس طرح اذیت نہ دو۔ کہ میری چیخ ان کے کانوں تک پہنچ جائے۔"

دو ایک مرتبہ مرد بھی اندر آ گئے۔ بانو کی چیخ و پکار پر سب طنزیہ قہقہے لگا رہے تھے۔

"بکال بک بک بند کر" بسنتے نے بانو کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا "جانتے ہیں تیری قوم کو"

"بسنتے تو نہیں جانتا اس قوم کو۔ پاکستان میں میرے لاکھوں بھائی ہیں۔ یہ ظلم کی روداد ان تک جا پہنچی۔ تو بادل بن کر تم پر برسیں گے۔ تمہارے چہرے نوچ لیں گے۔ تمہاری آنکھیں نکال لیں گے۔ وہ ایک غیرت مند قوم کے بیٹے ہیں۔ اور غیرت مند قوم اس مٹی کی تقدیس کو فراموش نہیں کرے گی۔ جس پر اس کے شہیدوں کا لہو بہا ہے۔ جس پر اس کی بیٹیوں کی آبرو لٹی ہے۔ چنگاریاں پاکستان پہنچ چکی ہیں۔ راکھ دبی چنگاریوں سے ایسی آگ بھڑکے گی۔ جو تجھ ایسے ظالموں کو جلا کر خاکستر کر ڈالے گی۔ اس راکھ سے وہ قوت' وہ طاقت جنم لے گی۔ جو اپنے لہو کا انتقام لے گی۔ اپنی بیٹیوں کی رسوائیوں کا بدلہ لے گی۔ اس دن سے ڈر بسنتے 'اس وقت سے ڈر۔ کہا" بانو جوش میں بل کھا کھا کر بسنتے سے کہہ رہی تھی۔

مرد کھلکھلا کر ہنس رہے تھے۔ عورتیں دوپٹوں میں منہ چھپا چھپا کر قہقہے لگا رہی تھیں۔ یہ ہنسی اور یہ قہقہے بانو کے لاشعور میں دہکتے ہوئے انگارے بن کر چمک رہے تھے۔ شعور میں آگ بن کر بھڑک رہے تھے۔

"یہ اس طرح رام ہونے کی نہیں" ایک عورت نے کہا

"تم پھر تم ہی ہمت کرو بھابی" دوسری بولی

"بسنتے!...... تو اس کو ذرا قابو میں کر۔ ہم اس کے کپڑے تبدیل کر دیتی ہیں کب تک اس کے بول سنتے رہو گے۔ جوش میں آئی ہوئی ہے خود ہی ٹھنڈی ہو جائے گی"

"ہاں بسنتے" پہلی عورت کی تائید میں ادھیڑ عمر کی بھاگ بھری نے بھی طنزیہ ہنستے ہوئے کی "۔ ایسی ٹھنڈی ہو گی کہ یاد کرے گی" بسنتے نے بانو کو اپنے مضبوط بازوؤں میں پکڑ لیا۔ بانو تڑپی مچلی چیخی چلائی کچھ نہ بن پڑا

نحیف و ناتواں بانو اتنے قوی ہیکل بازو اُن کے خلاف کب تک جدوجہد کر سکتی تھی۔

جیتاں نے بانو کے بالوں میں کنگھی کی بھاگ بھری نے اس کی مانگ میں سندور بھرا۔ سہاگنوں نے اس پر دوپٹہ ڈالا۔ کافی جدوجہد کے بعد بانو کو دلہن بنا لیا گیا۔

بسنتے نے اسے بازوؤں میں جکڑ کر اٹھایا۔ کچھ ہی دیر بعد سب گوردوارے پہنچ چکے تھے کے دورے پڑ رہے تھے۔ اسے گورو گرنتھ کے چبوترے کے سامنے بٹھا دیا گیا۔

اونچے چبوترے پر گورو گرنتھ رکھا تھا۔ مور چھل جھلے جا رہے تھے گرنتھی سفید کلفدار پگڑی پہنے گلے میں ڈالے گرنتھ کے سامنے بیٹھا تھا شبد کیرتن ختم ہو چکا تھا۔ اب گوربانی کے پاٹھ کی آخری اشلوک پڑھ کو نہال کر رہا تھا۔

پاٹھ ختم ہوا گرنتھی انگوچھا گلے میں ڈال کر گورو گرنتھ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ سب لوگوں اس کی تقلید کی۔ بانو کو بھی بہت سی عورتوں نے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ اب ارداس شروع ہو گئی تھی۔

گرنتھی کی بھاری اور عقیدت سے لرزاں آواز گونج رہی تھی۔ لوگ ہاتھ جوڑے خاموش سے کھڑے پر ساتھ ساتھ چوب بھی پڑ رہی تھی۔ جس سے فضا مرتعش ہو جاتی تھی۔

"گورو نانک 'گورو گوبند سنگھ' چڑھدی کلا۔ تیرے بھانے سربت کا بھلا" کہتے ہوئے گرنتھی نے گورو گرنتھ کے آگے ماتھا ٹیک دیا۔ حاضرین بھی جھک گئے۔ اور گورو گرنتھ کے آگے ماتھا ٹیک دیا۔

اس کے بعد واہ گوروجی کا خالصہ اور شری واہگورو کی فتح کی صدائیں لہرائیں۔

"جو بولے سو نہال" کسی نے پاٹ دار آواز میں نعرہ لگایا۔

"ست سری اکال" حاضرین نے جوش و خروش سے جواب دیا۔

یہ نعرہ تین بار گونجا اور طبل پر چوٹ پڑتی رہی۔

اس کے بعد گاؤں کے ایک بوڑھے آدمی نے کھڑے ہو کر تقریر شروع کی۔ بسنتے کے کارہائے کو سراہا گیا۔ بسنت سنگھ زندہ باد کے نعرے گونجے۔ دھرم کا نام اونچا کرنے والے بسنتے کو ودھائیاں گئیں۔ گاؤں والوں نے پورے جوش و خروش سے بسنتے کو داد تحسین سے نوازا۔ اور ایک مسلمان لڑکی کو قبول کروانے پر مجنونانہ خوشی کا اظہار کیا۔ بانو کے حواس جیسے جواب ہی دے گئے تھے۔ کبھی تو چیخ چیخ کر اور کبھی چپ سادھ لیتی۔ گیانی امرت کا پیالہ لے کر آ گیا۔ بانو کو امرت چکھا کر سکھ بنایا جاتا تھا۔ لوگ سے دیکھ رہے تھے۔ شری واہ گورو کی فتح اور جو بولے سو نہال 'ست سری اکال کے نعرے گونج رہے تھے گیانی زبان شلوک پڑھ رہا تھا۔

بانو ہوش میں بے ہوشی اور بے ہوشی میں ہوش کی باتیں کر رہی تھیں۔ کبھی ہذیانی کیفیت طاری ہو جاتی

گی اور وہ بدھ کی باتیں کرنے لگتی۔ امرت ہونٹوں سے چھونے پر اس نے تڑپ تڑپ کر ہاتھ پاؤں مارے لیکن کو تاب آئی۔ اسے امرت چکھا دیا گیا۔ بانو کا نام سندر کور رکھا گیا۔

اور دل سے گوردوارے کے در و دیوار گونج اٹھے۔ ودھیاں دے دے کر زن و مرد ناچنے لگے۔ بسنتے کو لوگوں نے جوش مسرت میں کندھوں پر اٹھا لیا۔ بھنگڑا ڈالتے لوگ گوردوارے کے صحن میں نکل آئے۔ صحن میں پنڈال سجا تھا۔ اس کے نیچے پوتر اگنی جل رہی تھی۔ یہاں بیاہ کی رسم ادا ہونا تھی۔ بانو اور بسنتے نے آگ کے پھیرے لینا تھے۔ مہنت جی، راہنما اپنی اپنی جگہ پر آ بیٹھے۔ آگ میں ڈالنے کے لئے گھی اور دوسری چیزیں قریب رکھ لی گئیں۔ لوگ جوق در جوق یہ تماشا دیکھنے بھی آ کر بیٹھنے لگے۔

بانو کو کئی عورتیں گھیرے میں لئے باہر لائیں۔ کسی نے دوپٹے کو کھینچ کر بانو کا گھونگھٹ نکال دیا۔ بانو نے بے بسی کے عالم میں سر ادھر ادھر مارا۔

"سندر کور۔ یوں تو نہ کر۔ دلہن کا چہرہ ڈھانپ کر رکھا جاتا ہے" کسی منچلی نے بانو کے کان میں کہا "یہ چہرہ دولہا پہلے دیکھے تو اچھا ہے"

"بھابو ٹھیک کہتی ہے سندر کور" دوسری عورت نے آنکھ ماری۔

"میں سندر کور نہیں ہوں" بانو چیخی اس کا گلا بیٹھ چکا تھا بازوؤں سے عورتوں نے سختی سے تھام رکھا تھا۔ سر ادھر ادھر مار رہی تھی۔

"میں سندر کور نہیں ہوں۔ تم مجھے سندر کور نہیں بنا سکتے میں میں ہوں۔ تم اس میں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے۔ بانو کو سندر کور بنانے پر خوشیاں منانے والے احمقو۔ بانو تو اسی دن مر گئی تھی۔ جس دن تمہاری قوم کے درندوں نے اس کا مقدس بدن چھوا تھا۔ اب مٹی کے ڈھیر کو سندر کور بنا کر خوشیاں منا رہے ہو۔"

وہ کہتی رہی چیختی رہی چلاتی رہی۔ کسی کو اس پر رحم نہ آیا۔ کسی نے اس کے دل کا درد محسوس نہ کیا۔ بانو کا دوپٹہ بسنتے کے ساتھ باندھ کر آگ کے گرد پھیرے لگوا کر بانو کو اس کی دھرم پتنی بنا دیا گیا۔ بانو کا دل تڑپ تڑپ کر رہ گیا۔ لوگ مبارکیں دیتے بھنگڑا ڈالنے لگے۔ مٹھائی تقسیم ہوئی۔ کھانا کھلایا گیا۔ خوشیاں منائی گئیں۔

اور رات بانو کو بسنتے کے بھڑکتے جذبات کی سولی پر لٹکا دیا گیا۔ حسن کی امانت یوں سر عام لٹ گئی۔

"درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا" والی بات تھی وہ بانو سے سندر کور بن گئی تھی۔ اس کی
متعین راستے سے اچانک ہٹ کر دوسری ڈگر پر چل نکلی تھی۔ کر بیہ المنظر بسنتا جسے وہ روحانی
جسمانی طور پر تو گیا گوارا ابھی نہ کر سکتی تھی اس کے جسم کا مالک بن بیٹھا تھا۔ یہ افلاس زدہ کتا
بوٹیاں نوچتا اس کی ہڈیاں بھنبھوڑتا بانو اب ظلم کی دہائی دیتی۔ نہ رحم کی ملتجی ہوتی۔ آہ و فغاں
مرتعش کرتی۔ نہ چیخ و پکار سے در و دیوار ہلاتی۔ بعض اوقات ہم یوں بھی تو مر جاتے ہیں۔ سانس آتی
ہے۔ جسم حرکت بھی کرتا ہے۔ سنتے بھی ہیں۔ بولتے بھی ہیں چلتے پھرتے بھی ہیں۔ سوتے جاگتے بھی
زندگی نہیں ہوتی موت واقع ہو چکی ہوتی۔ بانو بھی جیتے جی مر چکی تھی۔ اس نے اپنا مرض بھلا دیا تھا۔ اس
محبت خون دل میں ڈبو دی تھی۔ اس کے حال سے اتنا خون بہہ رہا تھا۔ کہ اس کی نہیں ماضی کے
رہی تھیں۔

شاید وہ پاگل ہو گئی تھی۔ لیکن نہیں۔

ظلم تو یہی تھا کہ وہ پاگل بھی نہیں ہوئی تھی۔ موت اس پر اک تواتر سے برس رہی تھی بسنتا الگ
اس کی ماں بہنیں الگ مائی جیونی نے تو اسے کولہو کا بیل ہی بنا لیا تھا۔ پو پھٹنے سے رات کا دل ڈوب جانے
سے مسلسل کام لیتی گائے کا گوبر پتھواتی۔ کچے کمروں میں لیپی پوتی اسی سے کرواتی۔ میلے چکٹ
سے اٹے کپڑے اسی سے دھلواتی۔

بانو جس کا درد ساکت ہو چکا تھا۔ چپ چاپ سارے کام کرتی رہتی۔ بے روح کے وجود پر
اب جسم بھی زخموں سے چکنا چور ہو گیا تھا۔ نرم و نازک ہتھیلیوں سے ہر روز خون بہتا۔ پاؤں کے تلوے
ہوتے۔

مایوسی کے اندھیرے اتنے گہرے ہو چکے تھے۔ کہ امید کی کوئی چمک نظر نہ آتی تھی۔ اب تو

۔۔۔ دکھوں میں کسی طرح کی کمی نہ کر سکتی تھی۔ بچاری اسے دیکھ دیکھ کر گھونٹ گھونٹ ہی میں پی جاتی۔ ٹھنڈی آہیں

۔۔۔ اب اک سسکی تھی۔ اک نالہ تھا۔ اک بین تھی۔

۔۔۔ وں خلاؤں میں گھورتے سوچ میں ڈوبی رہتی۔ حواس مختل ہو جاتے۔ اب تو اس کے ذہنی فرار کی راہیں

۔۔۔ وہ تھیں۔ شاید اسی لئے بانو اپنے آپ کو اس ماحول' اس فضا میں سمونے کی کوشش کر رہی تھی۔

۔۔۔ ندر کور! اے سندر کور! وہ اکیلے میں اپنے آپ کو بلند آواز میں پکارتی۔

"ہی۔ کیا ہے؟" وہ اپنی پکار کے جواب میں خود ہی کہتی۔

"تو سندر کور ہے۔ یاد رکھ تو سندر کور ہے۔" وہ اپنے آپ کو سمجھاتی۔

"ہاں میں سندر کور ہوں۔ سندر کور ہوں۔ بانو نہیں ہوں۔ بانو نہیں ہوں۔ بانو نہیں ہوں۔" وہ کتنی دیر

۔۔۔ الفاظ دہرائے جاتی۔

۔۔۔ بھی وہ اس حرکت پر ہنس پڑتی اور کبھی کلیجہ پکڑ کر مسلنے لگتی۔

۔۔۔ الف ۔۔۔ فرار کے حیلے۔ یہ خود فراموشی کے بہانے۔

۔۔۔ وہ بدنصیب لڑکی اضطراب میں دل کو کیا کیا فریب دے رہی تھی۔ بانو سے سندر کور بن رہی تھی۔ وہ اس

۔۔۔ خلاؤں ۔۔۔ چاہتی تھی۔ جو خدا وحدہ' لاشریک کی پرستار تھی۔ جو محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت تھی۔ جو

۔۔۔ کی بیٹی تھی جو سلیم کی بہن تھی۔ اور جو حسن کی امانت تھی۔

۔۔۔ ان زخموں کا مداوا کبھی یوں بھی ہو سکتا ہے۔ جن سے مسلسل خون بہہ رہا ہے۔

۔۔۔ کیسے سنگین حالات رونپذیر ہو جائیں۔ وقت کا دم گھٹتا ہے۔ نہ اس کی رفتار میں کمی آتی ہے۔ بانو پر

۔۔۔ کے پہاڑ ٹوٹے تھے اور مسلسل ٹوٹ رہے تھے۔ وقت گزرتا ہی چلا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے ماضی پر

۔۔۔ کے پردے ڈال دیے تھے۔ اپنے عزیزوں کی برہنہ لاشوں پر جبر کی مٹی ڈال دی تھی۔ اس نے حسن کو

۔۔۔ مسلسل بہنے والے خون میں ڈبو دیا تھا۔ لیکن ان قربانیوں ان اذیتوں اور ان صعوبتوں نے اس کی سوچ

۔۔۔ بدل دیے تھے۔ وہ اکثر سوچتی۔ کہ یہ قربانیاں یہ اذیتیں یہ صعوبتیں کس لئے ہیں۔

۔۔۔ نے بہت جلد اسے ان کے نشانوں سے باخبر کر دیا۔ جس کے لئے وہ یہ سب کچھ سہہ رہی تھی۔

۔۔۔ کا ذہن ایک نقطے ایک مرکز کی طرف گھوم گیا تھا۔

۔۔۔ وہ لفظ پاکستان تھا۔ وہ مرکز دولت خداداد پاکستان تھا۔

وہ اپنی روحانی اور جسمانی اذیتوں سے پاکستان کی عظمت کا اندازہ کرنے کی کوشش کرتی۔ اس کے کانوں

۔۔۔ ن کے الفاظ گونجنے لگتے۔ وہ الفاظ جو وہ پاکستان کے تصور کے ساتھ اس کے ذہن نشین کراتا رہا تھا۔

اب بانو کا ذہن اسی سوچ کی طرف منتقل ہو چکا تھا۔ وہ اس پناہ گاہ کے خیال میں گھنٹوں کھوئی رہتی
ارض مقدس کے تصور سے پہروں حظ اٹھاتی رہتی۔ اور پھر جیسے اسے جینے کا گر ہاتھ آ گیا۔ صعوبتوں
اور اذیتوں کے مہیب اندھیروں میں بھی وہ زندہ رہنے کی تمنا کرنے لگی۔

یہ تمنا صرف اس تمنا پر مبنی تھی۔ کہ وہ پاکستان دیکھنا چاہتی تھی۔

وہ ایک نظر اس مقدس زمین کو دیکھنا چاہتی تھی۔ جس کے لئے مال و زر' جان و آبرو کی اتنی فراوانی سے
دی گئی تھی۔ پاکستان وہ خطہ ارضی ہے، جو اس کے سات کروڑ افراد کے خاندان کا مسکن تھا۔ وہ
اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ وہ زمین کا ٹکڑا جس کے لئے قوم آگ اور خون کے طوفانوں سے
تھی۔ وہ حصار جس کے لئے لاکھوں گھر راکھ کا ڈھیر بن گئے تھے۔ وہ پناہ گاہ جس کے لئے ملت کی
بیٹیاں سکھوں کے بستروں کی زینت بن گئی تھیں۔ وہ عظیم ملک جس کے لئے بانو بانو نہ رہی تھی۔
تھی۔ بانو اس پاکستان کو دیکھنے کے لئے تڑپنے لگی۔ حوادث کا مقابلہ کرنے لگی۔ افلاس زدہ
بدن تیز ہو رہی تھی۔ مائی جیونی کا عتاب خوفناک ہوتا جا رہا تھا۔ جیتاں اور کبھی ظلم توڑنے میں بہت آگے
تھیں۔ لیکن بانو کے دل میں ایک لگن تھی۔ اک عزم تھا۔ اک آرزو تھی۔ اور جوں جوں اس کے
رہے تھے۔ اس کا عزم' آرزو اور لگن شدت اختیار کر رہے تھے۔

اس کے ہونٹوں کی جامد خاموشی اب ٹوٹ چکی تھی۔ بسنتا یا گھر کا دوسرا فرد مسلمانوں کے متعلق
بھی منہ سے نکالتا۔ تو وہ بھوکی شیرنی کی طرح غرانے لگتی۔ پاکستان کو کوئی اشارۃً بھی برا کہتا تو اس کی آنکھوں
خون اتر آتا۔

"میں پاکستان جاؤں گی۔ پاکستان۔ پاک لوگوں کا پاک وطن۔" وہ دیوانگی کے عالم میں جھوم جھوم
کہتی۔

"پاکستان!" بسنتا اس کے جنون پر کھلکھلا کر ہنس دیتا۔ "جیتے جی تو تجھے چھوڑنے کا نہیں
کر ہی جائے گی پاکستان۔ تیری روح ہو آئے گی۔ وہاں۔"

"مر کر؟" بانو خون اگلتی نظروں سے اسے دیکھتی۔ "میں جیتے جی جاؤں گی۔ جیتے جی۔ دیکھ
اس وقت تک نہیں مروں گی۔ جس وقت تک اس مقدس خاک کو اپنی آنکھوں سے نہ لگاؤں گی۔
بھی تو میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مرنے سے انکار کر دوں گی۔ سمجھے......"

"وہاں کرے گی کیا۔ تجھے کون منہ لگائے گا۔ کوئی تھوکے گا بھی نہیں تجھ پر۔" بسنتا آنکھوں میں
آگ سمیٹے قہقہہ لگاتا۔

"مجھے کون منہ نہیں لگائے گا؟" بانو پیچ و تاب کھا کر غراتی۔ "تو نہیں جانتا بسنتے میں اپنی قوم کی

[illegible] پھالا ہوں۔ جسے دکھ جانے کے ڈر سے وہ انتہائی احتیاط اور حفاظت سے سنبھال کر رکھے گی۔ [illegible] تو اس زخم کا علامتی نشان ہوں۔ جو میری ملی ہستی کے وجود پر تم درندوں نے لگایا ہے۔ میں تو اپنی قوم کے [illegible] کا وہ خون آلود کرتا ہوں جو اس نے اس وقت تک نہیں اتارا تھا جس وقت تک جے پال سے انتقام [illegible] لیا تھا۔ مجھے۔ میری اہمیت میری قوم سے پوچھنا۔"

[illegible] آلود آنکھوں میں قہر و طوفان لئے وہ بسنتے سے کہتی۔ اور جب بسنتا اس کے پاگل پن پر باچھیں [illegible] جا کر بھدے بھدے قہقہے لگاتا۔ تو اس کا خون کھول اٹھتا۔

"ذلیل کتے" وہ اس پر جھپٹ پڑتی۔ اس کے ہاتھ بسنتے کی گردن کی طرف اٹھتے وہ اس کا گلا اپنے [illegible] اس طرح دبانا چاہتی۔ بسنتے کی زبان باہر نکل آئے۔ آنکھیں ابل پڑیں اور وہ تڑپ تڑپ کر [illegible]

بسنتا ایک ہی دھکے سے اسے پرے گرا دیتا۔ کبھی قہقہہ لگا کر اور کبھی ماں بہن کی ننگی گالیاں بک کر اسے [illegible] اس حرکت کی سزا دیتا۔

لیکن بانو کے دل میں بسنتے کی شاہ رگ اپنے انگوٹھوں سے دبا دینے کا جذبہ دن بدن تقویت پاتا گیا۔ [illegible] کی عظمت پر کٹ مرنے کے لئے وہ ایک بار پھر تیار ہو گئی۔ بسنتے سے اس کی اس بات پر اکثر جھگڑا رہنے [illegible]

بانو کو اب اپنے وجود پر مان تھا۔ یہ وجود نہیں تھا۔ جس کی اذیت ہر پاکستانی کے دل میں ہو گی۔ یہ وجود نہیں [illegible] تھا۔ جو عظیم اسلامی مملکت میں بسنے والے ہر فرد کے دل میں سو بل کھا کر اٹھ رہا ہو گا۔ [illegible] کی حرمت پر کٹ مرنے والے بھائی کیا اسے بھول جائیں گے؟ نہیں۔ وہ جب پاکستان جائے گی۔ تو [illegible] ان باز تڑپ اٹھیں گے۔ وہ درندوں سے انتقام لینے کو ٹوٹ پڑیں گے۔

[illegible] کا مان روز بروز تقویت پکڑتا جا رہا تھا۔

بسنتا اس کی باتوں پر طنزیہ قہقہے لگاتا۔ تو اسے مار ڈالنے کا خونی جذبہ بانو کے دل میں کروٹیں لینے لگتا۔ [illegible] انگلیوں اور انگوٹھیوں میں بے چینی تڑپنے لگتی۔ آنکھوں میں خون اتر آتا۔

موسم بے حد حسین تھا۔ اونچی اونچی پہاڑیوں کا سینہ سبزے سے ڈھکا تھا اونچے اونچے گھنیری چھاؤں والے درخت سینہ تانے کھڑے تھے۔ خودرو پھول سبزے کا حسن بڑھا رہے تھے۔ کہیں کہیں ننگے پتھروں کی سبزے میں گھلی ملی بڑی ہی حسین نظر آتی تھی۔ ایک اونچی پہاڑی کے بطن سے قلقل کرتا چشمہ یوں پھوٹ رہا تھا جیسے سیال چاندنی بہہ رہی ہو۔ یہ چاندنی اک پتلی لمبی لکیر بن کر گول گول پتھروں سے ٹکراتی نشیب کی طرف جا رہی تھی۔ ہوائیں عطر بیز تھیں۔ ہر طرف سریلے نغموں کی لے پھیلی ہوئی تھی۔ فضا نورانی تھی۔ ہر سُو نور برس رہا تھا۔

اپنی بیمار روح کو بے چینیوں سے ہم کنار کیے حسن اس خوبصورت ماحول ڈانواڈول پھر رہا تھا۔ وہ بانو کا پتہ پوچھ رہا تھا۔ اک اک پھول سے بانو کی خبر مانگ رہا تھا مایوسی احاطہ کیے ہوئے تھی۔ کبھی ننگے کالے پتھر پر بیٹھ کر ٹھنڈی آہیں بھرنے لگتا۔ کبھی سبزے پر مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگتا اور کبھی عالمِ دیوانگی میں اس کی آواز بن کر فضا میں بکھرنے لگتا۔

"بانو...... بانو" اس کی بلند آواز پہاڑیوں سے ٹکرا کر لوٹتی۔

کتنی ہی دیر وہ یوں آوارہ پھرتا رہتا۔ کبھی ایک پہاڑی کے سینے پر پھیلے نرم نرم سبزے کو لتاڑتا۔ کبھی کے دامن میں پھیلے ہوئے پھولوں اور کانٹوں سے الجھتا۔ چاندنی کی لکیر نشیبی علاقے کی طرف بہتے ہوئے پانی بھی ہو گئی تھی۔ حسن گھومتے گھومتے اس جگہ جا پہنچا۔ جہاں اس پھیلی ہوئی چاندنی کے دو رویہ جھومتے درخت تھے۔ درختوں کے سینوں سے لپٹی ہوئی آوارہ بیلیں تھیں اور سبز گھاس کے غیر ہموار فرش پر رنگے پھول نگینوں کی طرح جڑے تھے۔

حسن آنکھیں بند کیے پانی کے کنارے کھڑا تھا۔ اچانک اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی پانی میں اتر رہا ہے۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ دوسرے کنارے پر سفید جھلملاتے ریشمی لباس میں کوئی ا

...الی میں ہاتھ مار رہی تھی۔

وہ اس کا چہرہ تو نہیں دیکھ سکا۔ لیکن یہ وجود اسے مانوس سا لگا۔ یہ انداز جیسے اس کا دیکھا بھالا تھا۔ کسی ...انجانی کشش سے وہ اس وجود کی جانب کھنچا۔ لیکن حسینہ نے ہاتھ کے اشارہ سے اسے روک دیا۔ وہ اپنا ...چہرہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔

"بانو!" حسن پوری قوت سے چیخا۔ وہ بانو تھی۔ سفید ملکوتی لباس میں۔ اس کا چہرہ نورانی تھا۔ نور کا ہالہ ...بانو کے گرد صاف طور پر نظر آرہا تھا۔ وہ صاف اور شفاف پانی میں ہاتھ ڈال کر وضو کر رہی تھی۔

حسن کے پاؤں جیسے زمین میں گڑ گئے۔ ندی کا پانی کوئی گہرا نہیں تھا۔ پھر بھی وہ آگے نہ بڑھ سکا۔

"بانو۔" اس نے وہیں کھڑے کھڑے تڑپ کر ہاتھ پھیلا دیئے۔

بانو کے چہرے پر فرشتوں کی سی پاکیزہ مسکراہٹ تھی۔ یہ مسکراہٹ حسن کی جانی پہچانی تھی۔ وہ تڑپ تڑپ ...لیکن زمین میں گڑے پاؤں کی جنبش نہ ہو سکی۔

"بانو...... میری جان۔ میری زندگی...... میری روح" حسن نے دونوں بازو پھیلا دیئے۔

بانو دوسرے کنارے پر کھڑی تھی۔ اس کے سفید لباس کی ملکوتی سرسراہٹیں حسن اس کنارے پر بھی محسوس ...تھا۔ وہ دوڑ کر اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لینے کو بے چین تھا۔ بانو نے پھر ہاتھ کے اشارے سے اسے رکنے کا ...

"بانو۔ تم خود ہی آجاؤ بانو...... میرے صبر کو اور نہ آزماؤ۔ خود ہی آجاؤ۔" وہ ہاتھ عالم اضطراب میں ...بے چینی سے بولا۔

"ابھی نہیں۔ حسن" بانو پہلی بار اس سے ہم کلام ہوئی۔ اس آواز کے جادو سے وہ بخوبی آشنا تھا۔

"پھر کب؟"

"اب وقت آئے گا۔"

"میں اور انتظار نہیں کر سکتا بانو۔"

"بے صبری اچھی نہیں ہوتی۔"

"میں مر جاؤں گا۔ تمہارے بغیر تڑپ تڑپ کر مر جاؤں گا۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"بانو۔"

"حسن مر جانا آسان ہوتا ہے۔ زندہ رہنا مشکل۔"

"صرف مشکل ہی نہیں۔ مشکل ترین۔ بانو۔"

"انسان وہی ہے جو مشکلات کا سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرے۔"

"میری ہمت ٹوٹ چکی ہے بانو۔ میرا حوصلہ میری ہمت تم تھیں۔"

"مجھے اب بھی اپنے ساتھ سمجھو حسن۔ تمہیں یاد ہے تم کہا کرتے تھے۔ حسن اور بانو ایک [illegible] ہیں۔"

"یاد ہے۔"

"تو پھر اب مجھے کیوں اپنے آپ سے الگ سمجھ کر ڈھونڈتے پھر رہے ہو۔ مجھے اپنے آپ [illegible] کرو۔"

"بانو......"

"حسن تم یوں دیوانوں کی طرح پھر کر وقت ضائع کر رہے ہو۔ اک آزاد قوم کے لئے ایک [illegible] ہوتا ہے۔ تمہیں اس بات کا احساس نہیں۔"

"بانو......"

"مجھے تمہاری حالت سے دکھ پہنچ رہا ہے۔ اک نئے ملک کو تمہاری کتنی ضرورت ہے لیکن تم [illegible] بھول کر کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ تم نے پاکستان بنانے کے لئے بڑی جدوجہد کی تھی۔ لیکن اصل [illegible] آیا ہے۔"

"میں کیا کروں بانو...... میں کیا کروں۔"

"تمہارے لئے ایک نہیں ہزاروں کام ہیں۔"

"کام کے لئے ہمت درکار ہے۔"

"بزدل نہ بنو۔"

"لیکن تمہارے بغیر۔"

"مجھے اپنے ساتھ سمجھو۔ میں تمہارے دل میں بس رہی ہوں۔ مجھے ان ویران اور سنسان [illegible] تلاش نہ کرو۔ پاکستان کو ایک ایک فرد کی انتھک محنت کی ضرورت ہے۔ تم اس بات کو بھول گئے۔ [illegible] مملکت کا کیا بنے گا۔ کام اور مسلسل کام حسن۔ یوں وقت ضائع کیا تو دولت خداداد پاکستان کا [illegible] گا۔ میرا خیال چھوڑ دو۔"

"بانو...... میں...... تمہیں پانا چاہتا ہوں۔ تمہیں چھونا چاہتا ہوں۔"

بانو نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کے چہرے پر اب مسکراہٹ نہیں بڑی متین اور سنجیدہ خاموشی تھی۔ [illegible] لمحے ایک ٹک اسے دیکھتا رہا۔

"بانو....."

"حسن ہماری محبت حوروں کی مقدس آنچلوں کی طرح پاکیزہ ہے۔ اسے جذبانیت کا رنگ دے کر ملوث نہ کرو۔ پاک محبت زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتی ہے۔"

"ہاں بانو۔" حسن دل پر ہاتھ رکھ کر عالم اضطراب میں اپنا کرتا مسلنے لگا۔

"اس پاک نور کی روشنی میں زندگی کے راستوں پر گامزن ہو جاؤ حسن۔ مجھے ہمیشہ اپنے آپ میں محسوس کرو اور تم دو نہیں ایک وجود کے دو نام ہیں۔"

"بانو۔"

"وعدہ کرو حسن۔"

"وعدہ کرو۔ تم اپنا وقت یوں ضائع نہیں کرو گے۔"

"میں ..... وعدہ ..... کرتا ..... ہوں ..... بانو"

بانو کے چہرے پر فردوسی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے اپنا پیازی ہاتھ فضا میں لہرا کر حسن کے وعدے کا خیر مقدم کیا۔

"بس مجھے تم سے صرف یہی وعدہ لینا تھا۔ اس وعدے سے منحرف نہ ہونا۔ اس وعدے کو اپنی جان سے بھی پیارا رکھنا حسن۔"

"اچھا۔ اچھا ..... بانو" حسن کے آنسو حلق میں اترنے لگے۔

"خدا حافظ" بانو نے اپنا نرم و گداز ہاتھ پھر لہرایا۔

"ابھی نہیں۔ بانو ابھی نہیں۔ کچھ دیر اور رک جاؤ۔" حسن نے گلو گیر آواز میں التجا کی۔ لیکن بانو نہیں رکی۔ وہ پشت موڑے چل دی۔

"بانو۔" حسن نے زور سے آواز دی۔ اب اس کے زمین میں گڑے پاؤں آزاد تھے۔ وہ تیزی سے بڑھا اور پانی میں دوڑتا دوسرے کنارے جا پہنچا ..... بانو آگے نکل چکی تھی اس کے ریشمی نورانی لباس کی سرسراہٹیں فضا میں مترنم سا شور بکھیر رہی تھیں۔

"بانو ..... بانو ....." چیختے ہوئے وہ بھاگا۔

بانو کے قدم زمین سے جدا ہونے لگے۔ وہ آہستہ آہستہ اوپر کو اٹھنے لگی۔ حسن رک کر اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ فضا کے نورانی سمندر میں تیرتے ہوئے اوپر ہی اوپر جا رہی تھی۔ یوں جیسے صاف و شفاف پانیوں میں پھسلتے جسم والی خوبصورت مچھلی تیر رہی ہوں۔

وہ نظروں سے تیزی سے دور ہوتی گئی۔ اس کا وجود اب ایک سفید نشان سا دکھائی دینے لگا۔ یہ نشان، سفید نشان فلک کی نیلاہٹوں میں پیوست ہو گیا۔ اور ایک روشن اور چمک دار ستارہ بن کر نورانی کرنیں چاروں طرف بکھیرنے لگا۔

ستارہ...... فلک کی نیلاہٹوں میں چمکتا ہوا روشن ستارہ۔

"بانو۔" حسن شدت کرب سے تڑپ کر زور سے چیخا۔

پلنگ کی پٹی پر بیٹھی ہوئی اماں اس پر جلدی سے جھک گئی۔ کانپتی آواز میں اسے پکارا۔ "حسن۔ حسن بیٹے۔ آنکھیں کھولو۔"

"حسن...... حسن......" حمید بھی کرسی پر بیٹھے بیٹھے اس پر جھک گیا۔ اماں اور حمید دونوں کے چہرے بے حد متفکر تھے۔

حسن نے آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا۔ پھر چھت پر نظریں جما دیں۔

"وہ ستارہ...... ستارہ۔"

"کیا ہے حسن؟" حمید نے اس کا کندھا پکڑ کر آہستہ آہستہ ہلایا۔ اماں کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

"ستارہ۔ کہاں ہے۔ ستارہ۔" حسن اپنے آپ سے بولا۔

"کوئی خواب دیکھا ہے حسن؟" حمید نے تولیے سے حسن کا پسینے سے تر بتر چہرہ صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"حمید بانو ستارہ بن گئی۔" حسن نے آنکھیں سختی سے بھینچ لیں۔ اماں ململ کے دوپٹے سے اپنی جل تھل آنکھوں کے گوشے پونچھنے لگیں۔

اب اماں اور حسن اس مکان میں آ گئے تھے۔ جو حمید نے بھاگ دوڑ کر کے الاٹ کروا دیا تھا حسن کی حالت ابھی تک اچھی نہ تھی۔ حمید دن میں دو تین بار خبر گیری کو ضرور آ جاتا تھا اس نے اماں کی منت سماجت تو بہت کی تھی۔ کہ فی الحال ان کے ہاں ہی قیام کریں۔ لیکن اماں اب ان پر بوجھ بننا نہیں چاہتی تھیں۔ حسن کی علالت کی وجہ سے گھر والوں کو تکلیف ہی ہونا تھی نا۔ اور یوں بھی پرائی جگہ اماں اپنے بچھڑنے والوں کا جی کھول کر ماتم نہ کر سکتی تھیں۔ اپنے گھر میں آزادی سے دل کھول کر رو سکتی تھیں۔ بین کر سکتی تھی۔ موت کی آغوش میں ابدی نیند سو جانے والوں کو یاد کر کے تڑپ سکتی تھی۔

حمید کی ماں اور بہنوں نے مل کر سارا اسامان کھولا تھا۔ اور ہر کمرے میں چیزیں ترتیب سے لگا دی تھیں انہی دنوں برکتے بھی لٹی پٹی نوکری کے لئے ان کے ہاں آئی تھی۔ اماں کو اس کی وجہ سے بڑی سہولت ہو گئی تھی ورنہ ٹوٹی ہمتوں کے ساتھ گھر گرہستی کے بار کیسے سنبھالے جاتے۔ حسن کی علالت نے تو بے موت ہی مار

[illegible] تھا۔ بیماری شروع ہی سے لگتی آئی تھیں۔ گھبرا کر حسن کے متعلق سوچتیں۔ تو دل جیسے ڈوبنے لگتا۔ زندگی کا یہی سہارا اب باقی تھا۔

حمید نے آہستہ آہستہ حسن کو ہلایا۔ گردن قدرے اونچی کر کے پانی کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا لیا۔ وہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔ دو تین ڈاکٹروں کا علاج تھا۔ لیکن کوئی بیماری تشخیص نہ ہو سکی تھی۔ جو بیماریاں روح کو چاٹ لیتی ہوں۔ ان کی مادی تشخیص ہونا ممکن بھی کہاں ہے۔ ڈاکٹر طاقت کے لئے ٹانک اور ذہنی سکون کے لئے گولیاں بھی تجویز کر رہے تھے۔

"حسن...... یار دیکھو تو میری طرف۔ کیا ہوا۔ خواب دیکھا کوئی۔" حمید نے اس کی پسینے سے تربتر گردن کو سفید چھوٹے تولیے سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

حسن اب ہوش میں تھا۔ لیکن خواب کی دھندلاہٹیں اب بھی آنکھوں میں پھیلی تھیں۔

حمید بڑے پیار اور محبت سے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھے آہستہ آہستہ دباتا رہا حسن آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ امی اس کی پٹی پر بیٹھیں پریشان نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"خواب دیکھ رہے تھے شاید" حمید نے مسکرا کر پوچھا۔

"شاید" حسن نے آنکھیں کھول دیں۔

"اب تو ہوش میں ہو نا۔"

"ہاں۔ حمید سوچ رہا ہوں۔ یہ خواب تھا یا حقیقت۔"

"ہوں"

حمید کے کہے بغیر ہی حسن نے سارا خواب اس کی گوش گزار کر دیا۔ حسن اس خواب سے بیحد متاثر نظر آتا تھا۔

"بانو بہن واقعی ستارہ بن کر چمک رہی ہے۔" حمید نے بڑے احترام سے کہا۔ "ان کی قربانی انہیں عظیم بنا گئی۔ تمہیں اس خواب سے سبق لینا چاہئے حسن۔ بانو بہن موت کے بعد بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ تمہیں ان سے کیا ہوا وعدہ یاد رکھنا چاہئے۔ مر کر زندگی گزارنا بزدلوں کا کام ہے۔ جو ہو چکا اسے رضائے الٰہی سمجھو۔ بانو واقعی عظیم ہیں۔ قیامت تک وہ ستارہ بن کر چمکتی رہیں گی۔"

"ستارہ...... روشن چمکدار...... نور کی شعاعیں...... حسن خواب کے اثر سے مرعوب اپنے آپ میں بڑبڑایا۔ "بانو۔ ستارہ بن گئی حمید۔ ستارہ۔"

"ہاں حسن۔ عظمت کے آسمان کا درخشندہ ستارہ...... جو ابد تک تابندہ رہے گا۔" حمید نے حسن کے بال ماتھے سے ہٹاتے ہوئے گھمبیر آواز میں بڑے احترام سے کہا۔ پھر وہ بڑی ہی دیر تک محبت اور خلوص سے

حسن کو تسلیاں دے دے کر زندگی کو اک عزم سے گلے لگانے پر ہمت بندھاتا رہا۔

حسن کے ذہن میں اس وقت صرف وہ ستارہ تھا۔ جو آسمان کی بیکراں وسعتوں میں نور کی شعاعیں بکھیر رہا تھا۔ بانو..... بانو نہ رہی تھی۔ ستارہ بن گئی تھی۔

بانو ستارہ نہیں بنی تھی۔ سیارہ تھی۔ ستارے اور سیارے میں صرف نقطوں کے اوپر نیچے کا فرق نہیں ستارے ساکن ہوتے ہیں اور سیارے گردش میں آتے رہتے ہیں۔

حسن کی حالت روز بروز سدھرنے لگی۔ ٹوٹتی ہمت کو اس نے قوت ارادی سے سنبھالا دیا۔ جب کبھی حالات کے سامنے کمزوری کے مظاہرے کی سبیل بنتی۔ حسن کے کانوں میں بانو سے کیے وعدے کی گونج دیتی۔ ذہن کے افق پر چمکتا ہوا ستارہ دکھائی دیتا۔ اس کے حوصلے تقویت پا جاتے۔ یوں اس نے جینے کا سیکھا۔ اماں کی جان میں جان آئی۔

زخم لگتا ہے۔ تو اس سے خون بہتا ہے۔ بعض اوقات خون اتنا بہہ جاتا ہے۔ کہ جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ لیکن قدرت نے خون میں ہی جم کر بند ہونے کی صلاحیت بھی پیدا کر رکھی ہے خون جم کر زخم کا منہ بند کر ہے۔ یہ جما ہوا کھرنڈ بند جاتا ہے۔ زخم کے منہ کا یہ کھرنڈ آہستہ آہستہ سوکھ کر خود ہی الگ ہو جاتا ہے۔ زخم نہیں رہتا۔ نشان رہ جاتا ہے۔ اس نشان کو دیکھ کر زخم کی اذیت کا خیال آجاتا ہے۔

اور پھر اک وقت ایسا بھی آتا ہے۔ کہ یہ نشان بھی واضح نہیں رہتا۔ مٹا مٹا سا مبہم مبہم سا نشان رہ جاتا ہے جس پر نظر پڑ بھی جائے۔ تو اس اذیت کی یاد دہانی نہیں ہوتی۔ جو زخم سے وابستہ تھی۔

بہتاں کے بیاہ کی تیاریاں زور شور سے ہو رہی تھیں۔ بسنتا بسن کی شادی دھوم دھام سے کرنا چاہتا تھا۔ ...ولی۔ کپڑا لتا تو ڈھیروں لوٹ مار میں لایا تھا۔ نقدی بھی بے شمار ہاتھ لگی تھی۔ کچھ دولت کی ریل پیل کچھ ...سلی کو سکھ دھرم میں لا کر شادی کرنے سے اب بسنتا گاؤں کے معزز لوگوں میں شامل ہو گیا تھا۔ ...مار اور غارت گری جس کا وہ شروع سے عادی تھا۔ اب ختم کر دی تھی۔ دو بیل گاڑیاں بنا لیں تھیں۔ جو ...ں سے غلہ اناج جالندھر منڈی لے جاتی تھیں۔ بسنتے کو معقول کمیشن مل جاتی تھی۔ یوں زندگی بڑے ٹھاٹھ ...گزر رہی تھی۔

...می اور مائی جیونی دن رات مصروف تھیں۔ گاؤں کی کئی عورتیں جہیز کی تیاری میں ان کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ ...ڑوں پر کڑھائی اور گوٹہ کناری لگانے میں مدد کرتی تھیں۔ رات ڈھولک پر گاؤں کی الھڑ مٹیاریں سہاگ کے گیت ...گاتیں۔ دن رات رونق ہی رونق تھی۔

بانو اپنے آپ ہی میں مست رہتی۔ اسے نہ پہلے گھر کی خاموشی کا احساس تھا۔ نہ اب رونق کا۔ ہاں کبھی ...کبھی ڈھولک پر گائے جانے والے سہاگ کے گیت اس کے کانوں میں یوں اترتے جیسے قطرہ قطرہ تیزاب ٹپک رہا ...۔ بے چینی سے وہ تڑپ تڑپ اٹھتی۔

اس گھر میں رہتے اسے مہینے نہیں سال بیت چکے تھے۔ ہوش میں بے ہوشی اور بیہوشی میں ہوش والی بات ...تھی۔ پاکستان پہنچنے کی تمنا شدید ترین ہو چکی تھی۔ بس اسے لگن تھی تو صرف یہی۔ بسنتے کے ساتھ جھڑپیں اب ...کم ہو چکی تھیں۔ اور لاشعور میں اسے قتل کر دینے کا انتقامی حیوانی جذبہ سلگ رہا تھا۔

شادی کے دن قریب آ گئے تھے۔ دور پار کی رشتہ دار عورتیں گھر میں آ گئی تھیں۔ بچے بڑے شاداں نظر ...آتے تھے۔ مائی جیونی تو دن رات مصروف رہتی۔ جہیز کی تیاری کے ساتھ ساتھ مہمان رشتہ داروں کی دیکھ بھال ...بھی کرنا ہوتی۔ بمشکل چوٹھا چوکا سنبھال لیتی تھی اوپر کا کام بانو سے لیا جاتا تھا۔

اس دوپہر سبھی پیتل کے تھالوں میں پیتل کی چھوٹی چھوٹی کٹوریاں رکھے بھات ساگ ڈال رہی تھی
مہمان کے لئے الگ تھال میں کھانا پروسا گیا تھا۔ مائی جیونی چارپائی پر اپنی دو چار رشتہ داروں کے ساتھ الگ تھلگ
کھانا لگے تھال آگے رکھ رہی بانو پانی کی بڑی سی پیتل کی گاگر سر پر اٹھائے ادھر آگئی۔

ستونت کور گاگر زمین پر رکھوانے کو اٹھی۔

"تو بیٹھ ستونتی" مائی جیونی نے کہا "رکھ لے گی خود ہی۔"

بانو نے بڑی دقت سے چھلکتی گاگر کو اتار کر زمین پر رکھ دیا۔ اس کے کپڑے پانی سے بھیگ چکے تھے۔
کوئی بات کیے وہ واپس مڑ گئی۔

"سندری بڑی کمزور ہو گئی ہے۔" بھاگ بھری نے چارپائی کے کونے پر بیٹھتے ہوئے بانو کی طرف دیکھا۔

"ہاں ..... جب آئی تھی تو بڑی صحت مند تھی۔" ستونت کور بولی۔

"کیوں جیونی" بھاگ بھری نے مائی جیونی کی طرف دیکھا۔

"کیا؟" پیتل کا تھال بھاگ بھری کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ بولی۔

"کچھ ہے اسے" بھاگ بھری نے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے معنی خیز نظروں سے پوچھا۔ مائی جیونی
نے ہاتھ نہ کی صورت میں ہلاتے گردن ادھر ادھر نفی انداز میں ہلائی۔

"میں تو سمجھی تھی، کچھ ہے۔" ستونت کور نے ہنس کر کہا۔

"نہیں ستونتی کچھ بھی نہیں۔"

"کوئی علاج ولاج کراتا تھا۔ دو سال ہو گئے۔"

"توبہ کر، اس چڑیل کا علاج کیسے کرائیں۔"

"کیوں؟"

"پاگل ہے پاگل۔"

"ارے نہیں تو۔"

"مان لے میری بات۔ چپ رہے گی تو چپ ہی رہے گی لیکن جب بپھر جائے گی تو قابو میں نہیں آئی۔"

"یہ بات ہے۔"

"ہاں"

"جیونی تیرا ایک ہی تو بیٹا ہے۔ کچھ تو سوچ۔ اولاد تو ہونی چاہئے۔"

"اب میں کیا کروں بھاگ بھری۔ میرا بس چلے تو اس کی اور شادی کر دوں اس بلا کو پلے باندھ دیا
ہے۔ اتنی سندر بہو قسمت والے کو ملتی ہے۔

"سندر ہے تو اسے چاٹتے پھریں۔ پگلی پلے پڑ گئی ہے۔ میں تو بسنتے کو کئی بار کہہ چکی ہوں پر یہی کہتا تھا اسی مسلی کے پیٹ سے پیدا ہو گا۔"

"مسلی؟"

"تو اور کیا۔ امرت چکھ کر بھی مسلی ہے۔"

"ہائے گورو۔"

"ایسی ایسی ماریں دی ہیں میں نے اسے لیکن اپنے آپ کو سکھ نہیں کہتی۔ یہی کہتی ہے میں مسلمان ہوں۔ بولی۔ بھاگ بھری اور ستونت کور بانو ہی کی باتیں کرتی رہیں۔ ستونت کور کا دل بانو کے لئے پسیج رہا۔ لیکن بھاگ بھری اور مائی جیونی کے سامنے اظہار ہمدردی کی جرات نہ کر سکتی تھی۔

ادھر بڑے دالان میں نوجوان لڑکیاں جیتاں کے بیاہ کے کپڑے ٹانک رہی تھیں۔ جذبات انگیز سی چھیڑ چھاڑ ہو رہی تھی۔ نئی۔ بیاہی سکھو اپنا لال لال ہاتھی دانت کا جوڑا چھنکاتے جیتاں کو ہنس ہنس کر بڑے بڑے راز کی باتیں کہہ رہی تھی۔ جیتاں دل ہی دل میں خوش ہوتے شرمانے کی کوشش کر رہی تھی۔

بانو دروازے کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ کمرے کے فرش پر کالے خانوں والے کھیس ڈالے لڑکیاں بیٹھیں کپڑے ٹانک رہی تھیں۔

"بیٹھ جاؤ سندر تم بھی۔" ایک لڑکی نے کہا۔

بانو نے اس کو کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک ٹک کپڑوں کو دیکھے گئی۔

"یہ کھلار بنے دو جیتاں یا اسے بھی ٹانکنا ہے۔" سرستی نے لال گوٹے سے جھلملاتا دوپٹہ ہاتھوں میں پکڑ کر جیتاں سے پوچھا۔

بانو کی نظر اس دوپٹے پر پڑی۔ لانبی لانبی کرن۔ چوڑے گوٹے اور گول گول نکلوں سے بھرا دوپٹہ جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ یہ دوپٹہ بانو کو مانوس سا لگا۔ وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھنے لگی۔ اس کے ذہن میں ہلچل مچ گئی۔ وہ سری پردوں والی چھپر کھٹ۔ وہ لال نکلوں والا جگمگاتا دوپٹہ۔ وہ کالے بوٹوں کی دھیمی دھیمی آواز۔ وہ دل کی اوادھڑ کنیں۔ وہ جذبات سے بوجھل تھرتھراتی آواز۔ بانو کا سر گھومنے لگا۔

"بتا بھی جیتاں" سرستی نے پھر پوچھا۔

"یہ میرا دوپٹہ ہے۔ یہ میرا دوپٹہ ہے بانو دوپٹے پر جھپٹ پڑی اور اسے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔

"ہائے ہائے! سارا مسلا گیا دوپٹہ۔

"چھین بھی لے اسے۔"

"پاگل ہو گئی ہے یہ تو۔"

"چھوڑ بھی دے۔"

"ساری کرن خراب ہو گئی"

لڑکیاں بانو سے دوپٹہ چھیننے کی کوشش کر رہی تھیں۔ لیکن وہ زمین پر دوہری ہو کر بیٹھی تھی۔ دوپٹہ اس نے چھاتی سے لگا رکھا تھا۔

"یہ میرا ہے۔ یہ میرا دوپٹہ ہے یہ میرا دوپٹہ ہے۔ وہ چیخے جا رہی تھی۔

صحن سے عورتیں شور وغل سن کر اندر آ گئیں۔ مائی جیونی بھی دوڑی آئی۔ لڑکیوں نے بتایا کہ وہ دوپٹہ نہیں دے رہی سارا مسلا جا رہا ہے

"ناشدنی" مائی جیونی نے بانو کی کمر میں ایک لات جمائی۔ وہ فرش پر اوندھے منہ گری۔

"میری بچی کے سہاگ کا دوپٹہ یوں مسل ڈالا۔ تیرا بیڑہ غرق۔ کمینی۔ مائی جیونی غصے میں گالیاں دیتے ہوئے بانو کو لاتوں اور مکوں سے ادھ موا کرنے لگی۔

لڑکیوں نے بانو سے دوپٹہ چھین لیا تھا۔ لیکن وہ اب بھی چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔

"یہ میرا گوٹے والا دوپٹہ میرا ہے۔ مجھے دے دو یہ میرا دوپٹہ۔ مجھے دے دو۔ میرے سہاگ کا دوپٹہ مجھے دے دو۔"

"واقعی جیونی تو سچ کہتی تھی۔ یہ تو پاگل ہے۔ دیکھ تو باؤلی نے دوپٹے کا کیا حال کر دیا۔" بھاگ بھری نے گال پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھ لیا نا اپنی آنکھوں سے۔ مصیبت ڈال رکھی ہے گھر میں بسنتے نے۔" مائی جیونی دالان کی دہلیز پر ہانپتے ہوئے بیٹھ گئی۔ کئی عورتیں دروازے میں آکر کھڑی ہو گئیں۔

بانو اب بھی مسلسل چیخ رہی تھی۔

"کیا ہوا۔ کیا بات ہے۔" بسنتا عورتوں کو دروازے پر جمع دیکھ کر بولا۔

"تیری پتی کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔" پھولے پھولے پیٹ والی بنتو نے ہنس کر کہا۔

"کیا ہو گیا؟" بسنتا دو ایک رشتہ دار عورتوں کو ہٹا کر اندر چلا آیا۔

"میرا دوپٹہ دے دو میرا دوپٹہ دے دو۔" بانو لڑکیوں سے دوپٹہ مانگ رہی تھی۔

"کیسا دوپٹہ" بسنتے نے پوچھا۔

"یہ لال دوپٹہ" ایک لڑکی نے تہہ کیا ہوا دوپٹہ اسے دکھایا۔ "یہ کہتی ہے میرا ہے مجھے دے دو۔

"تو دے دو نا۔" بسنتا ہنس کر بولا۔ "کیوں سندری لو گی یہ دوپٹہ۔"

"یہ میرا ہے۔" بانو نے خونی نظروں سے اسے دیکھا۔

"بھی لڑتی کیوں ہے؟ تیرا ہے تو لے لے۔ لاری یہ دوپٹہ۔" بسنتے نے لڑکی سے دوپٹہ مانگا۔

"لیکن یہ جیتاں کے جوڑے کا ہے۔" ماں جیونی بولی۔

"اور بن جاگے گاماں۔ پہلی بار تو تیری بہو نے کچھ مانگا ہے۔" بسنتے نے ہنستے ہوئے سب کی طرف دیکھا۔ اور پھر دوپٹہ کھول کے بانو پر ڈال دیا۔

"بس اتنی سی بات کے لئے لڑ رہی تھی۔ جو لینا ہوتا ہے مجھ سے کہا کر سندری۔ مجھے تو ارمان ہی ہے۔ کہ تو کوئی چیز مجھ سے مانگے۔"

بسنتا بانو کو گرسنہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ مائی جیونی کو اس کی حرکت اچھی نہ لگی تھی۔ بڑبڑاتے ہوئے وہ اٹھ کر صحن میں چلی گئی۔ جیتاں نے بھی ماتھے پر بل ڈال کر بانو کو دیکھا۔ لڑکیاں بانو کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔ لیکن بانو...... ! بانو آنکھیں پھاڑے گرد و پیش دیکھ رہی تھی۔ سر پر سرخ ٹکلوں والا گوٹے سے جھلملاتا دوپٹہ تھا۔

لیکن وہ چھپر کھٹ۔ سنہری پردوں والی چھپر کھٹ؟ وہ بھاری بھاری قدموں کی آواز؟ وہ جذبات سے بوجھل تھرتھراتی صدا۔ کچھ بھی تو نہ تھا۔ کچھ بھی تو نہ تھا۔

ظلم کی چکی میں پستے دن نہیں، ہفتے مہینے نہیں، سال گزر گئے۔ بسنتا اس کی زندگی کا لہو پوری
درندگی سے چوستا رہا۔ وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ اس کا ذہنی توازن کئی بار بگڑا۔ مائی جیونی ڈائن بن کر اس
رہی۔

بانو پھر بھی جیتی رہی۔ کبھی مہینوں خاموش رہی۔ کبھی متواتر بولتی رہی۔ کبھی خلاؤں میں گھور گھور کر
گزارا۔ تو کبھی اپنے آپ کو سندر کور بن بن کر پکارا۔ اور کبھی گھنٹوں نہا نہا کر اپنے مقدس وجود سے
کے حیوانی لمس کی غلاظت دھوتی رہی۔ اینٹ اور پتھر کے ٹکڑوں سے اپنا جسم رگڑ رگڑ کر اس نے کئی بار زخمی کر
تھا۔ لیکن بسنتے کے گھناؤنے لمس کا احساس ذہن میں ہر دم تازہ ہی رہا۔

اس پر قیامتیں ٹوٹیں اور بار بار ٹوٹیں۔ لیکن اس بار جو قیامت ٹوٹی۔ اس کا رنگ ہی اور تھا۔ وہ چند ماہ
نیچے بیٹھی برتن مانجھ رہی تھی۔ پیتل کی تھالی کٹوریاں اور گلاس سوکھی راکھ سے رگڑ رگڑ کر چمکا رہی تھی۔
تھوڑے سے برتن تھے۔ لیکن اسے یوں ہی بیٹھے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ مائی جیونی اور مکھی چارپائی پر بیٹھی تھیں۔
مکھی فریم میں دوسوتی کا رومال لئے رنگ برنگی دھاگوں سے گورو نانک کی شبیہہ بنا رہی تھی۔ مائی جیونی اس کے
ساتھ آہستہ آہستہ کچھ باتیں کر رہی تھی۔ وہ اس وقت بڑی خوش نظر آ رہی تھی۔

"سچ ماں، میرا بھی یہی خیال ہے۔" مکھی نے سوئی میں دھاگہ پروتے ہوئے کہا۔

"تو اس سے پوچھنا تو سہی۔" مائی جیونی نے رازداری سے کہا۔

"پوچھنا کیا ہے۔ مجھے پتہ ہوتا ہے اس کی تاریخ کا۔ جیتاں کی شادی سے پہلے کی بات ہے۔" مکھی نے
ہوئے کہا۔

"جیتاں کے بیاہ کو تو خیر سے ڈیڑھ مہینہ ہو بھی گیا۔" مائی جیونی حساب لگاتے بولی۔

"بس اتنے ہی دن اوپر سمجھو ماں۔" مکھی نے بانو کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

"ایسا ہو تو گورو کے نام کا چڑھاوا چڑھاؤں گی۔ میں تو نا امید ہی ہو چلی تھی۔" مائی جیونی اٹھتے ہوئے بولی۔ "تو ذرا ٹوہ تو لگانا۔"

"اچھا ماں۔ ویسے مجھے پتہ ہے نا۔ بات ٹھیک ہی ہے۔" مکھی نے کہا۔ اور دوسوتی کاڑھنے لگی۔

بانو اب بھی سوکھی راکھ سے برتن صاف کر رہی تھی۔

"سندری" مکھی چند لمحے اسے دیکھنے کے بعد اس کے قریب آ بیٹھی۔

بانو نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر تیزی سے ہاتھ چلانے لگی۔

"اے!" مکھی نے اس کا کندھا چھوا "اس دفعہ......"

مکھی کی آنکھوں میں بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ ابروؤں کے اشارے سے بانو کی طرف اشارے کرتے ہوئے نظروں نظروں میں پوچھنے لگی۔

بانو کے ہاتھ رک گئے۔ حیرت زدہ آنکھوں کو پوری طرح کھولے مکھی کو دیکھنے لگی

"یاد ہے جیتاں کے بیاہ سے پہلے تیرے دن آئے تھے۔" مکھی نے رازداری سے کہا۔ "ڈیڑھ مہینہ ہو گیا بیاہ کو۔ بیس اکیس دن اوپر ہو گئے ہیں۔ وہ دھائی ہو۔"

"کیا؟؟؟" بانو کا سر گاڑی کے پہیے کی طرح گھوم گیا۔

"تو ماں بنے گی سندری۔" مکھی نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ "مجھے تو ماں بننے کی حسرت ہی رہی"۔

"ماں! ماں! ماں!" بانو کی آنکھیں پھٹ جانے کو تھیں۔

"ہاں بچی۔ خوش ہو۔ اب تو تیری ناز برداریاں ہوں گی۔ مائی جیونی کو بچے کی بڑی حسرت تھی۔ بسنتا بھی بچے کے لئے مرا جا رہا تھا۔ تو بسنتے کا بچہ جنے گی سندری"

"بچہ۔ بسنتے کا بچہ......" وہ جیسے قبر میں بول رہی تھی۔ پھر راکھ سے لت پت ہاتھوں سے اپنا پیٹ مسلنے لگی۔

"نہیں۔ نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں بسنتے کو اپنے وجود میں ڈھلنے نہیں دوں گی۔ نہیں...... نہیں...... نہیں......"

راکھ سے بھرے ہاتھوں سے بانو نے اپنے بال نوچ ڈالے۔ اپنا پیٹ مسل ڈالا۔ چیختے چیختے بیدم ہو گئی۔

مکھی اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔ اسے نلکے سے اٹھا کر چارپائی پر لا کر بٹھایا۔ اور گھبرائے گھبرائے انداز میں تسلیاں دینے لگی۔

بانو اپنا پیٹ سختی سے دبائے دوہری ہو کر چیخے جا رہی تھی اس کے ذہنی نظام کی یک جہتی اور ہم آہنگی ریزہ ریزہ ہو گئی تھی۔ یہ آخری وار تھا۔ بڑا شدید۔ بڑا کڑا۔

بسنتے کو جب خوش خبری سنائی گئی۔ تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔

"میں نہ کہتا تھا ماں صبر کر۔ گورو کی کرپا ہو ہی جائے گی۔"

"گورو نے کرپا تو کر دی۔ لیکن اس باؤلی کا کیا ہے۔ مجھے تو ہر دم دھڑکا ہی لگا رہتا ہے۔"

"اس کی بات چھوڑ ماں۔ چند دن تڑپے گی پھر خود ہی ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

"اگر کوئی ہرج ورج ہو گیا تو۔"

"تم دونوں ہر وقت گھر میں رہتی ہو۔ اس کا خیال رکھا کرو۔"

"خیال تو رکھتی ہوں۔ اب تو میں نے اس سے کام بھی چھڑوا دیے۔ کوئی بھاری چیز بھی اٹھانے نہیں دیتی۔ مکھی بھی بڑا خیال رکھتی ہے اس کا۔ لیکن پھر بھی دھڑکا ہی لگا رہتا ہے۔ پگلی تو ہے۔"

"پگلی کہاں ہے ماں۔"

"تو اور کیا ہے؟"

"بس ذرا جنونی ہے۔ نازک دماغ چھوکری ہے بس۔ ہر بات کا اثر بہت جلدی لیتی ہے۔ تم اسے پاگل کہتی ہو۔ ذرا پاکستان کی بات کر کے دیکھو "اس سے کیسے کرارے جواب دیتی ہے۔ اس وقت اس کا دماغ ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

"ہاں پاکستان کو ذرا بھی برا کہہ دو تو سر پھوڑنے کو دوڑتی ہے۔ کمینی امرت چکھ کر بھی مُسلی رہی۔"

"کیا فرق پڑتا ہے ماں۔ یہ تو دھرم کی سیوا ہے۔ اس سے بڑا کارن اور کیا ہو گا۔"

ماں بیٹا باتیں کرتے رہے۔ مکھی کو بھی بانو کا خیال رکھنے کی مائی جیونی نے سختی سے تاکید کی۔ دونوں ہر وقت سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتیں۔

گوبندی نے اس آڑے وقت میں بانو کا ساتھ دینے کی پوری کوشش کی۔ اسے گلے سے لگا لگا کر وہ اسے کئی کئی گھنٹے تسلیاں دیتی رہی۔ چوری چھپے چھوہارے بھی لا کر کھلائے پاؤ بھر تل بھی چبوا دیے۔ لیکن بانو کی کوکھ میں ڈھل رہا تھا۔ کسی طرح بھی اس کی خلاصی نہ ہو سکی۔ ہاں گوبندی کے اخلاقی سہارے نے بانو کو ایک بار پھر تھام لیا۔ گوبندی نے ہار کر بانو سے التجا کی۔ "بانو تو اپنے خدا سے چھٹکارا پانے کی دعا کر۔ اپنی نماز چھپ کر پڑھا کر۔ ایشور سن لے گا۔"

بانو نے حیران حیران ویران ویران نظریں اس پر ڈالیں "گوبندی نماز تو ہم ناپاک کپڑوں سے بھی نہیں پڑھتے۔ میرا تو سارا جسم ہی بسنتے نے نجس کر ڈالا۔ تو نہیں جانتی۔ گوبندی ہمارے مذہب میں طہارت اور پاکیزگی بنیادی چیزیں ہیں۔"

بانو پر یہ قیامت بھی ٹوٹی۔ وقت کا دم گھٹنا اس کی رفتار میں کمی آئی۔ دیوانگی اور فرزانگی کے بین بین وہ

گوں ناہی چلا گیا۔

اب تو بانو کو اپنے وجود کی نجاست سے بھی کراہت محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ زور زور سے اپنے روز بہ روز ابھرتے پیٹ پر گھونسے مارتی۔ سیڑھیوں سے جان بوجھ کر اپنے آپ کو گرا دیا۔ لیکن غلاظت تو اب اس کے بطن میں پل رہی تھی۔ چھٹکارا نہ ہونا تھا نہ ہوا۔

نو ماہ کی اذیت ناک مدت کے بعد بسنتا اک نئے روپ میں اس کے جسم سے الگ ہو گیا بانو کو کوکھ سے بسنتے کے بیٹے نے جنم لیا۔

ملت کی بیٹی کے بطن سے ایک سکھ کا بچہ پیدا ہوا۔

یہ بچہ، جو قدرت کے لگے بندھے نظام کے تحت خود بخود پیدا ہو گیا تھا۔ جس نے بانو کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ لیکن بانو اس کی ماں نہیں تھی۔ یہ بن ماں کے بچہ تھا۔ اس بچے کی پیشانی پر اس نور کی چمک نہ تھی۔ جو ماں اور باپ کے باہمی اتحاد اور پیار کی مظہر ہوتی ہے۔ جو محبت کی مہر بن کر بچے کے ماتھے پر چمکتی ہے۔

بانو پر ضعف و نقاہت طاری تھی۔ اور گھر میں خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ مائی جیونی نے تو صحن میں بھنگڑا ڈالا تھا۔ بسنتا بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ناچا تھا۔ بسنتا لوگوں کی نظروں میں ایک بھگت بن گیا تھا۔

خوشیاں بیٹے کی پیدائش پر نہیں منائی جا رہی تھیں۔ اس بات پر منائی جا رہی تھیں کہ ایک سکھ نے دھرم کا نام اونچا کیا تھا۔ مسلم قوم کے منہ پر اک زناٹے دار تھپڑ مارا تھا۔ مسلمانوں کو ذلت آمیز گالی دی تھی۔

گاؤں کے سکھ تو سکھ، ہندو بھی اس موقعے پر گھی کے چراغ جلا رہے تھے۔ لڈیاں ڈال رہے تھے۔ بھنگڑا ناچ رہے تھے۔

بچے کی شکل بسنتے کی سی تھی۔ وہی بھدے بھدے موٹے موٹے ہونٹ۔ وہی چوڑا دہانہ۔ ویسی ہی ا[illegible] کو دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور اسی کی طرح موٹی سی پھیلی ہوئی ناک رنگ بھی تانبے کی طرح اسی پر گیا [illegible]

عالم جنوں میں بانو کے ہاتھ کئی بار بچے کی طرف بڑھے۔ اس نے بچے کو مروڑ ڈالنا چاہا لیکن وہ ایسا کبھی بھی [illegible] کر سکی۔ اس کی انگلیاں شل ہو گئیں۔ اس کے اٹھے ہوئے بازو اکڑ گئے۔ شاید اس لئے کہ ممتا کا کوئی [illegible] نہیں ہوتا۔

لیکن یہاں سوال شاید ممتا کا نہیں تھا۔ بانو اس بچے کو مارنا نہیں چاہتی تھی۔ زندہ رکھنا چاہتی تھی۔ [illegible] وقت تک زندہ رکھنا چاہتی تھی۔ جس وقت تک وہ پاکستان نہ پہنچ جائے۔ گو عالم جنون و دیوانگی میں کئی [illegible] نے بچے کو دیوار کے ساتھ پٹخا اس کے رونے چلانے، بسنتے کے پیچ و تاب کھانے اور مائی جیونی کے [illegible] کرنے پر اسے دلی سکون میسر آیا تھا۔ پھر بھی وہ اسے جان سے مار دینے سے گریزاں تھی۔

مائی جیونی اب خائف تھی۔ اس دن جب بانو نے بچے کے بازو پوری قوت سے مروڑے۔ بچہ [illegible] جیونی نے بانو کو دھکا دے کر بچہ اس سے چھیننا چاہا۔

"یہ ڈائن تو بچے کو مار ڈالے گی۔" اس نے دہائی دی۔

"کیا ہوا اماں" بسنتا بھی لپک کر آیا۔

"یہ بچے کو مار ڈالے گی بسنتے۔ میری بات کان کھول کر سن لے۔"

"نہیں ماں۔ تمہارا وہم ہے۔"

"وہم۔ ابھی بچے کے بازو مروڑ رہی ہے۔ تڑپ رہا تھا بچہ اور یہ ہنسے جا رہی تھی۔"

"کیوں سندری ماں ٹھیک کہتی ہے کیا" بسنتے نے بانو سے پوچھا۔

بانو نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس سے بچہ لے ہی کیوں نہ لیں بسنتے۔" مائی جیونی نے تشویش بھرے [illegible]

بھی کہا۔

"بچہ ؟ اور مجھ سے لے لو۔" بانو غرائی۔

"تو تو اسے مار ڈالے گی۔" جیونی نے طیش میں آ کر کہا۔ "ڈائن بچے کو تکلیف پہنچا کر خوش ہوتی ہے۔ کہیں اس کا گلا ہی نہ گھونٹ دے۔"

"میں اسے نہیں ماروں گی مائی۔ اسے نہیں مار سکتی۔ اسے تو پاکستان لے کر جاؤں گی۔" بانو نے بچے کو بانہوں میں دباتے ہوئے کہا۔

"بسنتا جانتا تھا بانو بچے کو نہیں مار سکتی۔ ممتا کے ہاتھ بچے کو گلے تک نہیں پہنچ سکتے۔ بانو کی بات پر بسنتا نے اس کی طرف دیکھا اور پھر بانو سے بولا۔ "پاکستان لے جائے گی اسے"

"ہاں"۔

"کیا کرے گی اسے لے جا کر۔ ایک سکھ بچے سے پاکستانیوں....."

"یہ سکھ بچہ نہیں بسنتے۔"

"تو اور کیا ہے؟"

"یہ وہ گالی ہے جو تم نے مجھے نہیں میری قوم کو دی ہے۔"

"بسنتے نے قہقہہ لگایا۔ بانو غرائی۔ "یہ گالی میں اپنی قوم تک پہنچاؤں گی بسنتے۔ تیری موت میری قوم کے ہاتھوں واقع ہوگی۔ یہ گالی۔ معمولی گالی نہیں۔ غیرت مند قوم ایسی گالیاں نہیں کھایا کرتی بسنتے۔ ہم نے کسی دور میں ایسی گالیاں نہیں کھائیں۔ مجھے پاکستان پہنچنے دو پھر دیکھنا اپنا حشر۔ بہنوں کی عصمت کی تقدیس کے لئے مر مٹنے والے بھائی اس گالی کو دیکھ کر کس طرح تڑپ اٹھتے ہیں۔

"ہے ہے پگلی کہیں کی۔" مائی جیونی ناک منہ چڑھا کر اٹھ کر چلی گئی۔ لیکن بسنتا بانو کی دیوانگی میں ناراضگی کا لطف لے رہا تھا۔

بانو نے پلنگ پر بچے کو لٹا دیا۔ خود اس کے قریب بیٹھ گئی۔ بسنتا تکیے کو پکڑ کر کھڑا تھا۔ وہ بانو کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کا طنز بانو محسوس کرتے بے چین ہوئی جا رہی تھی۔ بسنتے کو قتل کر دینے کا خونی جذبہ دل میں ابھر رہا تھا۔

"بڑا مان ہے تجھے اپنی قوم پر۔ بسنتے نے دانستہ اسے چھیڑا۔

"تو میری قوم کو نہیں جانتا۔" اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"بھگوڑوں کی قوم" بسنتے نے طنز سے بھرپور قہقہہ لگایا۔ "بھاگتے بھاگتے اپنی بہو بیٹیوں کو ہماری عیش کے لئے چھوڑ گئی۔

بانو تلملا اٹھی۔ اس کی آنکھوں میں خون اترنے لگا۔ پیچ و تاب کھاتے ہوئے اس نے بسنتے کو نفرت اور حقارت سے دیکھا۔ "کمزور اور بے بس عورتوں پر ظلم ڈھانے والے درندو! تم کیا جانو۔ کہ قومیں کیا ہوتی ہیں؟"

بسنتا پھر سفاکانہ طریق سے ہنس پڑا۔ اس کے منہ سے تھوک کے چھینٹے اڑے اور بانو پر گرے۔ بانو نے اس کی قطعاً پرواہ نہ کی۔ بسنتے کی باتوں سے تو اس کا سینہ جل اٹھا تھا۔ اس کے ذہن میں شعلے بھڑک رہے تھے وہ اڑ کر اپنی قوم کے پاس پہنچنا چاہتی تھی۔ اپنی قوم کو بتانا چاہتی تھی۔ کہ وحشی درندے تمہیں للکار رہے ہیں۔ اٹھو اور ان کی آنکھیں نوچ لو۔ ان پر آگ بن کر برس پڑو۔ انہیں طوفان بن کر نگل جاؤ۔ لیکن پاکستان پہنچتی کیسے؟ یہاں آکر اس کی ساری سوچیں منتشر ہو گئیں۔ اور پھر اس کے منہ میں جو جھاگ آ جاتی۔ پھر بھی وہ آگ نہ بجھی جو ذہن کو جلا رہی تھی۔ جو سینے میں بھڑک رہی تھی۔

بسنتا ہنس رہا تھا۔ بانو کا اشتعال بڑھ رہا تھا اس کے ہاتھ کے انگوٹھوں میں تشنجی سی کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ بسنتے کی گردن پر نظریں جمائے وہ اپنے سینے میں انتقامی حیوانی جذبے کا اضطراب محسوس کر رہی تھی۔

"سندری تجھے بڑا مان ہے پاکستان اور پاکستانیوں پر۔ کبھی کبھی تو جی چاہتا ہے ایک بار تجھے وہاں لے کر چلوں۔ پھر تجھے پتہ چلے گا۔ کہ تیری قوم کس کراہت اور نفرت سے تجھ سے آنکھیں پھیر لیتی ہے۔ تیرا مان ٹوٹ جائے گا۔ تو تیر کی طرح سیدھی ہو کر میری پتنی بنے گی۔"

"میرے پاکستانی مجھ سے آنکھیں پھیر لیں گے؟ کراہت اور نفرت کا اظہار کریں گے؟ یہ تو تمہاری بھول ہے بسنتے۔ تو نہیں جانتا میری قوم کو۔ ہم نے اپنے عقائد اور نظریے کی جنگ لڑی ہے۔ جنگوں میں جانیں بھی تلف ہوتی ہیں۔ بستیاں بھی اجڑتی ہیں، آبادیاں بھی ویران ہوتی ہیں۔ زر و مال بھی جاتا ہے۔ اور عصمتیں بھی لٹتی ہیں۔ یہ سب وارداتیں ہم پر بھی گزر گئیں تو کیا ہوا۔ ہمیں فخر ہے کہ ہم نے جنگ جیت لی ہے۔ جیت کے آگے تو یہ وارداتیں ہیچ ہیں۔ ہم نے پاکستان ایک خطہ زمین ہی حاصل نہیں کیا۔ اپنی ملی ہستی کے تحفظ کا حصار بنایا ہے۔ ہندو اور انگریز نے ہمیں مل کر دھوکہ دیا۔ ورنہ ہم یوں نہ لٹ جاتے۔ خیر۔ پھر بھی یہ کوئی بڑی بات نہیں۔"

بسنتا زور سے ہنسا۔

"تو کیا جانے ان باتوں کو ذلیل آدمی۔ قوموں کی بقاء کے چراغ شہیدوں کے لہو سے جلتے ہیں۔ قوموں کے کردار میں انتقام کی قوت بہنوں اور بیٹیوں کی لٹی ہوئی عصمتوں کے چرکوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اچھا ہی ہوا تم چرکے لگا گئے۔ ورنہ ہو سکتا تھا۔ میری قوم غافل ہو جاتی۔"

"تیری قوم کو راہ دکھانے والا تیرا جناح مر گیا۔ اب غافل ہی سمجھ اپنی قوم کو۔"

"میری قوم کی مائیں بانجھ نہیں ہو گئیں۔ وہ پھر جناح پیدا کریں گی۔ جو کشتی کی پتوار سنبھالیں گے۔ محمد بن قاسم پیدا کریں گی۔ ٹیپو اور تیتو میر جنیں گی۔"

...نے پھر قہقہہ لگایا۔ "ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ مان کرتی رہ اپنی قوم پر۔"

...ہم ہزار سال سے کافروں کے ساتھ رہ کر اپنے آپ کو بھول گئے تھے۔ ہم بھول گئے تھے۔ کہ ہم ... ہیں۔ ہم کشتیاں ساحل پر جلا دینے والے ہیں۔ ہم بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑا دینے والے ہیں۔ ہم ... الدین ایوبی بن کر انگریزوں کو سرنگون کیا۔ ہم نے محمود غزنوی بن کر تمہارے بتوں کو پاؤں تلے ... اپنی شاندار روایات کو بھول چکے تھے۔ لیکن اب! اب! ہم اپنے پاکستان میں اپنے قومی کردار کی ... کرنے کو پہنچے ہیں۔ اس بھول کی سزا ہم نے پالی ہے۔ بانویں مسندر کوریں بن گئیں۔ یہ سزا میری قوم ... لیکن یاد رکھ اس اسلامی مملکت میں لہو کی وہی شان عود کر آئے گی جو مسلمان کا خاصا تھی۔ ہم تم ... لیں گے اور ضرور لیں گے۔ ہم صلح جو ہیں۔ روادار بھی ہیں۔ لیکن جب چڑ کے کھا کر بپھر جائیں تو موت ... ہیں۔ بہت جلد موت کا طوفان تم پر ٹوٹ پڑے گا۔ موت کا طوفان۔ موت۔ کا طوفان۔

... خلاؤں میں گھورتے ہوئے گردوپیش سے بیگانہ کہے جا رہی تھی۔ بسنتا اس کی طرف دیکھ دیکھ کر قہقہے ...

... قہقہے کھولتی ہوئی آگ تھی۔ جو بانو کے کانوں میں ٹپک رہی تھی۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ بانو کی لگن میں وقت کے ساتھ استحکام آتا گیا۔ پاکستان اڑ کر پہنچنے کی خواہش اب ... گئی تھی۔ دن رات ایک ہی رٹ تھی۔ صبح و شام ایک ہی خیال تھا۔ بچے کو اب وہ بڑی احتیاط سے رکھتی ... کچھ ہو جاتا تو وہ بے چین ہو جاتی۔ اس کا سانس اوپر کا اوپر تلے کا تلے رہ جاتا۔ بسنتا ماں سے کہتا۔ ... کتنا پیار کرتی ہے بچے سے۔ تو کہتی تھی مار ڈالے گی اسے آخر تو ماں ہے۔ ممتا تو اپنی جگہ ہے ہی۔" لیکن بانو ... عکس تھا..... ممتا سے کہیں زیادہ یہ دھڑکا تھا۔ کہ بچہ مر گیا۔ تو وہ اپنے پاکستانی بھائیوں کو وہ گالی کیونکر ... گی جو بسنتے نے انھیں دی ہے

گوبندی کا بھائی شمشیر سنگھ پورے چھ سال بعد وطن لوٹا تھا۔ بڑا سلجھا ہوا انسان تھا لیکن اس میں [illegible] پاکیزگی تھی۔ تقسیم ہند کے وقت ملک میں پیدا ہونے والی صورت حال کا علم شمشیر بھی اسے معلوم [illegible] گراس نے حالات سنے تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

گوبندی نے بانو کے متعلق اسے سب کچھ بتایا۔

"بھا پاجی کسی دن آپ کو دکھاؤں گی۔ اب تو اس کا کوئی حال ہی نہیں۔ جب آئی تھی تو [illegible] بھولی بھالی تھی۔ کہ کیا بتاؤں۔"

"اف" شمشیر سنگھ بانو کی خونچکاں داستان سنتے ہوئے لرز اٹھا۔ "کہاں کی رہنے والی ہے۔"

"شاید لدھیانہ کی۔ ہاں لدھیانہ لدھیانہ ہی پکارتی تھی۔ اب تو اسے پچھلی کوئی بات [illegible]"

"کیوں؟"

"دماغ خراب ہی ہو گیا ہے اس کا۔"

"اوہ۔"

"چار باتیں سیدھی کرے گی تو چار الٹ پلٹ مار جائے گی۔"

"بیچاری"

"بھا پاجی۔ کسی طرح اس کے پاکستان بن جانے کا سمبندھ نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں؟" "وہ جانا چاہتی ہے کیا؟ تم تو کہتی ہو۔ اس کا دماغ ہی ٹھیک نہیں۔"

"بھا پاجی! سب باتیں بھلا کر اس نے ایک ہی بات یاد رکھی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"پاکستان"

"وہ پاکستان جانا چاہتی ہے۔"

"واقعی کیا۔ پاکستان کے لئے دن رات تڑپ رہی ہے۔"

"وہاں اس کا کوئی ہے؟"

"وہ تو ہر وقت کہتی رہتی ہے۔ پاکستان میرا اپنا گھر ہے۔ وہاں کے لوگ میرے اپنے ہیں۔ ویسے اس کا [illegible] میں ہے۔"

"پھر تو اسے بھجوانے کی ضرور کوشش کرنی چاہئے گوبندی۔ لیکن اس کا منگیتر اب اسے قبول کر لے گا؟"

"نہ کرے بھاپاجی۔ بانو اس ظلم سے تو نجات پالے گی۔ اپنوں میں ہوگی۔ تو زندگی کسی نہ کسی طرح گزار ہی لے گی۔ اور کچھ نہیں تو اس بدنصیب کی ایک خواہش تو پوری ہو ہی جائے گی۔ آپ کو کیسے بتاؤں۔ کہ وہ بن جل کی مچھلی کی طرح تڑپتی ہے۔"

"یقین نہیں آتا گوبندی کہ انسان درندہ بن گیا تھا۔"

"بھاپاجی آپ یہاں ہوتے تو دیکھتے۔ کہ گاؤں میں جب فساد ہوا تھا۔ تو کیا قیامت ٹوٹی تھی غریب لوگوں پر۔"

"ہوں۔"

"بھاپاجی۔"

"ہوں۔"

"جالندھر میں تو آپ کی کافی واقفیت ہے نا۔"

"ہاں۔"

"کسی بڑے افسر سے مل کر بانو کو یہاں سے چھٹکارا دلوا دیں۔"

"ہوں۔" شمشیر سنگھ سوچ میں ڈوب گیا۔ گوبندی ہاتھ باندھ کر بنتی کرنے لگی۔

"کام تو بڑا مشکل ہے۔ لیکن کوشش کروں گا۔"

"ضرور بھاپاجی۔"

"بہت اچھا۔"

"ابھی کسی بانو سے بھی نہ کہنا۔"

"اچھا بھاپاجی۔"

"سنتا نامی غنڈا ہے۔ اس کے کرتوت کون نہیں جانتا۔ ایسا نہ ہو۔ اس کے کانوں میں بھنک پڑ جائے۔"

"نہیں بھا پاجی۔ میں کسی سے نہیں کہوں گی۔"

"ایس پی ملوک چند کا بیٹا میرے ساتھ ہی انگلینڈ سے واپس آیا ہے۔" شمشیر سنگھ بولا۔ "چاہو تو اس سے بات کروں گا۔"

"ضرور بھا پاجی" نیک دل گوبندی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ شمشیر سنگھ اس کے من ... سے بڑا متاثر ہوا۔

"لگتا ہے تجھے اپنی سکھی سے بڑا پریم ہو گیا ہے۔"

"میرا بس چلتا۔ تو بانو کا بال بھی بیکانہ ہونے دیتی۔ بدنصیب لڑکی سے مجھے پہلے دن ہی پریم ہو گیا ... اس نے ان پانچ سالوں میں کیسے کیسے ظلم سہے ہیں۔ بیان نہیں کر سکتی۔ کوئی اور ہوتی تو مر گئی ہوتی۔ لیکن وہ ... ہے بھا پاجی۔ صرف پاکستان دیکھنے کی آس پر اس کی آس پوری ہونی چاہئے۔ اگر وہ یہیں مر گئی۔ تو اس کی ... بھٹکتی رہے گی۔"

"تو فکر نہ کر گوبندی۔ میں بہت جلد اس کی رہائی کا بندوبست کروں گا۔" شمشیر سنگھ نے بہن ... شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

"میں تو روز پاٹھ کے بعد گورو سے پراتھنا کرتی ہوں۔" گوبندی بولی۔

"واہگورو کی۔" شمشیر سنگھ نے کہا۔ اور بانو کی رہائی کے متعلق سوچنے لگا۔ دوسرے ہفتے وہ جالندھر ... ملوک چند سے ملا۔ ملوک چند نے اس سلسلے میں اسے پوری مدد دینے کا وعدہ کیا۔

لیکن قدرت شاید بانو کے سنگین سے سنگین تر امتحان لے کر اس کی ثابت قدمی اور ہمت سے متاثر ہو ... خود ہی اس کی رہائی کا وسیلہ بنا دیا۔

ہستا چھکڑا جالندھر لے جا رہا تھا۔ کہ ایک ٹرک سے تصادم ہو گیا۔ ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اس ... توڑ دیا۔

گھر میں اک کہرام مچ گیا۔ اک بھگت کی موت پر پورا گاؤں امنڈ آیا۔ ہستے کی خون میں تر لاش کو ... وعقیدت کے پھول چڑھائے گئے۔ اس کے زریں کارناموں کو خون کے آنسو روتے ہوئے دہرایا گیا۔

مائی جیونی نے اپنا سینہ پیٹ لیا۔ جیتاں نے بال نوچ لئے۔ نکمی بھی روتی پھری۔ گاؤں کی عورتوں ... کے بالوں میں راکھ ڈالی۔ اس کے سر پر سفید موٹا دوپٹہ ڈال دیا۔ اس کی پشت پر دو جنتر مار کر ہستے ... گیا۔

لیکن آج بانو کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ ہنس رہی تھی۔ مسکرا رہی تھی۔ قہقہے لگا رہی تھی۔ ... گیا تھا۔

ہیں!

ظلم مر گیا تھا۔ بانو ظلم کی آہنی گرفت سے آزاد ہو گئی تھی۔ اب اس کے پاکستان پہنچنے کے راستے صاف ہو گئے تھے۔

سارا گھر کیا پورا گاؤں اس رات جاگتا رہا تھا۔ صبح بسنتے کا کریا کرم تھا۔ اسے اک اعزاز سے جلایا جانا تھا۔ صندل اور گھی اکٹھے کئے جا رہے تھے۔ رات سب جاگ رہے تھے۔

لیکن اک بانو تھی۔ جو آج مدت کے بعد گہری پر سکون نیند سو رہی تھی۔ مائی جیونی اور جیتاں نے اس کے بال کھوڑے تھے۔ اس کی بوٹیاں نوچی تھیں۔ لیکن وہ اوں آں کرنے کے بعد بے خبر سوتی رہی تھی۔

بسنتے کی موت سے شمشیر سنگھ کی کوشش بھی بہت حد تک آسان ہو گئی۔ ایس پی تلوک چند بہ نفس نفیس گاؤں پہنچا۔ بانو سے ملا۔ اور وہیں اسے پاکستان پہنچنے کا مژدہ سنایا۔

سکھ برادری حیران تھی۔ مائی جیونی نے واویلا مچایا۔ گاؤں کے بزرگوں نے اسے بسنتے کی آتما کا سکھ گنوانے کا مترادف جانا۔ لیکن ایس پی تلوک چند نے کسی کی نہ مانی۔

مائی جیونی بچے کو دینے پر کسی طور آمادہ نہ ہوتی تھی۔ گاؤں والے بھی اس بات پر اڑ گئے لیکن بانو جس طرح بچے کو اپنے وجود میں چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ تلوک چند سے برداشت نہ ہو سکا۔

شمشیر سنگھ نے بھی بانو کا ساتھ دیا۔ اور پھر بانو ان دونوں کی وساطت سے بچے سمیت جالندھر پہنچ گئی۔ وہاں مغویہ عورتوں کی بر آمدگی کے لئے مسلمان کارکن موجود تھے۔

گوبندی شمشیر سنگھ کے ساتھ بانو کو جالندھر چھوڑنے آئی تھی۔ بانو پہلے غم کی شدت سے حواس باختہ تھی۔ اب خوشی کی انتہا سے بہکی جا رہی تھی۔

گوبندی روتی آنکھوں سے اس سے لپٹ گئی تھی۔ اور بانو نے خدا جانے کس جذبے کے تحت ان آنکھوں کو چوم لیا تھا۔ جن سے ساون بھادوں کی جھڑیاں لگی تھیں۔

بانو کے علاوہ سات اور لڑکیاں بھی مشرقی پنجاب کے مختلف علاقوں سے بر آمد کی گئی تھیں۔ ہر لڑکی اور و جبر و تشدد اور ظلم و استبداد کی جیتی جاگتی داستان تھی۔

ان سات لڑکیوں میں صابرہ سلطانہ بھی تھی۔ جس کے دونوں ہاتھ وحشی درندوں نے اس وقت کاٹ ڈالے تھے۔ جب وہ اپنی آبرو کے تحفظ کے لئے تڑپ تڑپ کر ان کے سامنے ہاتھ جوڑ رہی تھی۔

ان میں لنگڑی فیروزہ بھی تھی۔ جو اپنی عصمت بچانے کے لئے تین منزلہ مکان سے کود گئی تھی۔ لیکن ان نہ آئی تھی۔ آگ کی بھٹی میں جلنے کے لئے زندہ رہی۔ فیروزہ کے ساتھ نسیم بیگم بھی تھی۔ جو پانچ سال میں بچے جن چکی تھی۔ لیکن ان بچوں کی محبت پر ملک و ملت کی محبت غالب آئی تھی۔ وہ پاکستان کے لئے ان روتا بلکتا چھوڑ آئی تھی۔

ہر لڑکی دل ہلا دینے والی داستان تھی۔ جیتا جاگتا صدمہ تھی۔ سات میں سے چھ کے عزیز و اقارب کٹ چکے تھے۔ پاکستان میں سوائے پاکستانیوں کے ان کا کوئی نہ تھا۔ پھر بھی یہ یک و تنہا لڑکیاں اس پاک وطن کی طرف کھینچی چلی آئی تھیں۔

یہ لٹا ہوا کارواں واہگہ پہنچا۔ اپوا کی کارکن عورتیں یہاں پہنچ چکی تھیں۔ کچھ درد مند دل رکھنے والے مرد بھی موجود تھے۔

قانونی کارروائیوں کے بعد جب ان جیتی جاگتی شہیدوں نے سرزمین پاکستان پر قدم رکھا۔ تو ہر ایک کی حالت دید کے قابل تھی۔ کوئی اس پاک مٹی کو سجدے کر رہی تھی۔ کوئی فضا کو عقیدت سے دیکھ رہی تھی۔ کوئی سسکیاں بھر رہی تھی۔ تو کوئی خشک آنکھوں میں مسرتوں کے پھوٹتے چشمے کو بے روک ٹوک بہنے دے رہی تھی۔

ان مظلوموں کی دل جوئی، تسلی تشفی کے لئے ہر فرد کچھ نہ کچھ کہہ رہا تھا۔ کوئی سسکیاں بھرنے والی کے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ کوئی کٹے ہاتھوں والی کا اضطراب دیکھ کر آنسو پی جانے کی کوشش کر رہا تھا۔

وا اپنے بچے کو کندھے سے لگائے ان سب سے الگ تھلگ کھڑی تھی۔ اس نے بے تاب ہو ہو کر آنسو
... حال ہو ہو کر تیورائی۔ وہ تو ایک ٹک حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

"... یہ پاکستان............ ہے........" وہ بڑبڑائی۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ بیٹھ کر مٹی کو چھوا۔ شجر
... اس کی آنکھیں پھیلتی گئیں۔

... کر اس نے بھارتی علاقے کے آسمان کو دیکھا۔ پاکستان کا آسمان بھارت کے آسمان سے مختلف نہ تھا۔
... ی ہی تھی۔ درخت' گھاس' پودے' پتھر۔ پانی سب ویسا ہی تھا۔

اسے زبردست ذہنی دھچکا لگا۔ اس کا فردوسی تصور لرز گیا۔

پاکستان! بھارت۔

بھارت! پاکستان۔

کیا فرق تھا دونوں میں؟

کیا حد فاصل تھی۔

کیا شے تھی جس کے لئے وہ متواتر پانچ سال مرتی رہی تھی۔

اس کا سر گھومنے لگا۔ ایک بڑے سے پتھر سے ٹیک لگا کر اس نے سہارا لیا۔

مغویہ لڑکیوں کو دارالامان لے جانے والی بس میں سوار کرایا جا رہا تھا۔ بدنصیب لڑکیوں کے قدم خوشی
... جا رہے تھے۔

ادھر بانو کے خیالات بھٹکے جا رہے تھے۔

"السلام علیکم"

"وعلیکم السلام"

"کیا حال ہے۔"

"شکر الحمد للہ"

بس ڈرائیور کسی آدمی سے مصافحہ کر رہا تھا۔

بانو چونک کر پلٹی۔

"السلام علیکم۔ وعلیکم السلام اور شکر الحمد للہ" یہ شہد بھرے الفاظ اس کے کانوں میں ٹپکے۔ ان میٹھے اور
ان حسین الفاظ کی حلاوت آج اس نے پورے پانچ سال بعد چکھی۔ ان حسین الفاظ نے اسے احساس دلایا۔ کہ وہ
... پہنچ چکی ہے۔ پاکستان اور بھارت کا فرق اسے محسوس ہونے لگا۔ وہ آنکھیں پھاڑے دونوں آدمیوں کو
دیکھتی رہی۔

پھر دیوانہ وار چیخی۔ وفورِ مسرت سے چلائی "پاکستان...... میرا پاکستان...... میرا اپنا پاکستان۔ [illegible] کا پاک وطن...... عرب کے صحراؤں سے اٹھی ہوئی صداؤں کی تکمیل کا مرکز۔ محمد بن قاسموں کا [illegible] غزنویوں کا مقام۔ بہنوں کی آبروؤں کی خاطر طوفانوں سے ٹکرا جانے والوں کا وطن۔ صداقت اور [illegible] گوشہ...... لا الہ الا اللہ کی بنیادوں پر اٹھائے ہوئے نظام اور ایمان افروز طریق حکومت کی مملکت [illegible] بستا نہیں...... یاں کوئی بستا نہیں۔"

بانو کا سینہ فرطِ مسرت سے پھٹ جانے کو تھا۔ دو کارکن عورتوں نے اسے تھام رکھا تھا۔ اس کی [illegible] مخدوش نظر آ رہی تھی۔

چھوڑ دو" اس نے عورتوں سے بازو چھڑائے۔ "مجھے اس مٹی کو چوم لینے دو۔" وہ زمین پر گر گئی۔ [illegible] عورت نے اس کا بچہ اٹھانے کو ہاتھ بڑھائے۔ لیکن اس نے بچے کو نہیں چھوڑا۔ زمین کو والہانہ چوم [illegible] کھڑی ہوئی۔

عورتیں اور مرد اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اونچا کیا۔ عورتیں [illegible] حیران ہو کر اس کی جانب دیکھنے لگے۔

"میرا پاک بھائیو!" بانو خشک ویران آنکھوں سے سب کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"میری مقدس بہنو! اس نے عورتوں پر نگاہ ڈالی۔

"جانتے ہو یہ کیا ہے؟ نہیں تم نہیں جانتے۔ میں تمہیں بتاتی ہوں۔ یہ بچہ نہیں گالی ہے گالی۔ [illegible] نے مجھے نہیں تمہیں دی ہے۔ اس کا تمہیں انتقام لینا ہو گا۔ تم غیرت مند ہو۔ غیرت مند گالیاں [illegible] کرتے۔ اپنی آبرو کے لئے مرمٹنے کی قسمیں کھایا کرتے ہیں۔"

عورتیں تو عورتیں مردوں کی آنکھیں بھی بانو کی حالت اور باتوں سے نم ہو گئیں۔ دارالامان میں بھی [illegible] دن یہی حالت رہی۔ اس سے جب بھی پوچھا جاتا۔

"پاکستان میں آپ کا کوئی عزیز ہے۔" تو وہ ہنس کر جواب دیتی۔ "آپ کیسے سوال کرتے ہیں۔ [illegible] کا ہر فرد میرا عزیز ہے۔"

"لیکن بی بی تمہیں کہیں تو پہنچانا ہے نا۔"

"کہیں پہنچا دو۔ کسی گھر میں چھوڑ آؤ۔ ہر آنکھ میری منتظر ہے۔ ہر دل میں میری جگہ ہے۔ [illegible] ہے۔ بھارت تو نہیں۔ یہاں تو سب سلیم ہیں۔ کوئی بستا ہے نہیں۔ بانو کو ہر پاکستانی پر بھرپور اعتماد تھا۔ [illegible] لٹی ہوئی آبرو کا بدلہ مان تھا۔

بانو کے اعتماد اور مان پر سر خود بخود ندامت سے نگوں ہو جاتے۔

...اور مستعدی سے دیکھ بھال کی گئی۔ اسے پرسکون نیند کے لئے روز گولیاں کھلائی جاتیں۔ اچھی خوراک ... تسکین و تسلی کے پھاہے اس کے زخموں پر خلوص سے رکھے جاتے۔

... دن بعد اس کے حواس میں کچھ بجا ہوئے۔ پیار و محبت کی مسیحائی نے اس بانو کو زندہ کرنے کی کوشش ... تھی۔ اس خالی خول میں وہی روح بیدار ہونے لگی۔ جو حوادث نے موت کی نیند سلا دی تھی۔

... چپ تھی۔ ہر وقت سوچتی رہتی۔ پانچ سال کا عرصہ جو وہ بسنتے کے گھر گزار آئی تھی۔ چبھتی ... تھا۔

... تھی"؟ اسے یاد آرہا تھا۔

... اب کیا ہے؟ اسے بھول جانا چاہتی تھی۔

... کے نگران اور دوسرے کارکنوں کا رویہ بڑا ہمدردانہ تھا۔ بیگم صوفی نے اس دن بانو کو اپنے سینے ... پیار کیا۔ اور پھر بڑے خلوص سے اس سے باتیں کرنے لگی۔ بانو کو اپنے سینے سے لگا کر پیار کیا۔ اور پھر ... خلوص سے اس سے باتیں کرنے لگی۔ بانو بھی اس وقت کچھ پرسکون تھی۔ محبت کی گرمی سے اس کا درد ... تھا۔

... سب تمہارے بہن بھائی ہیں۔ ہمارا اصلی رشتہ ہے لیکن کچھ خون کے رشتے بھی ہوتے ہیں۔ کچھ روح کے ... ہوتے ہیں۔ تمہارا پاکستان میں کوئی خونی کوئی روحانی رشتہ دار ہے۔" بیگم صوفی نے اس کے بالوں پر ... ہوئے پوچھا۔"

... آنکھوں میں مدتوں کی اڑتی دھول گیلی ہونے لگی۔ برسوں بعد ان آنکھوں میں نمی آئی۔ اس نے بے ... کو دونوں تلے دباتے ہوئے سر اثبات میں ہلا یا۔

... صوفی خوش ہو کر جلدی سے بولی۔ "کیا تم ان کا پتہ جانتی ہو۔ کون ہیں وہ؟"

... " بانو کی آنکھوں کی ویران دھول سیلاب کی نظر ہونے کو تھی۔

... کام کرتے ہیں۔ کہاں رہتے ہیں۔" بیگم صوفی نے جلدی سے پوچھا۔ وہ سیلاب کی طوفانی کیفیت دیکھ ... سیلاب کی تباہی مچانے سے پہلے ہی وہ سب کچھ پوچھ لینا چاہتی تھی۔

... پی ڈبلیو۔ پی راولپنڈی"...... بانو نے رک رک کر یوں کہا۔ جیسے عالم نزع میں ہو۔ سیلاب پوری ... ٹوٹ پڑا۔

... صوفی نے جلدی سے پتہ نوٹ کر لیا۔ اور پھر دنوں کے وقفوں کے بعد بیگم صوفی بانو کے متعلق اتنا جان ... کہ ان کے والد کا نام نصیر الدین ہے اور وہ لدھیانہ کی رہنے والی ہے۔

... کو راولپنڈی کے پتہ پر اطلاع دے دی گئی۔

خط پنڈی سے ہوتا لاہور آیا۔ حسن کو ملا۔

اور

پھر

بانو دار الامان سے حسن کے گھر پہنچ گئی۔

یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے گھر میں ماتم ہو گیا ہو۔ اکتوبر کی خنک رات کافی ڈھل آئی تھی۔ اماں برکتے، اور محلے کی عورتوں کے علاوہ حمید کی ماں بہنیں اور خالہ صفیہ اپنی بہو بیٹیوں سمیت بانو کو گھیرے میں لئے بیٹھی تھیں۔ کمرہ عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ آنسو اور سسکیاں زیادہ تھیں۔ باتیں کم۔

اماں کے کمرے میں دری بچھا دی گئی تھی۔ سارا کام حمید کی ماں بہنیں اور برکتے ہی کر رہی تھی۔ اماں کے گھاؤ پھر سے ہرے ہو گئے تھے۔ بھائی بہن، بھاوج بچے ایک ایک کی لاش نگاہوں میں تھرک رہی تھی۔ رو دھو کر جب ذرا پر سکون ہوئیں تو بانو سے پھر انہی کے متعلق پوچھنے لگتیں بانو کبھی تو پورے ہوش و حواس میں جواب دیتی، کبھی چپ ہو کر خلاؤں میں گھورنے لگتی۔ اور کبھی بے تکی باتیں کرنے لگتی۔

"اب اسے آرام کرنے دو بہن" حمید کی ماں نے بانو کی طرف اشارہ کر کے اماں سے کہا "تم بھی صبر اور ہمت سے کام لو"

"سوائے صبر کے اور ہو ہی کیا سکتا ہے" خالہ صفیہ نے اپنی غمناک آنکھوں کو دوپٹے سے پونچھا۔

"میرا سینہ پھٹا جا رہا ہے۔ مجھ سے صبر نہیں ہوتا" اماں نے بین کرتے ہوئے کہا "ہائے میری ثریا......"

"ثریا ثریا...... بھابی" بانو نے آنکھیں پھاڑے ادھر ادھر دیکھا "اس نے اس نے تو ننگے سے صحن میں لٹکا دی تھی...... پھر...... پھر...... ایک سکھ...... نے اس کے پیٹ میں بلم ماری چھوٹا سا بچہ...... بلم خون......"

بانو نے خوف زدہ ہو کر یوں چیخ ماری جیسے سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہو۔ وہ کانپ رہی تھی اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ اماں سینے پر ہاتھ مار مار کر بین کرنے لگتیں۔

حمید کی ماں بانو کی حالت سے خائف تھی۔ اس نے صفیہ سے کہا "بہن اسے آرام کی شدید ضرورت ہے، بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے دماغ پر صدمے کا اثر ہے ایسا نہ ہو دماغ بالکل ہی بگڑ جائے"

"ہاں اسے سلا دینا چاہئے" صفیہ نے کہا پھر برکتے کو بلایا

"جی" وہ بولی

"بانو کے لئے بستر لگا دو....."

"اچھا"

"کسی الگ تھلگ کمرے میں لگاؤ یہاں اطمینان سے سو جائے اس کی حالت ٹھیک نہیں"

"اوپر؟ نہیں..... نیچے ہی لگا دو کسی کمرے میں..... اوپر اکیلے نہیں سلانا چاہئے اسے یہاں کرو... کے کمرے کے ساتھ جو کمرہ ہے اس میں چارپائی بچھا دو....."

"وہاں پلنگ پر"

"تو بس ٹھیک ہے جلدی کرو" بڑ کہتے چلی گئی۔

"کچھ کھایا بھی تھا اس نے" حمید کی ماں نے صفیہ سے پوچھا

"بڑی مشکلوں سے دو نوالے چاولوں کے کھلائے اف بیچاری پر کیا کیا قیامتیں ٹوٹیں"

"ہاں..... دل پھٹا جاتا تھا سن کر" صفیہ نے کہا۔

"ابھی تو پورے ہوش میں نہیں لگتی کبھی ایک بات کرتی ہے کبھی دوسری" حمید کی اماں بولی۔

"ہائے بہن..... " حمید کی ماں نے تاسف سے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا دونوں باتیں کرتی رہیں... بچھا کر آ گئی۔

لگا دیا بستر"

"جی"

"چلو اسے لے چلیں اس کمرے میں"

"ہاں....."

دونوں بانو کے قریب آ گئیں جواب بھی ثریا کے بلم پر ٹنگے بچے کی دل ہلا دینے والی داستان... تھی۔ جیسے سب کچھ اب بھی اس کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہو

"آؤ بیٹی" صفیہ نے بانو کا کندھا پکڑ کر اسے اٹھایا۔

بانو نے دری پر سوئے ہوئے بچے کو اٹھایا اور کندھے سے لگا کر ان کے ساتھ چل دی کچھ عورتوں... اس بچے کو دیکھ کر نفرت اور حقارت کا تاثر تھا۔ صفیہ کے ساتھ حمید کی ماں بھی بانو کو سہارا دیئے کمرے... آئی۔

"لو اب سو جاؤ آرام سے" صفیہ نے اسے سفید بستر پر بٹھاتے ہوئے محبت سے کہا" یہ تمہارا... بانو۔ اطمینان کی نیند سو جاؤ"

...اپنا گھر..... "بانو بچے کو بستر پر لٹاتے ہوئے بڑبڑائی۔

...تنہا چھوڑ دیں۔ تو سو جائے گی" حمید کی ماں نے صفیہ کے کان میں سرگوشی کی

... چلو" صفیہ نے باہر جانے کو قدم اٹھائے۔ بانو نے پلنگ سے اٹھ کر جلدی سے صفیہ کے کندھے پر

...

...حسن کا گھر ہے" بانو کی آنکھوں میں ویرانوں کا سناٹا تھا۔

...حسن کا" حمید کی ماں کے منہ سے بلا ارادہ نکل گیا۔

...یہ گھر حسن کا ہے" بانو نے دل تھام لیا۔

...بیٹی" صفیہ نے اسے دلاسا دیا۔ اور پھر پیار سے پلنگ پر بٹھاتے ہوئے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔"

...نہیں سوچو تمہارا اپنا گھر ہے بے فکر ہو کر سو جاؤ"

...کی ماں کے آنکھ کے اشارے پر صفیہ کمرے سے باہر چل دی۔ حمید کی ماں نے دروازہ بھیڑ دیا اور خود بھی

...

...عورتیں اب اٹھ اٹھ کر واپس جانے لگی تھیں۔ اماں اب بھی اپنی آنسو برساتی آنکھوں کو دوپٹے سے

...کی کوشش کر رہی تھی۔

...بہنوں نے اماں کو بستر پر لٹا دیا ایک ان کا سر دبانے لگی۔ دوسری پاؤں صفیہ اور حمید کی ماں انہیں

...تلقین کرنے لگیں۔

...رات حمید بھی یہیں رہ گیا تھا۔ وہ جب سے دار الامان سے آیا تھا۔ دو بار حسن کے کمرے میں گیا تھا۔

...بار بغیر کچھ کہے لوٹ آیا تھا۔ بسمل کی تڑپ دیکھنے کی سکت نہ تھی یوں بھی حسن کو اس کی حالت پر چھوڑ

...تھا۔ ایسے موقعوں پر تسلی و تشفی کے الفاظ کا کیا کام۔ حمید اس حقیقت سے آگاہ تھا۔ اس

...پوری طرح تڑپ لینے کو تنہا چھوڑ دیا تھا۔

...کی لمبی رات کا دل بوجھل تھا۔ وقت کی نبضیں ڈوب رہی تھیں۔ گھر میں آئے مہمان سو چکے تھے۔

...دن بھر رو رو کر نڈھال ہو چکی تھیں۔ نیند نے انہیں اب سکون دے دیا تھا۔

...... بانو اب تک نہ سوئی تھی۔

...اس کی زندگی کی شاید تلخ ترین رات تھی۔ وہ آج حسن کے گھر آگئی تھی۔ حسن کے گھر! خدا جانے کیسے

...کی گم شدہ کڑیاں خود بخود جڑنے لگیں..... اذیت کے پانچ سال وہ ایک ہی جست میں پھلانگ کر ماضی کے

...لمحوں کو یاد کرنے لگی۔ جن میں ان کے کنوارپنے کی مسحور کن مہک تھی۔

...... وہ بھرا پرا کنبہ..... وہ حسین شب و روز ایک ایک کر کے نظروں کے سامنے بکھرنے لگے۔ اس کی

اور اس بچے سے لینا چاہتی ہے۔ اس بچے سے جس کا باپ ہے نہ ماں جو قدرت کے لگے بندھے اصول کے پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا کیا قصور۔ اس کا کیا قصور اس کا کیا قصور"

اس کے ذہن میں یہ آواز بڑی گونج کے ساتھ پیدا ہوئی بانو کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

اس کی انگلیاں بے جان ہو گئیں۔

اس کے انگوٹھے بے سکت ہو گئے۔

بچے نے کروٹ بدلی اور بانو کی طرف رخ کر کے سو گیا۔

اس کے ماتھے پر بے شک نورانی چمک نہ تھی پھر بھی بچپن کی معصومیت کا ایسا ہالہ تھا۔ جسے بانو دیکھ کر متزلزل ہو گئی۔

بانو نے باقی رات آنکھوں میں ہی کاٹ دی۔ کئی بار اٹھ کر نہائی۔ کمرے میں دیوانہ وار ٹہلتی پھری۔ ماضی کی یادوں کو ذہن سے کھرچنے کے لئے کئی بار مٹھیاں آنکھوں میں گھسیڑیں سر دیواروں سے بار بار پٹخا۔

رات کی گہری میں آکر دل کچھ اور بیقرار ہو گیا تھا۔

اس کی ذہنی اذیتوں کا تو دور شاید آج شروع ہوا تھا۔

تین دن گذر گئے اماں کے ملنے ملانے والے، حسن کے جاننے والے بھی بانو کو دیکھنے آئے گھر میں سے کافی ہلچل رہی۔ بانو کو وہ کتنا چھوڑا سمجھ کر ہر ہاتھ اس کی جانب تسکین پہنچانے کو بڑھا۔ ہر آنکھ سے آنسو خون ٹپکا۔ اپنوں نے کیا غیروں نے بھی اس کا درد اپنا درد سمجھا۔ محبت، تعظیم اور اپنائیت سے ہاتھ لئے۔ اسے تسکین ضرور ملی

لیکن یہ تسکین بھی خلش سے پر تھی۔

ان تین دنوں میں اس نے حسن کی ایک جھلک بھی نہ دیکھی تھی۔ وہ ایک بار بھی اس کے پاس نہ آیا۔ اپنے زخموں میں کچھ زیادہ ہی ٹیس محسوس ہونے لگی تھی۔

زلزلے، آندھیاں، طوفان، سیلاب سب تخریبی عناصر ہیں جب یہ وقوع پذیر ہوتے ہیں تو ہر طرف خوف۔ تباہی کا سلسلہ خوف مسلط ہوتا ہے۔ لیکن ان کی تباہ کاریوں سے ہونے والے نقصان کا صحیح اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب یہ گزر جاتے ہیں۔

پانچ سال یہ تخریبی عناصر تباہی مچاتے رہے تھے۔ لیکن بانو کو ان کی تباہی سے ہونے والے نقصان کا اندازہ اب ہو رہا تھا۔

وہ ایسی عمارت تھی جو بنیادوں تک تباہ ہو چکی تھی۔ تباہ۔ بالکل تباہ۔ آنکھیں پھاڑے وہ ات تباہی کو دیکھتی اور جب کچھ ہوش آتا۔ تو حسن کے گریز کے متعلق سوچنے لگتی۔ لیکن حسن کا گریز اس سے تو نہیں اپنے آپ سے تھا۔ وہ حوصلہ ہی نہ پا رہا تھا۔ کہ بانو کے سامنے آسکے۔ وہ اپنے درد سے ڈرتا تھا اپنی تڑپ سے ڈرتا تھا۔ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے بانو کی اس تباہی کا وہ خود ذمہ دار ہو۔ اس کو اس حالت تک پہنچانے کا وہ وہ اس کے پاس جانا چاہتا تھا۔ لیکن جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ بانو کا دکھ تو نمایاں نہیں عیاں تھا۔ وہ اس کے کو تسلی کے الفاظ کہاں سے لائے گا۔ اس کے مصائب کی داستان تو اس کے چہرے پر رقم ہے۔ اس

...ورت میں اس کے ساتھ چپکی ہوئی ہے۔

حسن کے حواس مختل سے رہے تین دن اور تین راتیں وہ مسلسل سوچتا رہا اپنے کمرے میں مقید۔ وہ حمید سے ملا ...اور نہ بات کی سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتا چلا گیا صفیہ خالہ کی بڑی بیٹی نے وقت بے وقت دو چار نوالے ...ں الکھوائے۔ ورنہ اسے کھانے پینے کا ہوش ہی کہاں تھا۔

پہلا دن اور رات تو جذباتی دھاروں پر بہہ گئے تھے۔ دوسرے دن اس نے سوچنے کی شعوری کوشش کی تھی۔ ...نے جس طرح اچانک کروٹ لی تھی۔ مقام تو پوری دل ہی سے سوچنے کا تھا۔ دل کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ...اٹھا۔ پھر بھی حسن سوچنے کی شعوری کوشش کر رہا تھا۔

بانو آ گئی تھی۔ زندگی میں موت کا رنگ لیے ہوئے آئی تھی۔ شکستہ مسخ شدہ بانو آ گئی تھی۔ بانو..... جو اس کا ...پیار تھی۔ جو اس کی زندگی کا نقطہ آغاز تھی۔

...جس سے اس نے حیات کے راز پائے تھے عشق کے اسرار سے آگہی ہوئی تھی جو اس کے اپنے وجود کا دوسرا ...تھی۔ جسے مردہ جان کر بھی وہ اپنے دل میں درد بنا کر بسائے رہا تھا

لیکن..... ! جس سے رابعہ کی صورت میں وہ غداری بھی کر بیٹھا تھا۔

رابعہ..... بانو..... رابعہ..... بانو حسن کا دماغ سوچتے سوچتے ماؤف ہو گیا۔ وہ بانو کا مجرم تھا لیکن اب ...... کا سوال بھی تھا۔

ذہنی کشمکش نے اسے نڈھال کر دیا۔ کسی وقت تو اسے یوں لگتا جیسے اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔ سینے میں جلتی آگ اسے راکھ کا ڈھیر بنا دے گی۔

تین دن اور تین راتیں۔

مسلسل سوچ کی نذر ہو گئے۔ کھینچا تانی ہوتی رہی۔ ذہنی کشمکش نے بے حال کر دیا لیکن اس عرصے میں وہ اپنے آخری فیصلے کی جانب پوری طرح جھک گیا۔

بانو..... اس کے دل کا ہر دریچہ بانو کے لئے کھل چکا تھا۔ رابعہ کی آمد کے راستے کچھ خود بخود بند ہوئے کچھ اس نے دانستہ بند کر دیئے حسن نے اس ریختہ لاش کو اپنے سینے کی حرارت سے زندگی بخشنے کا مصمم ارادہ کر لیا جس کا نام بانو تھا۔

یہ رابعہ کے حق میں ظلم تھا لیکن حسن کی مجبوریاں اس فیصلے پر مجبور تھیں تیسری رات کے پچھلے پہر اس نے اپنی انگلی سے وہ انگوٹھی اتار دی جو رابعہ سے نسبت کی مہر تھی۔ اس کی انگلیاں لرز رہی تھیں دل کانپ رہا تھا۔ لیکن ایسا کرنا ہی تھا کتنی دیر وہ خاموش کھڑا رہا رابعہ کے لئے اس کا دل دکھا ضرور لیکن یہ حسن کا آخری فیصلہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں اس کے جسم میں بیدار ہونے والا وہ حسن جو صرف مرد تھا۔ ایک بار پھر مر گیا تھا۔ وہ حسن جو انسان تھا

زندہ رہا۔

صبح اس نے ناشتہ کیا تھی ہی اور کمرے میں ٹہلتا رہا پھر کپڑے الماری سے نکالے اور غسل خانے میں ...
آدھ گھنٹے بعد وہ تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلا۔ اماں صحن میں چارپائی پر دو تین عورتوں کے ساتھ بیٹھی تھیں ...
برکتے گھسنتے کے ساتھ والے کمرے سے باہر نکل رہی تھی۔

حسن کشمکش کے اس دور سے گزر گیا تھا۔ اب ایک مستحکم ارادے سے ...
قدم اٹھ رہے تھے برکتے نے اس کی طرف دیکھا اترا ہوا پریشان چہرہ دیکھ کر اس کا ...
حسن نے بانو کے بارے میں پوچھا۔ برکتے نے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

حسن کے قدم اک اعتماد سے اس کی طرف اٹھ گئے۔

بانو دروازے کی طرف پشت کیے پلنگ کے پاس کھڑی تھی۔ اماں کے ڈھیلے ڈھالے کپڑے اس ...
رکھے تھے۔ گیلے بال پشت پر بکھرے تھے۔ شاید وہ ابھی ابھی نہا کر غسل خانے سے باہر آئی تھی۔ اس ...
فرش پر بیٹھا اخبار کے پھٹے کاغذوں سے کھیل رہا تھا۔

حسن کی نظر بانو پر پڑی۔ اور پھسل کر بچے پر آ گئی۔ اس کا حوصلہ اور ہمت ٹوٹنے لگے۔ اس کا ...
لگا۔ اس کی تڑپ بے قابو ہونے لگی۔ پٹ سے لگ کر اس نے سر دروازے سے ٹکا دیا۔ آنکھیں بند کر کے ...
سے جلن کو ختم کرنے کی کوشش کی جو آنکھوں میں اترنے لگی تھی۔

"با ... نو ..." اس کی گھٹی ہوئی چیخ بے قابو ہو گئی۔

بانو پلٹی ... ایک [illegible] چونک کر پلٹی۔ حیران ہو کر پلٹی۔

یہ آواز ... صدیوں کے فاصلے سے آئی۔ اس آواز میں اس کا ماضی تھا۔ اس کے وجود کا سراغ تھا۔ اس ...
کی شخصیت کا اسرار تھا۔ اس کی محبت تھی۔ اس کا پیار تھا۔ اس کا عشق تھا۔ زندگی کی پیغامبر آواز کہاں ...
تھی۔ بانو پوری آنکھیں کھولے دروازے کے پٹ سے لگے حسن کو دیکھ رہی تھی۔

حسن آنکھوں میں کڑوے کسیلے دھوئیں سے جلن محسوس کرتے ہوئے بے حال سا ہو رہا تھا۔ ...
آنکھیں پوری کی پوری کھولے حسن کو دیکھ رہی تھی۔ حسن آنکھوں میں گھر گھر آنے والے بادلوں کی ...
اسے تک رہا تھا۔

دونوں دیکھتے رہے۔ دیکھتے رہے۔ کئی لمحے دیکھتے رہے۔ اور پھر نگاہوں نے نگاہوں کو پہچان لیا۔

"بانو" حسن کے کانپتے ہونٹوں سے تھرتھراتی صدا نکلی۔

"حسن" بانو پر سکتے کی سی کیفیت طاری تھی

"بانو" حسن کی آنکھوں میں بادل گھلنے لگے۔ سانس سینے میں الٹ پلٹ ہونے لگا۔ اس نے اپنا لیا ...

کی ـــ دانتوں تلے دبا لیا۔ اس کے ماتھے کی رگ شدت کرب سے پھول رہی تھی۔

"حسن" بانو نے زیر لب کہا "تم ۔۔۔ تم کہاں تھے حسن ۔۔۔ تم کہاں تھے"

"با ۔۔۔ نو" حسن سے برداشت نہ ہو سکا۔ اپنے پتھر کی طرح بھاری وجود کو گھسیٹتا ہوا بانو کے قریب آیا۔ اس کا دل سینے میں طائر مجروح کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔ صبر و ضبط کے بند ایک بار پھر ٹوٹ رہے تھے۔

بانو نے اپنے ہاتھ اٹھائے وہ حسن کو چھونا چاہتی تھی۔ شاید لیکن اس کے کھلے ہاتھوں کی انگلیاں بند ہو گئیں۔ آنکھوں کے ویران سناٹے نوحہ خواں ہو گئے۔ سر جھکا لیکن پھر بیتابی سے اٹھا۔ حسن کی طرف دیکھتے ہی وہ پھوٹ پڑی۔

"تم کہاں تھے حسن۔ ۔۔۔ سب نے مجھے چور چور کر ڈالا۔ میں تمہیں پکارتی رہ گئی تم کہاں تھے؟" اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا "تم کہاں تھے؟ تم ۔۔۔ کہاں تھے حسن"۔

یہ آواز بانو کی نہیں تھی۔ یہ آواز بانو کی نہیں تھی۔ یہ اک مظلوم کی بے بسی کی دل ہلا دینے والی فریاد تھی۔ ایک دکھ تھا جو زمانوں پر محیط تھا۔ اک کرب تھا جو پوری کائنات پر چھا گیا تھا۔ حسن کا دل رو بہ نکلا۔

"بانو" چہرے دونوں ہاتھوں سے ڈھانپے اس کی درد میں ڈوبی پکار گونجی۔

بانو تیورا کر پلنگ سے ٹکرائی۔ حسن نے جلدی سے بڑھ کر اسے تھام لیا۔ لیکن سنبھالتے سنبھالتے وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

"با ۔۔۔ نو ۔۔۔" حسن نے اسے پلنگ پر لٹاتے ہوئے پکارا۔ لیکن وہ ہوش و حواس کی دنیا سے دور بے سدھ پڑی تھی۔ فرط غم سے حسن کا سینہ پھٹنے لگا۔ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں عقیدت و احترام سے تھام کر وہ آواز میں دیوانہ وار پکارنے لگا۔ لیکن بانو کو ہوش نہیں آیا۔

برکتے کسی کام سے اندر آئی تو دیکھا۔ بانو مٹی کے ڈھیر کی صورت میں پلنگ پر پڑی تھی۔ اور حسن پلنگ کی پٹی پر سر رکھے دو زانو اس طرح بیٹھا تھا جیسے کسی نئی نئی قبر پر فاتحہ پڑھتے ہوئے شدت غم سے نڈھال ہو گیا ہو۔

برکتے اماں کو بلا لائی۔ دونوں عورتیں بھی آ گئیں۔ وہ دونوں بیہوش بانو کو ہوش میں لانے کے جتن کرنے لگیں۔

اماں نے حسن کو کندھا ہلا کر اسے پکارا۔ سلگتی آنکھوں سے حسن نے اماں کو دیکھا۔

"اٹھو" اماں نے اس کا بازو پکڑ کر اٹھایا۔ ان کے لہجے میں برفانی ٹھنڈک تھی۔ حسن اٹھا۔ اماں نے اس کی حالت دیکھی۔ دل کٹ گیا۔ لیکن منہ سے کچھ نہیں کہا۔ "اماں" بے تاب ہو کر اس نے ماں کے کندھے سے سر لگا دیا۔ اس کا دل برداشت سے باہر تھا۔

سلطانہ شادی کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ رابعہ اور اس کی قریبی سہیلیاں اس کارِ خیر میں اس کا ہاتھ بٹا رہی تھیں سلطانہ یہ شادی اس دھوم سے کرنا چاہتی تھی۔ کہ اک عرصے تک لوگ اس شان و شوکت کو یاد رکھیں۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ عبدالرحیم کو لائسنس مل جانے سے تو دولت کی ریل پیل میں بے حد اضافہ ہو گیا۔ روز بروز سلطانہ کی مصروفیتیں بڑھ رہی تھیں۔ اکتوبر جا رہا تھا۔ دسمبر میں شادی کرنا تھی سینکڑوں کام ابھی جن سے نپٹنا تھا۔ عبدالرحیم کو تو سوائے اپنی بزنس کے اور کسی چیز کی خبر ہی نہ تھی۔ سارا بار سلطانہ اور رابعہ کے کندھوں پر پڑا تھا۔

رابعہ کیف و سرور کی دنیا میں ڈوبتی رہتی۔ اک لذت آمیز گھبراہٹ اس پر طاری رہتی تصور کی حسین آنکھ مچولی میں شب و روز گزر رہے تھے۔ اپنی زندگی کے اس مختصر لیکن مسحور کن دور کی طلسمی یادوں کی بھیڑ میں کھوئی رہتی۔ لاہور اور کراچی۔ اس کی والہانہ چاہت اور جوشیلی محبت کی یادیں دونوں جگہ بکھری تھیں۔ جوں جوں شادی کے دن قریب آ رہے تھے۔ یہ یادیں کچھ طوفانی سی ہوئی جا رہی تھیں۔

حسن محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔ رابعہ سیرابی کے تصور سے بھیگی جا رہی تھی اس کے ہونٹوں پر جلتے ہونٹ کا لمس اب بھی اسی طرح تازہ تھا۔ یہ لمس اس کے ذہن میں پوری حشر سامانیوں سے محفوظ تھا۔

حسن کے خطوط رابعہ کی تسکین کا قیمتی سہارا تھے۔ تڑپتے جذبے کاغذ کا دل بھی دھڑکا دیتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو باقاعدگی سے خط لکھ رہے تھے۔

لیکن اس دفعہ حسن کا خط رابعہ کو وقت پر نہیں ملا۔ دوسرا دن گزر گیا۔ اور پھر تیسرا دن بھی۔ انتظار کا ایک لمحہ کوفت کا باعث بن رہا تھا۔ کبھی تو وہ متفکر ہو جاتی کبھی غصہ آ جاتا۔

"حسن کو خط کا جواب تو دینا چاہیے تھا"۔

"ہو سکتا ہے کوئی مصروفیت ہو"۔

"کہیں دورے پہ گئے ہوں"۔

"میرا خط ہی نہ ملا ہو"۔

"لیکن کچھ بھی ہوا نہیں میرا احساس تو ہونا چاہئے تھا۔ میری بے کلی کا اندازہ کرنا چاہیے تھا"۔

رابعہ اپنے آپ سے الجھتی۔ ہر روز وہ بڑی بے تابی سے نوکر سے ڈاک لے لیتی۔

ایک ایک لفافہ الٹ پلٹ کر دیکھتی۔ لیکن زیادہ تر ابو کی کاروباری ڈاک ہوتی کبھی کسی بھائی کے دوست کا لفافہ ہوتا۔ کبھی امی کی کسی سہیلی کا۔

اس دن بھی وہ ہمہ انتظار چمن میں حوض کے کنارے بیٹھی پانی میں تیرتی رنگ برنگی مچھلیوں کو دیکھ رہی تھی۔ ذہن پرانی یادوں سے لپٹا ہوا تھا۔ بار بار اپنی چھوٹی سی گھڑی پر بھی نگاہ ڈال رہی تھی۔ ڈاک کا وقت ہو رہا تھا۔ جس میں ملازم ڈاک لے کر ادھر ہی سے گزر کر ابو کے پاس جانے والا تھا۔

رابعہ ٹہلتے ٹہلتے روش پر آ گئی۔ آج انتظار کا تیسرا دن تھا۔ ہمہ شوق سراپا انتظار بنی وہ ٹہل رہی تھی۔

"نجو" اس نے وہیں سے پکارا

"جی بی بی جی"

"ادھر لاؤ ڈاک"

"اچھا جی"

"نجو نے مختلف لفافے رابعہ کی طرف بڑھا دیئے بیتابی سے اس نے لفافوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا اسکے چہرے پر مایوسی کے سائے لہرانے لگے۔ گہری ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے اس نے ڈاک نجو کے حوالے کر دی۔

اپنے کمرے میں آ کر اس نے پیڈ اور قلم سنبھالا۔ دل کی بے تابیاں کاغذ پر شدید صورت میں بکھرنے لگیں۔ اس نے خط نہ لکھنے کا گلہ بھی کیا۔ اور خط پانے کی آرزو بھی۔

لیکن خط لکھ کر بھی اس کی بے کلی نہ گئی۔ سینے پر بوجھ سا تھا۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

خط پوسٹ کرنے کیلئے ملازم کو دے کر وہ امی کے پاس آ گئی۔ امی کے ساتھ اس نے آج درزی کے پاس جانا تھا۔ بہت سے کپڑے سل چکے تھے۔ بہت سے ابھی رہتا تھے۔

"امی" اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔

لیکن امی خط پڑھنے میں مصروف تھیں۔ ان کا چہرہ پریشان سا نظر آ رہا تھا

"کس کا خط ہے امی"

"صفیہ آپا کا"

"خیریت؟"

"بانو پاکستان آگئی ہے"؟

"جی؟"

"بانو.... زندہ ہے؟" وہ زیرِ لب بڑبڑائی۔

"وہ لدھیانہ والی بانو باجی نا"

"ہاں"۔

"مجھے ان کی شکل کچھ کچھ یاد ہے۔ بڑی خوبصورت تھیں۔

"پانچ سال سکھوں کے پاس رہی ہے"

"پانچ سال.... اف.... بے چاری"۔

"صفیہ نے یہی لکھا ہے"۔

"ان کے پاس ہیں"۔

"یمن رشیدہ آپا کے پاس۔ حسن"۔

سلطانہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ وہ بڑی پریشان نظر آ رہی تھی۔ صفیہ کے خط سے بانو کی خبر پا کر اس کا [illegible] دھک سے رہ گیا تھا۔ حسن اور بانو کے بندھن کا اسے علم تھا۔

بانو کی گمشدگی پر حسن کی جو حالت ہوئی تھی۔ لاہور رہ کر وہ بھی دیکھ آئی تھی۔ دل کسی آنے والے [illegible] برابر انتظار کر رہا تھا۔

رابعہ کے ذہن میں بانو کا مبہم سا خاکہ تھا۔ اس خاکے سے وابستہ ہلکی سی یاد یہ بھی تھی کہ وہ حسن سے [illegible] تھی۔ لیکن رابعہ حسن کی محبت میں اس طرح ڈوبی تھی۔ کہ وقتی طور پر اس نے اس خبر کو کوئی اہمیت نہ دی [illegible] ہاں حسن کے خط نہ لکھنے کی وجہ وہ جان گئی۔

لیکن دل کے معاملے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جن کا سوجھ بوجھ سے تعلق ہوتا ہے نہ عقل و دانش [illegible] روح کے تار لرزتے ہیں اور معاملے خود بخود اہم اور سنگین ہوتے جاتے ہیں۔

شام تک رابعہ بھی اس خبر سے خاصی متوحش لگ رہی تھی۔ امی کی پریشانی نے اسے بھی پریشان کر دیا [illegible]

رات کھانے کی میز پر سلطانہ نے عبدالرحیم کو یہ خبر سنائی۔

"بانو زندہ ہے۔ وہ پاکستان آگئی ہے"۔

"کیا" عبدالرحیم کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ گیا۔

"ہاں.... بانو.... زندہ ہے"۔

"تمہیں کس نے کہا"۔

"صفیہ کا خط آیا ہے"۔

"بانو زندہ ہے" ۔
"جی پانچ سال سکھوں کے پاس رہی۔ اب پاکستان آ گئی ہے" ۔
"توبہ توبہ" ۔
"پانچ سال۔ بڑی مدت ہوتی ہے جانے کس حال میں ہو گی" ۔
"اف۔ توبہ" عبدالرحیم حیرت زدہ بھی تھے۔ اور پریشان بھی "صفیہ کے ہاں آئی ہے" ۔
"جی کہاں؟" حسن کے ہاں" سلطانہ نے اک الجھی ہوئی نظر اپنے میاں پر ڈالی۔ "اچھا۔۔۔ اچھا" وہ ...ڈ کر گئے۔
"میرا خیال ہے میں لاہور ہو آؤں" ۔ کچھ دیر بعد سلطانہ نے کہا۔
"ضرور جاؤ" عبدالرحیم بولے "کہیں معاملہ" ۔
وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے۔ لیکن سلطانہ اس کا اشارہ سمجھ گئی تھی۔ آنکھوں آنکھوں میں رابعہ کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہنے سے منع کر دیا۔
عبدالرحیم نے سر ہلا کر تائید کر دی۔ رابعہ کو کچھ الجھن ہونے لگی۔ پوری طرح کھانا بھی نہ کھایا۔ میز سے اٹھ کر چلی گئی۔ اس کے چلے جانے کے بعد میاں بیوی تشویش سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔
"حسن اور بانو" ۔
"جی میں سب جانتی ہوں" ۔
"کیسے" ۔
"یہی تو دھڑکا مجھے لگا ہے۔ یاد تمہیں۔ اس کے لئے کس طرح دیوانہ ہو گیا تھا۔ تین مہینے تو بیمار رہا تھا۔ بانو بانو پکارتا پھرتا تھا" ۔
"میں سب جانتا ہوں" ۔
سلطانہ چند لمحے خاموش رہی۔ لیکن سوچوں میں ہلچل تھی۔ وہ بار بار کانٹے سے خالی پلیٹ کو بجا رہا تھا۔
"امید تو نہیں کہ بانو میں اب حسن کیلئے کوئی کشش ہو گی۔ پانچ سال سکھوں کے پاس رہی ہے۔ کیا رہ گیا ہو گا اس میں" سلطانہ نے خود کو تسکین دینا چاہی
"محبت اندھی ہوتی ہے بیگم" عبدالرحیم نے خدشے کا اظہار کر ہی دیا "کہیں کوئی مصیبت نہ کھڑی ہو جائے" ۔
سلطانہ چپ ہو گئی۔
"آج بچے کہاں ہیں۔ کھانا نہیں کھائیں گے" عبدالرحیم نے سلطانہ کی پریشانی کو دور کرنے کی خاطر اس کی توجہ دوسری طرف مبذول کرنا چاہی۔
"وہ اپنے دوست کے ہاں مدعو ہیں" سلطانہ نے پھر کہا۔
دوسرے کمرے میں رابعہ "امی اور ابو کی باتیں سن کر مٹی کا بے جان تودہ بنی کرسی پر بیٹھی تھی۔ حسن اور بانو کے عشق کا انکشاف اس پر آج ہوا تھا

"بیٹے!" بانو نے بچے کو مخاطب کر کے کہا۔ بچہ ہاتھ پیر چلاتے ہوئے مسکرانے لگا۔ وہ پھر بے
اس پر جھکی ہوئی کہہ رہی تھی۔

"دیکھ لیا نا میرے عزیزوں کو۔ تو کہتا تھا۔ وہ مجھے منہ نہیں لگائیں گے۔ مجھ سے آنکھیں پھیر لیں گے۔ ہا۔۔۔ بے وقوف میں نہ کہتی تھی۔ میں ان کی ہتھیلی کا چھالا ہوں ہتھیلی کا چھالا۔ جسے بڑی احتیاط سے سنبھال کر رکھا جاتا ہے۔ تو کہتا تھا۔ وہ مجھ پر تھوکیں گے۔ خبیث"۔

بانو نے بچے کے سینے پر ہاتھ مارا۔ بچہ موڈ میں تھا سے ماں کا لاڈ سمجھ کر ہنس پڑا۔ بانو نے پھر تھپڑ مارا۔ گدگدی ہوئی وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ بانو کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ آنکھیں انگارہ سی ہو گئیں۔ کو جھنجھوڑتے ہوئے غرائی

"تو اب بھی ہنستا ہے مجھ پر"۔

بچہ قہقہے پہ قہقہہ لگانے لگا۔

"ذلیل۔۔۔ کمینے۔۔۔ تو اب بھی ہنستا ہے مجھ پر تیری ہنسی کا یہ طوفان ابھی باقی ہے۔ میں تجھے مار ڈالوں گی تیری گردن اس طرح دباؤں گی۔ کہ تیری زبان لٹک جائے گی۔ تیری آنکھیں ابل پڑیں گی"۔

اور وہ خونی نظروں سے بچے کو دیکھتے ہوئے واقعی اس پر جھپٹ پڑی۔ حسن دو جستوں میں کمرہ پار کر کے لپکا۔ بچے کی گردن کی طرف بڑھتے ہوئے بانو کے ہاتھ اس نے جلدی سے پکڑ لئے۔

حسن ابھی ابھی ماہر نفسیات سے مل کر آیا تھا۔ اس نے پھر یہی تاکید کی تھی۔ کہ بانو کو جہاں تک ممکن ہو سکے پیار سے رکھا جائے۔ پیار محبت خلوص اور تعظیم ہی اس کی ذہنی صحت مندی کی ضامن بن سکتی تھی۔

حسن بے قابو درد کو سینے میں بمشکل روکے بانو کی باتیں سن رہا تھا۔ بانو کو ہتھیلی کا کیا اس نے دل کا چھالا بنا رکھا تھا۔ اپنے سینے کی فراخ اور بے کنار وسعتوں میں اس کے سارے دکھ ساری اذیتیں۔ سارے کرب سمیٹ لینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ تخریبی عناصر نے جو تباہی مچائی تھی وہ اسے عزیز تھی۔ ملبے کے اس ڈھیر سے اسے اس عمارت سے بھی زیادہ پیار تھا۔ جو شکستہ ہو کر مسخ شدہ حالت میں اب ملبے کا ڈھیر تھی۔ بانو اب اسے پہلے سے بھی زیادہ محبوب تھی "وہ شکستہ ہو تو عزیز تر" والی بات تھی۔

ان شکستہ بنیادوں پر اک نئے سرے سے عمارت کھڑی کرنے کیلئے انتھک محنت اور پر خلوص جدوجہد کی ضرورت تھی حسن اس جدوجہد اور پر خلوص محنت کیلئے اپنے آپ کو ذہنی اور جسمانی طور پر تیار کر چکا تھا۔ زندگی کی رعنائی، شادابی اور بہاروں سے منہ موڑ کر اس نے کرب و اذیت اور دکھ کے دھاروں سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔

بانو کی سوچیں کچھ اپنی ہی ڈگر پر چل رہی تھیں۔ گھنٹوں نل کے نیچے بیٹھی اپنے بدن کو رگڑ رگڑ کر زخمی کر لیتی۔ بچے کو بستا کہتی اور بستا ہی سمجھتی۔ اپنے آپ پر نازاں ہو کر قوم کے بیٹے کا ذکر ہنس کر اتراتی۔ داستان پاکستان کرتی رہتی۔ کبھی پہروں چپ رہتی کبھی گھنٹوں باتیں کرتی رہتی۔ قوم کی باتیں۔ پاکستان کی باتیں۔ دیکھنے والے کو محسوس تک نہ ہوتا۔ کہ اس کا ذہنی توازن غیر متوازن ہے۔

اس دن بانو کی بے ہوشی کے بعد حسن کی تمام تر توجہ اسے سکون دینے کی طرف تھی۔ وہ گھنٹوں اس کے پاس خاموش بیٹھا اس کی اوٹ پٹانگ باتیں سنتا رہتا۔ وہ سوئی ہوتی تو شکستہ ہاتھ سے ان کھنڈروں میں اپنی کھوئی ہوئی متاع تلاش کرتا رہتا۔ عالم وارفتگی میں وہ اس پر سوال پہ سوال کئے جاتی۔ تو وہ بڑے حوصلے اور سکون سے جواب دیا کرتا۔

"میں پاکستان آگئی ہوں نا"۔

"یہ پاک لوگوں کا پاک وطن ہے"۔

"اس میں اسلامی معاشرہ تشکیل پا چکا؟"

"لوگوں نے دیانت اور ایمان داری کو اپنا منصب بنا لیا؟"

"یہاں کوئی برا کام تو نہیں ہوتا؟"

"کوئی کسی کی حق تلفی تو نہیں کرتا؟"

"سب بھائیوں کی طرح رہتے ہیں نا؟"

"سب کے دکھ ایک اور خوشیاں ایک ہیں نا؟"

"اسلامی نظام قائم ہو گیا ہے نا؟"۔

"غریب امیر سب بھائی بھائی بن گئے ہیں نا؟"

ایسے ہی سوالات بانو اکثر خلاؤں میں گھورتے ہوئے حسن سے کرتی رہتی حسن ہر بات کا جواب اس کی تسکین کی خاطر اثبات میں دیتا۔ بانو خوشی سے دیوانی نظر آنے لگتی۔ اور کبھی عتاب بن کر بچے پر ٹوٹ پڑتی۔ بچہ جو قد و قامت زیادہ ہنستا تھا۔ اس ہنسی میں بانو کو بستے کے طرح کی آگ بھری محسوس ہوتی۔ اس کے ہاتھ اٹھتے۔ ان میں حیوانی انتقامی جذبہ مچلنے لگتا۔ وہ بچے کو بستا سمجھ کر مار ڈالنے کے درپے ہو جاتی۔

آج بھی حسن موقعہ پر اس کے ہاتھ پکڑ نہ لیتا۔ تو شاید عالم جنون میں وہ بچے کو مار ڈالتی حسن نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔

"بانو۔۔۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے"۔

"مجھے؟"

"ہاں تمہیں"۔

"کچھ بھی تو نہیں"۔

"تو پھر ایسے کیوں کرتی ہو"۔

"کیسے؟"

"یہ بچہ ہے ہستا نہیں۔ ہستا بھارت میں تھا۔ یہ پاکستان ہے بانو۔ یہاں کوئی ہستا نہیں ... ہستا نہیں"۔

"یہاں کوئی ہستا نہیں"۔

"نہیں"۔

"سچ"۔

"ہاں بانو' سچ کہتا ہوں"۔

"لیکن یہ!" اس نے بچے کی طرف دیکھا۔ بچہ اب بھی ہنس رہا تھا۔

"یہ بچہ ہے"۔

"کس کا"۔

حسن سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اپنے دکھ کو بمشکل سینے میں سمیٹے اس نے بانو کی طرف دیکھا وہ ویران نظروں سے بچے کو دیکھ رہی تھی۔ دونوں ہاتھ حسن سے چھڑا کر وہ اپنے بچے کی جانب مڑ چکی تھی۔ حسن کے ... میں اضطراب مچلنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں نم کے گیلے پتوں کی سلگتی کڑواہٹ گھلنے لگی۔ ہونٹ دانتوں تلے دبا کر اس نے پھٹ کر بہہ جانے والے درد کو روکا۔ اس کے چہرے پر روحانی اذیت کے سائے لہرا رہے تھے۔ بانو ... دیکھ کر ہنس پڑی۔

"تم شاید مجھے پاگل سمجھتے ہو حسن"۔

"نہیں بانو"۔

"تو پھر ایسی باتیں کیوں کرتے ہو۔ بھلا میں جانتی نہیں۔ کہ یہ کس کا بچہ ہے۔ میرا تو نہیں ... ہے۔ ہستا بڑا خراب تھا حسن ہر وقت میرے ملک اور میری قوم کو گالیاں دیتا تھا۔ یہ بچہ ... گالی دی ہے۔ یہ گالی میں ساتھ ہی لے آئی تھی۔ نہ لاتی تو تم لوگوں کو کیسے پتہ چلتا۔ کہ وہ ... کیسی گالیاں دیتے ہیں"۔

حسن کے چہرے پر کرب کے طوفان تھے۔ بانو الٹی سیدھی باتیں کرنے لگی تھی۔ ہر پھر کر ... رہی تھی۔ یا پاکستان کی۔

حسن دیوار کا سہارا لیے کھڑا ایک ٹک بانو کو دیکھ رہا تھا۔ سینے میں طوفان اٹھ رہے تھے۔ بانو کی حالت ... رحم تھی۔ اس کی انتھک محنت اور پر خلوص جدوجہد سے بھی کوئی حوصلہ افزاء نتیجہ نکلا تھا۔

ماہر نفسیات ڈاکٹر قریشی نے صبر و تحمل کے ساتھ بانو کی وحشت سے نپٹنے کی تلقین کی تھی۔ روحانی ... ذہنی صدموں نے اس کے ذہن کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ یہ تاثر آہستہ آہستہ پیار و محبت خلوص و تعظیم ... سکتا تھا۔ ڈاکٹر پر امید تھا۔ بانو کی ذہنی صحت کے بارے میں اس نے تشویش کا اظہار کیا تھا لیکن خطرے کا ... دوائیاں بھی دی تھیں۔ اور پیار اور خلوص کے بے پناہ مظاہرے کی تاکید بھی۔

حسن اسے دوائی بھی کھلا رہا تھا اور عشق کی گرمی بھی دل سوزی سے بہم پہنچا رہا تھا لیکن اسے دنوں کی ...

ں کے بعد بھی نتیجہ خاطر خواہ نہیں تھا۔

پہ چنگ پر قلابازیاں لگانے لگا۔ حسن نے پہلی بار بچے کو غور سے دیکھا۔ نفرت کراہت اور بیزاری کا لاوہ اس کے دل میں ابل پڑا۔ جی چاہا بانو کے مظالم کی اس جیتی جاگتی تصویر کا گلا گھونٹ ڈالے۔ اس کی بوٹی بوٹی نوچ لے۔ اسے ختم کر ڈالے اسے نیست و نابود کر دے۔

لمحہ بھر کو اسے یہی محسوس ہوا جیسے یہ بچہ نہیں [illegible] ہے جو نیا روپ دھار کر بانو کے ساتھ چپک گیا ہے۔

یہ خیال برداشت سے باہر تھا حسن نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چکراتا ہوا سر تھام لیا۔ کئی لمحے یونہی گزر گئے۔ حسن نے بمشکل اپنے جلتے ہوئے افکار کو سنبھالا دیا۔ جھکا ہوا سر آہستہ آہستہ اٹھایا اس کی نظریں بانو پر پڑیں۔ جو اس کے عین سامنے کھڑی اسے یوں تک رہی تھی۔ جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو

”بانو“ حسن بے اختیار ہو کر چلایا۔

”تم تو۔ تم۔ تو“ بانو ہکلائی اس کی آنکھوں میں پہچان کی چمک ابھر رہی تھی۔

”میں کون ہوں بانو“ حسن نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے ”خدا کے لئے مجھے پہچانو“۔

”تم حسن ہو“ بانو بڑبڑائی۔

”صرف حسن“ ؟ بانو خدا اپنے آپ میں آؤ۔ مجھے پہچانو۔ اپنے آپ کو پہچانو“ حسن کی تڑپ اذیت ناک تھی۔ میں تمہارے لئے حسن کے سوا اور بھی تو کچھ ہوں مجھے تو بتاؤ مجھے بتاؤ“۔

حسن نے فرط جذبات سے مغلوب ہو کر اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر سینے سے لگا لئے۔ دکھ درد سے بے چین ہو کر اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔

”تم کہاں کھو گئی ہو۔ میں تمہیں کیسے پاؤں۔ کہاں پاؤں۔ کیوں کر پاؤں“۔

”حسن“ بانو کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں۔

”بانو....“ وہ مجنونانہ انداز میں اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولا۔

بانو غور سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کی مضبوط گرفت سے ہاتھ چھڑا کر حسن کے چہرے کو چھوا۔ پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ آہستہ آہستہ اس کی چھاتی پر پھیرنے لگی۔ اک مانوس لمس نے اسے بے چین کر دیا۔

”یہ خواب ہے یا وہ خواب تھا“ ۔ وہ زیر لب بڑبڑائی۔

”با.... نو....“ حسن تڑپ گیا۔ اس نے بانو کی تھوڑی انگلی سے اونچی کر کے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”مجھے دیکھو بانو۔ مجھے دیکھو۔ مجھے پہچانو“ بانو کی آنکھیں پوری پہچان سے پہلی بار جگمگائیں۔

”حسن“ اس نے بھرپور اپنائیت سے سرگوشی کی۔

”میری جان۔ میری زندگی۔ میری روح“ حسن نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ اپنی پوری طاقت اور قوت سے اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں مقید کر لیا۔

بانو کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

آنسو! جو صحت مندی کی دلیل تھے جو پہچان کا نتیجہ تھے۔

وہ رو رہی تھی سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ تڑپ تڑپ کر مچل مچل کر رو رہی تھی۔ حسن کی حسن

ان آنسوؤں سے بھیگ رہی تھی۔

"روؤ۔ بالو اتنا روؤ کہ تمہارے سارے دکھ درد اس میں بہہ جائیں تمہارے ذہن پر جمی ہوئی [illegible] دھل جائے۔ بہہ جانے دو اس رکے ہوئے سیلاب کو۔ اس گھٹن کو کھل جانے دو" عالم [illegible] سینے سے لگائے اس کے بالوں کو ہونٹوں کی جلتی ہوئی عقیدت سے چھوتے ہوئے کہہ رہا تھا

اماں کا ماتھا اسی دن ٹھنکا تھا۔ جس دن بانو کے پاکستان پہنچنے کی اطلاع آئی تھی۔ لیکن تین دن جو حسن بانو کے سامنے نہیں آیا تھا۔ تو انہیں کچھ تسلی ہو گئی تھی۔ بانو میں اب دھرا ہی کیا ہے۔ ؟ انہوں نے اپنے دل کو تسلی دے لی تھی۔

لیکن اس دن بانو کی بے ہوشی میں جس تڑپ، جس اضطراب کا حسن نے مظاہرہ کیا تھا۔ وہ تشویش کے کئی پہلو لیے ہوئے تھا۔ اسی دن کے بعد تو حسن نے جیسے اپنے آپ کو ہر پابندی سے الگ کر لیا تھا۔ صبح و شام، دن اور رات کی تمیز کیے بغیر بانو کے ساتھ رہا۔

حسن کا جنون جوں جوں بڑھ رہا تھا۔ اماں کی تشویش میں بلا کا اضافہ ہو تا جا رہا تھا۔ اب مزار پر فاتحہ خوانی کے لیے آنے والے بھی ختم ہو گئے تھے۔ بانو کے آنے سے چند دن کے لئے اپنوں پرایوں میں جو ہلچل ہوئی تھی اب ختم ہو چکی تھی۔ زندگی اپنے معمول پہ آ گئی تھی۔ اماں بھی اب مرنے والوں سے زیادہ جینے والوں کے بارے میں سوچنے لگی تھیں۔ بانو سے جس التفات، جس مروت اور جس محبت سے پیش آئی تھی۔ وہ اب خنکی سے دوچار تھا۔ اماں کا رویہ بانو سے بدل سا گیا تھا۔

اماں مثالی ماں تو ہوں گی۔ لیکن مثالی عورت ہرگز نہ تھیں۔ بانو سے صرف اتنی ہمدردی تھی۔ کہ وہ لٹ پٹ چکی تھی۔ اس خون خون ماضی کے مستقبل کا انہوں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اُت اپنی خوب رو بھتیجی کا خیال آتا تھا۔ جو ایک دولت مند باپ کی بیٹی تھی۔ جو جہیز کی صورت میں اتنا کچھ لانے والی تھی۔ کہ اماں کی برسوں کی تمنائیں پوری ہونے کا یقین تھا۔ لیکن بانو کے آ جانے سے حالات تشویش ناک ہو گئے تھے۔ ان کی طرح حسن بھی بانو کے لہولہان ماضی کو نظر انداز کر کے اس کے مستقبل سے بے خبر ہو جاتا۔ تو شاید وہ بانو کو بخوشی گوارا کر لیتی۔

لیکن اب تو دیوانے کے تیور بتا رہے تھے کہ کل اچھا نہیں۔ اس دن بانو کی بیہوشی ہی میں حسن کی مدہوشیاں عام تھیں۔ جو آج بانو کو یوں حسن کے سینے سے لگ کر آنسو بہاتے دیکھ لیا۔ بس غضب ہی میں تو آ گئیں۔ ☆☆☆

کرتے باورچی خانے میں پہنچیں۔ برکتے لگن میں پیاز کاٹ رہی تھی۔ زمانہ ساز تھی۔ مالکہ کی ہاں میں ہاں [illegible] ذاتی مفاد کا حیلہ اسے آتا تھا۔

"مجھے تو پہلے ہی پتہ تھا۔ مر کھپ گئی تھی۔ جانے کہاں سے آ نکلی۔ اب میں کہاں کی رہی۔ [illegible] بات بھی تھی۔"

"کیا ہوا بی بی جی۔"

"جا کے دیکھ لے تو بھی اپنی آنکھوں سے۔ کیا مزے سے سر پہ سینے سے لگائے کھڑی ہے۔"

"کون؟..... کون بی بی جی۔"

"اے وہی..... دیوانی..... جو دس کو دیوانہ کر کے بٹھائے۔ ہونہہ۔ میں جیسے جانتی نہیں۔ [illegible] لڑکے کو تو دیکھو۔ اتنا بے باک ہو گیا ہے۔"

جو درد حسن اور بانو کا مشترک تھا۔ اماں کو اس سے کیا واسطہ۔ برکتے ہاں میں ہاں ملا کر ان کے [illegible] اور آگ لگاتی رہی۔ شامت اعمال اسی دن سلطانہ کا خط آ گیا۔ صفیہ کے خط کے جواب میں اس نے [illegible] لکھا تھا۔ ڈھکے چھپے الفاظ میں اپنے خدشے بھی ظاہر کیے تھے۔ عبدالرحیم کو اچانک باہر جانا پڑا تھا۔ اس سلسلہ [illegible] آ سکی۔ تفصیلاً خط لکھ دیا تھا۔ سارے خدشات کے پیش نظر اس نے شادی کی جلد از جلد تاریخ مانگی تھی۔

شام حسن حمید کو ریلوے سٹیشن چھوڑ کر آیا تو اماں منہ بنائے بیٹھی تھیں۔ کھنچی کھنچی تو وہ کئی دن [illegible] تھیں۔ آج وہ حسن سے فیصلہ کن بات کرنا چاہتی تھیں۔

حسن حمید کو الوداع کہہ کر آیا تھا۔ اس کی تبدیلی پشاور ہو گئی تھی۔ حمید کی ضرورت اسے ان دنوں [illegible] تھی۔ وہ اسے اخلاقی سہارے دیا کرتا تھا۔ اس کے چلے جانے سے یوں لگ رہا تھا جیسے سارے بوجھ اٹھانے کو [illegible] رہ گیا ہو۔

کچھ پژمردہ کچھ نڈھال وہ گھر میں داخل ہوا۔ اماں کے کمرے کے سامنے سے گزرا تو جانے کیا [illegible] اندر چلا گیا۔

"آج حمید بھی چلا گیا۔" اس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ اماں کے قریب ہی پلنگ پر بیٹھ کر وہ کچھ [illegible] لگا۔ اماں سلطانہ کا خط لے آئیں۔

"یہ کیا ہے؟"

"سلطانہ کا خط۔"

"کیا لکھتی ہیں؟"

"پڑھ لو۔"

"پڑھ کر کیا کروں گا۔"

"حسن!"

"جی۔"

"خط پڑھ لو مجھے جواب دینا ہے۔"

"تو دے دیجئے۔"

"پڑھ کر تمہیں بتاؤ کیا لکھوں۔"

حسن نے خط پکڑ لیا۔ غور سے اماں کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ممتا کی شفق کا پرتو نہ تھا۔ اس کے تیوروں سے وہ بہت کچھ سمجھ سکتا تھا۔ ایسا بچہ بھی تو نہ تھا۔ اٹھتیس سالہ جہاں دیدہ آدمی تھا۔ جہاں دیدہ آدمی۔ جس کے ذہن کے ہر گوشے پر تلخ ترین تجربوں کے واضح نشان تھے۔ خط پر سرسری نگاہیں دوڑا کر خط پلنگ پر ڈال کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا جواب دوں" اماں نے غصے سے کہا۔

"جواب دے دیجئے گا۔" اس نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" اماں چیں بہ جبیں ہو کر بولیں۔

"اماں! آپ جانتی ہیں۔ بانو آچکی ہے۔" اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"آچکی ہے تو کیا ہوا۔"

"بانو نہیں آئی میری ذمہ داری آئی ہے۔"

"تیرا دماغ بھی خراب ہو گیا اس کے ساتھ۔"

"اماں! میں نے اپنی زندگی بانو کے لئے وقف کر دی ہے۔"

"نالائق"

"جو جی میں آئے کہہ دیجئے۔ لیکن میرا فیصلہ اٹل ہے۔"

"تو اس سے شادی کرے گا۔ وہ پانچ سال سکھوں کے پاس رہ کر آئی ہے۔"

اماں کے لہجے میں استہزاء تھا۔ حسن نے بڑے تحمل سے ان کی طرف دیکھا۔ اس کی نظریں دکھی تھیں۔ وہ بالکل چپ رہا۔ اماں نادم سی ہوئیں لیکن بپھری رہیں۔

"اماں۔" حسن نے گہری آہ بھر کر کہا۔ "بانو عظیم ہے۔ بانو ملت کے نام پر لٹ گئی۔ پاکستان کے لئے قربان ہوئی۔ اس فعل میں اس کی ذاتی رضا تو نہ تھی۔ وہ مظلوم ہے۔۔۔ قابل رحم ہے۔ آپ۔۔۔"

"بس کرو۔" اماں نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا۔ "بانو ہی کا خیال ہے رابعہ کا بھی تو سوچ۔"

"اماں رابعہ جوان ہے خوبصورت ہے امیر باپ کی بیٹی ہے اسے اچھے سے اچھا رشتہ مل جائے گا۔ [illegible]
بانو۔۔۔ بانو کو کون قبول کرے گا۔ آپ اسے بیٹی سمجھ کر سوچئے۔ اس نے کیسے کیسے گھاؤ کھائے ہیں۔ [illegible]
نظروں میں وہ اب بھی پاکیزہ ہے اماں فرشتوں کی طرح معصوم اور حوروں کی طرح پاکیزہ۔"

اماں چپ ہو گئیں۔ غصے سے کام نہ چلتا دیکھ کر انہوں نے پیار محبت اور ملائمت سے حسن کو سمجھانا چاہا۔

"تمہاری منگنی طے پا چکی ہے بیٹا۔ رابعہ کو کس جرم کی سزا دو گے۔ خواہ مخواہ بدنام ہو جائے گی۔ اس کے
ماں باپ کی عزت کا بھی خیال کرو۔ کیا گزرے گی ان پر۔"

وار کارگر تھا۔ حسن مضطرب ضرور ہو گیا۔ لیکن اپنے فیصلے پر چٹان کی طرح اٹل تھا۔

"میں رابعہ سے نادم ہوں۔ ماموں اور ممانی کا بھی مجھے پورا خیال ہے۔ لیکن میں کیا کروں اماں۔ [illegible]
کس کے سہارے چھوڑ دوں۔"

"میں اسے اپنی بیٹی بنا کر ساری عمر کلیجے سے لگا کر رکھوں گی۔ تم اس بات کا فکر نہ کرو۔ تم [illegible]
نہ الجھاؤ۔ رابعہ سے شادی۔"

"یہ کسی طور بھی اب ممکن نہیں۔ بانو کو میری ضرورت ہے۔ میں آخری دم تک اسے سہارا دوں گا۔"
حسن نے فیصلہ کن الفاظ میں کہا۔

"اسے شادی کر کے ہی سہارا دے سکتے ہو۔" اماں نے نرمی سے کہا۔

"ضروری نہیں۔ شادی ہو یا نہ ہو۔ میں نے اپنی زندگی اس کے لئے وقف کر دی ہے۔"

اماں نے بہتیرا قائل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن چٹان اپنی جگہ اٹل تھی۔ ہار کر اماں آخری [illegible]
آئیں۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولیں۔

"مجھے بھائی کے سامنے شرمندہ کرو گے۔"

"میں خدا سے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا اماں۔" حسن نے تڑپ کر کہا۔ اور بوجھل قدموں سے [illegible]
نکل گیا۔

اماں نے اسی دن ساری صورت حال سے سلطانہ کو مطلع کر دیا۔ لاہور آنے کی تاکید بھی کی۔ [illegible]
بلا بھیجا۔ شاید رابعہ ہی حسن کو راہ راست پر لے آئے۔

اس دن سے اماں کا رویہ بیزاری کی مجسمہ برودت سے بھر گیا۔ بانو جو حسن کے خلوص محبت اور [illegible]
صحت مندی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اماں کے رویے سے مضطرب سی ہو جاتی۔ اور وہ سوچنے لگتی۔

"یہ تو پاکستان ہے۔ یہاں کے پاک لوگ تو خلوص کے پیکر ہونے چاہئیں یہاں پہ یہ [illegible]

ان ابھی دکھنا چھوڑا تھا۔ سوچتی رہتی۔ سمجھ نہ سکتی۔ ہاں بات بات پر اسے رونا ضرور آنے لگا تھا۔

"بانو"

"بانو"

"کچھ تو بولو بانو"

"باتیں کیا کرو۔"

"آؤ میں تمہیں باہر لے چلوں۔"

"پاکستان کی سیر نہیں کرنا۔"

"اپنی قوم سے نہیں ملو گی۔"

"بولو نہ بانو۔"

"بولو نا۔"

"بانو"

"بانو"

"بانو"

حسن کتنی دیر سے پلنگ کی پشت پر جھکا بانو کو بلا رہا تھا۔ بانو چپ چاپ پٹی پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ اس کا [illegible] فرش پر پھیل رہا تھا۔ بانو گم صم سی خلاؤں میں گھور رہی تھی۔ وہ تین چار دن سے چپ تھی۔

اس دن سے چپ تھی۔ جب حسن کو اس نے پوری طرح پہچان لیا تھا۔ اس حسن کو جو اس کا [illegible] تھا، جس سے اس کی زندگی کے بندھن بندھنے کا پیمان ہوا تھا۔ جس نے بسنتے کے گھر میں [illegible] رہنے کی لگن دی تھی۔ جس نے اس کے لال سنہری گوٹے سے جگمگاتے دوپٹے کو بڑے جذباتی اور [illegible] میں چھوا تھا۔ اس کی ویران آنکھوں میں عجیب سی اپنائیت کی چمک سے اس دن نکھار پیدا ہوا تھا۔ لیکن [illegible]

...کا رویہ ظاہر ہو گیا تھا۔

...چپ تھی۔ حسن دو تین دن خاموشی سے اس کی حرکات کا جائزہ لیتا رہا۔ سوائے خاموشی کے اس نے ان ...کوئی غیر فطری حرکت نہ کی تھی۔ بچے کو مار ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ نہ پاکستان کے متعلق مدلل بحثیں ...کی۔ ہوں ہاں کے سوا اس کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا تھا۔

...اں کی کمزوری اور بیزاری سے بھری باتوں سے وہ کچھ ششدر رہ گئی تھی۔ لیکن زبان سے ایک لفظ نہ بولی ...ہاں آنسوؤں کے سیلاب ضرور بہائے تھے۔

آنسو صحت مندی کی دلیل تھے۔

حسن نے اسے روتے دیکھا تھا۔ چپ چاپ دیکھتا رہا تھا۔ وہ اسے رونے دینا چاہتا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ بانو ...آنسو بہا رہی ہے۔ اتنے ہی اپنے آپ میں لوٹ رہی ہے۔ اس بات سے اسے قلبی اطمینان مل رہا تھا۔

لیکن اتنی مہیب خاموشی اس سے اتنے طویل عرصے تک بھلا کیسے برداشت ہو سکتی تھی۔ آج اس نے بانو کو ...بولنے پر مجبور کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

دفتر سے آج وہ کچھ دیر پہلے ہی لوٹ آیا تھا۔ کھانا کھا کر وہ سیدھا بانو کے کمرے میں چلا آیا تھا۔ بانو بچے کو ...لیے بیٹھی سوچوں میں گم تھی۔ حسن کو آتے دیکھا تو اس پر عجیب سی گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ بچے کو جلدی ...گود سے اتار کر زمین پر بٹھا دیا۔

حسن نے اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی۔ لیکن وہاں تو مکمل سناٹا تھا۔ ادھوری سی مسکراہٹ ...لبوں سے ٹکرا کر لوٹ آئی۔ حسن کے دل کا درد رو گیا۔ لیکن اس نے آج بانو سے باتیں کرنے کا عزم کر لیا ...تھا۔

پلنگ کے تکیے کو پکڑ کر وہ قدرے بانو کی جانب جھکا۔ اسے بولنے پر آمادہ کرتا رہا۔ لیکن بانو کے ہونٹوں پر ...وہی خاموشی کا تسلط تھا۔ حسن تکیہ چھوڑ کر اس کے سامنے آ گیا۔

"بانو۔" حسن نے اس کا کندھا چھوا۔

بانو کے سینے کی مضطرب ہلچل اس کے اوپر نیچے ہوتے سانسوں سے عیاں تھی۔

"باتیں کرو نا..... بولتی کیوں نہیں۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ کوئی بات تو کرو۔" حسن نے گہری آہ کو ...دباتے ہوئے بڑے درد بھرے لہجے میں کہا۔

"تم..... میرے سامنے نہ آیا کرو حسن۔" بانو کی آنکھوں میں دکھ، اذیت اور کرب نے بے چین ...کروٹیں لیں۔ کالی کالی گھٹائیں گھلنے لگیں۔

"بانو۔" حسن کی چیخ گھٹ گئی۔

"تم میرے سامنے نہ آیا کرو۔ تم میرے سامنے نہ آیا کرو۔" بانو نے دونوں ہاتھوں سے لیا۔ کالی گھٹائیں کمل کر برسنے لگیں۔

"بانو۔" حسن اپنے خالی ہاتھوں کی مٹھیاں کھولتے بند کرتے اپنے پگھلے ہوئے دکھ سے ہوتے ہوئے بولا۔

بانو بے اختیار رونے لگی۔ بچہ اسے روتے دیکھ کر اس کی طرف لپکا۔ حسن نے بچے کی طرف غصہ سے اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ بچے کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹا۔ اور کمرے سے باہر لے گیا۔ خانے کی طرف جا رہی تھی۔

"اسے کچھ کھانے کو دے دو۔" حسن نے بچے کو اس کی طرف دھکیلا۔ برکتے نے حسن کو تھام تو لیا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں نفرت کا طوفان تھا۔ اس نے بچے کو کندھے سے یوں پکڑا۔ نجس چیز ہو۔

حسن ہونٹ کاٹتے افسردگی کا تاثر لیے واپس مڑا۔ بانو اب بھی اس طرح رو رہی تھی۔ اس ہاتھوں پر آنسوؤں کے قطرے پھسل رہے تھے۔

"بانو۔" حسن چند لمحے اسے دیکھتے رہنے کے بعد بولا۔"

"تم میرے سامنے نہ آیا کرو۔" بانو تڑپتے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"کیوں نہ آیا کروں بانو۔" حسن کے حلق میں پھندہ سا پڑنے لگا۔

بانو زار و قطار روتی رہی۔ حسن نے بے چینی سے رخ بدلا۔ اپنی گردن پر پڑے بالوں پر ہاتھ ہوئے دکھ سے بانو کو دیکھتا رہا۔ کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن لب نہ ہلے۔ چپ رہا۔ آہیں رو کیں کاٹے۔ کئی لمحے یونہی گزر گئے۔ لیکن پھر اس نے اک فیصلہ کن انداز میں آگے قدم بڑھایا۔

"بانو۔ میں تمہارے سامنے نہ آیا کروں۔" اس نے آہنی لہجے میں پوچھا۔

"ہاں" مضطرب سا جواب تھا۔

"کیوں؟ اس لہجے میں تلخی کا عنصر تھا۔

"تمہیں دیکھ کر مجھے اپنی نجاست شدت سے محسوس ہونے لگتی ہے حسن۔ تم میرے سامنے نہ آیا کرو۔

"بانو۔" حسن چیختے ہوئے اس پر جھک گیا۔

"یہ دیکھو۔ دیکھو حسن۔" بانو نے اپنی گز گز گرد زخمی کی ہوئی بانہیں اس کے سامنے کرتے ہوئے

"کیا ہے یہ؟" حسن نے حوصلے کا دامن نہ چھوڑا۔

"یہ ۔۔۔ یہ ۔۔۔" بانو ہاتھ اپنے بازو پر پھیرتے ہوئے بولی۔ "بستے تھے ۔۔۔ بستے تھے ۔۔۔"

"بانو..." حسن تڑپ کر چیخا۔ زمین پر دو زانو ہوتے ہوئے اس نے بانو کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ دیے۔" ان کو ایک خواب سمجھ کر بھلا دو۔"

بانو نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ " مجھے ہر وقت بدبو آتی رہتی ہے۔ اپنے بدن سے۔ اپنے آپ سے۔ تم سامنے آتے ہو تو یہ بدبو... بدبو..."

"بانو خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کرو۔" حسن نے اس کے گھٹنے جنجھوڑے۔

"تم سونگھو۔" بانو نے معصومیت سے جس میں دیوانگی کے آثار تھے۔ اپنے ہاتھ حسن کے سامنے کر دیے۔

حسن نے بڑے ہی جذباتی پن سے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگا لئے

"بدبو۔ اف۔ بدبو" بانو نے ہاتھ چھڑانا چاہا۔

"ان میں کوئی گندگی نہیں۔ کوئی بو نہیں۔ ان میں تو جنتی ہواؤں کا تاثر ہے بانو... یہ فردوسی لمس کے حامل ہیں۔ تم یوں نہ سوچا کرو۔ یوں نہ سوچا کرو بانو۔"

"سچ کہہ رہے ہو۔" بانو نے اپنے ہاتھوں کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم عظیم ہو بانو۔" حسن نے رندھے گلے سے کہا۔ "تمہاری قربانی نے تمہیں عرش کے کنگروں سے بلند کر دیا ہے۔ اپنے آپ کو سمجھو۔ تمہاری عظمت، تمہاری بڑائی کے سامنے دنیا کی ہر چیز ہیچ ہے۔ تم سونا تھیں۔ اب حوادث کی بھٹی میں تپ کر کندن بن چکی ہو، تم مجھے محبوب تھیں۔ لیکن اب میری نظروں میں اتنی بلند ہو گئی ہو کہ میری وہ محبت اس بلندی کے سامنے کچھ وقعت نہیں رکھتی بانو۔ تم نہیں جانتیں۔ تم... میرے لیے کیا ہو۔"

حسن نے بے اختیار ہو کر سر بانو کے گھٹنے پر رکھ دیا۔ بانو کے ہاتھ اس نے اپنے ہاتھوں میں بڑی عقیدت سے تھام رکھے تھے۔

"تبریز" میں سرِ شام ہی رات داخل آ گئی تھی۔ رابعہ کئی دنوں سے مضطرب و بے چین تھی۔ [illegible] خط سے بانو کی آمد کا پتہ چلا تھا۔ اس وقت تو اس نے اس اہم خبر کو کوئی خاص اہمیت نہ دی تھی۔ لیکن [illegible] ابو کی ادھوری باتوں نے پریشان کر دیا تھا۔

حسن کو اس نے ٹوٹ کر چاہا تھا۔ مستقبل کے حسین تصور اس کے دم سے آباد تھے [illegible] خراماں چلی جا رہی تھی۔ جسے چاہا تھا۔ اسے پا لیا تھا۔ لیکن اب اچانک اور بالکل اچانک [illegible] آگ برسنے لگی تھی۔ بچھڑنے اور جدائی کی صورت نظر آ رہی تھی۔

حسن کو اس نے ایک نہیں دو نہیں پورے پانچ خط لکھے تھے۔ لیکن جواب ایک کا بھی نہیں [illegible] میں اس نے اپنے جذبات کی تڑپ پوری طرح سموئی تھی۔ لیکن اس کا اثر کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

رابعہ کی زندگی رواں دواں بہاروں کو خزاں کی دیمک چاٹ رہی تھی۔ وہ روتی بھی تھی اور [illegible] آہیں بھی بھرتی تھی۔ زندگی ویران ہوتی جا رہی تھی۔

کوئی شکوہ نہ دوش۔ دکھ تھا تو صرف اس بات کا کہ اتنے پیار کے بعد حسن اتنے ہی [illegible] اس سے یہ ناطہ جوڑا ہی کیوں تھا۔ اسے محروم ہی رہنے دیا ہوتا۔ پیار کی انوکھی اور انجانی راہوں [illegible] اسے لوٹایا ہوتا۔

رابعہ دن رات سوچوں میں گم رہتی۔ چہرہ اترا اترا ہوتا۔ آنکھوں میں نمی ہوتی۔

جہیز کی تیاری ایک دم رک گئی تھی۔ سلطانہ بھی پریشان سے پریشان تر ہو رہی تھی۔ حسن کو [illegible] خط لکھا تھا۔ لیکن اس کا جو جواب آیا۔ اس نے جہاں رابعہ کے ڈگمگاتے حسین خواب [illegible] سلطانہ کی تشویش بھی سچ ثابت ہو گئی۔

اس نے صاف صاف لکھا تھا۔ حسن ان کے ہاتھوں سے بالکل نکل گیا ہے [illegible]

[illegible] کی تھی۔ کہ جس طرح ہو سکے رابعہ کو ساتھ لے کر چند دنوں کے لئے آ جائے۔ اپنی مشکل کشائی [illegible] نظر آئی تھی۔

رابعہ خط پڑھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ تکیئے میں منہ چھپا کر بے قابو ہو ہو کر آنسو بہاتی رہی۔ لیکن [illegible] میں یہ بھٹکتی پوری کوٹھی میں گھومتی پھری۔" حسن کو جو جی میں آئی کہا۔ یہ کہاں کی شرافت تھی کہ ادھر [illegible]۔ "آ جاؤ سے [illegible] کہ عشق سہی لیکن اصول بھی تو کوئی چیز ہے یہ ایسے بندھن تو نہیں جسے پرانے کپڑے کی [illegible] پھینکا جائے۔"

[illegible] ابراہیم کاروبار کے سلسلے میں تین ہفتے کے لئے باہر گئے ہوئے تھے۔ سلطانہ کو جو فیصلہ کرنا تھا خود ہی کرنا [illegible]۔ کچھ غصہ ٹھنڈا ہوا تو اس نے لاہور جانے کا پروگرام طے کر لیا۔ ساتھ رابعہ کو بھی لے جانا تھا۔ وہ [illegible] رابعہ کے کمرے میں آئی۔

رابعہ اپنے نرم نرم ریشمی بستر پر بے جان سی پڑی تھی۔ آنکھیں متورم تھیں۔ طبیعت بے طرح ہی [illegible] تھی۔ [illegible] لاہور سے خواب عالم میں تصور میں دیکھتے ہوئے بڑے ہی مضطرب اور بے چین ہو رہی تھی کمرے [illegible] ویران تھی۔ اترتے اندھیرے ماحول کو زیادہ ہی سوگوار بنا رہے تھے۔

سلطانہ چند لمحے خاموش کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ رابعہ ماں کو دیکھ کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اپنے دوپٹے کے [illegible] تلے دباتے اس نے بے صدا سسکی بھری۔

"[illegible] خیال لاہور جانے کا ہے رابعہ۔" سلطانہ کا دل بیٹی کی حالت دیکھ کر کٹنے لگا۔ رابعہ کچھ نہیں بولی۔ [illegible] جھکا لیا۔

"تم بھی چلو میرے ساتھ۔"

رابعہ نے جلدی سے نفی میں سر ہلا کر ماں کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔

"تمہیں بھی جانا ہوگا رابعہ۔" سلطانہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"نہیں امی۔ میں نہیں جاؤں گی۔" رابعہ گھٹنوں پر سر رکھ کر رو دی۔

سلطانہ چند لمحے پریشان سی کھڑی رہی۔ پھر رابعہ کے پاس بیٹھ کر پیار سے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ [illegible] تذبذب میں تھی۔ خود بھی کچھ نہ پا رہی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔

"اس بات کو جیسے بھی ہو سمیٹنا پڑے گا۔ ورنہ۔ ہم تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔" [illegible] والی۔

"امی۔" رابعہ بے تاب ہو کر ماں کی گود میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

سلطانہ کا دل بھی بھر آیا۔ لیکن ضبط کیے رہی۔ بیٹی کی تسلی کے لئے اس کے منہ سے کوئی لفظ بھی نہ نکل سکا۔

رات رابعہ سو نہ سکی۔ حسن کے ساتھ گزارے ہوئے حسین لمحے تصور میں آگ لگاتے [illegible] دل کے ساتھ ان لمحات کا تجزیہ کیا۔ اسے محسوس ہونے لگا۔ کہ حسن محبت کے اس کھیل میں اکیلا [illegible] تھا۔ بیٹھے بیٹھے مضطرب ہو جاتا۔ باتیں کرتے کرتے کھو جاتا۔ ہنستے ہنستے آنسو بن جاتا۔ اور مسکراتے [illegible] بین ہو جانا اس کھیل میں حسن کا معمول تھا۔

لیکن اس نے اس بات کو کبھی اہمیت نہ دی تھی۔ حسن کی محبت تو جیسے ہوا بند تھی۔ پانی سیلاب ہو [illegible] بہا تھا۔ رابعہ بیچاری معصوم سی لڑکی اس بہاؤ کے ساتھ بہہ گئی تھی۔ بند ٹوٹنے کی وجہ یہ عمر کیسے کرتی؟

سلطانہ نے آخری فیصلہ رابعہ کو بھی ساتھ لے جانے کا کیا۔ لیکن اس کی نسوانیت اس کی اجازت [illegible]

سلطانہ نے حالات کی نزاکت اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو کچھ بھی نہیں بگڑا۔ لیکن [illegible] جانے سے حالات خوش گوار صورت اختیار کر لیں۔ تم اسے مجبور۔"

"مجھ سے یہ کچھ نہ ہو گا امی۔" رابعہ نے افسردگی سے کہا۔

"تم چلو تو سہی۔ کوئی غیروں کے ہاں جانا ہے۔ اپنی پھوپھی کے گھر جانا ہے۔"

"لیکن امی۔"

لیکن ویکن کچھ نہیں۔"

"میں انہیں مجبور نہیں کر سکتی امی۔"

"مجبور کرنے نہ کرنے کا کیا سوال؟ ہماری عزت بھی کچھ ہے کہ نہیں۔ خواہ مخواہ کی رسوائی [illegible] ہنسائی ہو گی۔"

"حسن کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے تھا۔"

"وہ جذبات کی رو میں بہنے لگا ہے۔ تو تم اسے کنارے لا سکتی ہو۔"

رابعہ نے انکار کیا۔ لیکن سلطانہ نے اسے ڈانٹ دیا۔ رابعہ کشمکش میں پڑ گئی۔ لیکن امی کے [illegible] ہو رہی گی۔ اور کچھ نہیں۔ تو وہ حسن سے اپنی خطا تو پوچھ سکے گی۔ جس کی وہ اتنی بڑی سزا اسے دے رہا [illegible]

سلطانہ نے لاہور پہنچنے کی اطلاع بذریعہ تار دے دی۔

حسن اپنے کمرے میں عالم اضطراب میں چکر لگا رہا تھا۔ پریشان سے پریشان ہوتا جا رہا تھا۔ سگریٹوں کے دو پیکٹ پھونک ڈالے تھے۔ لیکن قرار نہیں آیا تھا۔ سوچیں بکھر گئی تھیں۔

آج چھٹی تھی۔ صبح ہی صبح حسن درزی سے کپڑے لینے گیا تھا۔ بانو کے لئے اس نے کچھ کپڑے بنوائے تھے۔ کپڑوں کے رنگ اور تاثر اس نے ماضی کے مرغزاروں سے چننے کی کوشش کی تھی۔ اس نے اپنی یادوں کے سے کپڑے تیار کروائے تھے ہلکے گلابی رنگ کا جوڑا بھی بنوایا تھا۔ جو اس نے بانو کو سلیم کی شادی کے موقعہ پر پہنے ہوئے دیکھا تھا۔ اور پیازی پیازی ریشم کے پھسلتے لمحوں کا احساس جاگا تھا۔

اس نے زرد زمین پر ہلکے ہلکے نیلے پھولوں والی قمیض بھی سلوائی تھی۔ اس کے ساتھ سفید ململ کا دوپٹہ بھی تھا۔ بانو کو مصلے پر بیٹھے دعا مانگتے اس نے "تقریباً ایسے ہی کپڑوں میں دیکھا تھا۔ اس نے سفید بے داغ ریشمی جوڑا بھی تیار کروایا تھا۔ جو اس نے آخری بار بانو کو پہنے دیکھا تھا۔ وہ خوشی خوشی کپڑے لے کر گھر پہنچا۔

ان دنوں اس کی پر خلوص محنت رنگ لا رہی تھی۔ بانو کو وہ ماں باپ بھائی اور محبوب بن کر پیار دے رہا تھا۔ اس کے پیار، شفقت اور جان سوز محبت نے بانو کی ذہنی حالت پر بڑا خوش گوار اثر کیا تھا۔ وہ اب بہت کم بہکتی تھی، حالات کو سمجھ سکتی تھی۔ خاموش اب بھی تھی لیکن اس خاموشی میں دیوانگی نہیں فرزانگی تھی۔

اماں کا رویہ بھی اب قدرے سلجھنے لگی تھی۔ جوں جوں وہ سرد مہری پر اتر رہی تھی۔ توں توں اسے اپنی کم مائیگی، بے بسی کا احساس زیادہ ڈسنے لگا تھا۔ کسی وقت تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کا دم گھٹ جائے گا۔ اگر اب دم گھٹ بھی جائے تو اس سے بڑی سعادت کیا ہوگی۔ پاکستان کی مٹی میں ملنا ہی تو اس کی سب سے بڑی آرزو تھی۔

حسن کپڑوں کا لفافہ لیے صحن میں آیا اماں غسلخانے سے نکل رہی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" انہوں نے روکھے لہجے میں پوچھا۔

"کپڑے"

"اپنے۔"

"جی نہیں۔ بانو کے ہیں اماں۔"

اماں کے ماتھے پر خنک سی شکن پڑی۔ لیکن وضعداری جانتی تھیں۔۔۔ خوش ہونے کی [illegible]
بولیں۔ "یہ تم نے اچھا ہی کیا۔ اس کے پاس کوئی کپڑا ہی نہیں۔ میرے دو میلے اجاڑے پڑے [illegible]
تھی۔ میں سوچ ہی رہی تھی۔ کہ تمہیں کہوں۔"

"میں نے آپ کی سوچ پہلے ہی محسوس کی کر لی۔" حسن نے آہستگی سے کہا۔ اماں سے کہا [illegible]
وہ کچھ بے چین سا ہو گیا تھا۔

"لاؤ میں اسے دے آؤں۔" اماں نے حسن سے کپڑے لینے چاہے۔

"نہیں اماں۔ میں خود اسے دوں گا۔" حسن نے بجھتی آواز میں کہا۔

اماں کے چہرے پر ناگواری کی لہر دوڑ گئی۔ ہاتھ میں پکڑا لوٹا صحن کے ایک طرف رکھ [illegible]
گئیں۔ حسن نے اندر جانے کو قدم اٹھایا۔

"حسن" اماں نے اسے پکارا۔

"جی" وہ سعادت مندی سے رکتے ہوئے بولا۔

"یہ کپڑے دے کر میرے پاس آنا۔"

"کیوں اماں۔"

"کچھ کام ہے۔"

"ابھی کہہ دیجئے۔"

اماں بے حد سنجیدہ نظر آ رہی تھیں۔ چہرہ گھما کر انہوں نے حسن کی طرف آہنی نظروں سے دیکھا [illegible]
نے آخر کیا فیصلہ کیا ہے۔"

"کیسا فیصلہ اماں؟"

"اپنے مستقبل کا۔"

حسن سوگواری ہنسی ہنسا۔ اماں کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔

"اماں" حسن کپڑوں کے لفافے کو سینے سے لگاتے ہوئے مستحکم آواز میں بولا۔ "کیا ایک ہی بات [illegible]
روز دہرانی پڑے گی۔"

"تو تم نے اٹل فیصلہ کر لیا۔" اماں کی آواز میں بلا کی چبھن تھی۔

"اماں" اس نے سنجیدہ اور پر وقار آواز میں کہا "خود کیے جانے والے فیصلوں اور خود بخود ہو جانے والے فیصلوں میں فرق ہوتا ہے۔" اماں نے ماتھے پر شکنیں ڈال کر بے تکلفی سے اسے دیکھا۔

"اماں بانو ایسا فیصلہ ہے جو خود بخود ہو گیا۔ اس میں اب ترمیم ہو سکتی ہے نہ اسے فسخ کیا جا سکتا ہے۔"

آہنی وفولاد کا تاثر لئے اس نے اماں کو دیکھا۔ اماں کا بس نہ چلتا تھا۔ جو اسے جنجھوڑ جنجھوڑ کر اس فیصلے پر نظر ثانی کا کہہ سکتیں۔

حسن اماں کے رویے سے بے چین اور اداس نظر آنے لگا۔ بانو کے لئے کپڑے لانے کی خوشی مجروح ہو گئی۔ تھکے تھکے قدموں سے وہ بانو کے کمرے میں گیا۔

"بانو۔" اس نے کمرہ خالی دیکھ کر پکارا۔

بانو غسل خانے میں بچے کو نہلا رہی تھی۔ حنیف کے پوتے کے کپڑے جو اس نے کل شام بھیجے تھے۔ بچے کو پہنانے کے لئے قریب رکھے تھے۔ حسن کی آواز پر چونک کر اس نے بچے کو چھوڑ دیا۔

بانو آج کل عجیب سی شش و پنج میں تھی۔ یہ بچہ اس کے لئے تشویش ناک مسئلہ تھا اب وہ قدرے حواس میں آ گئی تھی۔ بچے کا وجود سوچوں پر بار رہتا۔ وہ اسے دیکھتے ہوئے سوچوں میں گم رہتی۔ یہ ہنستے کھیلتے کا بچہ تھا۔ اس کے آلام کی کہانی تھی۔ جبر و استبداد کی نشانی تھی۔ لیکن جو کچھ بھی تھا۔ اس بچے کو اس نے اپنے بطن سے جنم دیا تھا۔ ممتا بے مذہب ہوتی ہے۔ لیکن اس ممتا کے برملا اظہار سے بھی ڈرتی تھی۔ حسن نے اسے جو سہارا دیا تھا۔ یہ اس پر گراں بار تھا۔ اس نے حسن کی آنکھوں میں اس بچے کے لئے نفرت اور قہر کی جھلسا دینے والی آگ اکثر دیکھی تھی۔ وہ خود بھی اسے اپنے وجود سے الگ کر لینا چاہتی تھی۔ لیکن کر نہ سکتی تھی۔ اور جب وہ ایسا سوچتی اس وقت وہ بانو ہوتی نہ سندر کور۔ صرف ماں ہوتی۔

ماں!

اماں کا رویہ بھی بچے سے ظالمانہ سا تھا۔ نفرت اور کراہت کے اظہار میں پیش پیش تھیں۔ وہ کسی کو ہاتھ بانو کے احساسات کا خیال کئے بغیر برتنے کو فوراً برتن مانجھ کر پاک کرنے کا حکم دیتیں۔ چارپائی پر چڑھ جاتا تو دھکا دے کر اتار دیتیں۔ کسی حد تک اس رویے پر حق بجانب بھی تھیں۔ اس بچے سے انہیں کیا لگاؤ ہو سکتا تھا۔

"بانو۔" حسن نے پھر اسے پکارا۔

غسل خانے کے ادھ کھلے دروازے کو حرکت ہوئی۔ بانو گیلے ہاتھوں کو دوپٹے سے پونچھتی باہر نکل آئی۔ اس کا چہرہ کسی طور شگفتہ نہیں تھا۔ الجھاؤ کے بے شمار زاویے تھے۔ جو پکار پکار کر اس کی ذہنی پریشانی کا اظہار کر

رہے تھے۔

"یہ تو ..." حسن اماں کی وجہ سے خود بھی پژمردہ ہو رہا تھا۔

"یہ ... کیا ہے؟" بانو نے نظریں جھکائے جھکائے پوچھا۔

"کھول کر دیکھو" حسن نے لفافہ پلنگ پر ڈال دیا۔

بانو نے لفافے پر نگاہ ڈالی۔ حسن نے اسے پلنگ پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "لو خود ہی نکالو۔"

بانو نے لفافے سے کپڑے نکالے۔ گلابی جوڑا۔ زرد نیلے پھولوں والی قمیض، سفید ریشمی ہوا۔ حسن نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ "یاد کرو۔ یہ کپڑے تم نے کس کس موقعہ پر پہنے تھے۔"

بانو ٹکر ٹکر ان کپڑوں کو یوں دیکھنے لگی جیسے ان سے مانوس ہو۔

"پہچانتی ہو انہیں۔" حسن نے انتہائے شوق سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

لیکن وہ ان کپڑوں کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتے ہوئے خدا جانے کہاں کھو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر درد و کرب کے ایسے طوفان تھے۔ کہ حسن تڑپ گیا۔ اسے اپنی غلطی کا اس وقت شدت سے احساس ہوا۔ یہ زخموں کے بھرے منہ میں نشتر گھنگھولنے کے مترادف تھا۔ اس کی حالت سے بے خبر ان کپڑوں کو آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی تھی۔ اپنے زرد زرد ہاتھوں سے انہیں چھو کر دیکھ رہی تھی۔

"بانو"۔ حسن نے اس کا کندھا چھوا۔

بانو نے اپنی ویران سی نظریں اس کی جانب اٹھائیں۔

"یہ ... یہ ... کپڑے۔"

"ہاں بانو۔" حسن نے مسکرانے کی ناتمام کوشش کی۔

"کیوں لائے ہو۔"

"پہنو نا انہیں"

بانو نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کیوں بانو" حسن بانو کے سامنے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گیا۔

"انہیں پہن کر بھی میں وہ بانو نہیں بن سکوں گی۔ جسے تم تلاش کر رہے ہو۔" بانو نے دکھ سے کہا۔

"بانو۔"

"مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔" وہ اٹھنے کو تھی۔

"بانو۔" حسن نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔ اور گلابی کپڑے بانو کو تھماتے ہوئے بولا۔ "میری خواہش ہے بانو۔ تم یہ کپڑے پہنو۔"

بانو نے بے چینی سے پھر سرتکیے میں ہلا دیا۔ وہ ویران نظروں سے ان کپڑوں کو دیکھ رہی تھی۔ یادیں تیز سے گہری ہونے لگی تھیں۔

"بانو۔ میری بات نہیں مانو گی؟" حسن نے اس کی آنکھوں میں اداسی سے دیکھا۔

"حسن میں وہ بانو ہوں نہیں۔" اس نے دکھ کی تیز دھار کی سی آواز میں کہا۔

"بانو.... تم.... بانو ہو۔ میرے لئے اتنا ہی کافی ہے۔" حسن نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"میں بانو نہیں۔ اس بانو کا مزار ہوں۔" بانو کی آنکھوں میں دھواں پھیلنے لگی۔

"پگلی۔" حسن یوں ہنسا۔ جیسے حلق میں آنسو اتر رہے ہوں۔"

"مٹی کے ڈھیر میں روح پھونکنے کی کوشش فضول ہے۔ ان مزاروں۔" وہ بڑبڑائی۔

"ہم مزاروں سے عقیدت رکھنے والے لوگ ہیں۔" حسن نے پیار سے اس کی ٹھوڑی کو چھوا۔ اور پھر ذرا سخت کر کے بولا۔ "چلو اٹھو۔ تمہیں کتنی بار منع کیا ہے۔ پچھلی باتوں کو اس انداز سے نہ سوچا کرو۔ ماضی مر چکا ہے۔ حال سے اس کا کوئی رابطہ نہیں ہوتا۔"

بانو مسکرائی۔ یوں جیسے جاں بلب مریض کے چہرے پر گھٹتے سانسوں کا تار ہوتا ہے۔ حسن کو یوں لگا جیسے اس کا دل سینے میں اس دکھ سے پھٹ جائے گا۔

غسل خانے میں بچہ نل کے نیچے پانی سے کھیلتے ہوئے اوٹ پٹانگ آوازیں نکال رہا تھا۔ بانو نے دھیرے دھیرے سر گھمایا اور غسل خانے کے ادھ کھلے پٹ سے اندر دیکھنے لگی۔

حسن نے جلدی سے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اپنی طرف گھمایا۔

"پیچھے لوٹ کر دیکھنے کی بجائے آگے دیکھا کرو۔" حسن نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

بانو کی دکھی مجروح نظریں حسن کی تنومند نظروں سے ملیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ حسن مضطرب سا اسے دیکھنے لگا۔

غسل خانے میں نہاتے نہاتے بچے کو جانے کیا سوجھی۔ بھاگتا ہوا کمرے میں آیا اور ایک جست مار کر پلنگ پر چڑھ گیا۔ ریشمی کپڑے اس کے بدن سے ٹپکتے پانی سے گیلے ہو گئے۔

"کم بخت۔" حسن نے گھسیٹ کر بچے کو پلنگ سے اتارا۔ اس کی آنکھوں میں شعلے سے بھڑکنے لگے۔ اسے یوں لگا۔ جیسے کسی مزار کے مقدس غلاف کو اس نے نجس کر دیا ہو۔

بچہ رونے لگا۔ بانو نے بچے کو تھام لیا۔

"میں سوچ رہا ہوں اسے کسی یتیم خانے میں داخل کروا دیا جائے۔" حسن نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "جب تک یہ تمہارے ساتھ چپکا رہا۔ تم اپنے آپ میں نہ لوٹ سکو گی۔"

"حسن" بانو کی آواز تھرتھرا گئی۔

"خدا جانے یہ تھرتھراہٹ خوشی کی تھی یا احتجاج کی۔"

بانو سخت بے چین تھی۔ اور حسن اس سے بھی کہیں زیادہ مضطرب۔

اپنے کمرے میں آ کر بھی وہ پر سکون نہ ہوا۔ ابھی اپنی انہی سوچوں میں سلطانہ تار لے کر آ گئی۔ اماں نے تار پہلے ہی ڈاکیے سے پکڑ لیا تھا۔

"یہ کیا ہے؟"

"تار۔"

"کہاں سے آیا۔"

"کراچی سے"

حسن نے جلدی سے تار کھول کر پڑھا۔ یہ کہتے واپس چلی گئی۔ سلطانہ کے ساتھ ساتھ راحیل بھی آ رہی تھی۔ حسن کا سر چکرا گیا۔

سوچیں آپس میں ٹکرانے لگیں۔ وہ پریشان سے پریشان تر ہوتا گیا۔ سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتا رہا۔ لیکن قرار!

قرار شاید اس کی تقدیر میں باقی نہیں تھا

گاڑی صرف پانچ منٹ لیٹ تھی۔ حسن پلیٹ فارم پر کھڑا تھا۔ سٹیشن کی بھیڑ کے باوجود وہ تنہا الگ تھلگ تھا۔ چہرہ انتہائی پریشان تھا۔ آنکھیں جیسے لہریں لیتے ہوئے اضطراب کی جھیلیں تھیں۔ سینے کا زیر و بم بھی غیر متوازن سا تھا۔ کبھی گھٹ کر آہیں رکتیں۔ کبھی لمبے لمبے گہرے گہرے سانس آنے جانے لگتے۔

رابعہ آ رہی تھی۔ اس خیال ہی سے اس کے رگ و پے پر گھبراہٹ مسلط ہو رہی تھی گھبراہٹ اس لئے نہ تھی کہ اس کا آنا اس کے لئے جذباتی ہیجان کا باعث تھا۔ گھبراہٹ بانو کی وجہ سے تھی۔ ان دنوں حسن کی کاوش تھی کہ وہ اسے اپنے اعتماد میں لا کر اس شکستہ خول میں بانو کی روح سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گو وہ پوری طرح کامیاب نہ تھا۔ لیکن پھر بھی حالات امید افزا تھے۔

کل بانو نے اس کے اصرار کے باوجود گلابی کپڑے نہ پہنے تھے۔ بچے کو بھی سارا دن اپنے قریب رکھا تھا۔ لیکن شام اس نے خدا جانے کیا سوچ کر وہ گلابی ریشمی لباس پہنا تھا۔ حسن کو یہ کپڑے پہن کر دکھانے وہ اس کے کمرے میں خود ہی چلی آئی تھی۔

حسن رابعہ کے تار سے پریشان نہ ہوتا۔ تو جانے ماضی کی وہ یاد بے اختیار ہو کر دہرا دیتا۔ جب اس نے ریشمی لباس میں اس کی پہلی بار کلائیاں پکڑ کر شادی کے ہجوم سے ایک طرف کھینچا تھا۔ وہ ذہنی انتشار کے باوجود کل سے بانو کے قریب آیا تھا۔

"ماضی مرجاتا ہے حسن۔ تم کہتے تھے ناماضی مرجاتا ہے۔ میں ــــ میں وہی بانو بن جاؤں گی نا ــــ وہی حسن ۔۔ تم ــــ کہیں سے پپی کو بھی لے آؤ۔ ثریا بھابی۔ سلیم"

بانو کی آنکھوں میں صحت مندی کی چمک نہ تھی۔ بہکنے کی دھول تھی۔ حسن کا شوق تڑپ گیا۔ بانو کپڑوں کو دیکھ کر سسکنے لگی تھی۔

حسن نے اسے گلے لگا کر روتے دیا تھا۔ پھر رات وہ پوری طرح حواس میں آ گئی تھی۔ افسردہ ــــ پژمردہ

خستہ حال۔۔۔ شکستہ شکستہ' چور چور نظر آنے کے باوجود وہ ہوش میں تھی۔ حسن بانو کی ذہنی اور دلی حالت سے آگاہ تھا۔ لیکن رابعہ؟

کیا وہ انتقام بن کر بانو پر ٹوٹ پڑے گی۔۔؟ اس بال آئے آئینے کو حفاظت اور احتیاط سے [illegible] ایک ہی ٹھوکر سے توڑ پھوڑ ڈالے گی؟ بانو کو ذرا بھی محسوس ہو گیا۔ کہ میں نے اس کی محبت سے غداری کی تھی تو اس کی کیا حال ہو گا۔۔۔؟ رات بھر حسن انہی خطوط پر سوچتا رہا تھا۔ اس نے پیش بندی کے طور پر رابعہ کو [illegible] سمجھانے کا سوچا تو تھا۔ لیکن رابعہ کے ردعمل کا اسے کیا پتہ چل سکتا تھا۔

اور۔۔۔ پھر۔۔۔ رابعہ؟

رابعہ کا بھی تو اسے احساس تھا۔ اس نے حسن سے محبت کی تھی۔ جرم نہیں کیا تھا۔ خود اس نے [illegible] محبت کو جذباتی سہارا نوٹ کر دیا تھا۔ قصوروار تو وہ تھا غداری تو اس نے کی تھی۔

اس کا دماغ کچے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ وہ شکنجے میں آیا ہوا تھا۔۔۔ کشمکش سے لمحہ لمحہ [illegible] تھا۔ مشکلات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ گھر کا ماحول پہلے ہی گھٹا گھٹا تھا۔ اب اگر سلطانہ اور رابعہ کے آنے سے گھٹن اتنی بڑھ گئی۔ کہ بانو سے سانس لینا بھی دشوار ہو گیا۔ تو۔۔۔ تو۔۔۔ وہ کیا کرے گا؟

یہ کیا؟ گھبراہٹ بن کر اس کے رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا۔

گاڑی کا بھک بھک کرتا انجن دور سے دکھائی دیا۔ اسٹیشن پر ہلچل سی مچ گئی۔ لیکن حسن کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا دل ساکت ہو گیا ہے۔ گاڑی نہیں آ رہی اس کی موت آ رہی ہے۔

لیکن موت کا سامنا اسے کرنا ہی تھا۔

گاڑی آہستہ آہستہ پلیٹ فارم پر رک رہی تھی۔ حسن جامد سا کھڑا اس کے رینگتے ڈبوں کو دیکھ رہا تھا۔

فرسٹ کلاس کی کمپارٹمنٹ میں اسے سلطانہ کا چہرہ نظر آیا۔ بوجھل قدموں سے وہ اس طرف بڑھا۔ اس کے پاؤں میں سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ اور اپنے اونچے لمبے وجود کا توازن برقرار رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

کمپارٹمنٹ کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی سلطانہ گاڑی کے دروازے سے باہر نکل رہی تھی۔ قلی کو اس [illegible] سامان نکالنے کو بھی کہہ دیا تھا۔ حسن کی نظر سلطانہ کے پیچھے اترنے والی رابعہ پر پڑی۔

اس کا دل بیٹھ گیا۔ اس کا دماغ گھوم گیا۔ چند لمحے وہیں رک کر اس نے اپنے آپ کو سہارا دیا۔

قلی نے سامان نکال لیا۔ دو ہی تو اٹیچی کیس تھے۔

حسن اپنے آپ کو گھسیٹتے ہوئے ان کے قریب پہنچا۔ سلطانہ کو سلام کیا بڑے ہی ٹھنڈے لہجے میں [illegible] جواب ملا۔ حسن نے رابعہ کی طرف دیکھا۔

ہلکے زرد رنگ کے سوگوار سے لباس میں وہ اتنی پرکشش لگ رہی تھی۔ کہ حسن کی نگاہیں الجھ گئیں [illegible]

...ادائی حسن اور بہاروں کا دامن پکڑ لینے کی قدرت رکھتی ہی ہے۔

"...ابھی تو ہو۔" حسن نے اس کے قریب کھڑے بھاری آواز میں زمی سے انداز میں کہا۔ رابعہ کسی جرمال... کی آنکھ کا خشک ہوا آنسو لگ رہی تھی۔ کسی بیوہ کے سپاٹ اور ویران چہرے کی دائمی مایوسی نظر آ رہی تھی۔ ...کی احوال پرسی کے لئے جواب وہ خشمناک نظروں سے گھور کر طنزیہ انداز میں دیتی۔ تو شاید حسن اس ...جوش انتقام کو بہہ جانے کی اور بھی راہ دیتا۔ لیکن وہاں تو مایوسی کی تڑپ کے اور کچھ تھا ہی نہیں۔ سر جھکاتے ...ہوئے اس نے جلدی سے اپنا کالا چشمہ بٹوے سے نکال کر آنکھوں پر لگا لیا۔ حسن نے بے چینی سے کئی پہلو ...بدلے۔

قلی نے سامان اٹھا لیا۔ تینوں خاموشی سے اس کے پیچھے چلنے لگے۔

سلطانہ نے خشک لہجے میں ایک دو باتیں کیں۔ لیکن حسن الجھا ہوا تھا۔ کوئی جواب دے نہ سکا۔ اس نے گاڑی کو پچھلا دروازہ کھولا۔ سلطانہ بیٹھ گئی۔ دوسری طرف کھسک کر اس نے رابعہ کے لئے بھی جگہ بنائی۔ لیکن رابعہ کے بیٹھنے سے پہلے ہی حسن نے پچھلا دروازہ بند کر کے اگلی سیٹ رابعہ کے لئے پیش کر دی۔

رابعہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔ حسن کی اس حرکت سے سلطانہ کو کچھ حوصلہ ضرور ہو گیا سامان رکھوا کر حسن اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ رابعہ کی طرف دیکھنے کی اسے جرات نہ ہو سکی۔ راستہ خاموشی ہی میں کٹا۔ گریہ خاموشی طوفان سمیٹے ہوئے تھی۔

گھر کے سامنے حسن نے گاڑی روک لی۔ تاجاں کا شوہر دروازے پر کھڑا تھا۔ حسن نے اشارے سے اسے بلایا۔

سلطانہ دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ رابعہ نے بھی اپنی طرف کا دروازہ کھولنے کو ہاتھ بڑھایا۔ حسن نے سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اس کا ہاتھ پکڑ کر رک جانے کا اشارہ کیا۔

رابعہ نے حسن کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ تاجاں کے شوہر سے اٹیچی کیس اٹھا کر اندر لے جانے کا کہہ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک حسن کے ہاتھ میں تھا۔

"آپ اندر چلئے ممانی۔ ہم تھوڑی دیر بعد آتے ہیں۔" سامان لے جانے کے بعد حسن نے سلطانہ کی طرف دیکھے بغیر بھاری آواز میں کہا۔

سلطانہ کی آنکھوں میں جیسے ستارے چمکنے لگے۔ سارا راستہ وہ اپنی سوچوں سے الجھتے آئی تھی۔ لیکن سٹیشن سے گھر تک اس کی سوچیں خوش گوار کروٹیں لے چکی تھیں۔

ہونٹوں پر پھیکا سا تبسم بکھیرے اس نے حسن کو سر کے خفیف اشارے سے جانے کی اجازت دے دی۔ حسن نے اک گہری ٹھنڈی آہ بھر کر گوشہ چشم سے رابعہ کو دیکھا۔ مٹی کے بے جان بت کی طرح وہ سیٹ پر بیٹھی

تھی۔

گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے اس نے دوبارہ رابعہ کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی سرنگوں بیٹھی تھی۔ [illegible] دی۔ اس پتلی گلی سے نکل کر کشادہ سڑک پر آئی اور پھر پوری رفتار سے شفاف سڑک پر دوڑنے لگی۔ [illegible] سڑکیں بدلیں۔ مہیب سی خاموشی میں فاصلے ماپے گئے۔

آبادی سے دور حسن نے گاڑی سنسان سڑک کے کنارے روک دی۔ وہ رابعہ کو [illegible] ہونے سے پہلے پوری صورت حال سے باخبر کرنے یہاں لایا تھا۔ وہ اسے بانو کے ماضی و حال سے [illegible] تھا۔ بانو کی عظیم قربانی کا احساس دلانا چاہتا تھا۔ اس کی ذرہ بھر بھی دل آزاری سے رو گئے کے [illegible] گاڑی رک گئی۔

وہ سٹیرنگ پر ہاتھ رکھے کئی لمحے سوچتا رہا۔

رابعہ اپنا سیاہ چشمہ ہاتھوں میں لئے خاموشی سے چشمے کو دیکھتی رہی۔

"رابعہ۔" اچانک حسن نے گردن موڑی اور بھرپور نظروں سے رابعہ کو دیکھا رابعہ نے بھی [illegible] دونوں کی نگاہیں ملیں۔ اضطراب کے لمحے مچلے۔ حسن نے درد کی اذیت ناک لہر جیسے [illegible] کی۔

"حسن۔" رابعہ کی گھٹی ہوئی چیخ نکل گئی۔ خوبصورت آنکھوں میں ساون کی لہراتی گھٹائیں مچل گئیں [illegible] بے قابو ہو کر اس نے چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔

وہ رو رہی تھی۔ اس طرح رو رہی تھی۔ کہ حسن کا دل تڑپنے لگا۔ معصوم بے گناہ لڑکی کس جرم کی [illegible] رہی تھی۔ حسن کھڑکی میں لگائے ہتھیلی پر ماتھا رکھے "آنکھیں بند کئے سوچ میں ڈوبا تھا۔ اس کا دوسرا ہاتھ [illegible] تھا۔

"حسن۔" روتے روتے رابعہ کی فریاد بکھر گئی۔ بے اختیار ہو کر اس نے اپنا سر حسن کے کندھے [illegible] لگا دیا۔

حسن تھرا گیا۔ جس مقصد کے لئے رابعہ کو یہاں لایا تھا۔ اس کے اظہار کی جرأت نہ رہی۔ [illegible] چاہئے۔ وہ تو اتنا بھی سوچنے کے قابل نہ رہا تھا۔ چکی کے دو پاٹوں میں پسنے والے دانہ گندم کی سی حالت تھی۔ [illegible] رابعہ کا سر کندھے سے ہٹا سکا۔ نہ اس کی تسلی اور تشفی کے لئے اس سر پہ ملائمت سے ہاتھ ہی پھیر [illegible] گھبرا کر اس نے گاڑی چلا دی۔

رات حسن پر بھاری تھی۔ رابعہ کی تڑپ نے اسے تڑپا دیا تھا۔ اس بیچاری کا قصور بھی کیا۔ جو اس کے حسین سپنے خواب یوں بکھر گئے۔

حسن نے تین دن اور تین راتوں کی مسلسل سوچ کے بعد منگنی کی انگوٹھی انگلی سے اتار کر اک فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن یہ فیصلہ اتنا سہل نہیں تھا۔ جتنا اس نے سمجھا تھا۔ رابعہ کو دیکھ کر اسے دکھ ہوا تھا۔ اس کے رونے سے تو وہ بری طرح پریشان ہو گیا تھا۔

بستر پر جوتوں سمیت چت لیٹا سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتے وہ حالات کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے یہ سب کچھ یوں لگ رہا تھا۔ جیسے وہ رسہ کشی کے کھیل میں استعمال ہونے والا رسہ ہے۔

ایسا خط مستقیم ہے۔ جس کا وجود ایک نقطے سے شروع ہو کر دوسرے پر ختم ہو جاتا ہے۔ کانچ کا وہ نازک برتن ہے۔ جو کسی سیال شے سے لبالب بھرا ہے۔ سیال شے جو ماسوا درد کے اور کچھ نہیں۔

یہ سیال شے معمولی سی بے احتیاطی سے بہہ سکتی تھی۔ کانچ کا نازک برتن معمولی سی ٹھیس سے کرچیاں بن سکتا تھا۔ وہ نازک لمحہ آن پہنچا تھا۔ اب احتیاط اور بے انتہا احتیاط کی ضرورت تھی۔

بانو کو وہ کسی قیمت پر چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ وہ اب صرف محبت نہیں فرض بھی تھی۔ وہ اس کی بہاروں کی روداد تھی۔ وہ اس تک آگ اور خون کی ندیاں پار کر کے پہنچی تھی۔ زخموں سے چور چور۔ نڈھال۔ پژمردہ ... بانو کو سہارا دینا اس کا اخلاقی فرض تھا۔ پھر کچھ دل کے تقاضے بھی تو ہوتے ہیں۔

کسی اور کو اعتراف تھا یا نہیں۔ اس کا تو رواں رواں بانو کی عظمت کے سامنے سجدہ ریز تھا۔

لیکن رابعہ بھی اس کا انتخاب تھی۔ اسے چھوڑتے ہوئے بھی دکھ ہوتا تھا۔ ظلم کا احساس جاگنے لگتا تھا۔ وابستگی کے پیمانے بھی چھوٹے تھے۔ اس نے رابعہ کے جسمانی لمس سے اپنے تشنہ جذبات کو آسودہ کیا تھا اس نے منگنی کی شب بیتابی کی انتہا کو چھوتے ہوئے اس کے لرزتے کانپتے ہونٹوں کو اپنے جذبات کی حدت سے دہکتے

ہونٹوں سے چھو لیا تھا۔ اس نے رابعہ جیسی معصوم لڑکی کو جذبات کے ... [illegible]

تھی۔ رابعہ نے اسے معبودوں کا معبود سمجھ لیا تھا۔

لیکن اب! وہ اپنی جراتوں اور بے باکیوں کی سزا رابعہ کو دینا چاہتا تھا؟

لیکن اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ زندگی کی بہاروں سے منہ موڑ کر اسے ... [illegible]

تھا۔

بانو سے شادی کرے یا نہ کرے۔ بہر حال اسے عمر بھر اس کا سہارا بننا تھا۔ وہ اپنی ... [illegible]

تیار تھا۔

تھری کیسل کی تیسری ڈبیہ سے آخری سگریٹ نکال کر اس نے ہونٹوں میں دبایا ... [illegible]

کر پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ ماچس کی تیلی جلائی۔ سگریٹ سلگا کر ہاتھ کے جھٹکے سے تیلی بجھا ... [illegible]

بار ہاتھ سے بھی یہی حرکت کی پھر تیلی پھینک کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

گھڑی دیکھی رات کے دو بج چکے تھے۔ کرب و اذیت کے تاریک لمحے ابھی باقی تھے ... [illegible]

بوٹوں کے تسمے کھولے۔ قمیض کے بٹن بھی کھول دیئے۔ کتنی دیر ننگے پاؤں کمرے میں گھوم ... [illegible]

تبدیل کئے اور بستر پر آ کر لیٹ گیا۔

نیند اب بھی آنکھوں میں حسرت بن کر بیدار تھی۔ رابعہ بھی اضطراب و انتشار سے دوچار تھی ... [illegible]

نے بانو کو دیکھا۔ لیکن خدا جانے اس کھنڈر میں اسے کونسی بات نظر آئی۔ دل کر فریبی ... [illegible]

ہمک کر اقرار کرنے کی سعی کی۔ کہ ان کھنڈروں کی دیکھ بھال اشد ضروری ہے۔ اس ... [illegible]

بانو کو سہارا دینے میں حق بجانب ہے۔ لیکن اس کے دل کے بھی تو کچھ تقاضے تھے۔ پھر ... [illegible]

تھی۔ اپنے پرائے سب جانتے تھے۔ یہ بندھن ٹوٹ گیا۔ تو اس کے علاوہ اس کے والدین کی ... [illegible]

رسوائیوں کا ڈر تھا۔

رات ختم کر گزر رہی تھی۔ رابعہ کبھی کشمکش و پیچ میں پڑ جاتی۔ کبھی اپنی معصوم ... [illegible]

کے قابل ہوتی ہے۔

ادھر بانو بھی بے چین تھی۔ خواب آور گولیاں کھانے کے باوجود نیند اچک چالی تھی۔ ... [illegible]

جتی اور ہم آہنگی بہت حد تک لوٹ تو آئی تھی۔ تاہم ذرا سے الجھاؤ سے یہ تسلسل ... [illegible]

رات سلطانہ کو وہ اپنی رام کہانی سناتی رہی تھی۔ سلطانہ خاصی متاثر بھی ہوئی تھی۔ ... [illegible]

رابعہ نے بھی اس کی روداد سن کر آنسو بہائے تھے۔ بانو چند باتیں صحیح کرنے کے بعد وہ ... [illegible]

تھی۔ رابعہ کو اس نے بڑے غور سے دیکھا تھا۔ سلطانہ سے اس کے متعلق پوچھا تھا۔ اس ... [illegible]

...کے بتانے کے باوجود وہ کئی بار ان کے متعلق پوچھ چکی تھی۔

"...کون ہے؟" اس نے رابعہ کو گہری گہری نظروں سے دیکھتے کئی بار پوچھا تھا۔ سلطانہ کو اس کی ذہنی ...ک گزرا تھا۔ اور رابعہ اس کے لئے دل میں ہمدردی محسوس کرنے لگی تھی

...ا جاتے با تو رابعہ کے متعلق پوچھ کر وقتی بھول جاتی تھی۔ یا اس کی چھٹی حس یہ احساس دلا رہی تھی۔ ...ف رابعہ ہی نہیں کچھ اور بھی ہے۔ بستر پر کروٹیں بدلتے وہ رات بھر رابعہ کے متعلق کچھ جاننے کی کوشش ...تی تھی۔ کبھی اس کا نام ذہن سے نکل جاتا کبھی اس کا وجود یاد نہ رہتا۔

رات اور بیجین کی نظر ہو گئی۔

گھر کی ساری فضا بوجھل تھی۔ سلطانہ رات اماں کے کمرے میں سوئی تھی۔ بانو سے زیادہ سوچوں نے ...کھا تھا۔ بانو کی زہرہ گداز داستان سن کر ترس بھی آیا تھا لیکن بیٹی کا مفاد اور اپنی عزت کا بھی خیال تھا۔ بانو کی ...صحت مشکوک تھی اسے سہارے کی ضرورت سے انکار نہیں تھا۔ لیکن ضروری نہیں تھا۔ یہ سہارا حسن ہی ...۔ اماں ماں بن کر سہارا دے سکتی تھی۔ سلطانہ عورت بن کر اسے تھامنے کو تیار تھی۔

...م ماحول اور فضا کھنچاؤ سے بھرپور تھا۔ سب نے شاید اپنی الجھنوں سے نپٹ کر اٹل فیصلے کر لئے تھے۔ ...شب بیداری اس کی سرخ آنکھوں اور سپاٹ چہرے سے عیاں تھی۔ لیکن اٹل فیصلے کی جھلک اس کی چال ...ال سے کافی عیاں تھی رابعہ مجروح نظر آ رہی تھی۔ بانو اسے دیکھ دیکھ کر ہنس رہی تھی۔

اس شام سلطانہ اماں اور حسن کے درمیان خاصی بحث ہوئی۔ سلطانہ جوش میں بھی آئی گھٹ کر بھی بولی۔ ...و پہلو بھی اختیار کیا۔ لیکن حسن اپنے فیصلے پر چٹان کی طرح قائم تھا۔ کل رات کی جذباتی کمزوری پر وہ پوری ...طرح قابو پا چکا تھا۔

"مجھے تو بانو کی ذہنی صحت بھی مشکوک لگتی ہے۔" سلطانہ نے منہ بنا کر کہا۔ "ایسی حالت میں تم اس ...شادی۔"

"...ماں۔" حسن نے مضطرب ہو کر کرسی پر پہلو بدلا۔ "شادی...! آپ شادی کو اتنی اہمیت کیوں ...دیتی۔"

"تو کیا تم اس سے شادی کا ارادہ نہیں رکھتے۔"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بانو ابھی پورے طور پر حواس میں نہیں آئی۔ یہ فیصلہ اس کی ...خوشی اور رضا پر ہے۔ شادی ہو یا نہ۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بانو کو سہارے کی ضرورت ...ہے اس۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں۔"

"...بات ہے۔"

"جی"

"سہارا صرف تم ہی دے سکتے ہو۔"

میں بھی سمجھتا ہوں"۔

"بانو کو میں اپنے سینے سے لگا کر رکھنے کو تیار ہوں۔" اماں پہلی بار بولیں۔

حسن تلخی سے مسکرایا۔

"اگر تم اسے صرف اخلاقی سہارا ہی دینا چاہتے ہو۔ تو شادی کے بعد۔" اماں نے جلدی سے کہا۔ ان کی آواز میں دلاسا تھا۔

"اماں۔" حسن بے کل ہو کر بولا۔ اس کی آواز میں درد تھا۔ آپ کو بانو کے دل کی کرچیاں سلامت نظر آ رہی ہے۔

"ہائے ہائے۔ میں تو جیسے دشمن ہوں اس کی۔" اماں اس طرح سے برا مان گئیں۔

"میں کب کہتا ہوں اماں۔ آپ اس کی دشمن ہیں۔" حسن اب بھی بے کل تھا۔ اماں چپ ہو گئیں۔ حسن سر جھکائے بیٹھا رہا۔ سلطانہ پلنگ پر دائیں سے بائیں پہلو بدل کر بیٹھ گئی۔ خاموشی کے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد بحث دوبارہ شروع ہو جاتی تھی۔

اس بحث کے اڑتے اڑتے پرزے بانو تک بھی پہنچے تھے۔ تکرار اس نے بھی سنی تھی۔ گھر کی فضا میں عجیب سی گھٹن تھی۔ یہ گھٹن بڑھ رہی تھی۔ بانو بے چین نظر آنے لگی تھی اس کی سوچیں الجھے دھاگوں کی طرح تھیں۔

آج پھر اس نے کئی بار رابعہ کے متعلق پوچھا۔ کہ وہ کون ہے۔

سلطانہ نے جھلا کر جواب دیا تھا۔ اماں نے بھی سرد سا جواب دیا تھا۔ بانو کو فضا میں موت کی سی گھٹن محسوس ہونے لگی تھی۔

گھر کی فضا دوسرے دن کچھ اور مکدر ہو گئی۔ حسن کے اعصابی کھچاؤ اور شب بیداریوں نے اسے چڑچڑا دیا۔

اسی چڑچڑے پن کا مظاہرہ اس نے بچے پر کیا۔ دو دفعہ تھپڑ لگایا۔ ایک دفعہ ٹھوکر۔

بانو خوف زدہ سی نظر آنے لگی۔

"رابعہ خدا کے لئے..... میری مجبوری کو سمجھو۔ " حسن نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ کرسی کی پشت پکڑے کھڑی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں سے آنسو ساون بھادوں کی جھڑی کی طرح برس رہے تھے۔

رات ڈوب رہی تھی۔ حسن اپنے کمرے میں تھا۔ آج سلطانہ سے پھر بحث ہوئی تھی۔ رابعہ سے بھی دو ایک بار سامنا ہوا تھا۔ لیکن معاملہ الجھتا ہی چلا گیا تھا۔ اب رابعہ اس کے کمرے میں تھی اسے اس کی آہنی عزم سے ہٹانے کی کوشش کرنے آئی تھی۔ یا اپنی ناتمام محبت کا آخری فیصلہ سننے..... وہ رو رہی تھی۔

حسن اسے کافی دیر بانو کے متعلق بتاتا رہا۔ وہ سسکیاں بھرتی رہی۔

"بانو کا یہاں کون ہے۔ اتنا تو سوچو۔ میں بھی اسے سہارا نہ دوں تو وہ کہاں جائے گی۔

رابعہ..... اس کا یہاں کون ہے۔ وہ بے سہارا ہے۔ تم اس بات کو سمجھتی کیوں نہیں۔ "

" آپ نے مجھے دھوکے میں کیوں رکھا تھا۔ " سسکیاں لیتے ہوئے رابعہ نے کہا۔

"میں نادم ہوں۔ میں نے تمہیں پیار کے سپنے دکھائے۔ " حسن نے اک گہری آہ بھری۔

"بانو نہ آجاتی۔ تو مجھے کہنے میں ذرہ بھی باک نہیں۔ کہ تمہیں میں اب بھی پیار کرتا ہوں۔ "

"حسن۔ " رابعہ کی روح سی چیخ اٹھی۔

"لیکن اب بانو آگئی ہے رابعہ۔ میرا فرض مجھے پکار رہا ہے۔ تم مجھے متزلزل کرنے کی کوشش نہ کرو۔ اگر میں..... میں بہک گیا۔ تو یاد رکھو۔ اس گناہ کو خدا بھی معاف نہیں کرے گا۔ "

رابعہ پھر سر جھکا کر آنسو بہانے لگی۔

"رابعہ..... تم عورت ہو۔ بانو کے درد کو مجھ سے زیادہ تمہیں محسوس کرنا چاہئے۔ اس پر قیامتیں ٹوٹ چکی ہیں۔ وہ پانچ سال متواتر مرتی رہی ہے۔ کیا اب میں اس کا گلا اپنے ہاتھوں سے دبا دوں۔ یہ ظلم نہ ہو گا؟ رابعہ سوچو تو..... "

"میں کیا کروں..... حسن میں کیا کروں۔ تم مجھ پر بھی تو قیامت توڑ رہے ہو۔"

"قیامتوں سے نباہ کرنا سیکھو۔"

"حسن"

حسن رابعہ کے قریب آ کر شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "مجھے [illegible] باتی ہے۔ مجھے دکھ ضرور ہے۔ کہ تمہارے مستقبل کے حسین و رنگین تصور مجھ سے وابستہ تھے۔ [illegible] سے مانوس بھی ضرور ہو گئی ہو گی۔ لیکن میری طرف دیکھو۔ میں نے بھی تو تمہارے ساتھ [illegible] کلیاں چنی تھیں۔ پر بہار زندگی کا خواب دیکھا تھا۔ اب میں جانتا ہوں۔ کہ میں ابدی دکھ کو سینے لگا [illegible] نہیں بن سکتی جو وہ تھی۔ قدم قدم پر اس کا خوابیدہ ماضی اس سے الجھے گا۔ لیکن میں اسے [illegible] رابعہ..... اسے تمہاری محبت، میری ہمدردی اور خلوص کی اشد ضرورت ہے۔ وہ بجھی ہوئی شمع ہے۔ [illegible] مقدر ہے۔ لیکن میں ان اندھیروں میں بھٹکنے کا عہد کر چکا ہوں۔ یا تو..... مقدس ہے..... عظیم ہے [illegible] روشنی ہے۔" وہ کچھ دیر کو رکا۔ پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا

"اس کا تقدس، اس کی عظمت، اس کا نور اور روشنی صرف میں دیکھ سکتا ہوں رابعہ۔ اور کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ کوئی نہیں دکھ سکتا۔"

حسن کی باتوں سے رابعہ متاثر نظر آنے لگی۔

"میں جانتا ہوں۔ بندھن توڑ دینا آسان نہیں ہوتا۔ بچھڑنا بھی اک قیامت ہوتی ہے لیکن [illegible] سے کام لیا جائے تو ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ وقت بہت بڑا معالج ہے رابعہ۔ تمہیں میرے [illegible] وقتی دکھ ضرور ہو گا۔ لیکن وقت۔"

"حسن" میرے جذبات کو اس حد تک ٹھیس نہ پہنچاؤ۔" رابعہ نے گھٹ کر سسکی لیتے ہوئے کہا۔

"تم نے دکھوں کو گلے لگانے کا عہد کر لیا ہے۔ تو رابعہ بھی عمر بھر کے روگ کو گلے لگائے گی۔ [illegible] ..... تمہیں اپنا معبود مان کر پرستش کی ہے۔"

"رابعہ" حسن بے تاب ہو کر بولا۔

رابعہ نے بھیگی بھیگی نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وار قاتلانہ تھا۔ حسن نے جلدی سے منہ پھیر لیا۔

"رابعہ!..... مجھے اتنا شرمندہ نہ کرو۔ میں پہلے ہی بڑا دکھی ہوں..... میری مجبوری کو سمجھو۔ [illegible] یہاں کھینچ لائی ہے..... وہ تنہا ہے۔ اس کا یہاں کوئی بھی نہیں۔ کوئی بھی نہیں رابعہ۔ ماں باپ بھائی [illegible] ختم ہو گئے۔ اس کا واحد سہارا میں ہوں۔ اس کا اور کوئی نہیں رابعہ۔ کوئی نہیں۔"

حسن ایک ہی نقطہ رابعہ کے ذہن نشین کرا تھا۔ اور کمرے سے باہر سفید سرسراتے ریشمی لبادے [illegible]

میں روح بھٹک رہی تھی۔ اک سیارہ گردش کر رہا تھا۔

بانو یہاں کیسے آئی تھی۔ کیوں آئی تھی۔ اس کا اسے خود بھی پتہ نہ تھا۔ شاید حسن سے اس بات کی تصدیق کروانے آئی تھی۔ جو آج شام برکتے نے اسے بتائی تھی۔۔۔ حسب معمول اس نے رابعہ کو صحن سے گزرتے دیکھ کر پوچھا تھا۔

"یہ کون ہے؟"

"رابعہ بی بی" برکتے نے جواب دیا تھا۔

"رابعہ۔۔۔ کون" بانو نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے سوچنے کی کوشش کی تھی۔

"حسن میاں کی منگیتر" برکتے نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر سمجھایا تھا۔

بانو نے برکتے کے الفاظ زیر لب دہرا دیے تھے۔ لیکن جب سر کو دو ایک بار جھٹک کر اس نے ان الفاظ پر غور کیا تو رابعہ کے متعلق جان لینے کی خواہش تسکین پا گئی۔ اس تسکین نے اسے بے چین کر دیا۔

"دو ایک مہینے ہی تو رہ گئے تھے شادی میں۔۔۔ اب تو مصیبت ہی کھڑی ہو گئی۔ اللہ جانے کیا ہوگا۔" برکتے نے اپنی دانست میں بڑا تیر مارا۔

"کیا مصیبت کھڑی ہو گئی برکتے۔"

"مصیبت سی ہوئی نا۔"

"کیا؟"

"آپ دیکھ نہیں رہیں۔ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ حسن میاں شادی سے انکار کر بیٹھے ہیں۔"

"شادی سے انکار"؟

"ہاں بی بی۔"

"شادی سے انکار کرنا تھا تو پھر منگنی کیوں کی تھی؟"

"یہ تو وہی جانیں۔ رابعہ بی بی اور وہ۔"

"کیا؟"

"دونوں بڑا پیار کرتے تھے ایک دوسرے سے۔ منگنی دھوم دھام سے ہوئی کہ بس۔ اب شادی۔"

برکتے مالکن کی طرح بڑے گھر کی بیٹی سے شادی کرنے پر خوش تھی۔ وہ ایک ریشمی جوڑے تو لے ہی جاتی۔ اس لئے بڑھ چڑھ کر باتیں کرنے لگی۔

بانو گم صم کھڑی تھی۔ سوچ رہی تھی۔ اتنی بڑی خبر حسن نے اسے کیوں نہ بتائی۔ اسے جانے کیا لگا۔ بے چینی اور بے کلی تو پہلے ہی مقدر بن گئی تھی۔ اب اضطراب اور بھی بڑھ گیا۔ اس اضطراب سے مجبور ہو کر وہ حسن کے

پاس آئی تھی۔ لیکن رابعہ اور حسن کی باتیں سن کر اس کا دماغ چکرانے لگا۔ وہ بے تحاشا گھو... گئی
تھا۔ تن بدن سلگتی آگ میں جل رہے ہیں۔ صحن کے نلکے کے نیچے اس نے اپنا سر رکھ دیا۔ ...
میں ٹھنڈا پانی بھی اس کے تپتے جواس کو ٹھنڈک نہ پہنچا سکا۔

حسن اور رابعہ ــــ رابعہ اور حسن۔

وہ ان دونوں کے متعلق دکھ سے سوچنے لگی۔ اس کی اپنی سوچیں متصادم ہونے لگیں۔ کبھی ...
چیخ بن کر فضا میں بکھر جائے۔ اور کبھی سوچتی کہ حسن کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالے۔ اس نے رابعہ ...
کر کے بانو کی غیر فانی محبت سے غداری کیوں کی تھی۔ لیکن ــــ لیکن ــــ بانو ــــ بانو میں اب رکھا ہی کیا ...
ہوئی راکھ کا ڈھیر تھی۔ حسن اور اس کے درمیان صدیوں کے فاصلے حائل ہو چکے تھے۔ چنانچہ ابھر آئی تھیں ...
پرو ے راستے میں آ چکے تھے۔

حسن سچ ہی تو کہہ رہا تھا۔ بانو وہ نہیں بن سکتی جو وہ تھی۔ بانو کی حیات کا قطرہ قطرہ بہہ ...
اس کے خوابوں کو چکنا چور کر دیا تھا۔ اس کے رنگین تصور چھین لئے تھے۔ حسن کا کیا قصور ــــ وہ کب تک ...
یادوں کے سہارے جی سکتا تھا۔ اس نے رابعہ سے دل لگا کر اچھا ہی کیا تھا۔ لیکن ان ساری باتوں کے ...
باوجود بانو کے دل سے بوند بوند خون ٹپکنے لگا تھا۔ دیوانگی سے سوچ رہی تھی۔ کہ ان بیتے پانچ سالوں کو ...
سالوں کو اپنے وجود سے نوچ پھینکے۔ لیکن ایسا ممکن کہاں تھا۔ شعور زخمی تھا۔ لاشعور زخمی تھا۔ جن باتوں کو ...
چاہتی تھی وہ اسی شدت سے یاد آ جاتی تھیں اور پھر ــــ پھر ــــ ہستے کا پچھ ــــ ظلم بن کر اس کے ...
پیوست تھا۔ وہ اسے مار ڈالنا چاہتی تھی۔ لیکن مار بھی نہ سکتی تھی۔ مار ڈالنے سے بھی تو پانچ خونی سال ...
سکتے تھے۔ وہ تو ناسور تھی۔ ناسور۔ ہر دم رستے والا ناسور۔

بانو صحن میں دیوانہ وار پھرتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ اور پھر اس کی سوچیں ایک نقطے پر آ کر جمع ہو ...
حسن ابدی دکھ کو گلے لگانے کا عہد کر کے رابعہ سے منہ موڑ رہا تھا تو ایسا نہ ہونے دے گی۔ وہ حسن کے ...
میں آگ نہیں لگانے دے گی۔ وہ اس کی چنتی کلیوں کو بکھرنے نہیں دے گی۔ وہ اسے دکھ کے دھاروں پہ بہہ جانے کی
اجازت نہیں دے گی حسن اور رابعہ کو ایک کر دے گی۔ ایک۔ ایک۔

لیکن ایسا کرنے کے بعد وہ کیا کرے گی؟ وہ کیا کرے گی؟؟ اس سوال کا جواب کچھ نہ مل سکا۔ سر کو جھٹک
جھٹک کر اس نے کئی بار اس سوچ کو ذہن سے نکالنا چاہا۔ سوچتے سوچتے وہ حسن کے کمرے کی طرف بڑھی۔
اب اس کے قدم اعتماد سے اٹھ رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔

وہ کیا کرے گی؟ شاید اس نے سوچ لیا تھا۔

وہ بے دھڑک کمرے میں داخل ہو گئی۔ حسن پلنگ کے قریب کھڑا تھا اور رابعہ کرسی کی پشت پکڑے اب بھی ...

...تھی۔ دونوں اسے دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ حسن تو دہل سا گیا۔ رابعہ سے اس کا تصادم متوقع تھا۔

لیکن وہ رابعہ کی طرف دیکھے بغیر حسن کی طرف بڑھی "حسن آج میں نے پھر سفید کپڑے پہنے ہیں" اس نے تمہید کہا "دیکھو یاد ہیں نا وہی کپڑے۔ آج میں نے پھر پہنے ہیں۔ پھر اس طرح مسکرائی۔ کہ حسن کا دل دہل گیا۔ اس کی باتوں سے خطرے کی بو آ رہی تھی۔

"ایک بات تو بتاؤ" اس نے پھر حسن سے کہا اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔ اور چہرے پر ویرانی مسلط تھی۔ اس کے بالوں سے پانی کے قطرے رس رہے تھے۔ بوند بوند پانی جیسے دل سے خون ٹپک رہا ہو۔ حسن خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس خاموشی میں جتنا کرب تھا جتنا دکھ تھا وہ حسن کے چہرے سے عیاں تھا۔

"تم کیوں کہہ رہے تھے۔ یہاں میرا کوئی نہیں۔ کیا میں پاکستان میں نہیں ہوں۔ کیا یہاں لاکھوں مسلم نہیں بستے۔ کیا یہ گھر میرا گھر نہیں ہے۔ بولو حسن کیوں کہہ رہے تھے۔ کہ بانو کا یہاں کوئی نہیں۔ اس کے ماں باپ بھائی بہن سب وہیں ختم ہو گئے۔ پاکستان میرے عزیزوں سے بھرا پڑا ہے نا۔" بانو لرز رہی تھی۔ حسن نے ہاتھ سے اس کی پشت کو سہارا دے لیا۔ وہ دکھی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"میں پاکستان میں ہوں نا" بانو نے بھٹکی بھٹکی نظروں سے اسے دیکھا۔

"تم پاکستان ہی میں ہو بانو" حسن کا پشت پر رکھا ہاتھ بانو کو آہستہ آہستہ اپنے قریب کر رہا تھا۔

"یہاں لاکھوں مسلم ہیں نا" بانو نے خلاؤں میں گھورتے ہوئے کہا۔

"ہاں" دکھ کی تیز دھار حسن کے کلیجے میں اتر گئی۔

"یہاں" وہ ذرا مڑی اور ایک دم حسن کے سامنے آ کر بولی۔ "یہاں کوئی ہستا نہیں ہے نا..."

"بانو..." حسن گھٹی ہوئی آواز میں چیخا "یہاں کوئی ہستا نہیں۔ ہستا بھارت میں تھا۔ یہاں نہیں ہو سکتا۔ یہاں کوئی ہستا نہیں بانو۔ کوئی ہستا نہیں"

بانو ہنس دی۔ یوں جیسے مدقوق سینے میں کھانسی کھڑکھڑا گئی ہو۔

حسن نے پھر ہاتھ کا سہارا دے کر اسے تھام لیا۔ رابعہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ حسن نے دکھی نظروں سے رابعہ کو یوں دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو اسے بے سہارا چھوڑ دینے کی تمہارا ضمیر اجازت دے سکتا ہے۔ دیکھو۔ اس کی حالت تو دیکھو۔

بانو رابعہ کی طرف دیکھنے لگی۔ بڑی گہری گہری نظروں سے دیکھتی رہی۔ رابعہ کچھ تا دم کچھ خائف نظر آنے لگی۔ بانو کی آنکھوں میں صحت مندی کے کوئی آثار نہ تھے۔ رابعہ اس سے ڈر رہی تھی۔

"رابعہ" بانو نے زیر لب کہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے قریب آئی۔ اس کا ہاتھ پکڑا۔ اور پھر اس کا ہاتھ کھینچے حسن کے قریب لے آئی۔

حسن حیران سا کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ کیا کرنے والی تھی۔ اس کا سے علم تھا۔ اسے [illegible]
ہاتھ بھی پکڑ لیا۔ اور پھر حسن کے ہاتھ میں رابعہ کا ہاتھ دے دیا۔

"بانو..." حسن کے کھلے ہاتھ سے رابعہ کا بے جان سا ہاتھ گر گیا۔

بانو نے حسن کی طرف دیکھا۔ دھول سے اٹی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کا ساتھی وحو بھی کی طرح چل [illegible]
بے جان بت کی طرح اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ایک ٹک اسے تکے جا رہا تھا۔ بانو محروی کا [illegible]
حزن و ملال سے چہرہ اترا اترا تھا۔

"بانو" حسن نے دکھ کے لہجے میں اسے پکارا۔ لیکن بانو کے ذہن میں کچھ اور ہی تھا۔ وہ [illegible]
جھپکائے بغیر دیکھتی رہی۔

پھر اس نے اپنے لرزتے کانپتے ہاتھ آہستہ آہستہ حسن کے چہرے کی طرف بڑھائے [illegible]
کے حیرت زدہ چہرے کو چھوا۔ پھر یہ کانپتے ہاتھ حسن کے شانوں پر پھسل گئے۔ بے معنی سی [illegible]
کندھوں پر تھر تھراتی رہی۔ پھر بانو نے ہاتھ اس کی چھاتی پر رکھ دیئے۔ کئی لمحے اس کے ہاتھ حسن کی چھاتی [illegible]
آہستہ پھرتے رہے اور اس کی آنکھیں حسن کے چہرے پر لگی رہیں۔

"بانو..." بے بس ہو کر حسن چیخ اٹھا۔ بانو جلدی سے پلٹی اور کمرے سے باہر جانے لگی۔ اس [illegible]
اس نابینا کی سی تھی۔ جس کے ہاتھ سے لاٹھی کہیں گر گئی ہو اور وہ ہوا میں ہاتھ مار مار کر راستہ ٹٹول رہا ہو۔

"بانو" حسن نے آنکھیں بند کر کے اپنی الٹی ہتھیلی پر دانت گاڑ دیئے۔ رابعہ کا دل بھی [illegible]
بھول گئی۔ بھلا قطرے اور سمندر کا کیا مقابلہ؟

"حسن اسے تھام لو۔ اسے تھام لو حسن۔ اسے تمہارے سہارے کی اشد ضرورت ہے۔" [illegible]
پھوٹ کر روتے ہوئے بولی۔

"بانو کو سہارا دو حسن۔ اسے تمہاری اشد ضرورت ہے۔"

حسن تیزی سے بانو کے پیچھے لپکا۔ بازو کا سہارا دے کر اسے اس کے کمرے تک لے آیا۔ بانو اب [illegible]
تھی۔

حسن نے اسے پلنگ پر لٹا دیا۔

حسن کا دکھ بیکراں تھا۔ بانو کو رابعہ کے متعلق پتہ چل گیا تھا۔ اف۔ حسن کو یوں لگتا تھا۔ جیسے اس کا دل [illegible]
پھٹ جائے گا۔ لیکن اس وقت وہ جبر کئے ہوئے تھا بانو سے کچھ کہنا سود مند نہیں تھا۔ بانو کو اس وقت [illegible]
ضرورت تھی

بانو آنکھیں بند کئے پڑی رہی۔ حسن ٹکٹکی باندھے اس بدنصیب لڑکی کے درد کا اندازہ کرتا رہا۔

ناشتے کی میز پر سب دل گرفتہ سے بیٹھے تھے۔ سب کی حالت جنازہ اٹھ جانے کے بعد پس ماندگان کی سی تھی۔ ابا اور اماں پر مایوسی کا پرتو تھا۔ رابعہ خاموش تھی۔ لیکن اس خاموشی میں اک فیصلے اک عزم کی جھلک تھی۔ محرومیت کا احساس تو تھا۔ لیکن رات بانو کی حالت دیکھ کر اس نے حسن کے راستے سے خاموشی سے الگ ہو جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ روز کی طرح کملائی ہوئی نظر نہیں آ رہی تھی۔ حسن بانو کے بارے میں متفکر تھا۔ رات بانو کو ... کے متعلق علم ہو گیا تھا۔ اس کی مجنونانہ سی حرکت کا بار بار اسے خیال آ رہا تھا۔ رابعہ کا ہاتھ حسن کے ہاتھ ... دیتے وقت اس کے چہرے پر کتنا جان دار دکھ تھا۔ حسن اس تصور سے بھی لرز لرز جاتا تھا۔

ناشتے پر بانو موجود نہ تھی۔ حسن نے چند لمحے اس کا انتظار کیا۔

اماں۔ سلطانہ اور رابعہ کے سامنے کھانے کی چیزیں بڑھا کر بجھے بجھے اصرار سے کھانے کو کہہ رہی تھیں۔ سلطانہ ... اپنی پلیٹ میں آملیٹ ڈال کر پلیٹ رابعہ کی طرف سرکا دی۔

رابعہ نے خاموشی سے پلیٹ حسن کی طرف بڑھا دی۔

... ٹرے میں چائے دانی اور دودھ کا برتن لئے اندر آئی۔ دونوں چیزیں اس نے اماں کے قریب رکھ دیں۔

"برکتے!" حسن میز کی سطح پر کہنیاں ٹکائے ہاتھوں کی مٹھی بنائے ناخنوں کو دانتوں سے کاٹ رہا تھا۔

"جی" برکتے بولی۔

"... بی بی کو دیکھو۔ جاگ رہی ہوں تو ناشتے کے لئے بلا لاؤ"

"اچھا جی"

"... دیکھو۔"

"ہاں جی"

"... سو رہی ہوں۔ تو جگانا نہیں۔"

"اچھاجی۔"

حسن نے پھر دانتوں سے انگوٹھوں کے ناخن کاٹنا شروع کر دیئے۔ رابعہ پلیٹ کے پھولوں پر انگلی ... سلطانہ کا چہرہ پژمردہ تھا۔ بے دلی سے وہ ناشتہ کرنے لگی۔ اماں نے بھی اپنے لئے چائے بنالی۔ ...

"میرا خیال آج رات کی گاڑی سے واپس جانے کا ہے۔" سلطانہ نے بجھے بجھے انداز میں کہا۔

حسن نے سرد سرد گہری گہری نظروں سے سلطانہ کو دیکھا۔ پھر اک ٹھنڈی سانس کھینچی۔ ... سا بھی نظر آیا۔ رابعہ نے اک نظر اسے دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ اماں نے سلطانہ کی بجائے حسن کی طرف ... دیکھا۔ سلطانہ سے رک جانے کا کہنے کا نہ حوصلہ ہوا۔ کمرے کی فضا کچھ اور بوجھل ہو گئی۔

حسن کی نظریں دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ بانو کی جگہ برکتے آ رہی تھی۔

"بانو بی بی تو کمرے میں نہیں ہیں۔" برکتے نے دروازے میں کھڑے کھڑے کہا۔

"غسل خانے میں ہو گی" اماں نے کہا۔

"وہاں بھی نہیں ہیں۔" برکتے بولی۔ "باہر والے غسل خانے میں بھی دیکھ آئی ہوں۔"

"اوپر دیکھو۔" اماں نے تیزی سے کہا۔ "یا بیٹھک میں دیکھو۔"

حسن اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بے کل سا ہو گیا تھا۔

"تم بیٹھو۔ ابھی آجاتی ہے۔" اماں نے قدرے غصیلے لہجے میں کہا "اوپر گئی ہو گی۔"

حسن سدھائے ہوئے جانور کی طرح چپ چاپ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تم تو کھاؤ بیٹی۔ آملیٹ ٹھنڈا ہو جائے گا۔" اماں نے دکھتے پیار سے رابعہ سے کہا۔

"بانو آجائیں۔" رابعہ کے لہجے پر حسن، سلطانہ اور اماں چونک سے گئے۔ حسن نے گوشہ چشم سے ... رابعہ کے چہرے کو دیکھا۔ شاید اس کے تاثرات کا صحیح اندازہ کرنا چاہتا تھا۔ اسے اطمینان سا ہوا۔ رابعہ کے معصوم چہرے پر بے پناہ خلوص تھا۔

"تم شروع کرو۔" حسن نے پلیٹ اس کی طرف بڑھا دی۔ "بانو بھی آجاتی ہے۔"

"آپ پہلے لیں۔" رابعہ نے آہستگی سے کہا۔ اور پلیٹ اس کی جانب بڑھا دی۔ اس کے لبوں پر ... جانے والی مسکراہٹ تھی۔ احسان مندی سے حسن کا سر کچھ جھک گیا۔

وہ اس کی بات رد نہ کر سکا۔ پلیٹ سے آملیٹ لینے لگا ہی تھا۔ کہ برکتے کچھ گھبرائے سے انداز میں آئی۔

"کیوں؟" حسن نے آملیٹ اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"بانو بی بی۔ تو اوپر ہیں نہ بیٹھک میں۔ سارے کمرے بھی دیکھ آئی ہوں۔"

"کیا ___ ؟" حسن نے آنکھیں پھاڑ کر برکتے کو دیکھا۔ "اوپر نہیں۔ بیٹھک میں بھی نہیں"

پلیٹ پرے ہٹا کر وہ جلدی سے اٹھا۔

"حسن آج میں نے پھر سفید کپڑے پہنے ہیں۔" بانو کی آواز گونج بن کر حسن کے کانوں سے ٹکرائی۔

رابعہ بھی اس کے پیچھے اٹھ کر باہر نکلی۔ حسن بانو کے کمرے میں گیا۔ غسل خانے میں جھانکا۔ باورچی بیٹھک، سٹور، اپنا کمرہ۔ رابعہ کا کمرہ دیکھ کر وہ سیڑھیوں کی جانب لپکا۔ سیڑھیاں پھلانگتا وہ اوپر گیا۔

لیکن بانو ہوتی تو ملتی۔

تھی نہ اس کا پتہ ___ حسن ڈیوڑھی کی طرف بھاگا۔ پھر گلی میں نکل گیا۔ دور دور تک گلی دیکھی۔ سڑک دائیں بائیں بھی طرف دیکھا۔

"شاید کسی ہمسائے کے ہاں ہو۔" دل کو تسلی دیتے وہ لوٹ آیا۔ برکتے کو گلی کے گھروں میں پتہ کرنے ا۔

بانو کا کہیں پتہ ہی نہ تھا۔ رابعہ کا رنگ اڑ گیا۔ اماں اور سلطانہ بھی ناشتہ چھوڑ کر صحن میں آ گئیں۔ حسن گھر کا ایک ایک کونہ تلاش کیا۔ یوں جیسے بانو نہیں سوئی کھو گئی ہو۔ اس کی حالت دگرگوں ہوتی جا رہی حواس عقل سے دور ہے تھے۔

"کہیں بھی نہیں ہیں جی" برکتے نے صحن میں آتے ہی کہا۔

رابعہ نے سینے پر بے اختیار ہاتھ مارا۔ اماں اور سلطانہ بھی ششدر کھڑی رہ گئیں۔ حسن ایک ایک کا منہ تکنے لگا۔ اس کی آنکھیں جیسے ابل کر باہر آ رہی تھیں وہ دوڑ کر پھر بانو کے کمرے میں گیا۔ غسل خانے کو دیکھا۔ گلی طرف جانے کا تو کوئی راستہ ہی نہ تھا۔ گھر کا ایک ہی دروازہ تھا۔

برآمدے میں کھڑے ہو کر اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ اس کا رنگ فق ہو رہا تھا اور بدن کانپنے لگا تھا۔

"صبح برکتے کو کس نے دروازہ کھولا تھا۔" اماں سہمی ہوئی بولی۔

سلطانہ اور رابعہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ دروازہ حسن نے بھی نہیں کھولا تھا۔ اماں نے بھی نہیں۔ "ی میں صبح آئی تو دروازہ کھلا تھا۔"

"ہم میں سے کسی نے بھی نہیں کھولا دروازہ۔ تو کیا بانو نے کھولا ___ تھا۔" اماں سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

"پتہ نہیں جی۔ میں آئی تو دروازہ کھلا تھا۔ اذانیں ہو چکی تھیں۔ جب میں آئی۔" برکتے ہاتھ ملتے ہوئے لی۔

"با ___ نو ___" حسن کی چیخ در و دیوار سے یوں ٹکرائی جیسے کسی وزنی بم کا دھماکہ ہوا ہو۔ اس نے اپنا گریبان دونوں مٹھیوں میں پکڑ کر چیر ڈالا تھا۔

سلطانہ لپک کر اس کے پاس آئی۔ "گھبراؤ نہیں۔ یہیں کہیں ہوگی۔ جا کہاں سکتی [illegible]
سے واقف بھی نہیں۔ باہر جا کر کسی سے پوچھو۔ کچھ پتہ کرو۔" اس نے حسن کو کندھے سے [illegible]
وہ گھومنے لگا۔ جیسے ساکت ہو گیا ہو۔ وہ کچھ لمحے خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس زور سے "بانو [illegible]"
در و دیوار کانپ گئے۔ رابعہ تو سہم کر رونے لگی۔ سلطانہ بھی ہراساں نظر آنے لگی۔

تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد حسن "بانو..... بانو" چیخنے لگا۔ پانی کے بغیر مچھلی بھی [illegible]
جس طرح وہ تڑپ رہا تھا۔

اماں نے برکتے کے بیٹے کو بلا بھیجا۔ کچھ گلی کے مردوں کو بلا کر بانو کے متعلق بتایا۔ سب اس کی [illegible]
نکل گئے۔ لیکن گھنٹوں کی تلاش بھی مایوسی سے ہم کنار ہوئی۔

"آپ خود جایئے نا..... بانو..... کہاں چلی گئیں۔ آپ نے رات انہیں تمام کیوں [illegible]
حالت بھی تو ٹھیک نہیں۔ وہ کہاں جائیں گی۔" رابعہ نے رو رو کر حسن سے کہا۔ تلاش بے سود [illegible]
جا چکا تھا۔

حسن کی حالت خراب تھی۔ تڑپ رہا تھا۔ بلک رہا تھا۔ بانو کی دماغی کیفیت اس کے لئے [illegible]
منظر تھی۔ وہ کہاں گئی۔؟ حسن اپنے دل کو ہاتھوں سے مسلتے دیوانوں کی طرح پھر رہا تھا۔

اماں نے حمید کو تار دے کر بلوا لیا۔ وہ تین دن کی رخصت لے کر آ گیا۔ بانو کی گمشدگی [illegible]
لگا۔ اس نے ہر ممکن کوشش کی۔ اخبارات میں اشتہار دیئے۔ ڈھنڈیا پٹوائی۔ لوگوں کو کہا [illegible]
مارا۔ لیکن بانو نے نہ ملنا تھا۔ نہ ملی۔ اتنے بڑے شہر میں اسے ڈھونڈ نکالنا ممکن بھی تو نہ تھا۔ [illegible]
تھیں۔

حسن کی حالت بگڑتی گئی۔

"بانو" بیٹھے بیٹھے اس طرح چیخ اٹھتا۔ کہ دل سینے میں پھڑک جاتے۔ سلطانہ اور اماں [illegible]
سرنگوں تھیں۔ رابعہ حسن کو سہارا دینے کی کوشش کرتی۔ دن رات سایئے کی طرح اس کے ساتھ تھی۔
لیکن حسن کو تو اپنے وجود کا ہوش نہ تھا۔ سایئے کا کیا خیال آتا۔

رات کا سناٹا جانے کون سا پہر تھا۔ جب بانو کی سوچوں کے الجھاؤ اتنے بڑھ گئے کہ اسے انجام و عواقب کی خبر نہ رہی۔ بچے کو اٹھا کر کندھے سے لگایا۔ کمرے سے نکلی برآمدہ عبور کیا۔ صحن سے گزری اور کنڈی کھول کر گھر سے باہر نکل گئی۔

اس کے دل و دماغ میں یہ بات گھر کر چکی تھی۔ کہ پاکستان اس کا اپنا دیس ہے۔ یہاں ایک نہیں لاکھوں گھر ہیں۔ ہر گھر اس کا اپنا گھر ہے۔ یہاں کوئی بیگانہ نہیں۔

گلی سے سڑک پر آئی۔ پہلے موڑ پر گھومی۔ جو گلی نظر آئی اس میں چلتی گئی۔ جو بازار آیا۔ اسے عبور کیا۔ کبھی آگے ہی آگے بڑھتی گئی۔ کبھی گھوم کر پیچھے لوٹ آئی۔ مسلسل چلنے سے اس کی ٹانگیں شل ہو گئیں۔ بچے کو کندھے سے لگائے اس کے بازو اکڑ گئے۔

وہ بے دھڑک چلتی جا رہی تھی۔ یہ پاکستان تھا۔ گوشہ عافیت۔ گہوارہ امن۔ یہاں اسے کوئی دھڑکا نہ تھا۔ لیکن اس کی منزل کہاں تھی۔ اس کا تعین اس نے نہیں کیا تھا۔ وہ تو صرف اس گھر سے نکل آئی تھی۔ جہاں اس کی بیگانگی تھی۔ اس جگہ سے آ گئی تھی۔ جہاں حسن کی تڑپتی سسکتی محبت تھی۔

بیگانگی میں آگ تھی۔ اور محبت بھی آگ۔ سکون دونوں سے دور تھا۔ اس آگ سے وہ دور بھاگی تھی۔ حسن اور رابعہ کے ابدی بندھن کے لئے راہیں ہموار کی تھیں۔ وہ حسن کی بہاروں میں آگ نہیں لگانا چاہتی تھی۔ آگ میں جلنا تو اس کا مقدر تھا۔

چلتے چلتے وہ تھک گئی۔ سوچتے سوچتے اس کا دماغ ماؤف ہو گیا۔ بالآخر وہ ایک مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ اللہ کا گھر تھا۔ اس گھر پر اس کا حق تھا۔ وہ سیڑھیوں پر بچے کو گود میں ڈالے بیٹھ گئی۔

خدا جانے کب اسے اونگھ آ گئی۔ اور وہ اس مقدس گھر کی سیڑھیوں پر سر رکھ کے سو گئی۔ اکتوبر کی ٹھنڈی ہوا نے اس کے تپتے دل و دماغ کو قدرے سکون بخشا۔ وہ بے خبر ہو گئی۔

جانے وہ کب تک سوتی رہی۔ مسجد میں نمازیوں کی آمد شروع ہو گئی۔ ون کا ہلکا ہلکا اجالا [illegible]
کی بھن بھناہٹ سی اس کے کانوں میں پڑی۔

"یہ کون ہے۔"

"اکیلی عورت اور یہاں ـــــ"

"بچے والی ہے۔"

"لباس اور شکل و صورت سے تو اچھے گھر کی لگتی ہے۔"

"یہاں سونے کا مطلب۔"

"کوئی پردیسن ہو گی؟"

"ہو سکتا ہے کوئی ایسی ویسی ہو۔"

"ایسی ویسی اللہ کے گھر نہیں آ سکتی ہے۔"

چند نمازی اس کے قریب کھڑے قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ بانو نے آنکھیں کھول کر [illegible]
آنکھیں جھپکائیں۔ پھر کھول دیں۔

"کون ہو تم" ایک نمازی نے پوچھا "یہاں کیوں بیٹھی ہو۔"

بانو نے دوپٹہ درست کیا۔ بچہ لڑھک کر جیز ھی سے نیچے لٹک رہا تھا۔ اس نے گھسیٹ کر [illegible]
دیا۔ پھر آنکھیں مل مل کر ان سب کو دیکھنے لگی۔

"بی بی ـــــ" ایک معمر نمازی آگے بڑھا۔ "یہاں کیوں بیٹھی ہو۔ کون ہو تم ـــــ"

"میں ـــــ" بانو نے جمائی روک کر پوچھا۔

"ہاں"

"میں بانو ہوں۔"

نمازیوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ سفید ریش والا رمضان علی آگے بڑھا
"کون ہو تم"

"مجھے پہچانتے نہیں تم ـــــ" بانو نے سب کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھا۔ نمازیوں کو [illegible]
گزرا تھا۔ کہ کوئی پگلی ہے۔ اس کی باتوں سے شک تقویت پا گیا۔

"خدا جانے کون ہے" ایک شریف صورت نے کہا۔

"میں تمہاری ماں ہوں۔ ـــ بہن ہوں۔ ـــ بیٹی ہوں۔" بانو نے اعتماد سے اترا کر کہا۔
نمازی زیر لب مسکرانے لگے۔ کچھ رک گئے۔ کچھ آگے بڑھ کر مسجد کے اندر چلے گئے۔ [illegible]

بوڑھے بابا نے بانو میں کیا نظر آیا۔ اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "بیٹی ..."

"تم نے مجھے پہچان لیا۔" بانو نے اس کی بات سنے بغیر خوشی سے کہا۔

"ہاں ہاں ... بھلا پہچانتا کیوں نہ ..." رمضان علی نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ جان گیا تھا کہ لڑکی نیم پاگل ہے۔ اتنی جوان، خوبصورت اور اچھے لباس کی لڑکی یوں مسجد کی سیڑھیوں پر پڑی تھی۔ رمضان علی کا دل بھر آیا۔

"تم یہیں ٹھہرو۔ نماز پڑھ کر میں تمہیں گھر لے چلوں گا۔" رمضان علی نے کہا۔ لیکن پھر کچھ خیال آیا۔

دیوانی کا کیا۔ یہ تو ایسی کشتی ہے جو کسی ساحل پہ نہیں رکتی۔ ایسا نہ ہو وہ مسجد میں چلا جائے۔ اور اس کا جنون اسے کہیں کا کہیں لے جائے۔ زمانے کی ہوا سے آگہی تھی۔ جوان لڑکی تھی۔ رمضان علی خود بھی جوان بیٹیوں کا باپ تھا۔ اسے اکیلے چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔

"آؤ" اس نے بانو سے کہا۔

"کہاں؟"

"گھر۔"

بانو کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ اس نے بچے کو اٹھا کر کندھے سے لگایا۔ رمضان علی اسے اپنے ساتھ گھر لے آیا۔ راستے میں اس نے بانو سے کئی سوال کیے۔

اس کی بیوی اور جوان بیٹیاں وضو کر رہی تھیں۔ بابا کے ساتھ ایک نوجوان اور خوب رو عورت کو دیکھ کر حیران ہی ہو گئیں۔

"تمہاری بہن ہے بیٹی۔" کسی کے استفسار سے پہلے رمضان علی نے اپنی بیٹیوں سے کہا۔ پھر اشارے سے انہیں بتایا کہ وہ نیم پاگل سی ہے۔ پیار اور دلاسے سے باتیں کرنے کا بھی اشارہ کیا۔

رمضان علی ایک ریٹائرڈ سکول ماسٹر تھا۔ چھوٹے سے مکان میں اپنی تین جوان بیٹیوں اور غم زمانہ کی ماری بیوی سمیت رہتا تھا۔ ایک جوان بیٹا قضا چھین لے گئی تھی۔ دوسرے کو بہو ... کھا گئی۔ بیٹا باپ ماں اور بہنوں سے بے خبر تھا۔ رمضان علی پنشن پاتا تھا۔ کچھ بچوں کو پڑھا کر چار پیسے کما لیتا تھا۔ بیٹیاں دل و دماغ پر بوجھ بنی بیٹھی تھیں۔ لیکن وہ بیچاریاں کیا کرتیں۔ سوئی سلائی کر کے باپ کی محدود آمدنی میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتی رہتی تھیں۔ لیکن رضائے الٰہی پر شاکر تھیں۔ صوم و صلوٰۃ کی پابند تھیں۔ شرافت سے زندگی گزار رہی تھیں۔ سفید پوشی کا بھرم رکھے ہوئے تھیں۔

ماں بیٹیوں نے بانو کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔ بانو کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے بچھڑے عزیزوں سے

آج مل گئی ہو۔

"یہاں بچے کو ڈال دو۔ خود بھی لیٹ جاؤ بیٹی۔" ماں نے پیار سے بانو کی پشت پر ہاتھ [illegible] چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔

بانو نے بچے کو لٹا دیا۔ خود بھی لیٹ گئی۔ چند لمحوں بعد وہ پر سکون نیند سو رہی تھی۔

رمضان علی نے ساری روئداد گھر والوں کو سنا دی۔ "بیچاری خدا جانے کس گھر کی [illegible] دلاسا دینا۔ گھر بار کا پتہ بتا دیا تو پہنچا دیں گے۔ اللہ جانے گھر والوں پر کیا بیت رہی ہو گی۔"

رمضان علی نماز پڑھنے چلا گیا۔ اس کی بیوی اور بیٹیاں بھی نماز اور تلاوت میں مصروف ہو گئیں۔ [illegible] خوب خوب نیند نکالی۔ بچہ بیدار ہو گیا۔ بانو کی نیند کے خیال سے بڑی لڑکی مسرت نے بچے کو اٹھا [illegible] میں بٹھا لیا تھا۔ ماں نے پیالی میں دودھ ڈال دیا تھا۔ روٹی بھی دی تھی۔ بچے مزے سے کھانے لگا [illegible]

دھوپ نکھر آئی تھی۔ دن کافی آ گیا تھا۔ بانو نے آنکھیں کھول دیں۔ اپنے گرد و پیش دیکھا [illegible] کو دیکھ کر ہراساں سی ہوئی۔ رمضان علی اور اس کی بیوی نے شفقت اور دل جوئی سے اسے سہارا [illegible] آیا۔ چہرہ ہاتھوں پر گرا کے وہ دل کھول کر روئی۔ رات کا سارا واقعہ اسے یاد آ گیا تھا۔ گھر سے [illegible] تک پہنچنے کی حقیقت سے آگاہ تھی۔

رمضان علی اور اس کی بیوی صغریٰ کے بار بار پوچھنے پر اس نے دل کے پھپھولے پھوڑ [illegible] کہانی شروع سے آخر تک کہہ سنائی۔ سننے والے کانپ کانپ گئے۔ مسرت، بصیرت اور نصرت کی آنکھوں [illegible] تو آنسو بہنے لگے تھے۔ صغریٰ بھی کئی بار سینے پر ہاتھ مار کر غم کا اظہار کر چکی تھی۔ بانو بھی آنسو [illegible] بھی مسکراہٹوں سے سجا کر اپنی دکھ بھری کہانی سنا رہی تھی۔

"لیکن آپ اپنے رشتہ داروں کے گھر سے کیوں آ گئیں۔" مسرت نے غم سے اوبی آواز میں [illegible]

"تم بھی تو میری رشتہ دار ہو۔ ملی ناطہ تو ہے ہم دونوں میں۔" بانو نے کہا۔

"کیوں نہیں بیٹی" صغریٰ نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ تم نے پاکستان کی خاطر اتنے مظالم [illegible] تو آنکھوں پر بٹھانے کے قابل ہو۔"

بانو کی آنکھوں میں ستارے چمک اٹھے۔ پھر یہ چمک دھندلا گئی۔ اس کے لبوں پر "[illegible] گیا۔

رمضان علی مومن آدمی تھا۔ بانو کی داستان سن کر اس کا دل لرز گیا۔ اور جب بانو نے [illegible]
"مجھے اپنے سائے میں پناہ دو گے بابا..... میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔ یہ گھر میرا اپنا گھر [illegible]

"ضرور..... ضرور بیٹی۔ تمہارا گھر ہمارے دلوں میں ہے۔ تم یہیں رہو۔ میں بچوں کی [illegible]

اہلِ خانہ نے اس کے لئے دیدہ و دل وا کر دیے۔ قوم و ملک کے نام پر لٹی ہوئی آبرو کو سینے سے لگا لیا۔ اس خلوص، محبت اور پیار کا بے پناہ مظاہرہ کیا۔ اس کے بچے سے کراہت کھانے کی بجائے سینے سے لگا لیا۔ و مطمئن ہو گئی۔ اس چھوٹے سے گھر میں اسے جتنی ٹھنڈک میسر آئی۔ اس آگ کی تپش یہاں نہ پہنچ
سکی جو وہ چھوڑ آئی تھی۔

ہاں حسن اس کے دل میں اب بھی درد بن کر سمایا تھا۔

"یہ سکھ ہے بابا۔ یہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔"

"بیٹی"

"مان بھی جاؤ بابا۔ یہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔"

"یوں نہ کہو بیٹی۔ یہ بچہ ہے۔ اسے کیا خبر۔"

"بابا میں امرت چکھ کر بھی سکھ نہ بن سکی۔ اس کی رگوں میں ہستے کا خون ہے۔ یہ سکھ ہے۔ سکھ۔ مسلمان کبھی نہیں ہو سکتا۔"

"یہ مسلمان ہے۔ اس کا نام آج سے غلام احمد ہے۔ بانو بیٹی۔ یہ غلام احمد ہے۔ اسے ہستا نہیں کہنا اب۔ سمجھ گئیں نا۔"

بانو چپ ہو گئی۔ رمضان علی نے آج بچے کو نہلا دھلا کر نئے کپڑے پہنائے تھے بال کٹوا دیے تھے۔ اور باقاعدہ مسلمان کیا تھا۔ اس کا نام غلام احمد تجویز کیا تھا۔ گھر والے آج بے حد خوش تھے۔ مسرت وغیرہ تو اسے یوں لپٹائے پھر رہی تھی۔ جیسے کوئی قیمتی تحفہ مل گیا ہو۔ رمضان علی اور صغریٰ بھی اس کار خیر سے محظوظ ہو رہے تھے۔

لیکن ــــ بانو حیران تھی۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ کہ ہستے کا بیٹا مسلمان ہو سکتا ہے۔ اس کی شکل و صورت وہی تھی۔ اس کے اٹھنے بیٹھنے کا انداز ویسا ہی تھا۔ وہ ہنستا بھی اس طرح تھا۔ پھر وہ ہستے سے غلام احمد کیوں کر بن سکتا تھا۔ بانو اس مسئلے کو حل کرنے سے قاصر تھی۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ پھر بہک جاتا۔

صغریٰ اور رمضان علی ٹھنڈی آہیں بھر بھر کر اس کے متعلق سوچتے تھے۔ انہیں ابھی تک یہ پتہ نہ چل سکا تھا۔ کہ بانو کے وہ عزیز جن کے پاس وہ پاکستان آئی تھی۔ کون ہیں اور کہاں رہتے ہیں۔

"خدا جانے کس خاندان کی بیٹی ہے۔"

"بچاری پر کیا کیا قیامتیں ٹوٹیں۔

ملک کی خاطر تباہ و برباد ہوئی۔"

کتنی محبت ہے اسے ملک و ملت سے۔

سب کچھ بھول کر صرف یہی یاد ہے کہ اس نے اتنی بڑی قربانی کے بعد پاکستان پالیا ہے۔" "کسی بڑے خاندان کی ہے۔ مذہب' سیاست ہر چیز پر سیر حاصل بحثیں کرتی ہے کوئی کہہ سکتا ہے اس کا دماغ بگڑا ہوا ہے۔"

"بگڑا ہوا نہیں۔ حوادث سے بری طرح متاثر ہے۔"

"یہ اثر زائل کہاں ہو سکے گا"

"پیار اور محبت مداوا بن سکتے ہیں اسے ہمدردی اور شفقت کی سخت ضرورت ہے۔"

"ہم تو اپنی طرف سے کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ میرا تو دل کانپ جاتا ہے جب سوچتی ہوں کہ اس بچاری پر کیا بیت گئی۔"

"حسن حسن پکارتی ہے کبھی کبھی"

"خدا جانے وہ اس کا کیا لگتا ہے"

"مسرت کو بتا رہی تھی ایک دن۔ کہ وہ اس کا منگیتر تھا"

"اس کے پاس یہاں پاکستان آئی تھی"

"ہاں"

"ہاں جی۔ کون مائی کا لال اسے قبول کرنے کا حوصلہ رکھتا سکھوں کے پاس پانچ سال رہی ان کا بچہ جنتا۔ اف خدایا"

"اس میں اس بچاری کا کیا قصور اسے تو سر آنکھوں پر بٹھانا چاہئے تھا۔ آفرین ہے اس کی ہمت پر سختیاں جھیل جھیل کر بھی زندہ رہی پاکستان کی خاطر"

"توبہ توبہ جس وقت باتیں سناتی ہے میرے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں"

"پاکستان کو تو خدا جانے کیا سمجھتی ہے"

"اللہ رحم ہی کرے"

دونوں میاں بیوی اکثر بانو کے متعلق اسی طرح باتیں کرتے رہتے بڑے ہی مخلصانہ انداز سے سوچتے ہمدردی سے اس کے زخموں پر پھاہے رکھتے بانو پر ان کے مشفقانہ طرز عمل کا خاطر خواہ اثر ہو رہا تھا بچے کو وہ بھی اب غلام احمد کہنے لگی تھی اس سے پیار بھی کرتی لیکن بچہ جب اپنے مخصوص انداز میں ہنستا یا قہقہہ لگاتا تو بانو مضطرب ہو جاتی اسے یوں لگتا جیسے یہ ہنستا ہے اور حسب عادت اس کی حالت کا تمسخر اڑاتے قہقہے لگا رہا ہے۔

دن گزرتے گئے بانو لڑکیوں سے مکمل مل گئی وہ گھر کا کام کاج بھی خوشی خوشی کرنے لگی وہ کھانا [illegible] پکاتی برتن صاف کرتی بصیرت ' مسرت اور عصمت اس سے کام چھین لیتیں ۔

"ہم کیا کم ہیں آپ کو کام کرنے کی ضرورت نہیں باجی ۔ بہت ہی کام ہے تو کھانا وانا پکا لیا کریں [illegible] دھونے ' برتن مانجھنے ' صفائی کرنا آپ کو زیب نہیں دیتا بانو ہنستی ۔ درحقیقت بیٹے میں کھو کھلا پن [illegible] نہیں اعتماد سے ہنستی سکون سے ہنستی وقار سے ہنستی ۔

"میں نے تو مائی جیونی کے ناپاک کپڑے دھوئے ہیں رستے کے میل اور بدبو سے اٹے کپڑے [illegible] کپڑے تو میری بی بی کے ہیں"

بی بی کے تصور میں وہ کئی لمحے ڈوب جاتی ان دنوں اسے بی بی کچھ زیادہ ہی یاد آنے لگی تھی [illegible] لپٹ جاتی تھی۔ منع کرنے کے باوجود صغریٰ کے کپڑے دھو کر استری کرنا اس کا معمول تھا اس کام کو شوق ' بڑے پیار اور بڑی چاہت سے کرتی اس کے والہانہ پن سے صغریٰ بڑی متاثر ہوتی اور مسرت [illegible] عصمت کی نظروں میں اس کا مقام کچھ اور بلند ہو جاتا۔

مسرت ' رمضان علی کی بڑی بیٹی تھی تیس کے لگ بھگ تھی چہرے سے معصومیت چھن چکی تھی [illegible] پختگی آ گئی تھی بالوں میں اب تو کہیں کہیں سفید تار بھی دکھائی دینے لگے تھے ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی بصیرت اور عصمت بھی جوانی کی ڈھلان سے پختہ عمری کی طرف لڑھک رہی تھیں بانو کو اس دن جانے کیا خیال [illegible]

"بی بی"

"ہوں"

"مسرت کی شادی نہیں ہوئی"

صغراں نے گہرا سانس لے کر سر نفی میں ہلا دیا

"کیوں ؟"

"یہ بڑی لمبی کہانی ہے بانو بیٹی"

بانو کہانی سننے پر مصر تھی صغریٰ آپا نے بتایا مسرت بچپن سے اپنے تایا زاد سے منسوب تھی وہ لوگ [illegible] میں رہتے تھے شادی کی تیاری ہو رہی تھی کہ ملکی حالات مخدوش ہو گئے معاملہ التوا میں پڑ گیا پھر [illegible] لوگ ہجرت کر کے لاہور سے سندھ میں آ گئے قسمت اچھی تھی آتے ہی زمینیں الاٹ کرا لیں [illegible] بھرے پرے گھروں پر قبضہ جما لیا ایک ہی پلٹے میں متوسط طبقے سے امراء میں شامل ہو گئے ۔ وہ [illegible] نے رجوع ہی نہ کیا یہی سمجھا گیا کہ ابھی آباد ہو رہے ہیں لیکن بات یہ نہ تھی اب انہیں اپنے بیٹے کے لئے [illegible] کا جہیز لانے والی لڑکیاں مل رہی تھیں مسرت ترازو کے پلڑے میں بہت ہلکی تھی اسے قبول کیسے کیا جاتا [illegible]

...ت سے انکار کر دیا بصیرت کی منگنی اس بات پر ٹوٹ گئی کہ لڑکے والوں کو خوش نہیں کیا گیا گفت کی بات ...کرنے کی جرأت ہی نہ ہو سکی

...اپنی آنکھوں سے اپنی رام کہانی سنا رہی تھی بانو پوری آنکھیں کھولے انگشت شہادت دانتوں میں ...حیرت زدہ سی تھی۔

...تم کیسی باتیں کر رہی ہو یہ سب کچھ پاکستان میں ہو! جہیز کی رسم ابھی باقی ہے۔؟

...کہاں۔ پاکستان بننے سے تو لوگوں کو دولت کی چاٹ لگ گئی لوٹ مار سے دولت ہاتھ آئی ہے تو آنکھیں ...گئی ہیں جہیز کی رسم تو اب لعنت بنتی جا رہی ہے۔ لڑکیاں تو جہیز کے مول بکنے لگی ہیں۔ شرافت پوچھتا ہے کوئی ...اس لڑکی جتنا زیادہ جہیز لے کر آئے اتنی ہی اونچی۔" صغریٰ بیزاری سے بولی۔

...تو ہندوؤں کی رسم تھی بی بی" ہندوستان میں ان کے دوش بدوش رہ کر ہم نے بھی اپنا لی لیکن اب تو ہم ...ملک کے مسلمان ہیں یہ رسم ختم ہو جانا چاہیے تھی"

...ختم ہوئی" صغریٰ نے دل آزار لہجے میں کہا۔

...دن اس میں اضافہ ہوتا رہا ہے لڑکے والے بھی ٹھونک بجا کر رشتہ کرتے ہیں اور لڑکی والے بھی بعد اخیر ...سے لوٹ مار کر کے لے آتے ہیں ہم جیسے سفید پوشوں کی لڑکیاں ماں باپ کے دل کا بوجھ بن کر گھٹ گھٹ ...کر زندگی گزارتی رہتی ہیں جو نہیں گزار سکتیں وہ لگامیں توڑ کر بے راہ روی کی جانب مائل ہو جاتی ہیں"

...بی بی!" بانو نے سینے پر ہاتھ مارا "نہیں۔ نہیں پاکستان میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ نہیں ہونا چاہیے"

...گئی پر بیٹھی وہ سوتی کا ذہنی مسرت نے بانو کی حالت دیکھ کر ماں کو چپ رہنے کا اشارہ کیا لیکن بانو سوچ میں ...گئی تھی وہ سمجھ ہی نہ سکتی تھی کہ یہ پاکستان ہے پاک لوگوں کا پاک وطن اسلامی معاشرے والا آزاد ملک ...اب تک لڑکیاں جہیز کی سولی پر چڑھتی ہیں۔ وہ کئی دن گم صم سی رہی اسی مسئلے کو سوچتی رہی حسن نے تو اسے ...تصور دیا تھا پاکستان کا۔ تو کیا۔ ؟ کیا۔ ؟ حسن نے جھوٹ بولا تھا

...حسن جھوٹ نہیں بول سکتا۔ حسن جھوٹ نہیں بول سکتا۔ صبح و شام بانو کا ذہن کشمکش سے دوچار رہتا ...ایسی سوچوں کے درمیان کبھی بچہ شامت اعمال ہنس پڑتا تو وہ اسے خونخوار نظروں سے دیکھنے لگتی۔

حسن کی حالت ناگفتہ بہ تھی کانچ کا وہ نازک سا پیکر تن جو سیال شے سے لبالب بھرا تھا ایک چھناکے سے [illegible] گیا تھا اس کے چاروں طرف درد ہی درد پھیل گیا تھا جس درد نے پہلو بہ پہلو کانچ کی کرچیاں چبھو کر [illegible] اک بار پھر اس سے بچھڑ گئی تھی وہ عالم اضطراب میں اپنے آپ کو کوستا اس نے وہ منحوس لمحہ [illegible] تھا۔؟

دفتر میں حمید نے بھی طویل رخصت کی درخواست بھجوا دی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ریا سے کی [illegible] گی۔

حسن سارا سارا دن بانو کو تلاش کرتا پھرتا کبھی موٹر لے کر سڑکوں پر آوارہ پھرتا کبھی پیدل [illegible] چلتا رہتا ہواؤں سے بانو کا پتہ پوچھتا فضاؤں میں اس کی مہک سونگھتا فریاد بن کر بکھر جاتا لیکن مایوسی کے [illegible] وسیع و عریض شہر میں جہاں لاکھوں نفوس تھے ایک بانو کا پتہ کیوں کر مل جاتا۔

بانو ٹھیک ٹھاک ہوتی تو اس کے چلے جانے کا وہ شاید اسطرح اثر نہ لیتا لیکن جس حالت میں وہ گئی تھی [illegible] سے ہی تڑپ اٹھتا تھا۔ اماں بھی سہمی ہوئی تھیں ایک تو بیٹے کی حالت مخدوش تھی دوسرا اپنا ضمیر [illegible] رہتا تھا اللہ کے حضور سجدے میں گر کر آنسو بہاتے ہوئے اپنے جرم کی معافی چاہی لیکن تسکین نہ [illegible] باریک ذرے کی طرح دل میں چبھ گئی تھی گھر کی حالت سلطانہ کو بھی قلق تھا وہ تو اس دن سے بالکل چپ [illegible]

رابعہ کا دل بھی بانو کے لئے خون کے آنسو رو رہا تھا اس کی مخدوش دماغی حالت کا سوچ کر اسے [illegible] آجاتی لیکن وہ بڑی ہمت سے حسن کا حوصلہ بندھا رہی تھی دن رات ایک کر دیا تھا ایک ابر تر کی طرح [illegible] بحال کر رہی تھی۔ حسن تڑپتا تو وہ دل تھام کر اسے تسکین پہنچانے کی کوشش کرتی وہ بانو۔ [illegible] کر اسے تسلی دیتی چھپ چھپ کر روتی لیکن حسن کے لئے سہارا بنی رہی۔

حسن اور رابعہ کا درد مشترک تھا حسن اپنے محبوب کو کھو کر تڑپ رہا تھا اور رابعہ اپنے محبوب [illegible]

چھوڑنا مناسب نہ تھا طے یہی پایا کہ کچھ دن اور سلطانہ بھی یہیں رک جائے حسن کی حالت [illegible]
گوارا کر رہی تھی۔ سلطانہ نے پہلے تو پس و پیش کیا لیکن رابعہ کے ارادے اٹل دیکھ کر چپ ہو گئی [illegible]
حسن ذرا سنبھل جائے تو اسے اور اماں کو ساتھ لے کر کراچی چلے جائیں۔ رابعہ کو اس بات پر کوئی اعتراض [illegible]
تو اپنی زندگی حسن کے لئے وقف کرنے کا تہیہ کر چکی تھی۔

رابعہ کی بے لوث خدمت اور دلجوئیاں رنگ لانے لگیں۔ حسن کے درد کا پیمانہ [illegible]
درد کا عادی بنا دیا۔

رابعہ کی دن رات کی خدمت سے وہ متاثر تھا وہ اسے سنبھالا دیتی تو وہ جانے اس کا کیا حال ہو [illegible]
بچوں کی طرح کھلاتا پلاتا۔ شیو کے لئے آمادہ کرنا نہلانے دھلانے اور کپڑے بدلنے کی ہوش [illegible]
"رابعہ۔ میں تم سے پہلے ہی بہت شرمندہ ہوں۔ میری پور پور بہت تمہارے احسانوں کے بوجھ [illegible]
نہیں۔"

"آپ ایسی باتیں نہ کیا کریں حسن" رابعہ اپنا درد چھپا کر کہتی "میرے فرض کو احسان کا نام [illegible]
حسن خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا جس پر چٹانوں کی سختی ابھر آنے کے باوجود معصومیت [illegible]
چھاپ بڑی گہری ہوتی۔ حسن پہروں اس سے بانو کی باتیں کرتا رہتا بانو سے محبت کی سرگوشیاں [illegible]
تھامے سنتی رہتی۔

کبھی وہ بے اختیار ہو کر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر شدت کرب سے تڑپ کر پوچھتا "رابعہ [illegible]
کہاں گئی۔ کہاں چلی گئی۔ میں اسے کہاں پاؤں گا میری فریادیں ستاروں سے ٹکرا کر لوٹ آئی ہیں [illegible]
جان ہوں رابعہ۔ بانو کے بغیر بھی جی رہا ہوں بانو سے چھپ کر بھی زندہ ہوں کتنا سخت جان ہوں میں [illegible]
تڑپ کر رابعہ سے پوچھتا "کیا بانو کبھی مل جائے گی؟ میں بھی سکون اور چین پاؤں گا"

رابعہ بجھتے ڈوبتے دل سے سب کچھ سنتی اور برداشت کر جاتی انسان واقعی بڑا سخت جان [illegible]
بھی تو حسن کے بغیر جی رہی تھی اس سے چھٹ کر زندہ تھی لیکن یہ سب محبت کا کرشمہ تھا عشق کی [illegible]

حسن کو سنبھلتے دیکھ کر سلطانہ نے کراچی جانے کا پروگرام بنا لیا حسن کی چھٹی ابھی باقی تھی یوں بھی [illegible]
کی تبدیلی اس کے لئے سودمند تھی۔ سلطانہ اپنا گھر بار چھوڑے کب تک بیٹھی رہتی اب کے [illegible]
اعتراض نہیں کیا وہ خود بھی اس جہنم کدے سے نکل کر کچھ دن سکون کے بسر کرنا چاہتی تھیں۔

رابعہ حسن سے پوچھ کر ہی کوئی فیصلہ کر سکتی تھی اس دن اس کی طبیعت کچھ دیکھ کر اس نے ذکر [illegible]
دیا۔

"تم واپس چلی جاؤ گی" حسن نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا "تو میں کیا کروں گا" رابعہ [illegible]

...سے بولی "امی واپس جانا چاہتی ہیں گھر سے آئے انہیں بہت دن ہو گئے۔

...۔ تم نہ جاؤ۔ تم چلی گئیں۔ تو میں اپنا دکھ درد کس سے کہوں گا حسن کے لہجے میں تڑپا دینے والی عاجزی تھی ...بھی میرے ساتھ چلئے" اس نے آہستگی سے کہا "مجھے تو یہاں بھی رہنے پہ کوئی اعتراض نہیں لیکن امی۔

...مجھے یہاں چھوڑ جانا پسند نہ کریں آپ ہمارے ساتھ کراچی چلئے کچھ تو جی بہل جائیں گے"

حسن کی حالت اس بچے کی سی تھی جس نے ابھی چلنا شروع کیا ہو قدم قدم پہ سہارے کی ضرورت تھی۔ یہ ...رابعہ کے سوا کون دے سکتا تھا لیکن حسن جیسے حساس انسان کے سینے میں اس زیادتی سے بھی کسک اٹھتی ...نے اسے کراچی چلنے پر آمادہ کر ہی لیا

حسن نے اس دن رابعہ کے سامنے مجرموں کی طرح سر جھکا کر کھڑے ہوئے کہا

...تم پر کس قدر زیادتی کر رہا ہوں رابعہ۔ اگر میں تمہیں محبت دے نہیں سکتا۔ تو تمہاری محبت کے سہارے ...زیادتی ہے تم کتنی عظیم ہو جانتے ہوئے بھی کہ میرا سب کچھ بانو کے ساتھ ہی لٹ گیا میری شکستہ اور چور چور ...کو سہارا دیے جا رہی ہو"

...رابعہ نے دھندلائی آنکھوں اور کانپتی آواز میں صرف اتنا کہا "آپ کے دل میں میرے لئے کچھ نہ سہی ...دل میں تو سب کچھ آپ کے لئے ہے میں نے آپ کو معبود جان کر پرستش کی ہے میرا یہ حق مجھ سے نہ چھینئے

حسن بے چین و بے کل ہو گیا لیکن دل کے رستے لہو میں بانو ہی بانو تھرک رہی تھی

واقعی عشق نور ہے۔

عشق روشنی ہے۔

عشق لافانی ہے۔ عشق اٹل ہے۔

عشق انسیت ہے۔ عشق الوہیت سے پھوٹا ہوا سرچشمہ ہے۔

http://www.rehanahmed.com
http://www.rehanahmed.com

"بابا"

"جی بیٹی......"

"کہیں بتا کام"

"تم ناحق تردد کروگی۔ کام کرنے کی ایسی کونسی ضرورت ہے۔ سوکھی گیلی جو ہم کھا رہے ہیں۔ تم ہم
ریم ہو۔"

"نہیں بابا...... میرے لئے کام تلاش کرو۔ اپنے ملک میں کام کرنے سے کوئی قباحت تو نہیں۔ پاک
کی خدمت کر کے ثواب ہی ملے گا نا۔ میں دینیات پڑھا سکتی ہوں۔ اقبال کا کلام مجھے اچھی طرح از
ہے۔ پڑھائی لکھائی نہ سہی۔ کوئی کام مل جائے بیکار رہنا بری بات ہے۔ قوم و ملک کی خدمت کرنا چا

"کہہ رکھا ہے دو چار آدمیوں کو۔ تمہاری خوشی ہمیں منظور ہے بیٹی۔ گو میں ضرورت تو نہیں سمجھتا
اصرار کرتی ہو۔ تو کر دیکھو"۔

بانو کے ذہن میں کام کی دھن سمائی تھی۔ اس گھر میں اسے کوئی تکلیف نہ تھی۔ پھر بھی وہ اس گھر کی
آمدنی پر اپنے آپ کو بار سمجھنے لگی تھی۔ ان لوگوں کا اخلاقی سہارا کیا کم تھا دوسرے اس کے دماغ میں اپنے
ملک کی خدمت کا جنون بھی سمایا تھا۔

رمضان علی نے بہتیرا روکا۔ بہتیرا سمجھایا۔ لیکن جنونی سی تو تھی۔ صبح شام اٹھتے بیٹھتے کام کی تلاش کے
دہائی کرانے لگی۔

ایک پرانے شاگرد کی وساطت سے رمضان علی کو بانو کے لئے ایک امیر گھرانے کے دو بچوں کو پڑھانے
کام مل گیا۔ معقول تنخواہ تھی۔ بانو کو تنخواہ کی خوشی نہ تھی۔ اپنی قوم کے بچوں کی نگہداشت کا مقدس فر
کرنے پر خوشی سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔

اصغر اور بیگم اصغر اپنی جہازی سائز آراستہ کوٹھی میں ٹھاٹ کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ آمدنی معقول سے بھی زیادہ تھی۔ زندگی کے لوازمات میسر تھے۔ عیش عیاشی کی حدوں کو چھو رہی تھی۔ دونوں ماڈرن سوسائٹی کے روان تھے۔ ببلی اور جمی دو بچے تھے۔ میاں کو کاروبار اور بیوی کو کلب سے فرصت نہ تھی۔ اس لئے بچوں کی داشت کے لئے کسی اچھی آیا کی ضرورت تھی۔

بانو کو ناقدانہ نظروں سے دیکھنے کے بعد بیگم اصغر نے معقول مشاہرے پر ملازم رکھ لیا۔ ببلی سات سال کی تھی جمی نو سال کی۔ خوبصورت تندرست و توانا۔ خوبصورت ملبوسات پہنے یہ بچے دیکھ کر بانو باغ باغ ہو گئی۔

بچے قوم کی امانت ہیں۔ یہ قوم کا مستقبل ہیں۔ ان صاف ستھرے بچوں کو دیکھ کر قوم کے سانے مستقبل بانو بڑی پر امید تھی۔ دونوں بچے انگریزی سکول میں تعلیم پا رہے تھے۔ بانو ان بچوں کو سفید براق سے یونیفارم سکول جاتے دیکھتی تو نہال ہو جاتی۔

لیکن دو چار ہی دنوں میں وہ کچھ بددل سی ہو گئی۔ ببلی جمی ماں باپ کو ممی ڈیڈی کہتے تھے۔ گفت و گو میں انگریزی کے الفاظ کثرت سے استعمال کرتے تھے۔ انگریزی نظمیں انھیں بڑی روانی سے آتی تھیں۔ جمی کو حساب کے سوال سمجھ نہ آتے تھے لیکن انگریزی میں ساری تعلیم تھی۔ بچہ پورے طور سے کلاس کے ساتھ چل نہیں سکتا تھا۔

بانو کو ذہنی دھچکا سا لگا۔ اس دن اس نے دونوں بچوں سے کلمہ سنا۔ جمی نے الٹ پلٹ اور ببلی نے غلط سنایا۔ مسلمان بچے ہو۔ تمہیں تو پوری نماز یاد ہونا چاہئے۔ تمہیں کلمہ بھی ٹھیک نہیں آتا۔ بانو نے بچوں کو کلمہ سکھایا۔

ماں کو ممی اور باپ کو ڈیڈی کہنے کی بجائے امی اور ابو کہنے کی تلقین کی۔ انگریزی نظموں کی بجائے اقبال کی بچوں کی دعا یاد کرائی۔ اسے بچوں کی حالت دیکھ کر بے حد دکھ ہوا تھا۔ رمضان علی سے رات وہ روز یہی باتیں کیا کرتی تھی۔ "بابا یہ بچے ہماری قوم کی امانت ہیں۔ قوم کا مستقبل ہیں۔ انگریزی انھیں ضرور پڑھنا چاہئے۔ لیکن ایک زبان سمجھ کر۔ احساس کمتری کا مرض بن کر نہیں۔ بابا غلامی کی یہ چھاپ تو آزاد ملک کے آزاد باشندوں کے ذہن پر نہیں ہونا چاہئے نا۔ اردو ہماری قومی زبان ہے۔ کتنی میٹھی، کتنی پیاری زبان ہے۔" رمضان علی اس کی دلجوئی کی خاطر ہاں میں ہاں ملا دیتا۔

اس دن بیگم اصغر کے ہاں ایک شاندار چائے تھی۔ ان کے فیشن ایبل دوست مدعو تھے۔ بے باکی اور بے حجابی کا دور دورہ تھا۔

بانو اس ماحول کو پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ کسی کی بیوی کسی کے پہلو میں لگی بیٹھی تھی۔ کسی کی بیٹی کسی کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ عریاں لباس جسم کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔ بانو آنکھیں پھاڑے ان لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔ کیا

یہ سب مسلمان ہیں؟ پاکستانی ہیں وہ انہیں دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

چائے کے بعد فرمائشوں کا دور شروع ہوا۔ گانے گائے گئے۔ کپل ڈانس ہوئے بانو کی آنکھیں [illegible] پھٹ جانے کو تھیں۔ اس کا جی چاہ رہا تھا۔ ایک ایک کو پکڑ کر پوچھے۔ تم مسلمان ہو؟ اسلامی مملکت کے [illegible] ہو؟ کیا اسلام نے تمہیں یہی تعلیم دی ہے۔ تم نے تو ابھی نیا نیا ملک بنایا ہے۔ تمہیں تو سرتاپا [illegible] اور [illegible] چاہئے۔ لیکن یہ سب کیا ہے؟ یہ سب کیا ہے؟"

بانو کا دماغ چکرا رہا تھا۔

ببلی اور جمی خوبصورت لباس پہنے ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ بیگم اصغر نے جب فیاض کی پشت پر ہاتھ [illegible] فیاض نے اصغر کے سامنے ہنستے ہنستے بیگم اصغر کے گرد اپنا بازو لپیٹا۔ تو بانو نے آنکھیں بند کر لیں۔ ببلی [illegible] سے ماں کو دیکھ رہی تھی۔ بانو سوچنے لگی۔ یہ بچی اس ماں سے کیا سبق سیکھے گی۔

ڈانس گانے کی دھما چوکڑی کے بعد بچوں کی باری آئی۔

"تم ٹونکل ٹونکل لٹل سٹار والی نظم سناؤ ببلی۔" بیگم اصغر نے بچی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر انگریزی [illegible] اکسایا۔ بچی پہلے شرمائی۔ پھر بانو کی طرف دیکھا۔

"امی"! ...... ببلی نے دیکھا۔ بیگم اصغر ممی سے امی بننے پر حیران سی ہوئی۔ ایک دم گھور کر اسے [illegible] بچی نے انگریزی نظم کی بجائے "لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری" سنانا شروع کر دیا۔ حاضرین [illegible] ہوئے۔ لیکن انگریزی نواز بیگم اصغر کی ہتک ہو گئی۔ اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ مہمانوں کے جانے [illegible] نے وہ شور مچایا۔ کہ بانو سکتے میں آ گئی۔

"بی بی۔ اردو ہماری قومی زبان ہے۔"

"بکواس بند کرو۔ تم میرے بچوں کو جاہل بنا دو گی۔ آج وہ بار بار مجھے امی کہہ رہے ہیں۔ یہ بھی [illegible] نے سکھایا۔ کتنا شرمندہ ہوئی میں آج۔"

بانو رات ساری روئیداد رمضانی اور اصغر کو سنا رہی تھی۔ آج بچہ پھر قہقہے لگا رہا تھا اس کی آواز میں [illegible] ہنسی کی تپتی ہوئی کھنک تھی۔ بانو اس پر جھپٹی۔ لیکن مسرت نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

آج بانو پھر سوچ رہی تھی۔ کیا حسن نے اس سے جھوٹ بولا تھا۔ کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہو گی جہاں مسلمان ایک اسلامی معاشرے کی تشکیل کر کے عرب سے اٹھی ہوئی صدا کی تکمیل کر سکیں گے۔ [illegible] الا اللہ کے نام پر حاصل کئے گئے ملک میں ایسی غیر اسلامی حرکات کا جواز ہی کیا تھا۔

دوسرے دن بانو نے پھر کوئی ایسی ہی باتیں کیں۔ بیگم اصغر کی نازک مزاجی بھلا کہاں تک متحمل ہو سکتی تھی۔ کھڑے کھڑے بانو کو نوکری سے برطرف کر دیا۔

بانو چپ چاپ وہاں سے آ گئی۔ تنخواہ کا چیک بھی نہیں اٹھایا۔

بڑی سڑک سے وہ گھر جانے والی سڑک پر آ گئی۔ کسی پرائمری سکول میں چھٹی ہو گئی تھی۔ میلے میلے باسوں والے گندے گندے بچے تھیلے، بستے اور سیاہی سے بھری تختیاں لئے سکول کی عمارت سے یوں نکل رہے تھے جیسے بھیڑ بکریاں ہوں۔

"یہ کیا ہے۔" بانو نے کسی راہ گیر سے پوچھا۔

"سکول ہے بچوں کا۔"

بانو دروازے کے قریب کھڑی بچوں کو نکلتے حیران نظروں سے دیکھنے لگی۔ بلی اور جمی بھی طالب علم بچے تھے۔ یہ بھی بچے تھے، لیکن ان کا سکول، ان کا لباس، ان کی صحت مندی اور توانائی۔ وہ نہ رہ سکی۔ ایک راہ گیر سے پھر پوچھا۔ "یہ کس کا سکول ہے۔"

راہ گیر اس سوال سے حیران ہوا۔ پھر بولا۔ "بچوں کا"

"بچوں کا...... یہ میلے کچیلے بچے۔"

"بی بی۔ یہ اردو سکول ہے۔ یہاں غریب اور متوسط طبقے کے بچے پڑھتے ہیں۔ کوئی انگریزی سکول نہیں۔ جہاں امیروں کے صاف ستھرے بچے فر فر انگریزی بولتے نظر آئیں۔ یہاں اردو میں تعلیم دی جاتی ہے۔"

"ایک ملک میں دو نظام ہائے تعلیم۔ ایک قوم کے بچے دو مختلف طریق سے تعلیم پاتے ہیں۔" بانو بڑبڑائی۔

راہ گیر کچھ نہ سمجھا۔ اپنی راہ چل دیا۔

ان میلے کچیلے، کالی سیاہی سے ہاتھ منہ رنگے بچوں کو اپنی قوم کا مستقبل ماننے سے انکار تھی۔ سوچتے سوچتے وہ اپنی راہ چل دی۔

دائیں ہاتھ گلی کے سرے پر ایک کشادہ جگہ پر کوڑے کے ڈھیر لگے تھے۔ بانو نے اس ڈھیر پر بھی ننگ دھڑنگ بچوں کو کھیلتے دیکھا۔ گندگی کے کیڑوں کی طرح وہ چیزیں چن چن کر کھا رہے تھے۔ کسی کے گلے میں پھٹا کرتا تھا۔ کوئی لنگوٹی پہنے تھا۔ کسی کے پاؤں میں جوتا نہیں تھا۔

بچے...... یہ بچے بھی پاکستانی ہیں؟"

یہ بھی قوم کی امانت ہیں؟

یہ بھی قوم کا مستقبل ہیں؟

بانو کے ذہن نے جھٹکے پہ جھٹکے کھائے۔

رات دیر تک وہ اسی موضوع پر بابا سے باتیں کرتی رہی۔ بابا کا دل خود بھی جلا ہوا تھا۔ لیکن بانو کو وہ تسلیاں دیتا رہا۔

سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بیٹی سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی ہمارا ملک نیا نیا تو وجود میں آیا ہے۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

بابا کی باتوں سے بانو کو تسکین نہ ملتی۔ اس کا ذہنی انتشار بڑھتا جاتا۔

عابدہ مسرت کی پر خلوص دوست تھی۔ ایک مقامی کالج میں لائبریرین تھی۔ شہر میں ایک زنانہ تنظیم کی طرف سے چیرٹی شو ہو رہا تھا۔ عابدہ کو کالج کی ایک امیر لڑکی سے تین چار ٹکٹ مل گئے تھے۔ وہ مسرت کے پاس آئی۔

"چلو گی۔"

"کہاں؟"

"چیرٹی شو میں۔"

"توبہ کرو۔ پیسے کہاں سے لاؤں گی۔"

"ٹکٹ مل گئے ہیں۔ مفت۔ مفت۔ ٹکٹ خریدنا ہوتا تو میں بھی ضرور ہی جاتی۔ ہو نہ۔" عابدہ نے اسے چار ٹکٹ دیئے۔

"پھر تو ضرور چلوں گی۔" مسرت بھرے لہجے میں کہا۔

"میں بھی چلو باجی" بصیرت نے کہا۔

"چلو" عابدہ بولی۔

"بانو کو لے چلتے ہیں۔" مسرت نے کہا۔

"بانو کون؟"

"ہماری ایک بہن۔"

عابدہ نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔ مسرت نے مختصر الفاظ میں اسے بانو کے متعلق بتایا عابدہ بڑی متاثر ہوئی۔ بصیرت بانو کو بلائی۔ وہ اب بھی رمضان بابا سے "بچے قوم کا مستقبل" پر بحث کر رہی تھی۔ وہ جو کچھ بھی کہہ رہی تھی۔ سچ کہہ رہی تھی۔

http://www.rehanahmed.com

عابدہ بانو سے مل کر خوش ہوئی۔ سے چیریٹی شو میں چلنے کی دعوت دی۔ بانو نے اس شو کے [illegible] پوچھے۔ عابدہ تو کھیل تماشا دیکھنے جا رہی تھی۔ اتنی طویل تفصیلوں میں جانے کی کیا ضرورت تھی۔

عابدہ۔ بانو اور مسرت کو ساتھ لے کر مقررہ جگہ جا پہنچی۔ ہال میں گیٹ پر بہت زیادہ رش تھا۔ [illegible] اور بچے بھی اندر جلد از جلد پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس شو میں کشش انگیز چیز صوفیہ کے رقص [illegible] ایک مقامی کالج کی فورتھ ایئر کی طالبہ تھی۔ ایک بہت بڑے باپ کی بیٹی۔ ماڈرن سوسائٹی کی [illegible] مقاصد کے لئے ہونے والی تقریبات میں پیش پیش۔ یوں ہی نام پیدا کر لیا تھا۔ جس تقریب میں [illegible] شامل ہوتے۔ اس کی کامیابی یقینی ہوتی۔

عابدہ کو بھی صوفیہ کے رقص کی کشش نے کھینچا تھا۔ ورنہ اسے تو اتنے بہت کام تھے ایک [illegible] کچھ بھرا تھا۔ عورتوں سے زیادہ مرد رقص کے مشتاق تھے۔ بانو حیران سی تھی۔ عورتوں کی تعلیم کی [illegible] آنے والی تقریب میں مردوں کا کیا کام؟

لیکن اسے کون سمجھاتا۔ کہ یہ ہماری ثقافت ہے۔ فن کا مظاہرہ ہے۔ جسے صرف عورتیں ہی [illegible] پیش نہیں کر سکتیں۔ مردوں کی داد و آفرین بھی ضروری ہے۔

رقص کیا تھے۔ نیم عریاں لباس میں جذبات کے بھڑکیلے مظاہرے تھے۔ مرد بے قابو ہو ہو کر [illegible] تھے۔ عورتیں بھی بڑھ چڑھ کر تالیاں پیٹ رہی تھیں۔

"پاکستان میں طوائفیں ابھی ہیں؟" اچانک بانو نے مسرت سے پوچھا۔ "وہ سٹیج پر تھرک [illegible] رہی تھی۔"

"کیا؟" مسرت صوفیہ کے جسم کے لہراتے بل دیکھ رہی تھی۔

"یہ طوائف" بانو نے سٹیج کی طرف اشارہ کر کے قدرے بلند آواز میں کہا۔

"ہائے اللہ" عابدہ نے خوف زدہ نظروں سے بانو کو پھر مسرت کو دیکھا۔ "یہ کیسے طوائف [illegible] مسرت۔"

"یہ طوائف نہیں ہے کیا؟ بانو کی آنکھیں حیرت سے پھٹ جانے کو تھیں۔

"خدا کے واسطے ایسی بات زبان سے نہ نکالیے۔ صوفیہ ایک شریف لڑکی ہے ایک بہت بڑے باپ کی بیٹی ہے۔"

"شریف لڑکی 'بہت بڑے باپ کی بیٹی۔"

"ہاں بانو۔" مسرت بانو کے تیوروں سے گھبرا گئی۔

"شریف لڑکیاں یوں سٹیج پر غیر مردوں کے سامنے ناچتی ہیں۔" بانو حیران ہو کر بولی۔

...ں کا مظاہرہ ہے۔ " عابدہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ " وہ بیچاری قوم کی خاطر اپنا وقت دے رہی ... چندہ جمع کرنے کے لئے رقص کر رہی ہے۔ غریبوں کی مدد کے لئے۔ آپ نے حد ہی کر دی۔ "

... ہماری ثقافت ہے بانو۔ ضروری تو نہیں رقص طوائفیں ہی کریں۔ قوم کی مدد کے لئے چندہ جمع کرنا نیکی ہی ... ہے۔ مسرت نے اسے خاموش کرنے کے لئے جلدی جلدی کہا۔

" تم کس بے غیرت قوم کی بات کر رہی ہو مسرت۔ " بانو کی آواز میں اشتعال تھا۔ " جو اپنی جوان بیٹیوں کو ... وں کے سامنے نچوا کر پیسہ اکٹھا کرتی ہے۔ غریبوں کے لئے چندہ اکٹھا کرنے کا کوئی اور طریقہ نہیں۔ "

مسرت نے عابدہ کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ کیا عجب بانو کا جنون بڑھتا جائے۔ اور وہ یہاں کوئی تماشا ہی بنا ... عابدہ اٹھنے کو تیار نہ تھی۔ اتنا خوبصورت ' جذبات انگیز اور تسکین پرور رقص چھوڑنے کو جی کہاں چاہتا ... لیکن مسرت نے سر کی طرف اشارہ کر کے بانو کی طرف دیکھا۔ عابدہ سمجھ گئی۔ بادل نخواستہ اٹھنا پڑا۔

... نو کا دماغ چکرا رہا تھا۔ صوفیہ کا ہیولیٰ ذہن میں تھرک رہا تھا۔ کیا وہ مسلم قوم کی بیٹی تھی۔ کیا ہال میں بیٹھے سب ... مسلمان تھے۔ کسی کو غیرت نہ آئی۔ کسی کو حیا نے نہ جھنجھوڑا نہیں۔ یہ مسلمان نہیں۔ یہ وہ قوم نہیں جس نے ... ... پر سات سال کے قلیل عرصے میں ایک نیا ملک ابھارا تھا۔

... دن گذرتے گئے۔ بانو ذہنی جھٹکے کھاتی رہی۔ ان دنوں وہ ایک معزز خاندان میں ملازمت کر رہی تھی۔ میر صاحب ایک شریف انسان تھے۔ تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ پاکستان کے سچے شیدائی تھے۔ قوم ... میں مچلتا رہتا تھا۔ ملت کے خادم تھے۔ ان کی دو بچیوں کو اردو پڑھانے کی ذمہ داری بانو نے لے لی ... بانو کو یہاں ذہنی سکون ملا۔ مسلمان کی شان کا پرتو اسے اس گھرانے میں نظر آیا۔ دیانت ' صداقت اور ... کی بیکراں دولت اس گھرانے میں تھی۔ بانو کے ذہن میں ایک پاکستانی کا کچھ ایسا ہی تصور تھا۔ اسے یوں ... جیسے وہ ایک بار پھر اپنے لوگوں میں آگئی ہو۔

... ان یہاں بھی اسے ذہنی جھٹکے لگے۔ میر صاحب تحریک پاکستان کے عملی رکن تھے۔ لیکن اب ان کا پرسان ... کوئی نہ تھا۔ نئے نئے چہرے سامنے آ رہے تھے۔ ان کی کہیں شنوائی نہ تھی۔ درد دل میں دبائے وہ صرف ... ال آرائیاں اور قیاس آرائیاں ہی کر سکتے تھے بانو حیران تھی۔ کہ قوم و ملک کو تو ایسے سچے اور مخلص پرستاروں کی ... ضرورت ہے۔ لیکن میر صاحب جیسے انسان کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ کیا ان سے بھی زیادہ ہمدرد ' پر خلوص اور ... دار آدمی قوم و ملک کو میسر آگئے؟

اگر آگئے تھے تو خوشی کا مقام تھا۔ اگر نہیں تو قوم کی تیرہ بختی تھی بانو گومگو کے عالم میں تھی۔

○

... انہی دنوں میر صاحب کا جواں سال قابل ترین بیٹا دوسری بار اس مطلوبہ نوکری کو حاصل نہ کر سکا۔ جس

کے لئے اس نے انتھک محنت کی تھی۔ وہ قابل ترین ہونہار اور صحت مند رجحان کا مالک تھا۔ انتظامی ڈھانچے کی کلیدی آسامیوں پر اسے فائز ہو کر اپنے ملک اور قوم کی صحیح اور ایمان دارانہ خدمت کرنا تھی۔ لیکن اس کی جگہ دوسری بار بھی اس شخص کو منتخب کر لیا گیا تھا۔ جس کے پیچھے لیاقت کا وزن نہیں بہت بڑی سفارش کا وزن تھا۔ اس دفعہ تو میر صاحب کا بیٹا اتنا بدظن ہوا تھا۔ کہ اس کے منہ سے ناجائز کلمات بھی نکل گئے تھے لیکن میر صاحب نے اسے حوصلے اور ہمت ہی کی تلقین کی تھی۔ ملک و ملت سے بدظنی کو گناہ کے مترادف کہا تھا۔

پھر میر صاحب کا اپنا کاروبار بھی کچھ انہی وجوہ سے متاثر ہوا تھا۔ وہ ایمان داری کے اصول کو اپنا کر کام کر رہے تھے۔ رشوت کے نام سے خوف کھاتے تھے لیکن ملت کی رگوں میں یہ زہر تیزی سے سرایت کر رہا تھا۔ میر صاحب کو وہ ٹھیکہ نہ مل سکا۔ جس پر ان کی امیدیں وابستہ تھیں۔ دوسرے ٹھیکیدار نے چور دروازے سے یہ کام کر لیا۔ رشوت دی اور کام بن گیا۔ میر صاحب قومی مفاد کے نقطہ نگاہ سے ہی دیکھتے رہ گئے میر صاحب کو کم ریٹ پر بھی کام نہ مل سکا۔ لیکن دوسرا زیادہ ریٹ منظور کروانے میں کامیاب ہو گیا۔ منظور کرنے والے عملہ کو دینے کے لئے روپیہ اس نے اسی طرح پورا کرنا تھا۔

میر صاحب سے زیادہ بانو کو ذہنی دھچکا لگا۔

وہ سوچتی ایمان داری دیانت داری کی اہمیت کچھ بھی نہیں رہی۔ لیکن پاکستان کے یہی تو نعرے تھے۔ کیا یہ نعرے اک فریب تھے۔

حسن تو اسے یہی کہا کرتا تھا۔ بڑے بڑے لیڈروں کی تقریریں میں بھی یہی بات ہوتی تھی۔ لیکن اب یہاں کیا ہو رہا تھا؟ کیا یہ وہی پاکستان تھا۔ جس کا تصور جنتی رعنائیوں کا حامل تھا۔ جس کے تین بنیادی نعرے تھے۔

اسلام۔ زبان اور کلچر......

وہ اکثر رمضان بابا سے اس سلسلے میں بحث کرنے لگتی۔ رمضان بابا تنگ دستی اور معاشی ناہمواری کا پِسا ہوا مہرہ تھا۔ پھر بھی بانو کی ذہنی حالت کے پیش نظر اسے ہمیشہ تسلی و تشفی دیتا۔

بانو کی ذہنی الجھنیں بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔ کبھی کبھی اس کا جی چاہتا۔ حسن کے پاس جائے اور اس کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑ جھنجوڑ کر پوچھے۔ کیا یہی ہے وہ اسلامی مملکت جس کے لئے تم نے دن رات ایک کر کے اتنے سہانے تصور دیئے تھے...... ؟ کیا تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا؟ میں تو قیامت تک بھی یقین نہیں کر سکتی۔ کہ تم جھوٹے بھی ہو سکتے ہو؟

پہلے تو بانو کو حسن کے گھر کا پتہ ہی نہ تھا۔ لیکن پچھلے دنوں رمضان علی اور نگہت کے ساتھ ہسپتال جاتے ہوئے اس نے وہ سڑک دیکھی تھی۔ جس سے بڑی سی کشادہ گلی اتر جاتی تھی۔ اس نے رمضان علی کو بتایا تھا۔ کہ حسن یہاں رہتا ہے۔

رمضان علی نے چاہا تھا۔ کہ اسے اس کے عزیزوں کے پاس لے چلے۔ لیکن اس نے خوف زدہ ہو کر سختی سے انکار کر دیا تھا۔ حسن نئی زندگی کی بہاروں کو یقیناً گلے لگا چکا ہو گا۔ وہ خود تو کیا اپنا سایہ بھی اس تک پہنچنے نہ دے گی۔

حسن اب بھی اس کے دل میں اسی شدت وحدت سے بس رہا تھا۔ لیکن اس کا راستہ اس سے کٹ چکا تھا۔ ہاں کبھی کبھی عالم جنوں میں وہ اس تک پہنچنے کی تڑپ محسوس کرتی۔ صرف یہ پوچھنے کے لئے کہ اس نے اس سے جھوٹ کیوں بولا تھا۔

بانو سیارہ تھی۔ سیارہ جو ہمیشہ گردش میں رہتا ہے۔

اک آوارہ روح کی طرح وہ بھٹکتی پھری۔ رمضان علی کے خلوص کا سہارا نہ ہوتا تو اب تک یہ سیارہ ذرہ ذرہ ہو کر بکھر بھی گیا ہوتا۔

مہ و سال گزرتے گئے۔ بانو نے ان سالوں میں کئی جگہ نوکری کی۔ نوکری وہ صرف پیسے کے لئے نہ کر رہی تھی۔ وہ پاکستان اور پاکستانیوں کو قریب سے دیکھنے کی متمنی تھی۔ اس نے پنڈی پشاور کراچی اور دیگر کئی شہروں میں کام کیا۔ گھوم پھر کر اپنی قوم کو دیکھا۔ وہ پاکستان جس کے تصور میں وہ متواتر پانچ سال مرتی رہی تھی۔ لیکن اس مسلسل موت میں بھی زندہ رہنے کی لگن پائی تھی۔ اسے کہیں نہ ملا۔ وہ قوم جو طوفانوں سے ٹکرانے کا ولولہ رکھتی تھی۔ اسے نظر نہ آئی اسے ہر کوئی پیسے کی دوڑ میں اندھا دھند بھاگتا نظر آیا۔ قوم کا نظریہ جیسے بدل ہی گیا تھا۔

اس نے اپنے گھروں میں بھی نوکری کی۔ جو الہ دین کا چراغ رکھتے تھے۔ ہزاروں سے لاکھوں اور لاکھوں سے کروڑوں میں پہنچ رہے تھے۔ یہ الہ دین کا چراغ کیا تھا؟ بانو ذہنی جھٹکے پہ جھٹکے کھاتی۔ آبرو کا لفظ اپنی اہمیت ہی کھو چکا تھا۔ دولت حاصل کرنے کے خبط میں عزت و آبرو تک کی بازی لگائی جا رہی تھی۔ کردار و اخلاق بے معنی ہو گئے تھے۔

اس نے بلیک مارکیٹنگ کرنے والوں کو بھی قریب سے دیکھا۔ اور سمگلنگ کر کے قوم و ملک کے سینے میں خنجر اتار کر ان زخموں کی تعیش کا سامان لوٹتے لوگوں کو بھی دیکھا۔

اس نے بھوک و افلاس سے بلکتے دم توڑتے لوگوں سے بھی ملاقاتیں کیں۔ اس نے حق داروں کا حق تلف ہوتے بھی دیکھا۔ اس نے قوم کے نونہالوں کو گناہ کی پھسلتی ڈھلان پر پھسلتے بھی دیکھا۔ جوان لڑکیاں بے راہ روی پر آمادہ بھی نظر آئیں۔

کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں پر قوم کے مستقبل کو گلی سڑی سبزیاں کھاتے بھی پایا اور ہسپتالوں میں دوائیوں

کے بغیر ڈاکٹروں کی لاپرواہی سے دم توڑتے مریض بھی نظر آئے۔ اس کے تلخ تجربے اور جان لیوا مشاہدے نے اس کے ذہن کو بری طرح متاثر کیا۔ وہ بچہ جسے رمضان علی نے غلام احمد بنایا تھا۔ اسے ہمیشہ ہنستا ہی نظر آیا۔

ہنستا! اس کی مایوسیوں پر طنزیہ قہقہے لگانے والا ہنستا۔

کبھی تو وہ نادم ہو کر بچے کے سامنے سر جھکا کر بیٹھ جاتی۔ اور کبھی حیوانی انتقامی جذبے سے مجبور ہو کر اس کے گلے پر جھپٹ پڑتی۔

ان دنوں وہ لاہور رمضان علی کے ہاں ہی تھی۔ رمضان علی نے اب اسے کسی دوسرے شہر میں نوکری کرنے سے سختی سے منع کر دیا تھا۔ وہ تو اس کی حالت کے پیش نظر لاہور میں بھی نوکری سے منع کرنا چاہتا تھا۔

لیکن بھلا سیارے بھی کبھی ساکن ہوتے ہیں۔

بانو...... اپنی روح' اپنے دماغ اور اپنے ذہن ہی کی طرح گھوم رہی تھی۔

مسز اشرف کے بچہ ہونے والا تھا۔ بانو کو ملازمت دینے میں اس نے پس و پیش نہ کیا۔ زچگی ہسپتال میں ہونا تھی۔ اسے وہاں اپنے ساتھ ایک عورت کی ضرورت تھی۔ پہلا بچہ تھا۔ کچھ ڈر سا بھی لگتا تھا۔ ویسے بچے کے لئے تو اس نے عیسائی تربیت یافتہ آیا کا بندوبست کر لیا تھا۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ عزت و دولت دونوں چیزوں کی فراوانی تھی۔

بچہ پیدا ہوا۔ لڑکے کی پیدائش پر بیگم اشرف بے حد خوش ہوئی۔ اشرف کو لڑکی کی خواہش تھی۔ بہر حال تندرست و توانا خوبصورت سا بچہ اللہ میاں کی طرف سے دیا گیا تحفہ تھا۔ خوشی اور شکر کا مقام تھا۔

لیکن مسز اشرف نے بچے کو دودھ پلانے سے انکار کر دیا۔

"کیوں بی بی۔ دودھ اتر نہیں رہا۔" بانو نے گھبرا کر پوچھا۔

"اتر رہا ہے۔"

"اوپر کا دودھ دوں گی۔"

"کیوں؟"

"بس۔ میری مرضی۔"

"لیکن بچے کی قدرتی غذا جو اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔"

"اوہ...... بحث نہ کرو۔ میرا دماغ پہلے ہی تھکا ہوا ہے۔ تم بچے کو آیا کے حوالے کر دو۔ وہ سنبھال لے گی۔"

"لیکن بی بی۔ اوپرا دودھ۔"

"ہاں ہاں۔ اوپر کا۔ میں نے اسے اپنا دودھ نہیں دینا۔"

http://www.rehanahmed.com

مسز اشرف بچے کو دودھ پلا کر اپنا سڈول جسم بے ڈول کرنے کی حامی نہ تھی۔ بچے نے پلنا ہی ہے۔ دوسرے دودھ پر بھی پل جائے گا۔ اس کی دوست ثمینہ کا بچہ بھی تو اوپرے دودھ پر تھا۔ کتنا صحت مند اور سرخ سپید......

لیکن بانو حیران تھی۔ جب ماں کا اپنا دودھ ہے تو بچے کو دوسرے دودھ پر ڈالنے کی ضرورت کیوں پڑی۔ اس حیرانی کا ہر بار اس نے مسز اشرف سے دردمندانہ انداز میں ذکر کیا۔

"اوہ خدایا۔" مسز اشرف کی نازک دماغی اسے کہاں تک برداشت کرتی۔

"بیگم...... بچے کو تم اپنا دودھ نہیں پلاؤ گی۔ تو یہ تمہاری ممتا کی بو کیسے پہچانے گا۔ عیسائی آیا اسے وہ تربیت کیسے دے گی۔ جو اسے ملنا چاہئے۔ وہ طارق کیسے بنے گا خالد کیسے ہو گا۔ محمد بن قاسم کیوں کر بنے گا۔ تمہیں معلوم نہیں ابھی ہندوستان میں سینکڑوں بیٹیاں اور بہنیں ہیں۔"

"اوہ!...... بس بھی کرو۔ کیا بک بک لگا رکھی ہے۔"

"بک بک" بانو کا دماغ لٹو کی طرح گھوم گیا۔ "تم اسے بک بک کہتی ہو۔ خطرے کی تلوار ہمارے سروں پر لٹک رہی ہے۔ ہندوؤں نے ہمیں ابھی تک ذہنی طور پر قبول نہیں کیا۔ سانپ جب بھی موقع ملے ڈس لیتا ہے۔ ہمیں تو وہ لاٹھی تیار کرنا ہے جو اس سانپ کا سر کچل سکے۔ ان بچوں کو اپنا دودھ پلاؤ۔ انہیں اپنا خون پلاؤ بی بی۔ جبھی تو یہ دشمن......"

"اوہ۔ تم چپ کرو گی۔ یا میرا دماغ چاٹ لو گی۔"

بانو حیران ہو کر مسز اشرف کا غصے اور جھلاہٹ سے تمتماتا چہرہ دیکھنے لگی۔

شام اشرف بیوی بچے کو دیکھنے آیا۔ تو مسز اشرف نے سب سے پہلے بانو کی شکایت کی۔ "اشرف اس کا حساب بے باق کر کے جواب دو۔ الٹی سیدھی ہانک کر میرا دماغ کھا جاتی ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے۔ کچھ دن اور میرے پاس رہی تو میرا نروس بریک ڈاؤن ہو جائے گا۔"

بانو ششدر رہ گئی۔ اس کا ذہن ماؤف تھا۔ اسی شام لاڈلی بیگم صاحبہ کے حکم کی تعمیل میں بانو کو جواب مل گیا۔

بانو کا دماغ لٹو کی طرح گھوم رہا تھا۔ پاکستانی ماؤں نے تو شاہین بچوں کو پالنا تھا ان کی تربیت کے انداز بدلنا تھے۔ ان کے بازوؤں میں بجلیاں بھرنا تھیں۔ ان کے عزم میں تنومندی کا سیسہ بھرنا تھا۔ بچوں کو طارق بنانا تھا۔ خالد بنانا تھا۔ محمد بن قاسم بنانا تھا۔

لیکن...... لیکن...... یہ مائیں۔

"رمضانی بابا" بانو کا سینہ فرط غم سے پھٹ جانے کو تھا۔ آج پھر وہ رمضانی بابا سے پرانی بحث کر رہی تھی۔

"مایوس نہ ہو بیٹی۔ خدا سب کا مالک ہے۔" رمضانی بابا رکتے رکتے بولا۔

"بابا" بانو پھٹی پھٹی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھتے بولی۔ "یہ پاکستان نہیں ہے بابا یہ پاکستان نہیں ہو سکتا۔

"اتنی مایوس نہ ہو میری بچی۔" رمضان علی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"یہ قوم مر چکی ہے بابا۔ مر چکی ہے۔"

"نہیں بیٹی۔ مایوسی گناہ ہے۔ قوم کی غفلت سے انکار نہیں۔ لیکن اسے مردہ بھی مت کہو۔ تمہاری سوچ جذباتی ہوتی ہے۔ ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن تو ہوئے ملک کو بنے۔ اور کتنی ترقی ہو سکتی تھی۔ تعمیری پہلو بھی تو دیکھا کرو۔ صنعت کے میدان میں پاکستان آگے نکل رہا ہے۔ زمینیں سونا اگل رہی ہیں۔ یہ سب پاکستانیوں ہی کی محنت کا نتیجہ ہے نا۔"

بانو نے مایوسی سے سر نفی میں ہلا دیا۔ "تم غلط کہہ رہے ہو بابا۔"

"غلط نہیں' ٹھیک' کہہ رہا ہوں۔ میں اپنی قوم کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ اک نوزائیدہ مملکت میں اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا تھا۔"

"کچھ بھی نہیں ہوا بابا...... اس قوم کو جن خطوط پر سوچنا تھا۔ اس پر نہیں سوچ رہی۔ مان بھی جاؤ۔ میں نے گھوم پھر کر بہت کچھ دیکھا ہے۔ قوم کی اجتماعی سوچ کا انداز بدل گیا ہے۔ جسے تم ترقی کہہ رہے ہو۔ وہ پیسے کی ہوس ہے۔ مخلصانہ کام کہیں بھی نہیں ہو رہا۔ عیاشی' عیش و عشرت...... اس قوم کا نصب العین بن گیا ہے بابا۔"

"نئی نئی قوم۔ نیا نیا ملک۔ ایسے ہی ہوتا ہے۔"

"نئی قوم......" بانو نے تقریباً چیخ کر کہا۔ "چودہ سو سال پہلے جس قوم کی تشکیل ہوئی۔ اسے تم نئی قوم کہہ رہے ہو۔ ملک نیا تھا۔ لیکن اسلام نے جو ضابطہ حیات اس قوم کو بخشا ہے۔ اس پر عمل پیرا ہونے میں کیا ممانعت تھی۔ اس ملک میں تو اس کو صرف رائج ہی کرنا تھا تجربات کی تکمیل تو اسلام نے پہلے ہی کر دی تھی۔ نیا پن کیا ہوا؟......"

رمضان بابا چپ سا ہو گیا۔ بانو سوچ میں ڈوب گئی۔

صغرا نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "بیٹی...... تمہیں کیا پڑی ہے ایسی باتیں سوچنے کی۔ وقت گزر رہا ہے۔ اچھا برا گزر ہی رہا ہے۔ تم سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہو۔ ہر وقت قوم ہی کا غم کھاتی رہتی ہو۔"

"بی بی"...... بانو دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "کیا اسی لئے پاکستان بنا تھا۔ کیا لاکھوں گھر اسی لئے جلے تھے۔ کیا خون کی ندیاں اسی لئے بہی تھیں۔ کیا بانو اور حسن میں ازل وابد کے فاصلے اسی لئے آئے تھے۔"

بانو رونے لگی۔ رمضان علی کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ صغرا بھی آنچل سے آنسو پونچھنے لگی۔ بانو کو روتے دیکھ کر بچہ جو مسرت کے پاس بیٹھا قاعدہ پڑھ رہا تھا۔ اٹھا اور ڈرتے ڈرتے بانو کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

"بیٹی" صغرا نے بانو کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "تم یوں نہ سوچا کرو۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ اللہ کی رضا یہی تھی۔ بس زندگی کے دن پورا کرنے ہیں۔ ہو جائیں گے۔ ملک و ملت کو دماغ پر مسلط نہ کیا کرو۔"

"بی بی۔" بانو نے روتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ "تم کیا جانو۔ اس مٹی کے لئے ہم پر کیا کیا قیامتیں گزر گئیں۔"

"بانو بیٹی" رمضان علی اس کی پشت تھپ تھپاتے بولا۔ "قوموں کی زندگی میں قربانی کے مرحلے آتے ہی رہتے ہیں۔ راستے متعین ہونے میں بھی کچھ وقت لگتا ہے۔ گھبرانا نہیں چاہئے۔"

"راستے اب متعین کرنا ہیں کیا...... ؟" بابا ہم نے تو خون کی لکیریں کھینچ کھینچ کر راستوں کا تعین کیا تھا۔ لیکن میں دیکھتی ہوں۔ کہ خون کی ان لکیروں پر دھول کی تہیں جم چکی ہیں۔ قوم اس قربانی کو بھلا بیٹھی ہے۔ اس کا نظریہ بدل گیا ہے۔ اس کے اصول بدل گئے ہیں۔" وہ جوش میں آ کر بولی۔ بچہ سہم کر اس کا منہ دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظر بچے" پر پڑی۔ اس کے اندر کا طوفان ابل پڑا۔ مسرت نے جلدی سے بچے کو اپنی طرف کھینچ لیا۔

بانو خونی نظروں سے بچے کو دیکھتے ہوئے چیخی۔ "اس قوم کو جھنجھوڑو بابا۔ اسے اس کا مقام یاد دلاؤ۔ اس کا نصب العین بدل دو۔ کیا اس قوم کو عیش و عشرت زیب دیتے ہیں۔ جس کی بیٹیاں بسنتوں کے ہاتھوں لٹ گئی تھیں۔ بانوئیں سندر کوریں بن کر ان کے بچے جنتی رہیں۔ قوم کو تو اس بے عزتی پر انتقام کی آگ بن جانا چاہئے تھا۔ ابھی بھی کروڑوں مسلمان دشمن کے پنجہ استبداد میں ہیں۔ ان کی فریاد سے قوم نے کان بند کر لئے تو وہ کہاں جائیں گے۔ انہوں نے تو جانی اور مالی قربانیاں دے کر پاکستان کا حصار بنایا تھا۔ لیکن اب ان کے متعلق کون سوچتا ہے۔ درندوں پر رحم نہ کرو بابا۔ تمہارے وہ مسلمان بھائی محفوظ نہیں ہیں۔ تمہیں حفاظت بہم پہنچا کر وہ خود غیر محفوظ ہو چکے ہیں۔ خطرے کی تلوار ابھی سر پر لٹک رہی ہے۔ تم کیوں بھول رہے ہو۔"

رمضان علی متاثر تو بے حد ہوا۔ لیکن بانو کو تسلی دینا ضروری تھی۔ اسے سر پر پیار دیتے ہوئے بولا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا بانو بیٹی۔ مایوسی گناہ ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب کچھ آہستہ آہستہ ہی ہو گا نا۔"

"میں کب کہتی ہوں۔ کہ سب کچھ ایک دم ہی ہو جائے۔ عمارت کھڑے ہوتے وقت لگتا ہے۔ لیکن بابا۔ عمارت کھڑی ہونے کا سوال تو تب ہو۔ جب کہیں سنگ بنیاد بھی رکھا جائے۔ یہی حال رہا تو آگے چل کر اس قوم کا کیا حال ہو گا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ رمضان علی نے تاسف سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ اس کے سوا بانو کی تسلی کے لئے اس کے پاس جیسے الفاظ ہی نہ رہے تھے۔

بانو غیر مطمئن تھی۔ امید کی کوئی کرن اسے نظر نہ آرہی تھی۔ وہ مایوسی کے اندھیروں میں بھٹکنے لگی۔ بیٹھے بیٹھے اس کے کانوں میں حسن کی باتوں کی گونج لہراجاتی۔

"پاکستان ہم محض ایک خطہ زمین حاصل کرنے کو کوشاں نہیں۔ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں ہم اسلام کے ازلی وابدی اصولوں کو آزماسکیں۔"

"اسلام ہماری زندگی اور ہمارے وجود کا بنیادی سرچشمہ ہے۔"

"غلامی میں ہمارے خون کی یہ شان ہے تو آزاد ملک میں آزاد قوم کے لہو کا کیا رنگ ہو گا۔

بانو بے اختیار ہو جاتی۔

کیا یہ سب فریب تھا؟ حسن نے اس سے جھوٹ بولا تھا؟

سوچ سوچ کر اس کا ذہن ماؤف ہونے لگتا۔

حسن رابعہ کے ساتھ کراچی آ گیا۔ اور پھر عبدالرحیم نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے اس کی تبدیلی بھی کراچی کروالی حسن سے وہ دیار بھی چھٹ گیا جس میں اس کی حسرتوں کے مزار تھے۔ رابعہ اس تبدیلی سے خوش تھی۔ اتنی خوش جیسے کوئی انمول چیز پالی ہو۔ حسن کی قربت ہی اب اس کی زندگی تھی۔ جانتے ہوئے بھی کہ حسن راکھ کا ڈھیر ہے۔ وہ اس راکھ کی عقیدت میں سرشار تھی۔

اماں اور سلطانہ پرامید تھیں۔ کہ وقت اور قربت دونوں کو اس بندھن میں باندھ دیں گے۔ جو بانو کے آ جانے سے ٹوٹ گیا تھا۔

لیکن ایسا سوچنا بھی حسن کے لئے گناہ کے مترادف تھا۔ دل پر پہلے ہی بوجھ کیا کم تھا۔ بانو کی گمشدگی ضمیر میں تیر کی طرح چبھی تھی۔ اپنی غداری پر شرمسار تھا۔ بانو تو پہلے ہی چور چور تھی۔ اس انکشاف سے کہ حسن نے رابعہ سے دل لگا لیا تھا۔ اس کا ٹوٹا دل ریزہ ریزہ ہی تو ہوتا تھا۔

حسن رابعہ سے بھی شرمسار تھا۔ اب اس کے احسانوں کے بوجھ تلے اس طرح دب گیا تھا۔ کہ چیخنے کی گنجائش بھی نہ رہی تھی۔ آگ ہی آگ چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ کراچی سے حسن کا تبادلہ کوئٹہ ہو گیا تھا رابعہ کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ لیکن حسن مطمئن تھا۔ رابعہ کے احسانوں کا بار اٹھانے کی اس میں ہمت نہ رہی تھی۔

رابعہ نے اپنی زندگی حسن کے لئے وقف کر دی تھی۔ حسن کی قربت تو میسر تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے غم سے آشنا تھے۔ درد مشترکہ تھا۔ دوستوں کی طرح ایک دوسرے کے غم گسار تھے رابعہ کا یہ سہارا بھی چھوٹ رہا تھا۔

حسن نے بارہا رابعہ کو سمجھایا تھا۔ کہ راکھ کے ڈھیر میں شعلہ ہے نہ چنگاری ہے اس پر سہارا نہ کرے جو خود بے سہارا ہو چکا ہے۔

لیکن یہ تو دل کے معاملے تھے۔ رابعہ ہر بار اسے ایسا جواب دیتی۔ کہ وہ لاجواب ہو جاتا۔ دونوں کا درد تو ایک

ہی تھا نا۔ کیا حسن بانو کے خیال کو دل و دماغ سے نکالنے پر قادر ہو سکتا تھا۔ پھر وہ رابعہ سے ایسی توقع کیوں کرتا تھا۔

حسن تبدیل ہو کر کوئٹہ چلا گیا۔ وہ خون جگر پیتا رہا غم اسے کھاتا رہا یہی واردات رابعہ پر بھی بیت گئی۔

سلطانہ نے رابعہ کی زندگی میں خوشیاں لانے کی پوری کوشش کی حسن سے مایوس ہو کر اس نے دو تین اچھے اچھے رشتوں کو جانچا پرکھا۔ پیغام بھی آئے۔ خواہش بھی ظاہر کی گئی۔

لیکن رابعہ اپنے جنسی جذبات کو موت کی نیند سلا چکی تھی۔ اس کا اول و آخر تھا تو صرف حسن۔ اسے اپنی ناکامی بھی محبوب تھی۔ سلطانہ نے اس کی سہیلیوں کے ذریعے زور دیا۔ خود سمجھایا۔ سختی پر اتر آئی۔ باپ سے دباؤ ڈلوایا۔ لیکن رابعہ مجبور نہیں ہوئی بلکہ اس نے ہر جگہ انکار کر دیا۔

مہینے نہیں سال بیت گئے۔ حسن کوئٹہ سے پشاور تبدیل ہو گیا۔ زندگی گھسٹتی چلی جا رہی تھی۔ اماں اب بیمار رہنے لگی تھیں ساری عمر محرومیوں سے نپٹتے گزری تھی۔ اب ہمت جواب دے گئی تھی۔ حسن سے اب وہ کچھ بھی نہ کہتی تھیں۔ سلطانہ کے خطوط گاہے گاہے ملتے رہتے تھے۔ رابعہ کی ہٹ دھرمی کا رونا وہ اماں کے خطوط میں رویا کرتی تھی۔ اماں کی خرابی صحت کی وجہ سے حسن نے باہمی رضامندی سے تبادلہ لاہور کروا لیا۔ اماں کے بھی عزیز لاہور میں تھے۔ اس لئے لاہور رہنے کی متمنی تھیں۔ حسن پھر اس گھر میں آ گیا۔ جہاں اس کی زندگی کی رنگین اور سنگین داستانیں بکھری پڑی تھیں۔

ان دنوں حمید بھی لاہور میں تھا حسن کو اس کی وجہ سے بڑی تسکین ملی۔ ورنہ یہاں آ کر تو زخموں کے منہ پھر سے کھل گئے تھے۔ حمید کی ہمدردیاں رابعہ کے ساتھ بھی تھیں جو خواہ مخواہ سولی پر چڑھ گئی تھی۔ زندگی تباہی سے ہم کنار کر دی تھی۔ لیکن حسن کا دکھ اتنا گھمبیر تھا۔ کہ اس سلسلے میں حمید کو کبھی کچھ کہنے کی جرات نہ ہو سکی تھی۔

انہیں دنوں اماں کو قولنج کا شدید درد اٹھا۔ کچھ عمر کا تقاضا کچھ دل و جگر چھلنی' اماں تو گھڑیوں پلوں میں جیسے ہاتھوں سے نکل گئیں۔ حسن تو گم سم ہو کر رہ گیا حمید ہی نے دوڑ دھوپ کر کے ہسپتال داخل کروایا۔ اور اماں کی خواہش پر کراچی ٹیلی فون کر دیا۔

سلطانہ' عبدالرحیم اور رابعہ نے بذریعہ ہوائی جہاز پہنچنے کی اطلاع دی۔ شام چار بجے کی پرواز سے وہ لاہور پہنچ رہے تھے۔ حمید اماں کے پاس ہسپتال میں رکا۔ اور حسن انہیں لینے ہوائی اڈے پر پہنچ گیا۔

حسن کا دل رقت سے بھرا تھا۔ بڑا ہی مضطرب' بڑا ہی نڈھال' بڑا ہی افسردہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے رابعہ کو دیکھا' مایوسی مجسم تھی جیسے سفید لباس میں آبلہ سا لگ رہی تھی۔

حسن کو دیکھ کر رابعہ کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔ وہ سرتاپا بدل گیا تھا سرخ و سپید رنگت پرانے تانبے کی سی

ہو رہی تھی کنپٹیوں پر بالوں میں کچھ سفیدی جھلک رہی تھی۔ آنکھیں انتظار کی کیفیت لئے تھیں۔ دائمی انتظار ۔ انمٹ انتظار۔ لازوال انتظار۔

اماں خطرے سے تو نکل گئیں۔ لیکن نقاہت بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ بھائی بھاوج اور نامراد بھتیجی کو دیکھ کر ان کا درد پھٹ گیا۔ کچھ اس بے صبری سے روئیں کہ دیکھنے والوں کے دل تڑپ گئے حسن تو برداشت نہ کر پایا۔ جب اماں نے رابعہ کو سینے سے لگا کر بین کئے۔ تو وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

عبدالرحیم' سلطانہ اماں اور رابعہ کی محرومیت پر حمید کا دل خون کے آنسو رو یا رات جب سب مہمان حسن کے ساتھ گھر گئے تھے۔ اماں نے اپنا سارا درد حمید کے سامنے بکھیر دیا۔

"میں نے کوئی خوشی نہیں دیکھی بیٹا۔ ساری عمر دکھوں ہی میں کٹ گئی۔ کس دن کی حسرت میں میں نے ایک سال کے بچے کو سینے سے لگا کر اپنی پوری جوانی کا نذرانہ دیا تھا۔" اماں رو رو کر حمید سے دل کے دکھوں کا تذکرہ کرتی رہی "ارمان یہی ہے کہ اس کے سرے کے پھول بھی نہ دیکھ سکی"

ان کے دکھ سے متاثر ہو کر ان کی محرومی سے دکھ کر حمید نے حسن سے اس سلسلے میں بات کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے موقع تلاش کر کے بات چھیڑ دی دونوں ہسپتال کے برآمدے میں کھڑے تھے۔

"دوست ہو کر بھی میرے درد کا اندازہ نہ کر سکے" حسن نے حسرت سے کہا حمید کا دل تو دکھا۔ لیکن اسے اماں کے آنسوؤں اور آہوں کا احساس تھا۔

"تمہیں صرف اپنے دکھ کا ہی احساس ہے ماں کے دل میں بھی کبھی جھانکنے کی کوشش کی ہے"

"حمید.....میں مجبور ہوں"

"میں تمہیں خود غرض کہوں گا"

"حمید....."

"اپنی ذات کے خول سے باہر نکلو حسن۔ تم نے صرف اماں ہی پر ظلم نہیں کیا۔ اک معصوم اور بے گناہ لڑکی کو بھی سولی پر چڑھا دیا ہے"

حسن بے چین ہو کر حمید کو دیکھنے لگا۔ وہ کتنی تلخ باتیں کر رہا تھا۔

"مجھے تمہاری انتہا پسندی سے ہمیشہ خوف آتا تھا۔ ڈر لگتا تھا یہ تمہیں لے ڈوبے گی۔ وہی ہوا۔ جس سے میں ڈرتا تھا"

"حمید....."

"تمہارا غم عظیم ہے حسن..... لیکن اس غم کا تقاضا یہ تو نہیں کہ تم دوسروں سے بالکل ہی آنکھیں بند کر لو۔ یوں جل جانا عظمت نہیں۔ دوسروں کو جلنے سے بچانا عظمت ہے"

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو"

"تم اچھی طرح سمجھتے ہو۔ اگر نہیں سمجھتے تو سن لو۔ میں تمہیں رابعہ کو اپنانے کا کہہ رہا ہوں"

"یہ میرے بس کی بات نہیں"

"تو پھر تم خود غرض ہی نہیں ظالم بھی ہو۔ رابعہ کی بربادی کے ذمہ دار تم ہو۔ تم نے اس پر ظلم کیا ہے"

"لیکن اب تم مجھے اس سے بھی بڑے ظلم پر اکسا رہے ہو"

"وہ کیسے؟"

"حمید میں اس طرح لٹ چکا ہوں۔ کہ اب رابعہ کے لئے میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔ اس حالت میں اسے اپنانا ظلم نہیں تو کیا ہے۔"

"ظلم تو وہ ہر حال میں سہہ رہی ہے۔ وہ تمہارے نام کا سہارا لئے بیٹھی ہے۔ خدا جانے اس کی زندگی کتنی ہے ماں باپ کا ساتھ کب تک ہے۔ اس کے بھیانک مستقبل کا تمہیں کبھی بھی خیال آیا۔ اتنا تو تم بھی جانتے ہو کہ وہ کسی اور سے وابستگی کا تصور بھی گناہ سمجھتی ہے۔"

حسن چپ ہو گیا۔ حمید جوش میں برابر بولتا چلا گیا۔ رابعہ سے اسے واقعی دلی ہمدردی تھی۔ وہ اک جلی ہوئی آہ تھی۔ مظلوم سی لڑکی آگ میں مسلسل جل رہی تھی۔ حسن حمید کی باتیں خاموشی سے سنتا رہا۔

رات پھر اس نے حسن کو جھنجھوڑا۔ حسن نے اس کی ایک بات کا بھی جواب نہیں دیا۔

خاموشی سے سر جھکائے صرف سنتا رہا۔

رابعہ جب سے آئی تھی۔ اماں کی خدمت ایک بیٹی کی سی لگن اور محبت سے کر رہی تھی۔ سارا گھر بھی اس نے ٹھیک ٹھاک کیا تھا۔ ہر چیز الٹ پلٹ اور بے ترتیب ہو رہی تھی۔ اماں اسے دیکھ دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتیں اور اپنے مقدر کی تاریکیوں پر آنسو بہاتیں۔

اس شام حمید اماں کو دیکھنے آیا تو رابعہ انہیں بیٹھی دبا رہی تھی اماں کے دکھی چہرے پر بھی سکھ کی پرچھائیاں تھیں۔ حسن کھڑکی کے قریب کھڑا سر جھکائے کچھ سوچ رہا تھا۔

"تمہیں نہ سہی اماں کو ایک ہمدرد ساتھی کی ضرورت تو ہے" حمید نے آہستگی سے حسن سے کہا "کب تک اکیلے زندگی کا بوجھ گھسیٹتے جائیں گی وہ"

حسن نے بے چین نظروں سے حمید کو دیکھا۔ اور پھر رابعہ کسی کام سے باہر گئی تو وہ اماں کے قریب آ گیا۔

"کتنی خدمت گزار لڑکی ہے رابعہ" اس نے اماں سے کہا۔

اماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے "اسے اپنی بد نصیبی کے بغیر اور کیا کہوں بیٹا"

"اماں" حسن تڑپ گیا۔

"میں تھک گئی ہوں حسن بیٹے، بہت تھک گئی ہوں" اماں کی آواز رندھی تھی۔

"اپنا نہیں تو میرا ہی خیال کرو"۔

اماں زار زار رونے لگیں۔ حسن نے پلنگ کے آہنی تکئے پر سر رکھ دیا حمید سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

"میری ایک خواہش پوری کر دو حسن۔ میں نے کبھی کوئی خوشی نہیں دیکھی۔ مجھے مرنے سے پہلے ہی خوشی"

"اماں...... پٹی پر بیٹھتے ہوئے حسن نے اپنا سر ان کے سینے پر رکھ دیا۔

"میری خاطر...... میرے بچے میری خاطر...... "اماں دونوں ہاتھوں سے اس کی پشت سہلاتے ہوئے بولیں۔ وہ مسلسل روئے جا رہی تھیں

حسن گھائل کی طرح تڑپ رہا تھا۔

"آپ کی خواہش ضرور پوری ہوگی" حسن کی جگہ حمید نے کہا۔

"حمید" یہ احتجاج نہیں تھا شکست کی آواز تھی۔ حسن اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"ہمت سے کام لو میرے دوست" حمید نے اسے اپنے چوڑے سینے سے لگا لیا

"دنیا میں ایسا ہوتا ہی رہتا ہے"

حسن بیتاب ہو کر کمرے سے نکل گیا۔ اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے دل و دماغ کے پرزے اڑ جائیں گے۔ حمید نے اسے جانے دیا۔ ہاں آنکھوں کے گوشے اس کی حالت پر نم ضرور ہو گئے۔

پھر دو تین دن حمید حسن سے صبح و شام اسی موضوع پر باتیں کرتا رہا۔ اماں کے واسطے سے حسن کو اس آگ میں کود جانے کے لئے ذہنی طور پر تیار کرتا رہا۔ اکیلے میں سوچنے کا موقع دیا۔ بحثیں کیں۔ دلائل دیئے حسن چپ ہو گیا۔ حمید نے عبدالرحیم اور سلطانہ سے بھی بات کی۔ حسن کی خاموشی سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ دونوں بچی کے مستقبل سے متفکر تھے۔ انہیں اعتراض کس بات کا تھا۔ دونوں بیحد حمید کے شکر گزار تھے۔ حمید حسن کے حامی بھرتے ہی نکاح کے بول پڑھوا دینے کا خیال رکھتا تھا۔ لمبی چوڑی تقریبیں اور رسموں کے جھنجھٹ میں پڑنا غیر ضروری تھا۔ رابعہ بھی حالات سے بے خبر نہ تھی۔ حمید اسے بھی ذہنی طور پر تیار کر رہا تھا۔ حمید کا دباؤ بہت بڑھا۔ اماں کے مایوس چہرے نے التجائیں کیں۔ تو حسن نے رابعہ سے صرف اتنا کہا "سلگتی زندگی کو قبول کر سکو گی"

"میں اسے بہت پہلے قبول کر چکی ہوں" رابعہ نے جس دکھ سے کہا تھا۔ حسن کا جی چاہا چیخیں مار مار کر رو دے۔

وہ برآمدے سے کمرے میں اور پھر اس کمرے سے دوسرے کمرے میں آ گئی۔ حمیدہ نظر آئی نہ اس کی دونوں بچیاں بانو ان دنوں حمیدہ کی دونوں بچیوں کو کلام پاک پڑھانے آتی تھی۔ رمضان علی بانو کو کہیں نوکری کرنے نہیں دیتا تھا۔ صغرا ابھی اس کی ذہنی حالت سے مطمئن نہ تھی۔ لیکن بانو مصر تھی۔ گھر کے قریب ہی یہ جگہ مل گئی تھی۔ رمضان علی کو بھی کچھ اطمینان ہو گیا تھا۔ گھنٹہ بھر کا کام تھا۔

حمیدہ اچھی عورت تھی۔ لیکن شوہر بد قماش تھا لاکھوں روپے عیاشی میں تباہ کر چکا تھا۔ حمیدہ گیلی لکڑی کی طرح سلگتی رہی۔ لیکن شوہر کو بھٹکے راستے سے سیدھی راہ پر لانے سے قاصر تھی۔

بانو بچیوں کو پڑھانے پر مامور تھی۔ حمیدہ کے مذہبی رجحان سے اسے بڑا سکون ملتا تھا۔ وہ زیادہ توجہ اور محنت سے بچیوں کو پڑھا رہی تھی۔ دو ماہ ہی میں بچیاں عربی قاعدے روانی سے پڑھنے لگی تھیں۔

بانو آج بھی وقت مقررہ پر آئی۔ لیکن گھر میں حمیدہ تھی نہ بچیاں۔ ملازمہ تھی نہ نوکر۔ گھر کھلا تھا وہ چند لمحے کمرے میں حیران سی کھڑی رہی پھر باہر نکل آئی۔

وہ واپس جانے کو تھی کہ حمیدہ کا شوہر داؤد برآمدے کے آخری سرے سے نظر آیا وہ خاصا گرانڈیل آدمی تھا۔ چہرے مہرے سے شرافت ٹپکتی تھی گھر میں ہمیشہ گربہ مسکین بنا پھرتا تھا۔

"حمیدہ کہاں ہے" بانو نے اس سے پوچھا۔

"پنڈی گئی۔"

"کیوں؟"

"اس کی اماں کی بیماری کا تار آیا تھا۔

"بچیاں بھی ساتھ گئی ہوں گی"

"بچیاں بھی۔ ملازمہ بھی"

"داؤد سگریٹ کے کش لینے کو اس کے قریب آ گیا"

"کب آئیں گی"

"خدا جانے"

"اچھا" جب آئیں مجھے اطلاع کر دیجئے گا" بانو واپس جانے کو مڑی۔

"بانو بہن" داؤد شریفانہ انداز میں پکارا۔

"جی"

"تکلیف نہ ہو تو ایک کپ چائے بنا دیجئے ملازم کم بخت جانے کہاں مر گیا۔ دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ بنا کر دے سکتی ہیں چائے"

"کیوں نہیں" بانو نے جلدی سے کہا اور باورچی خانے کی طرف چل دی۔ بہن کہہ کر اس نے بانو کا اعتماد جگایا تھا۔

"میرے کمرے میں پہنچا دینا۔" داؤد اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ سگریٹ کے کش لیتے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

"اچھا جی"

بانو چائے بنانے باورچی خانے میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ چائے کی ٹرے اٹھائے داؤد کی طرف پشت کئے بیٹھا تھا۔ اور سگریٹ کا دھواں بڑے تعیش سے اڑا رہا تھا۔

"رکھ دو میز پر" اس نے بانو کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

بانو نے آگے بڑھ کر ٹرے میز پر رکھ دی۔

"بس؟" وہ جانے کو قدم اٹھانے لگی۔

"بیٹھو ... تم بھی پیو" داؤد نے مسکرا کر کہا یہ مسکراہٹ اک لپکتا ہوا شعلہ تھی۔

بانو اس مسکراہٹ میں آگ کی لپیٹ، دیکھ کر گھبرا سی گئی۔

"بیٹھ بھی جاؤ" ۔ داؤد نے اس کی کلائی پکڑ لی۔

"نہیں ..... نہیں" بانو پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی "مجھے جانے دو۔ میں چائے نہیں پیتی" ۔

"چائے نہ پیو۔ بیٹھ کر دو چار باتیں تو کرو" داؤد نے ایک عجیب انداز میں اسے دیکھا۔

بانو نے بھی اس کی طرف دیکھا۔ اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ داؤد کی آنکھوں میں شیطان ننگا ہو رہا تھا۔ ہوس کی آگ بھڑک رہی تھی۔

جھٹکے سے ہاتھ چھڑا کر وہ بے تحاشا بھاگی۔ لیکن چند قدم پر ہی داؤد نے اسے پکڑ لیا دروازے کی کنڈی چڑھاتے ہوئے اس نے بانو کو دھکا دے کر پلنگ پر گرا دیا اور پھر ایک زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "کتنے دنوں سے تڑپا رہی تھیں۔ اب میں تمہیں یہاں سے تھوڑا ہی دوں گا۔"

بانو کی آنکھیں پھٹ جانے کی حد تک کھلی تھیں۔ رنگ ہلدی کی طرح تھا۔ سارا بدن کانپ رہا تھا۔ وہ پلنگ سے اٹھتے اٹھتے داؤد کو ڈر، حیرت اور اعتماد کی تھرتھراہٹ سے دیکھ رہی تھی۔

داؤد اس کے قریب آ کر قدرے جھکا۔ اس کی سرخ سرخ آنکھوں میں شیطانی چمک تھی۔ "..." بھسنا "بانو چیخی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔

"دیکھو۔ شور مچاؤ گی۔ جب بھی کچھ نہیں بنے گا۔ آرام سے میری بات مان جاؤ گی۔ تو عیش کرو گی۔ سمجھیں" وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ بانو پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ داؤد نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ بانو کو داؤد کی آنکھوں میں بھسنا نظر آ رہا تھا۔ سر جھٹک کر وہ اس بات کی تردید کرنے لگی داؤد پھر ہنسا۔

"تم ...... تم ...... کون ہو۔ بھسنا تو بھارت میں ہے۔ تم تو ...... مسلمان ہو"۔ بانو آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم نے مجھے بانو بہن کہا تھا"۔

داؤد نے پھر ایک قہقہہ لگایا۔ بانو کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔

بانو کو یوں لگا۔ جیسے بھسنے نے ایک بار پھر اس کا ہاتھ پکڑ لیا ہو۔ اس نے چیخنا چاہا۔ لیکن سر کو جھٹکا دیتے ہوئے پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

"تم ...... تم تو مسلمان ہو۔ سکھ تو نہیں۔ یہ پاکستان ہے نا"۔

"ہاں ...... ہاں" داؤد نے ہنستے ہوئے اسے اپنی طرف کھینچا۔ بانو تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی۔ "تم مجھے کیوں کھینچ رہے ہو۔ تم سکھ تو نہیں مسلمان ہو میں تمہاری ماں ہوں، بہن ہوں، بیٹی ہوں۔ مجھے چھوڑ دو۔ مجھے چھوڑ دو۔ تم تو ماں بہنوں کی آبرو پر کٹ مرنے والے ہو۔ مجھے کیوں پکڑ رہے ہو۔ میں تمہاری تیرہ تیرہ ناموس ہوں۔ لٹی ہوئی آبرو ہوں۔ مجھ پر ہاتھ رکھ کر تم نے انتقام کی قسمیں کھانا ہیں۔ تم یہ کیا کر رہے ہو۔ کیا ...... کر رہے ہو۔ کیا کر رہے ہو ...... چھوڑ دو ...... چھوڑ دو ...... میں تمہاری بہن ہوں۔ میں تمہاری بہن ہوں"۔

بانو کی باتوں پر قہقہے لگاتے وہ اسے اپنے قریب تر کر رہا تھا۔ شیطانی قوت مجتمع تھی۔ ہوس ناچ رہی تھی۔ جذبات کا زہریلا طوفان امنڈ رہا تھا۔

بانو چیختی رہی۔ لٹی ہوئی آبرو کی قسمیں دیتی رہی۔ تیرہ تیرہ ناموس واسطے دیتی رہی۔

http://www.rehanahmed.com

لیکن آج بانو درندگی کے پنجے میں آچکی تھی۔ درندہ کئی دنوں سے موقعے کی تاک میں تھا۔ آج موقعہ مل گیا۔

بانو تڑپی...... بانو مچلی...... بانو نے ہاتھ پاؤں مارے۔

لیکن طوفان اس پر ٹوٹ پڑا۔ لٹی ہوئی آبرو ایک بار پھر لٹ گئی۔ بال آیا ہوا آئینہ چکنا چور ہو گیا۔ تیرہ تیرہ ناموس کی دھجیاں اڑ گئیں۔

لیکن زمین پھٹی نہ آسماں ٹوٹ پڑا۔ ہاں بانو کے دل و دماغ کے پرخچے اڑ گئے۔ تار تار لباس۔ بکھرے بال۔ سر پاؤں سے ننگی جب وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر بستا بستا چیختے گھر پہنچی۔ تو صغرا صحن میں کھڑی تھی۔

"ہائے ہائے" صغرا نے سینے پر دوہتڑ مارا۔ اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں "کیا ہوا تجھے...... بانو...... تجھے کیا ہوا"۔

...... "بستا...... "بستا" بانو اکھڑے سانسوں کے درمیان جیسے ہچکیاں لے رہی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ اور سر ادھر سے ادھر پٹخ رہی تھی۔ بانو کے چہرے اور سینے پر جو نشان تھے۔ وہ اس قیامت کا پتہ دے رہے تھے۔ جو بانو پر ٹوٹ چکی تھی۔

صغرا اور بانو کی آواز سن کر بصیرت کمرے سے لپک کر آئی۔ لیکن جب بانو کو دیکھا تو دم سادھ کر کھڑی ہو گئی۔ یہی حال مسرت اور نگہت کا تھا۔

بانو کا پیچھا کرتے کچھ بچے دروازے تک آ گئے تھے۔ محلے کی دو تین عورتیں بھی لپک کر آ گئی تھیں۔

"تو تو...... حمیرا کے گھر گئی تھی۔ تجھے کیا ہوا کچھ تو کہہ دے بچی" صغرا نے سینہ پیٹتے ہوئے ایک سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

"بستا۔ بی بی بستا۔ آج پھر اس نے۔ آج پھر بی بی آج پھر"...... بانو گلا پکڑ کر اس زور سے چیخی کہ اس کی آواز پھٹ گئی۔

"ہائے مر گئی" مسرت نے سر پکڑ لیا۔ صغرا ہائے وائے کرتے بانو کو ساتھ لپٹانے کی کوشش کرتے رو پڑی۔

"مجھے ہر دم یہی دھڑکا لگا رہتا تھا۔ ہر وقت یہی ڈر رہتا تھا۔ بانو...... تو پھر لٹ گئی بانو...... پھر لٹ گئی۔ ہائے ہائے بانو"۔

صغرا ماتم کر رہی تھی۔ بصیرت اور نگہت انگشت بدنداں کھڑی کانپ رہی تھیں۔ دو تین ہمسائیاں اندر آ گئی تھیں۔ ان کے چہروں پر ایک ہی سوال تھا۔ کیا ہوا؟"۔

"بستا۔ یہاں بھی بستا۔ یہاں بھی" "بستا" بانو ہانپ رہی تھی۔ اس کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ چیخ چیخ کر آواز پھٹ گئی تھی۔ سر ادھر ادھر مار کر ابلی آنکھوں سے گرد و پیش دیکھتے ایک ہی بات

وہرا رہی تھی۔

عورتوں نے سہارا دے کر اسے چارپائی پر بٹھانا چاہا۔ کوئی پانی لے ۔ ۔ یلین بانو بیٹھی نہ پانی پیا۔

"یہاں بھی بسنتا۔ یہاں بھی" بسنتا" چیخنے گی۔ کچھ بتاؤ تو سہی کیا ہوا ایک عورت نے پوچھا۔

"بسنتا...... یہاں بھی بسنتا...... یہاں بھی" بسنتا" بانو آنکھیں بند کئے سر پٹختے چیخنے گی۔

"کون" بسنتا" عورتیں ایک دوسرے سے پوچھ رہی تھیں۔

"حسن کہتا تھا۔ یہاں کوئی بسنتا نہیں۔ یہاں کوئی بسنتا نہیں۔ بانو الٹ پلٹ سانسوں کے درمیان چیخی" حسن نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا حسن نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔

"بی بی! حسن نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا"۔ شدت کرب سے وہ دوہری ہو گئی۔ پھر اس کی آنکھوں میں شعلے لپکنے لگے۔ دانت پیستے ہوئے غرائی۔ "حسن نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا میں اس سے پوچھوں گی۔ اس نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تھا"۔

وہ دروازے کی طرف بھاگی۔ غنیمت تھا۔ جو عورتوں نے پکڑ لیا۔ بانو جال میں آئی مچھلی کی طرح تڑپنے لگی۔

"مجھے چھوڑ دو...... مجھے چھوڑ دو...... مجھے چھوڑ دو...... حسن نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ مجھے اس سے پوچھنے دو۔ مجھے جانے دو"

وہ بے حال ہو گئی۔ سرتاپا پسینے میں ڈوب گئی۔ ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے۔ لڑکیاں اس کی حالت پر آنسو بہا رہی تھیں۔

"مجھے چھوڑ دو...... مجھے جانے دو۔ مجھے حسن سے پوچھ لینے دو۔ پوچھ لینے دو" بانو یاد کرتے ہوئے بولی۔

"ذرا ٹھہر تو جاؤ۔ دم تو لو" عورتیں اسے چارپائی کی طرف لا رہی تھیں۔

"حسن نے مجھے سے جھوٹ بولا تھا۔ جھوٹ...... جھوٹ...... جھوٹ" وہ ہانپنے لگی۔

اچانک دائیں ہاتھ والے کمرے سے اسے ہنسی کی آواز آئی۔ وہ ٹھٹک گئی' ساکت ہو گئی۔ پھٹی پھٹی نظروں سے کمرے کی طرف دیکھنے لگی اور پھر اک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا کر کمرے میں داخل ہو گئی۔ احمد کتابوں پر جھکا اپنا سبق یاد کر رہا تھا۔

بانو اسے دیکھنے لگی۔ غلام احمد نہیں وہ بسنتا بیٹھا تھا۔ وہی ناک نقشہ وہی بھدے بھدے ہونٹ' ذہنی تلخ بے ربط ہنسی' بانو گھورتی گئی۔ بچہ بسنتا ہنستا گیا بکھرے کیس' پھیلی پھیلی بے ترتیب ڈاڑھی۔ پیلے دانت' لال مسوڑے۔ بچہ سہم کر اسے دیکھنے لگا یا وہ کچھ بڑبڑایا۔

لیکن بانو کو یوں لگا جیسے بسنتا اس کی حالت پر مسکراتے ہوئے کہہ رہا ہے" دیکھ لیا اپنے دیس کے درندوں کو۔ بڑا مان تھا ان پر...... ہونہہ" حقارت سے لبریز قہقہے بانو کے لاشعور میں اکھڑنے لگے۔

بانو بے چین ہوئی۔ غرائی اور پھر جنگلی شیرنی کی طرح بچے پر جھپٹ پڑی۔ مسرت کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ پوری قوت سے بچے کا گلا دبوچ چکی تھی۔

"میں تجھے مار ڈالوں گی۔ تجھے مار ڈالوں گی۔ بستے تجھے مار ڈالوں گی"۔ بانو کے ہاتھوں میں دیوانگی اور انتقام کی جو قوت تھی۔ اسے کئی عورتوں کی جدوجہد بھی نہ توڑ سکی۔

اک قیامت بچ گئی۔ شور برپا ہو گیا۔ مسرت، نگہت اندر باہر تڑپتی پھریں۔ عورتوں نے پوری قوت صرف کر دی۔ لیکن بانو کے ہاتھوں کے آہنی شکنجے سے بچے کی گردن کوئی نہ چھڑا سکا۔

بچے کی آنکھیں ابل کر باہر نکل آئیں۔ اس کی زبان لٹکنے لگی۔ وہ چھری تلے آئے جانور کی طرح تڑپ رہا تھا۔ بانو کے انگوٹھے اس کی شہ رگ کو دباتے گئے۔ انگلیاں گردن میں پیوست ہوتی گئیں۔ بانو کے سانس غیر ہموار ہوتے گئے۔

بچہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کی گردن ڈھلک گئی۔ بانو کے ہاتھوں کی گرفت بھی ڈھیلی ہو گئی۔ اس بے جان جسم کو دیکھ کر بانو نے اک زوردار قہقہہ لگایا۔

پھر وہ قہقہے پر قہقہہ لگاتے چلی گئی۔ بچہ مر چکا تھا۔ مسرت نے اسے سینے سے لگا کر پالا تھا۔ اتنے سالوں کی محبت خون کے آنسو رلانے لگی۔ لوگوں کا ہجوم تھا۔ عورتیں مرد بچے سب ہل پڑے تھے۔ لوگوں کے نرغے میں بانو اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے چیخ رہی تھی۔ "میں نے بستے کو مار ڈالا میں نے بستے کو مار ڈالا"۔

بچے کو مسرت نے چارپائی پر لا ڈالا۔ بانو کی نظر اس پر پڑی۔ خوف زدہ سی نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر اس کو چھوا "اسے کیا ہوا۔۔۔ یہ تو مر گیا۔۔۔ مر گیا"۔

بانو تھر تھر کانپنے لگی۔ دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر چیخیں مارنے لگی جنون پھر بڑھا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ "حسن نے مجھ سے کیوں جھوٹ بولا تھا۔ کیوں جھوٹ بولا تھا۔ مجھے جانے دو۔ مجھے چھوڑ دو"۔

رمضان علی عصر کی نماز پڑھ کر گھر لوٹا۔ تو قیامت کا سماں تھا۔ دل دھک سے رہ گیا۔ دیوار کا سہارا دے کر سکتے میں آئے بانو کو دیکھنے لگا۔ روتے دھوتے صغرا نے ساری روداد سنائی۔

وہ سر پکڑ کر وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ ساری کائنات گھومنے لگی تھی۔ بانو نے اسے تڑا کر بھاگنے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ اس کی آواز میں ایسی خرخراہٹ تھی۔ جیسے حلق پہ چھری پھر رہی ہو۔ آواز بیٹھ گئی تھی۔ الفاظ رک رک کر اٹک اٹک کر نکل رہے تھے۔

"لڑکی تو مر جانے کی"۔ ایک عورت نے وسوسہ ظاہر کیا۔

"مر تو پہلے ہی گئی ہے کم بخت" وہ صغرا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"حسن کہتا تھا۔ یہاں کوئی بستا نہیں حسن کہتا تھا یہاں کوئی بستا نہیں اس نے جھوٹ بولا تھا۔ اس نے

مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ مجھے اس تک پہنچ جانے دو۔ مجھے چھوڑ دو..... مجھے چھوڑ دو..... وہ تڑپ رہی تھی۔ بلک رہی تھی۔ سسک رہی تھی۔

"اسے لے ہی جاؤ" صغرا نے رمضان علی سے کہا "گھر تو تمہیں معلوم ہی ہے نا"۔

"گھر تو نہیں گلی کا پتہ ہے۔ رمضان علی کی جیسے کمر ہی ٹوٹ گئی تھی۔

ہجوم مزید بڑھ رہا تھا۔ چہ مہ گوئیاں ہو رہی تھیں۔ آنسو بہہ رہے تھے۔ سوال پوچھے جا رہے تھے۔ ہاتھا پائی میں بانو کا لباس اور بھی پھٹ گیا تھا۔ رمضان علی اور صغرا ابھی اسے حسن تک پہنچانے کا سوچ ہی رہے تھے کہ وہ دیوانگی کے عالم میں عورتوں کو دھکے دے کر گراتی دروازے سے باہر نکل گئی۔

رمضان علی حواس باختہ اس کے پیچھے بھاگا۔ گلی میں مردوں کا ہجوم تھا۔ بانو وہی الفاظ دہراتے ہجوم کو مجنونانہ انداز میں چیرتے گلی سے سڑک کی طرف جا رہی تھی۔

آج عصر کی نماز کے بعد حمید کی مخلصانہ کوششوں سے حسن اور رابعہ ایک بندھن میں بندھ گئے تھے۔ زندگی کی حرارت سے یکسر خالی دو پیکر نکاح کے دو بولوں سے ایک ہو گئے تھے۔ حسن کی شادی کا اماں کو بڑا ارمان تھا۔ لیکن آج یوں لگتا تھا۔ جیسے اچانک کوئی ماتم ہو گیا ہو۔ باجہ بجانہ شہنائی بابل کے گیت گائے گئے نہ وداع کے 'مبارک سلامت کا شور گونجا نہ ہنسی مذاق کے فوارے چھوٹے۔

ہر بات خاموشی سے ہوئی۔ سادگی سے طے پائی۔ خالہ صفیہ کی بہو بیٹیوں نے رابعہ کو دلہن بنایا۔ اماں کے مدتوں کے سنبھال کر رکھے زیوروں سے لاد دیا۔ سرخ سنہری گوٹے اور کرن والا گول گول ٹکلوں سے بھرا دوپٹہ بھی اس پر ڈالا۔ سرخ جوڑا بھی پہنایا۔ بناؤ سنگار بھی کیا۔ لیکن یہی محسوس ہوتا رہا۔ جیسے میت بڑے اہتمام سے کفنائی جا رہی ہے۔ لال جگ مگ جگ مگ کرتا جوڑا اور جھلملاتے زیورات بھی رابعہ کو دلہن نہ بنا سکے۔ دلہن لال جوڑے سے نہیں بنتی۔

جگمگاتے چمکتے زیور بھی دلہن کا نام نہیں پاتے۔ دلہن تو جیتے جاگتے زندگی سے بھرپور ارمانوں کا نام ہے۔ تمنا آرزوؤں کی سیرابی کی تفسیر ہے۔ رابعہ تو ان چیزوں سے دست بردار ہو کر سجائی گئی تھی۔ دلہن کیوں کر بنتی

حسن کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ یوں لگ رہا تھا۔ جیسے مدتوں کا بیمار موت کے گلے لگ رہا ہو۔ اماں کی خاطر اس نے زہر پی لیا تھا۔

زہر!...... زہر...... زہر ہی ہوتا ہے نا اپنا اثر دکھا رہا تھا۔ حمید اسے برابر سنبھالا دے رہا تھا۔ لیکن اس وقت حسن کی جو حالت تھی۔ حمید کے سینے میں خوف کی لہریں سرعت سے اٹھنے لگی تھیں۔

ابھی شام نہیں اتری تھی۔ گھر میں مہمانوں کی وجہ سے کچھ ہلچل تھی۔ لیکن ہر دل بجھا بجھا تھا۔ ہر طبیعت الجھی الجھی تھی۔ حسن کی بیزاری جان لیوا تھی۔ حمید صحن میں کھڑا اسے باتوں سے بہلا رہا تھا۔ اچانک گلی میں کچھ شور سا ہوا۔

حمید اور حسن نے بیک وقت مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔

کوئی لڑکی اندر گھسنے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ تاجاں کا بیٹا اور گلی کے کچھ لوگ اسے روک رہے تھے۔

حسن اور حمید ابھی کچھ سمجھ بھی نہ پائے تھے کہ لڑکی نیم عریاں حالت میں سر سے ننگی' پاؤں سے برہنہ بکھرے بال' ابلی آنکھیں اور سوکھے ہونٹ تیر کی تیزی سے اندر آئی۔ اس نے حسن کو دیکھ لیا تھا۔

تڑپ کر اس تک پہنچی دونوں ہاتھوں سے اس کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تھا۔

اس کی بات سننے سے پہلے ہی حسن چیخا۔

"با............ نو "اس کی چیخ پھٹ گئی۔

حمید سکتے میں آ گیا لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے۔

"تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تھا تم کہتے تھے۔ یہاں کوئی .... نہیں بولو تم نے جھوٹ کیوں بولا تھا۔ میری اذیت کے ایک ایک لمحے کا حساب چکاؤ" وہ دیوانگی کے عالم میں حسن کا گریبان دونوں ہاتھوں میں پکڑے اسے جھٹکے دے رہی تھی۔ اپنا سر اس کے سینے سے ٹکرا رہی تھی۔

حسن کا سارا وجود کانپ رہا تھا۔ اپنی لرزتی بانہوں کے حلقے میں بانو کو لئے وہ صرف "بانو......بانو" پکار رہا تھا۔

بانو اس سے اپنی اذیت کے ایک ایک لمحے کا حساب مانگ رہی تھی۔

اردگرد کھڑے لوگ چشم گریہ سے اسے دیکھ رہے تھے۔ حمید نے تو اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا تھا۔

بوڑھا رمضان علی بانو پر ٹوٹی قیامتوں کا حال روتے ہوئے سنا رہا تھا۔

"بس کرو بابا" حمید کا دل جیسے پھٹ جانے کو تھا۔

بانو حسن کے ہاتھوں میں جھول گئی۔ حسن اسے سینے سے لگائے خود بھی لڑ کھڑا رہا تھا۔ اماں سلطانہ اور عبدالرحیم بھی آ گئے۔ صفیہ خالہ بھی آ گئی تھی۔

"ڈاکٹر کو بلاؤ۔ کوئی ڈاکٹر کو بلا لائے" اماں چیخیں۔ ہر کوئی کانپ رہا تھا۔ کسی کو جیسے ہوش ہی نہ رہا تھا۔ جانے کون ڈاکٹر کو بلانے گیا اور کون سہارا دے کر حسن کو کمرے میں لایا۔ اس نے دونوں ہاتھوں پر بانو کو اٹھا رکھا تھا۔

خالہ صفیہ کی منجھلی بہو نے آج حسن کا کمرہ حجلۂ عروسی بنایا تھا۔ ریشمی بستر پر پھول اور سنہری تاروں کے ہار ڈالے تھے۔

حسن نے بانو کو اس بستر پر ڈال دیا۔ بانو کے سر کے نیچے اس کا بازو تھا۔ دوسرا ہاتھ وہ بانو کے چہرے پر

پھیرتے "بانو..... بانو" پکار رہا تھا۔

اماں سلطانہ اور صفیہ رو رہی تھیں۔ عبدالرحیم ہاتھ ملتے ادھر سے ادھر جا رہا تھا۔ کچھ لوگ ہجوم کو کمرے سے باہر نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ حمید گنگ سا کھڑا تھا بانو کے دونوں ہاتھوں میں حسن کا گریبان تھا۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ اس کے لب ہل رہے تھے۔ شاید وہ اب بھی حسن سے پوچھ رہی تھی۔ تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تھا۔ میری اذیتوں کے ایک ایک لمحے کا حساب چکاؤ"۔

رابعہ کو پتہ چلا تو تڑپ کر آئی۔

"بانو..... بانو" اس نے بانو کے قدم پکڑ لئے۔

"بانو کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے پتھرائی آنکھیں رابعہ کی طرف پھیریں سرخ جھلملاتا گول گول سنہری ٹکلوں والا دوپٹہ۔ سنہری کرن اور گوٹے والا دوپٹہ"۔

"اف! اس کی آنکھوں میں کرب کے طوفان تڑپے۔ اس کا سارا بدن تھر تھر کانپنے لگا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت حسن کے گریباں پر اور سخت ہو گئی۔

اس نے آخری جھٹکا کھایا اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

ڈاکٹروں کے آنے سے پہلے ہی بانو حیات قید و بند سے آزاد ہو گئی۔

حسن نے پچھاڑیں کھائیں۔ اس کے چھلنی سینے پر سرخ پنج دیا۔ نالہ و شیون گونج گئے۔ اماں اور سلطانہ نے سینہ پیٹ لیا۔ لوگ آنسوؤں پر قابو نہ پا سکے۔ حمید کی آنکھوں سے بھی رکا ہوا طوفان بہہ نکلا۔ رمضان بابا دھاڑیں مارنے لگا۔

رابعہ بانو کے پاؤں پر سر رکھے رو رہی تھی۔

وہ عظیم پاؤں۔

جن پر مسافتوں کے داغ تھے۔

اذیتوں کے نشان تھے۔

کہرام مچا ہوا تھا۔ حسن کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ بانو کے ہاتھ اب تک حسن کے گریبان پر تھے۔ اس کی پتھرائی ہوئی نیم وا آنکھیں اب بھی اپنا سوال دہرا رہی تھیں۔ اپنی اذیتوں کے لمحوں کا حساب مانگ رہی تھیں۔

حمید بانو کی لاش کو دیکھتا رہا۔ اس کے سینے میں طوفان مچلنے لگے۔ اس کے ذہن میں قیامتیں ٹوٹنے لگیں۔

اس نے آنسو آنکھوں میں پی لئے آگے بڑھا۔ جھکا۔ بانو کے مقدس بدن کو چھوا اور پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"میں تیری عظمت کو سلام کرتا ہوں۔ بہن"۔

لوگ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ حمید نے ایک وقار سے ہاتھ اٹھا کر بانو کی لاش کو تعظیم کی۔ سلام کیا۔

ید کا سلام نہیں تھا۔ پاک فوج کے ایک جانباز سپاہی کا بانو کی عظمت کو سلام تھا۔

"میں تیری لٹی ہوئی آبرو کی قسم کھاتا ہوں۔ بانو بہن میں تیرا انتقام لوں گا اور ثابت کر دوں گا۔ کہ تیرے بھائی زندہ ہیں۔ تیرے دیس کے محمد بن قاسم حیات ہیں"۔

کاش! حسن کو بھی اس وقت اتنا ہوش ہوتا کہ بانو کے مقدس وجود کو چھو کر معاشرے کی ہر برائی کے خلاف جہاد کا بیڑہ اٹھانے کی قسم کھا سکتا۔ اللہ تعالیٰ بانو کی رُوح کو آسودہ کرے۔

تیس سال بعد

میرے قارئین یہ جاننے کے لئے ہمیشہ ہی خواہشمند رہے۔ کہ جن کرداروں سے وہ ناول میں متعارف ہوتے ہیں..... ان کا آگے کیا بنتا ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے۔ کہ میرے فرضی کرداروں کو قارئین حقیقی کرداروں کی طرح جانتے ہیں ان سے ملتے ہیں ان کے ساتھ چلتے ہیں ان کی خوشی سے خوش ہوتے اور ان کے غم سے غمگین ہوتے ہیں......

شاید

اس لئے

وہ ان کے مستقبل سے بھی آگہی کے خواہشمند ہوتے ہیں۔

ان کی اس خواہش کے پیش نظر میں انھیں بانو کے باقی کرداروں سے ملا رہی ہوں۔

تیس سال بعد

ان سے ملیئے۔

رضیہ بٹ

http://www.rehanahmed.com

آج مدتوں بعد اس سڑک سے گزری تو دائیں ہاتھ اترنے والی کشادہ پکی سرخ اینٹوں والی گلی دیکھ کر مجھے وہ گھر یاد آ گیا۔ جس میں حسن رہا کرتا تھا۔ اور جس کے آنگن سے جب بانو کا جنازہ اٹھا تھا تو اک قیامت سی بپا ہو گئی تھی۔ گھر کے اندر اور باہر ہجوم ٹوٹ رہا تھا۔ دھاڑیں مار مار کر روتے مرد اور سینہ کوبی کرتی عورتوں نے بانو کی موت کے دکھ کو اجتماعی شکل دے دی تھی۔ گھر کے اندر۔ گلی میں حتی کہ سڑک پر بھی سر ہی سر نظر آتے تھے۔ لوگوں کا اک جم غفیر تھا۔ جو اس ماتمی جلوس میں شریک ہو رہا تھا...... بانو پر ٹوٹی قیامتوں نے ہر دل کو متاثر کیا تھا۔ یہ قیامتیں لوگوں کی زبانی ایک سے دوسرے کو پہنچ رہی تھیں۔ بھارت میں تو اس پر جو ظلم و ستم ٹوٹے تھے وہ اپنی جگہ۔ خود اپنے ملک میں اک بھیڑیے نے اسے بھنبھوڑ ڈالا تھا۔ یہ ایسا واقعہ تھا۔ جو ہر حساس دل کو مجروح کر رہا تھا۔ لوگ اس دستان غم کو سن کر غم و غصے سے بے قابو بھی ہو رہے تھے۔ بانو لگتا تھا ان کے اپنے زخموں کا نام ہے۔ رمضان بابا سے بانو کی باتیں سن سن کر وہ بپھر رہے تھے۔ ایک بار تو انہیں دیکھ کر ایسے لگا تھا۔ کہ مائیں محمد بن قاسموں اور خالد بن ولیدوں کو جنم دینا نہیں بھولیں۔

بانو کا جنازہ اک دھوم سے اٹھا تھا۔

لوگوں کے اضطراب اور غم والم کو دیکھ کر شاید بانو کی روح کو بھی قرار آ گیا ہو گا۔

میں اسی ماتمی جلوس جو کوئی اٹھائیس تیس سال پہلے اس گلی سے نکلا تھا۔ کے بارے میں سوچتی آپوں آپ ہی اس کشادہ گلی میں آ گئی...... جو سرخ پکی اینٹوں کی بنی تھی اور جس میں ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے پکے پکے حویلی نما مکان تھے۔ ایک منزلہ دو منزلہ اور کئی تین تین منزلہ۔

گلی میں کافی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ کئی بڑے مکانوں کی جگہ اونچے اونچے پکے چوباروں والے مکانوں نے لے لی تھی۔ تین تین منزلہ عمارتیں بھی وجود میں آ گئی تھیں۔ جن کی دیواروں پر جپسم اور ماربل لگے ہوئے تھے۔ کئی پرانے مکانوں کے حلیے بدل دیئے گئے تھے۔ لیکن کچھ پرانے مکان بھی موجود تھے۔ کئی ایک تو ڈھے رہے تھے

دیواروں پر کائی جمی تھی۔ دروازوں کھڑکیوں کے پٹ اکھڑے ہوئے تھے۔ تھڑوں کی سیڑھیاں سیمنٹ کی چادر سے ننگی ہو رہی تھیں۔ اینٹیں جگہ چھوڑ چھوڑ کر لڑھک رہی تھیں۔

پھر بھی

گلی زندہ تھی۔

اس کا مزاج وہی تھا۔

لوگ آجا رہے تھے۔ بچے کھیل کود رہے تھے۔ جگہ جگہ کوڑے کی ڈھیریاں بھی تھیں اور نالیوں میں سلیٹی رنگ کا ملغوبہ بھی بہہ رہا تھا۔ کئی مکانوں کے سامنے نالی ڈھکی ہوئی تھی۔ اور کئی مکانوں کے سامنے ننگی۔ سہ پہر ہونے والی تھی۔ اس لئے گلی میں کچھ زیادہ لوگ نہیں تھے۔ صبح و شام گلیوں میں رونق جوبن پر ہوتی ہے۔ جب لوگ کام کاج کے لئے اور بچے سکولوں کالجوں کے لئے گھروں سے نکلتے ہیں۔ دفتروں کو جانے والے بھی اسی وقت گلی کی چہل پہل میں اضافہ کرتے ہیں۔ شامیں بھی گلیوں میں رونق لئے اترتی ہیں۔ لوگ تازہ دم ہو کر باہر نکلتے ہیں۔ ملنے ملانے آتے جاتے ہیں۔ خریداری کرتے ہیں۔ اور بڑی سڑک کی کشادہ کشادہ دکانوں کے اندر اور باہر کھڑے ہو کر گپ شپ لگاتے ہیں۔ حالات حاضرہ پر تبصرے کرتے ہیں۔

میں پہلے تو کچھ جھجکی

لیکن

شوق و تجسس نے ابھارا.....

میرے قدم اس گھر کی طرف اٹھنے لگے۔ جو دس مرلے کا کشادہ پکی اینٹوں والا مکان تھا۔ یہ مکان ان دنوں نیا تھا..... اور کیپٹن حمید نے جو حسن کا جگری اور مخلص دوست تھا۔ حسن کی بھارت میں چھوڑی ہوئی پراپرٹی کے عوض الاٹ کروا دیا تھا..... حسن پر تو جو افتاد ٹوٹی تھی اسے یہ کام کرنے کا ہوش ہی کہاں تھا.....

میں اب اس گھر کے سامنے کھڑی تھی۔

اٹھائیس تیس برس اس پختہ حویلی پر بھی بیت گئے تھے۔ مکان اب بھی شان سے کھڑا تھا۔ لیکن وقت کی دھول اس پر جم چکی تھی..... باہر کی دیوار کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ دروازے اور بیرونی کھڑکیوں کا رنگ و روغن بھی اڑا اڑا تھا۔ تھڑے کی اینٹیں بھی کئی جگہ سے مسکی ہوئی تھیں اور صدر دروازے پر جو لکڑی ہی کے پھول بوٹے بنے تھے وہ بھی جگہ جگہ سے اکھڑے ہوئے تھے۔

مکان کی خستہ حالی سے مکینوں کی حالت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ پھر بھی کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ کہ اس بند دروازے کے پیچھے زندگی کا رنگ کیا ہے۔ وہ لوگ اب بھی یہیں ہیں۔ یا کہیں اور چلے گئے ہیں۔ زندہ بھی ہیں یا قید حیات سے چھوٹ چکے ہیں..... کچھ پتہ نہ تھا..... تیس برس بھی کوئی کم عرصہ تو نہیں ہوتا۔

http://www.rehanahmed.com

میں چند لمحے وہیں کھڑی اس گھر کو دیکھتی رہی .....

مکان پر کوئی نیم پلیٹ نہیں تھی۔

میں نے ایک راہگیر سے پوچھنا مناسب سمجھا

"یہ گھر ..... " میں نے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "حسن صاحب کا ہے نا ..... "

راہگیر نے گھر کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا .....

اب بھی وہی یہاں رہتے ہیں ..... میں نے بے اختیارانہ سی بے تابی سے پوچھا۔

راہگیر کے لئے شاید یہ مضحکہ خیز بات تھی۔ مجھے متبسم آنکھوں سے دیکھ کر بولا "گھر حسن صاحب کا ہے تو ظاہر ہے وہی اس گھر میں رہتے ہیں ..... "

میں نے اس کا تمسخرانہ تبسم نظر انداز کر دیا ..... مجھے خوشی ہوئی کہ حسن زندہ ہیں اور میں ان سے مل سکوں گی۔

"شکریہ" میں نے ملائمت سے کہا

اس نے شاید سنا بھی نہیں وہ تو تیز رفتاری سے جا رہا تھا۔ میری بات کا جواب دے کر اس نے ٹھہرنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی

میں آگے بڑھی .....

دروازہ کھلا تھا ..... میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ کال بیل کا بٹن نظر آ گیا۔ میں نے انگلی بٹن پر رکھ دی۔

"کون" اندر سے آواز آئی ..... کسی خاتون نے پوچھا تھا۔

"کیا یہ رابعہ کی آواز ہے" میں نے آواز سے پہچاننے کی کوشش کی ..... میری نگاہوں میں جوان خوبصورت اور شائستہ سی رابعہ کا پیکر گھوم گیا ..... ایک جھپک کئی یادیں ذہن میں لہرا گئیں .....

کھلا دروازہ قدرے اور کھلا اور ایک پندرہ سولہ سالہ ملازم لڑکے نے باہر نکل کر مجھے سلام کیا۔

میں نے جواب دیتے ہوئے اسے سرتاپا دیکھا۔

"آپ نے کس سے ملنا ہے" وہ بولا .....

"حسن صاحب ہی کا گھر ہے نا"

"جی ..... "

"وہ گھر پہ ہیں ..... "

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "پھر بولا ..... " آنے ہی والے ہیں ..... "

"اور کوئی ہے گھر پہ"

بی بی ہیں......"

"رابعہ بی بی......؟"

"جی...... آیئے...... وہ ہیں گھر پہ......"

اس نے میرے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ میں اندر داخل ہوئی......

میرا ذہن بار بار ماضی کی طرف لوٹ رہا تھا...... ماضی جسے ہم لوٹا تو نہیں سکتے لیکن ذہن کی آنکھ سے دیکھ ضرور سکتے ہیں۔

میں صحن میں آ گئی تھی......

مجھے اماں کی وہ چارپائی تخیل کے پردوں پر نظر آ رہی تھی۔ جس پر وہ اکثر گرم شال کی بکل مارے دیوار سے ٹیک لگائے دھوپ تاپا کرتی تھیں اور ان کے قریب ہی ان کی ملازمہ برکتے نمک مرچ مصالحے لوہے کے ہون دستے میں کوٹ کوٹ کر تالوں میں ڈھیریاں لگائے بیٹھی ہوا کرتی تھی۔

مجھے برآمدے میں وہ چیختا چلاتا حسن بھی نظر آیا۔ جس نے بانو کی گمشدگی پر اپنا گریبان چاک کر ڈالا تھا۔ مجھے لٹی لٹائی وہ بانو بھی دکھائی دی جو حسن کا گریبان جھنجھوڑ کر اس سے اپنی اذیتوں کے ایک ایک لمحے کا حساب مانگ رہی تھی......

اور

وہ رابعہ بھی دکھائی دی۔ جو دلہن بن کر بھی دلہن نہیں لگی تھی۔

"آیئے" ملازم لڑکے نے مجھے چاروں طرف نظریں دوڑاتے دیکھ کر کہا "میں بی بی جی کو بلاتا ہوں۔ آپ بیٹھئے"

اس نے مجھے بیٹھک کا دروازہ دکھایا......

اور

خود بی بی جی کو بلانے چلا گیا۔

میں اندر آ کر ایک صوفے پر بیٹھ گئی...... بیٹھک صاف ستھری تھی۔ فرنیچر پردے قالین وہی تو نہیں تھے۔ لیکن نئے بھی نہ تھے۔ کوئی خاص آرائشی چیزیں بھی نہیں تھیں۔ بس سادگی اور صفائی سے مہمانوں کے بیٹھنے کے لئے صوفے اور کرسیاں بچھی تھیں......

میں ابھی کمرے کا جائزہ ہی لے رہی تھی۔ کہ دروازے میں داخل ہوئی۔

اس نے سلام کیا......

میں نے جواب دیتے ہوئے گردن موڑ کر ادھر دیکھا۔

وہ

وہ

رابعہ ہی تھی۔

لیکن وہ رابعہ نہیں جو تیس برس پہلے کی تھی......

وہ رابعہ جوان تھی اور یہ رابعہ بڑھاپے کی دہلیز پار کر رہی تھی۔ جسم قدرے فربہی مائل تھا..... بال کھچڑی ہو رہے تھے۔ چہرے پر وہ تازگی اور شگفتگی بھی نہیں تھی۔ زمانے کے نشیب و فراز اس کے چہرے پر رقم تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ وقت اس کے ساتھ اچھا نہیں برتا...... اس نے سادہ سے کپڑے پہن رکھے تھے......

یہ میرا اپنا ہی اندازہ تھا۔

رابعہ سلام کر کے آگے بڑھی..... میں بھی کھڑی ہو گئی تھی۔ اس نے شاید مجھے پہچانا نہیں۔ اسی لئے مجھے بیٹھنے کے لئے کہا۔

"آپ رابعہ ہیں...... " میں نے کہا

"جی......"

"رابعہ...... مجھے پہچانا...... "

"اس نے سر نفی میں ہلاتے ہوئے مجھے غور سے دیکھا۔ پھر اس کی آنکھوں میں سبھی دھندلاہٹیں ایکا ایکی چھٹ گئیں۔

"آپ...... آپ" اس نے میری طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ اس کے چہرے پر روشن روشن خلوص لہریں لینے لگا۔

"رضیہ بٹ...... " میں نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"اوہ...... آپ" وہ تیزی سے میری طرف بڑھی۔ ...... ہم اتنے تپاک اور خلوص سے ملیں کہ آنکھیں آپوں آپ نم ہو گئیں......

کئی لمحے ہم ایک دوسرے سے لپٹی کھڑی رہیں..... پھر میں نے ہی اسے آہستہ سے اپنے سے الگ کر کے کندھوں سے پکڑ کر اپنے سامنے کھڑا کیا......

"کیسی ہو رابعہ...... " میں نے نمناک نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"اچھی ہوں۔ آپ سنائیں" اس نے دوپٹے کے آنچل سے آنکھیں پونچھیں..... "کیسے ہماری یاد آگئی...... "

"بس۔ اتفاقاً ادھر سے گزر ہوا..... گلی دیکھی تو تم لوگ یاد آگئے..... جی نہ مانا کہ ملے بغیر چلی جاؤں"

"شکریہ" اس نے کہا "تشریف رکھیے"

میں بیٹھتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی "میں تھوڑی دیر بیٹھوں گی..... تم بھی بیٹھو رابعہ ......"

"اتنی مدت بعد آئی ہیں۔ تو میں جانے تھوڑا ہی دوں گی ......" وہ تپاک اور اصرار سے بولی۔

"اچھا تم بیٹھو تو سہی ...... کسی تکلف میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ میں تم سے ملنے آئی ہوں بس تم میرے پاس بیٹھو اور ان تیس برسوں کی روئیداد سناؤ ..... جو بیت چکے ہیں ......"

اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولی "اب ملے ہیں تو ایک دوسرے کی سنیں گے کہیں گے۔ میں ذرا چائے کے لئے تو کہہ دوں ......"

"چائے بھی پئیں گے ..... پر حسن بھائی آجائیں تو ..... اس لڑکے نے بتایا ہے کہ وہ آنے ہی والے ہیں ......"

"چائے ان کے ساتھ ہی پئیں گے"

"ٹھیک ہے"

رابعہ میرے قریب بیٹھ گئی۔ ہم دونوں ایک دوسری کو دیکھ کر خاصی جذباتی ہو رہی تھیں ..... بار بار ایک دوسری کا ہاتھ پکڑ لیتیں۔ ایک دوسری کے گلے لگ جاتیں۔

"رابعہ ..... میں نے تو ڈرتے ڈرتے تمہارے گھر کی طرف قدم بڑھائے تھے ......"

"کیوں"

"بھئی اتنا عرصہ ایک دوسرے کی خیر خبر ہی نہ پائی تھی۔ ڈر رہی تھی کہ تم لوگ یہاں ہو گے بھی یا نہیں۔ اور یہ بھی دھڑکا تھا ...... کہ ......"

"مر کھپ تو نہیں گئے" رابعہ نے میری بات مسکراتے ہوئے پوری کر دی۔

"ہاں ...... کچھ ایسا ہی واہمہ تھا"

"خوشی ہوئی ہے نا ...... کہ ہم ہیں ابھی"

"بہت بہت خوشی ہوئی" میں نے رابعہ کو لپٹا لیا ......

وہ الگ ہوتے ہوئے بولی "آپ نے تو مڑ کر ہماری خبر ہی نہ لی۔ ہم پر ماہ و سال کیسے بیت گئے ......"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے اسے دیکھا۔

"بانو کے فوت ہونے پر آئی تھی میں"

"اس کے بعد آج خیال آیا ہمارا ! ......"

"انتیس تیس برسوں بعد ......"

"وہ بھی ادھر سے اچانک گزر ہو گیا"

http://www.rehanahmed.com

"ہوا تو اچانک لیکن جی تم لوگوں سے ملنے کو مچل اٹھا تھا۔ شکر ہے تم دونوں مل گئے......"

رابعہ اپنی گیلی آنکھوں کو پھر اپنے دوپٹے کی کنی سے پونچھنے لگی......

میں نے چند لمحے چپ رہنے کے بعد پوچھا...... "ان دنوں اماں بھی بہت بیمار تھیں"

"ہاں...... چند دنوں بعد ہی فوت ہو گئی تھیں۔ حسن کی حالت ان سے دیکھی نہ جاتی تھی۔"

"بانو کے مرنے کا حسن نے بہت زیادہ اثر لیا ہو گا......"

رابعہ نے ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے کہا "صدمہ ہی ایسا تھا...... پاگل سے ہو گئے تھے۔ چھ مہینے ذہنی حالت مخدوش رہی تھی...... نہ پوچھئے وہ وقت میں نے کیسے گزارا......"

"بانو کو یاد......"

"بانو کے مرنے سے تو انہیں قرار آ گیا تھا......"

میں نے حیرانگی سے رابعہ کی طرف دیکھا وہ سر اثبات میں ہلاتے ہوئے بولی "بانو نے ان کے ہاتھوں پر دم توڑا تھا"۔

"ہوں"

"حسن نے اپنے ہاتھوں انہیں قبر میں اتار اتھا مٹی دی تھی۔ اس بات سے تو انہیں قرار سا آ گیا تھا۔ کہ بانو زندگی کی دستبرد سے محفوظ ہو گئی...... لیکن......"

"لیکن!"

"لیکن جب رمضان بابا سے بانو کی باتیں سنیں اس پر بیتے ماہ و سال کا تذکرہ سنا اور اس درندے کی بابت سنا جس نے بانو......"

رابعہ کی آواز رندھ گئی...... میں نے افسردہ سی نگاہ اس پر ڈالی...... وہ چند لمحے رکنے کے بعد خود ہی بولی "حسن تڑپ تڑپ اٹھے تھے۔ حسن کیا ہم سب کا یہی حال تھا۔ حسن اک وحشی درندے کو قتل کر دینے کے لئے پاگل ہو رہے تھے۔ لیکن وہ...... بڑی بڑی شخصیتوں نے اسے اپنے تحفظ میں لے لیا۔ حسن صدمے سے چور چور ہو گئے تھے۔

میں نے سر جھکا لیا...... وہ اذیت و کرب کے ان لمحوں کا احوال اس طرح بتانے لگی جیسے سب کچھ ابھی اس کے سامنے ہو رہا ہو...... "حسن کا تو سچائی اور دیانت داری پر سے اعتماد ہی اٹھ گیا تھا...... کتنا عرصہ تو اپنے آپ کو بولتے رہے گالیاں دیتے رہے۔ کہ کیوں ایسا پاکستان بنایا تھا۔

وہ بہت پژمردہ ہو رہی تھی...... دل تو میرا بھی دکھ رہا تھا۔ پھر بھی دلاسے کی خاطر میں بولی "چھوڑو رابعہ ان بھولی بسری اذیتوں کو...... میں ان کے متعلق جانتی ہوں۔ ہاں یہ بتاؤ ابتلا کے اس دور سے تم نکلی کب؟"

"بس...... خدا نے میری دعائیں سن ہی لیں...... حسن کی بیقراری کو قرار آہی گیا...... انسان واقعی بڑا ڈھیٹ ہے حالات سے مفاہمت کر ہی لیتا ہے۔ ہم لوگوں نے بھی کر لی...... اور زندگی کے متعین راستوں پر چلنے لگے...... گو یہ راستے بڑے دشوار اور کٹھن تھے...... لیکن......"

"دشوار اور کٹھن......"

"ہاں۔ حسن کی ذہنی ابتری کا حساب چکانا ہی تھا...... وہ تو جاب کرنے کے قابل نہ رہے تھے...... لمبی چھٹی لی...... لیکن سالہا سال کی بیکاری اور بیروزگاری نے مالی طور پر بہت پریشان رکھا......"

"وہ...... وہ تمہارے والد...... جن کا خاصہ کاروبار پھیل چکا تھا......"

"ابا مرحوم نے بڑی مدد کی......"

"مرحوم...... کب فوت ہوئے تھے......"

"امی ابو کو فوت ہوئے تو کوئی بیس اکیس سال ہو چکے ہیں۔ کار ایکسیڈنٹ ہوا تھا...... یہ صدمہ بھی ہم نے جھیلا"

"اوہو......" میں اور رابعہ تھوڑی دیر اپنی باتیں کرتے رہے۔ میں نے اس کے ابا کے کاروبار کے متعلق پوچھا......

"ان کا کاروبار اب دونوں بھائیوں نے سنبھال لیا ہے۔"

"خوب پھیلا ہو گا کاروبار......"

"جی ہاں دونوں کی اپنی ٹیکسٹائل ملیں ہیں...... خوب پھل پھول رہے ہیں ماشاء اللہ......"

"پاکستان نے انہیں دیا ہے...... ان سے لیا نہیں......"

"اللہ کی مہربانی ہے...... اور ان کی محنت......" رابعہ جلدی سے بولی" وہ پوری سنجیدگی سے اپنی صنعت کو بڑھانے کے لئے کوشاں رہتے ہیں...... ابا زندہ تھے تو حسن کو بہت دفعہ بلایا تھا۔ کہ کراچی آ کر رہیں۔ کوئی کاروبار سیٹ کر لیں یا انہیں کے ساتھ شامل ہو جائیں...... لیکن"

"حسن گئے نہیں......"

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا "حسن اس گھر کو چھوڑ نہیں سکتے۔ اب بھی کہتے ہیں۔ اس گھر کو اسی وقت چھوڑوں گا جب زندگی ساتھ چھوڑے گی۔ اس گھر سے ان کی یادیں۔ ان کا ماضی جو وابستہ ہے۔"

"آپ اس گھر میں اکیلی رہتی ہیں......"

"حسن کے ساتھ رہتی ہوں۔ آپ مجھے جانتی ہیں نا...... میں نے حسن سے بہر طور نبھاہ کا عہد کیا تھا۔ اس پر قائم ہوں"

"میرا مطلب...... بچوں سے تھا...... آپ کے بچے......"

"تین بچے ہیں دو بیٹے ایک بیٹی...... بڑا بیٹا ایم بی اے کر کے اسلام آباد میں ملازمت کر رہا ہے۔ چھوٹا بڑے ماموں کے ساتھ کاروبار میں شریک ہے۔ بیٹی کی شادی کر دی ہے...... اب ہم دونوں ہی رہ گئے ہیں یہاں......"

"بچوں کے کیریئر اور مستقبل سے آپ مطمئن ہیں......"

"ہماری زندگی میں بھی تو چند پھول کھلتے ہیں۔ باقی تو خاروں سے الجھتے سلجھتے ہی گزر گئی۔ بچے قدموں پر کھڑے ہو گئے ہیں۔ ایمانداری اور دیانتداری سے کام کر رہے ہیں...... انہیں اچھا پاکستانی بنانے کی ہم نے اپنے طور سے پوری کوشش کی ہے۔

ہمارے بچے بہت اچھے ہیں...... ہمارے لئے بھی اور ملک و ملت کے لئے بھی پر خلوص ہیں......"

"مجھے خوشی ہوئی ہے...... تقدیر ایک ہاتھ سے کچھ لیتی ہے تو دوسرے ہاتھ سے دے بھی دیتی ہے......"

"ہاں شاید......"

رابعہ کچھ کہنے ہی والی تھی۔ کہ ملازم لڑکا اندر آیا۔

"یہ ہماری پرانی ملازمہ برکتے تھی نا...... اس کا پوتا ہے...... تاجاں کا بیٹا...... آپ برکتے اور تاجاں کو تو جانتی ہیں نا"

"ہاں" میں نے لڑکے پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔

"بی بی جی...... خواجہ صاحب آگئے ہیں......" لڑکا بولا

"اچھا......"

رابعہ جلدی سے اٹھی۔ اٹھتے وقت اس نے دائیں گھٹنے پر ہاتھ رکھا تھا۔ مسکراتے ہوئے بولی "اس گھٹنے میں بہت تکلیف رہتی ہے بڑھاپا" میں نے مسکرا کر کہا۔

میں ابھی آئی۔ حسن آگئے ہیں......"

میں رابعہ کو جاتے دیکھ کر حسن کے متعلق سوچنے لگی

واقعی انسان بڑا ڈھیٹ ہے۔ حالات سے مفاہمت کر لینا اس کی فطرت میں ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو سکتا تو آج اس گھر میں مجھے رابعہ اور حسن کبھی نہ ملتے...... جو کچھ ان پر بیتی تھی...... اس کے نتیجہ میں یا تو دائمی اجل کو لبیک کہہ چکے ہوتے یا کسی پاگل خانے میں برس ہا برس سے پڑے گل سڑ رہے ہوتے۔

لیکن

وہ

تھے

http://www.rehanahmed.com

اور اپنے حالوں زندگی سے نبھاہ کرتے ہوئے اچھے جی رہے تھے۔

پتہ نہیں اس بات سے مجھے خوشی ہو رہی تھی۔ یا مایوسی اور دکھ۔ شاید میں ان برباد ہو جانے والوں کو آباد دیکھ کر مایوسی سے دوچار تھی۔ کیوں؟ اس کیوں کا میرے پاس جواب نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد رابعہ حسن کو لیئے اندر آئی۔

اس نے حسن کو میرے متعلق بتا دیا تھا۔ جبھی تو حسن بڑے تپاک سے مجھے سلام کیا اور خیر و عافیت دریافت کی۔

میں نے ان کی طرف دیکھا۔

بڑھاپا ان پر پوری ستمگری سے وارد ہو چکا تھا...... بال بالکل سپید ہو گئے تھے۔ رنگت پرانے تانبے کی سی تھی...... خوبصورت آنکھوں پر پپوٹوں کا بوجھ جھک آیا تھا...... چہرے پر جھریوں کے غیر واضح سے جال بچھ رہے تھے...... پہلے سے بہت دبلے پتلے تھے۔ کمر میں بھی کچھ جھکاؤ کی کیفیت تھی۔ زندگی نے انہیں اور انہوں نے زندگی کو جیسے لیا اور برتا تھا۔ بنا پوچھے ہی جواب مجھے مل گیا تھا...... غموں کا بار وہ اب تک اٹھائے تھے...... مجھے خوشدلی سے خیر مقدمی الفاظ کہتے ہوئے بھی ان کی آنکھوں میں کرب کی لہریں تھیں۔

انہیں دیکھ کر مجھے دلی دکھ ہوا...... لیکن میری مایوسی دور ہو گئی۔

اور

مجھے یقین ہو گیا

کہ

واقعی

عابد معبود نہیں بدلا کرتے۔ مجھے بانو کی مکمل گرفت ان کے دل و دماغ اور اعصاب پر محسوس ہو رہی تھی۔

وہ میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے...... رابعہ بھی برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

چند لمحے ہم ایک دوسرے کی احوال پرسی کرتے رہے۔ رسمی سی باتیں کیں۔

رابعہ اٹھتے ہوئے بولی

"آپ باتیں کریں۔ میں چائے بناتی ہوں"

"اسلم سے کہہ دو بنا لائے گا" حسن نے رابعہ سے کہا......

"لو...... اتنی مدت کے بعد وہ آئی ہیں...... میں خود ان کے لئے......"

"رابعہ۔ یہ اتنی مدت کے بعد آئی ہیں۔ اس لئے ان کے پاس بیٹھو...... باتیں کرو۔ گزرے ہوئے طویل سالوں کی...... یہ چائے پینے نہیں آئیں...... ہمیں جاننے سننے کے لئے آئی ہیں......"

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے" میں نے رابعہ کا ہاتھ پکڑ کر حسن سے کہا...... لیکن وہ ہاتھ چھڑا کر بولی "ابھی آتی ہوں"

"تکلفات کا پیچھا نہیں چھوڑے گی" حسن نے کہا...... "چائے تو اسلم بھی بنا کے لا سکتا ہے اسے کہہ دو......"

"آپ باتیں کریں...... بے تکلف ہو کر" وہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی...... "میں چند منٹ میں آجاتی ہوں۔

میں نے اک بھرپور نگاہ حسن پر ڈالی......

انہوں نے بھی میری طرف دیکھا...... وہ کچھ مضطرب سے نظر آنے لگے تھے۔

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ بولے "آپ کو دیکھ کر برسوں پہلے کا دور یاد آگیا......"

"میں نے ملائمت سے کہا "میں یہی تو پوچھنے والی تھی۔ کہ کبھی برسوں پہلے کا دور یاد بھی آیا......"

انہوں نے کرسی میں پہلو بدلا...... میری طرف بیچارگی سے دیکھتے ہوئے بولے "آپ نے میری گھریلو زندگی سے اندازہ لگایا ہو گا۔ کہ میں نے زندگی سے مفاہمت کر لی تھی......"

"جی...... یہ اچھی علامت ہے"

"بی بی...... انسان کو خدا جانے کس ڈھیٹ مٹی سے بنایا ہے۔ ہر حال میں زندگی سے نبھاہ کر لیتا ہے۔ کبھی میں سوچا کرتا تھا کہ بانو نہ رہی تو میں بھی نہ رہوں گا...... لیکن دیکھ لیں تیس برس بیت گئے۔ جی رہا ہوں"

ان کی آواز میں اتنی رقت تھی کہ میں ایک دم ہی ان سے کوئی بات نہ کر سکی۔

بات بدلنے کو میں نے پوچھا "حسن آپ کے دوست حمید ان دنوں کہاں ہیں...... اب تو ریٹائر ہو چکے ہوں گے۔"

انہوں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا "ہمیشہ کیلئے ریٹائر ہو چکا ہے...... کرنل حمید......"

"جی...... کیا؟"

"وہ اکہتر کی جنگ میں شہید ہو گیا تھا......"

"میں نے ایک لمحہ کو آنکھیں بند کر لیں حمید کا سراپا میری نظروں میں گھوم گیا۔ پھر میں نے عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "ملک و ملت کا شیدائی تھا...... بڑا پیارا اور نفیس انسان تھا...... اللہ اس کے درجات بلند کرے"

"اس نے دو جنگیں لڑیں۔ پینسٹھ کی جنگ میں وہ سرخرو لوٹا تھا...... دوسری بار جب محاذ پر گیا۔ تو مجھ سے کہہ کر گیا تھا۔ کہ...... حسن میں پھر دشمن پر برق بن کر ٹوٹوں گا۔ میرے انتقام کی آگ پچھلی جنگ میں پوری طرح ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی...... اس دفعہ بھی میں پورا انتقام نہ لے سکا۔ تو واپس نہیں لوٹوں گا......"

"اوہو......" میرے منہ سے نکلا

"شاید اس دفعہ وہ...... وہ کچھ نہ کر سکا...... جو کرنا چاہتا تھا...... اسی لئے وعدے کے مطابق واپس نہ لوٹا......" حسن تلخی سے بولے

"ان کے بیوی بچے......"

"اپنے حالوں جی رہے ہیں...... بے وقوف سا آدمی تھا۔ مارشل لا میں بھی کچھ نہ کمایا اور نہ پلاٹ والاٹ مارے...... خالی خولی پنشن چھوڑ گیا پچھلوں کے لئے......" حسن کا انداز طنزیہ تھا...... "مرتے جیتے گزر گئی اب تو بچے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے ہیں اس کے...... ویسے تھا احمق...... حب الوطنی ہی کو سب کچھ سمجھتا تھا"

میں نے تیز دھاری طنز کو محسوس کرتے ہوئے یونہی کہہ دیا" یہ آپ کہہ رہے ہیں حسن...... حب الوطنی حماقت ہے کیا؟......"

"لگتا تو یہی ہے...... میرے تجربے نے بھی یہی سکھایا ہے مجھے...... آپ کو حیرانی کیوں ہو رہی ہے۔ ملک میں کیا ہو رہا ہے...... آپ نہیں جانتیں...... کیا"......"

لیکن حسن جو کچھ بھی ہو رہا ہے۔ اس کے ذمہ دار ہم لوگ ہی ہیں نا......"

"نہیں بی بی...... نہیں......" حسن نے پرزور انداز میں کہا......" اس کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جو اس ملک کے کرتا دھرتا ہیں...... ہم نے یہ ملک اس لئے تو نہیں بنایا تھا...... ہم نے یہ خطہ زمین تو اس لئے حاصل کیا تھا۔ کہ یہ ایسی تجربہ گاہ ہوگی۔ جہاں ہم اسلام کے ازلی و ابدی اصولوں کو آزما سکیں گے...... لیکن یہاں...... یہاں کیا ہو رہا ہے۔ لاکھوں جانوں کا نذرانہ دے کر گھر بار لٹا کر عصمتیں داؤ پر لگا کر ہم نے کیا پایا کیا اسی لئے یہ ملک بنا یا تھا......"

حسن جوش میں بولے جا رہے تھے...... خود غرض سیاست دانوں اور حکمرانوں کو بے نقاب کر رہے تھے۔ معاشرتی برائیاں گنوا رہے تھے...... ملک کے ٹوٹنے کا تذکرہ کر رہے تھے۔ اسلامی اقدار کی بے حرمتی کا رونا رو رہے تھے۔ وہ پرجوش انداز میں کہہ رہے تھے" یہی تو مسائل تھے جن میں ملت گھری تھی...... لیکن اس سلسلے میں کیا ہوا ہے اب تک......

وہ چند لمحے رکے...... صوفے پر پھر پہلو بدلا...... مضطربانہ انداز میں میری طرف دیکھا...... پھر بے آنسو روتے ہوئے بولے" کبھی کبھی تو میں اپنے آپ سے نادم ہو جاتا ہوں...... بانو کی روح مجھ سے اب بھی یہی پوچھتی ہے۔ کہ میں نے اس سے کیوں جھوٹ بولا تھا...... بانو کو میں نے پاکستان کا جو تصور دیا تھا...... وہ اسے یہاں آ کر نہیں ملا...... مجھے بھی نہیں ملا...... میں سوچتا ہوں۔ کیا واقعی میں نے بانو سے جھوٹ بولا تھا......؟"

"نہیں حسن......" میں کچھ کہہ نہ سکی......

http://www.rehanahmed.com

حسن اپنے آپ سے الجھے بیٹھے تھے۔ شاید میری بات انہوں نے سنی ہی نہیں۔ خود ہی بڑبڑائے "بانو...... ایک بار نہیں مری...... وہ...... وہ بار بار مرتی ہے...... ملک دولخت ہوا تھا...... تو وہ چیخ چیخ کر تڑپ تڑپ کر میرا گریبان جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر دم توڑ گئی تھی...... وہ بے سکون ہے۔ اس کی روح بیقرار ہے۔ مر کر بھی اسے چین نہیں یقین کریں بی بی...... جب بھی کہیں ظلم ہوتا ہے۔ کوئی عصمت لٹتی ہے۔ کوئی ڈاکہ پڑتا ہے۔ کہیں دھماکے ہوتے ہیں بم پھٹتے ہیں...... کوئی لڑکی جہیز کی سولی پر چڑھتی ہے...... حق دار کو حق نہیں ملتا...... رشوت کی زبان چلتی ہے۔ مہاجر اور مقامی فساد ہوتے ہیں۔ لسانی جھگڑا اٹھتا ہے۔ روپے پیسے کی دوڑ میں انسانی قدریں پامال ہوتی ہیں۔ ہوس کا دور دورہ ہوتا ہے۔ مفاد پرستی اور خود غرضی کی ہوا چلتی ہے۔ تو...... میں بانو کی چیخیں سنتا ہوں۔ اس کی روح کی بیقراریاں محسوس کرتا ہوں...... اس کے الفاظ میرے کانوں میں سیال آگ انڈیلتے ہیں...... اور اور...... میں اپنے کو مجرم سا محسوس کرنے لگتا ہوں...... کہ میں نے کیا واقعی اس سے جھوٹ بولا تھا! اسے جھوٹے سپنے دکھائے تھے...... بہلاوے دیئے تھے؟"

"ہاں...... آپ نے اس سے جھوٹ بولا تھا......" ایک دم ہی میرے منہ سے نکلا۔

حسن نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا......

میں بولی "حسن صاحب...... جب کوئی انقلاب آتا ہے تو توڑ پھوڑ ہوتی ہی ہے...... لہو بھی بہتا ہے۔ گھر بار بھی لٹتے ہیں اور...... عصمتیں بھی قربان ہوتی ہیں...... الحمد اللہ کہ ہماری یہ قربانیاں رائیگاں نہیں گئی تھیں۔ اور ہم نے وہ خطہ زمین حاصل کر لیا تھا...... جس کا نام پاکستان ہے...... اس پاکستان کو پاک لوگوں کی سرزمین ہم نے بنانا تھا...... اپنی اجتماعی کوششوں سے...... لیکن ہر کوئی اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر دیکھے اور اپنے آپ سے پوچھے کہ اس نے اس سلسلے میں کیا کیا؟...... جواب کیا ملے گا؟"

حسن خاموشی سے مجھے تکنے لگے......

"ملک بنانا اگر بہت بڑا مرحلہ تھا...... تو اسے سنبھالنا اس سے بھی بڑا مرحلہ تھا حسن صاحب...... یہ نوزائیدہ مملکت دشمن کی آنکھ کا خار تھی...... اس نے اسے ناپید کرنے کے لئے کوئی حربہ نہیں چھوڑا...... ہم یہ ساری ذمہ داری حکمرانوں اور سیاست دانوں پر ڈال کر اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے لیتے ہیں...... یہیں غلطی ہے۔ یہ ملک عوام اور سیاست دانوں کی مشترکہ محنت اور جدوجہد سے بنا تھا...... اسے سنبھالنے میں بھی یہی دو قوتیں مشترکہ کام کر سکتی تھیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں...... کہ ملک بننے کے بعد حکومت اور عوام کے راستے ہی الگ الگ ہو گئے تھے...... ہم لوگ معاشرتی برائیوں کے خلاف جہاد کرتے تو انہیں تو کسی حد تک دور کر سکتے تھے لیکن ایسا نہیں ہوا...... کسی نے ان کے خلاف ہمہ گیری انداز میں علم نہیں اٹھایا...... آپ جیسے لوگوں نے بھی نہیں...... جن کے زخموں سے لہو رس رہا تھا...... جو بانوؤں کی قربانیوں کے قرضدار تھے......"

حسن گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے مجھے تک رہے تھے......

میں جوش میں بولے جا رہی تھی...... "حسن آپ ہی بتایئے آپ نے معاشرتی برائیوں کو دور کرنے کے لئے کیا کیا...... بانو کو بار بار مرنے سے بچانے کے لئے آپ نے کیا تگ و دو کی...... آپ نے اس بے چین و مضطرب روح کو صرف یہی خراج عقیدت پیش کیا۔ کہ اس کا غم سینے میں سمیٹ کر خاموش ہو گئے حالات کو ملک کو برائیوں کو صرف تماشائی بن کر دیکھتے رہے...... یہی تو ایسا ہوا...... کچھ آپ جیسے لوگ تھے۔ جو اپنے زخموں سے رستے لہو کو لئے بیٹھے رہے۔ اور کچھ سب کچھ بھول بھال کر مادہ پرست ہو گئے۔ بھوک مٹانے کے لئے وحشی درندے بن گئے۔ دولت کی ہوس مٹانے کے لئے اچھائی برائی کی تمیز کھو بیٹھے...... معاشرے میں برائیوں اور مسائل کا دور دورہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا......"

حسن نے سر جھکا لیا...... میں بے تکان بولے گئی...... ان کے گرد جمود کا جو حصار تھا توڑنے کے لئے ضربیں لگائے گئی حسن مضطرب ہو ہو کر پہلو بدل رہے تھے۔

انہوں نے میری طرف دیکھا...... ان کی آنکھیں کھل گئی تھیں...... اور مجھے پچھتاوے کا احساس ان آنکھوں میں گھلتا دکھائی دے رہا تھا......

وہ پھر سر جھکا کر بیٹھے رہے...... اور آہستہ آہستہ بولے...... "آپ سچ کہتی ہیں۔ یہیں کہیں کوتاہی ہوئی تھی...... ہم الگ تھلگ ہو کر بیٹھ گئے...... ذاتی حصاروں میں بند ہو گئے۔ ملک و معاشرے سے کیا؟ ہم تو اپنی آنکھوں سے بھی اوجھل ہو کر چھپ کر بیٹھ گئے تھے...... اپنے غم کو ذاتی بنانے کی بجائے اجتماعی بنانا چاہئے تھا۔ ایسا کرتے...... تو شاید...... شاید معاشرے......"

"معاشرے کا رنگ ہی اور ہوتا...... "میں نے ان کی بات پوری کرتے ہوئے کہا......

حسن نے ہولے ہولے سر ہلایا......

"اب بھی بہت کچھ کیا جا سکتا ہے حسن صاحب...... اس وطن عزیز پاکستان کی سلامتی کے لئے اس کی خوشحالی کے لئے عزت و وقار کے لئے ہر فرد کچھ نہ کچھ کرنے کا اہل ہے۔ ہر فرد کو کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے...... ذات کے حصار کو توڑ کر باہر آیئے......"

میں نے خاصی لمبی چوڑی تقریر کر ڈالی......

حسن متاثر و مرعوب ہوئے......

آپ تو اب فارغ ہیں...... کئی چراغ جلا سکتے ہیں...... اچھائی اور نیکی کا پرچار کر سکتے ہیں...... برائیوں کے خلاف جہاد کر سکتے ہیں...... ان پڑھ اور جاہلوں کو علم کی روشنی دے سکتے ہیں...... بہت کچھ کر سکتے ہیں...... ابھی بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں...... آپ کے ارد گرد بے شمار لوگ ہیں...... جو دکھوں میں گھرے ہیں...... جو مسائل سے

پریشان ہیں...... جو زندگی سے بیزار ہیں آپ ان سے باتیں کر کے ان کے مسائل سن کر ان کی بیزاری کو میٹھے بولوں ہی سے دور کر دیں تو یہ بھی معاشرے کے سدھار کے لئے اہم بات ہو گی...... یقین مانیں آپ...... اگر...... یہ ننھے ننھے دیئے جلانے لگیں گے نا...... تو بانو کی مضطرب اور بے چین روح کو قرار مل جائے گا...... وہ بار بار نہیں مرے گی۔

حسن...... اسے سکون دینے کی خاطر یہ سب کچھ کیجئے...... ثابت کیجئے کہ آپ نے بانو سے جھوٹ نہیں بولا تھا......"

ہم تھوڑی دیر باتیں کرتے رہے......

پھر

رابعہ آ گئی...... اسلم اس کے پیچھے پیچھے ٹرالی لے آ رہا تھا......

"رابعہ ان تکلفات کی کیا ضرورت تھی" میں نے ٹرالی پہ سجی کھانے پینے کی چیزوں پر نگاہ ڈالی۔

رابعہ تپاک اور محبت سے بولی "کچھ بھی نہیں ہے...... آپ نہیں جانتیں آپ سے مل کر مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے"

اس نے ٹرالی اپنے قریب گھسیٹ لی...... وہ میرے دائیں ہاتھ صوفے پر بیٹھی تھی......

سامنے صوفے پر حسن بیٹھے تھے۔ وہ کئی بار پہلو بدل چکے تھے۔ ان کی بے چینی سے میں نے محسوس کیا تھا۔ کہ میری باتوں کا انھوں نے بہت اثر لیا ہے......

مجھے خوشی ہو رہی تھی......

رابعہ نے پلیٹ میری طرف بڑھائی......

"شکریہ" میں نے پلیٹ لے لی۔

وہ دوسری پلیٹ حسن کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی "لیجئے......"

حسن نے ایک نگاہ اس پر ڈالی...... پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولے...... "میں صرف چائے لوں گا......"

رابعہ نے چائے بنائی

ایک پیالی میری طرف بڑھائی

دوسری حسن کو دی

اور

تیسری اپنے لئے میز پر رکھتے ہوئے لوازمات سے بھری ٹرالی میرے سامنے کرتے ہوئے بولی "آپ بے تکلفی سے لیں...... اپنا گھر ہے آپ کا......"

http://www.rehanahmed.com

"بالکل بالکل..... "میں نے ایک شامی کباب اپنی پلیٹ میں رکھ لیا....

پھر

چائے کے دوران میں اور رابعہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے.....

میں ان کے بچوں کے متعلق پوچھنے لگی.....

حسن نے ان باتوں میں کوئی خاص حصہ نہیں لیا۔ میں دیکھ رہی تھی۔ کہ ان کا ذہن کافی مصروف ہے۔ شاید وہ کوئی لائحہ عمل وضع کر رہے تھے۔ معاشرے کی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے کچھ سوچ رہے تھے۔ بانو کی روح کو تسکین دینے کے لئے کوئی راہیں نکال رہے تھے

مجھے خوشی کے ساتھ یقین بھی ہو رہا تھا۔ کہ حسن ایک بار اس جہاد کے لئے آمادہ ہو گئے تو ان کی کاوشوں میں کئی حسن شریک ہو جائیں گے۔ اور اک بار پھر وہ جدوجہد کو کامیابی سے اسی طرح ہمکنار کر دیں گے۔ جس طرح پاکستان بنانے کی جدوجہد کو کیا تھا۔

میں نے دل ہی دل میں ان کی کامیابی کی دعا کی۔

چائے کے بعد میں نے واپس آنا چاہا۔ لیکن حسن اور رابعہ دونوں ہی نے اتنے خلوص اور اصرار سے رکنے کے لئے کہا کہ میں انکار نہ کر سکی۔

ہم کافی دیر اکٹھے بیٹھے ماضی کی جھلکیاں دیکھتے رہے۔

ماضی

جو لوٹایا نہیں جا سکتا تھا۔ چھوا اور پکڑا بھی نہیں جا سکتا تھا

لیکن

جسے ہم اپنے جذبات کی شدتوں سے اب بھی محسوس کر رہے تھے۔

رابعہ رات کا کھانا بنانے گئی تو میں بھی اس کے ساتھ اٹھ کر باورچی خانے میں آگئی۔ حسن شاید باہر چلے گئے تھے۔

رابعہ اپنے ہاتھوں سے میرے لئے کھانا بنا کر اپنے خلوص اور محبت کا اظہار کر رہی تھی۔ ورنہ کھانا تو اسلم بھی بنا لیتا تھا.....

میں نے جذبوں کو محسوس کرتے ہوئے رابعہ سے کہا "تم اب بھی ویسی کی ویسی ہو۔ محبت کرنے والی پر خلوص عورت....."

اس نے میری طرف صرف مسکرا کر دیکھا۔ اور بولی "ایسی نہ ہوتی تو زندگی گذارنا مشکل ہو جاتی۔"

پھر

اس نے گہری سانس لے کر کہا "خیر گزر گئی ہے۔ گزر جائے گی"

"رابعہ" میں نے کہا

"ایک بات پوچھوں"

"ضرور پوچھئے ......"

"حسن کا رویہ بہ حیثیت شوہر تمہارے ساتھ کیسا رہا......"

اس نے دکھ بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ پھر خود ہی چہرے پر مسکراہٹ سجالی.... بولی "میری تو ساری عمر بکھرے حسن کو سمیٹتے ہی گزر گئی ....."

"انہوں نے تمہیں پیار دیا ....."

"وہ مضطرب سی ہوئی ..... پھر ہنس پڑی ..... "اس عمر میں کیسی باتیں پوچھ رہی ہیں ......"

"تمہارے تیس سالہ دور کی باتیں ......"

"میں نے کہا نا گزر گئی بس ......"

"حسن کو پایا .....؟"

"ہمیشہ اپنے پاس ہی پایا ......"

"پیار کے معاملے میں ......"

"وہ ہمیشہ بانو ہی کے رہے ...... لیکن مجھے کبھی زیادہ دکھ نہیں ہوا ......"

"اس لئے کہ بانو مر گئی تھی ......"

"نہیں ..... اس لئے کہ بانو ہم سب کی تھیں ..... قابل احترام واجب عقیدت ......"

"ہوں ......"

وہ مسکراتے ہوئے بولی "لیکن سچی بات کہوں ..... کبھی کبھی بہ حیثیت عورت اور بیوی جی ضرور چاہا..... کہ حسن مجھے احترام کی بجائے صرف اور صرف پیار دیں ..... خیر چھوڑیئے۔ اب تو عمر کے اس حصے میں ہیں۔ کہ یہ سب باتیں طفلانہ سی لگتی ہیں ...... میرے لئے یہی بہت ہے کہ مجھے ساری عمر حسن کا قرب ملا ..... اور میں ان کی خدمت کر سکی ......"

"آفرین ہے تم پر رابعہ ......"

رابعہ مسکرا کر دیگچی میں چمچ ہلانے لگی۔

میں رات تک ان کے ساتھ رہی

ہم سب نے مل کر کھانا کھایا

اور

ایک بار پھر ملکی حالات۔ سیاست اور معاشرتی برائیوں اور خامیوں پر سیر حاصل گفت و گو کی۔

رات

دونوں مجھے بڑی سڑک تک چھوڑنے آئے۔

"پھر بھی آیئے گا" انہوں نے بڑے اصرار سے کہا

"ضرور آؤں گی" میں نے وعدہ کیا

اور

واپس چلی آئی

اس امید و یقین کے ساتھ

کہ

ملک و ملت کے یہ مخلص بہی خواہ اور جانثار خلوص و اعتماد کے ساتھ ایک بار پھر تحفظ و سلامتی کے لئے سینہ سپر ہو جائیں گے۔

رضیہ بٹ لاہور ______

○

میں اپنے کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ جنہوں نے میری ہر تحریر کو سراہا۔ داد و تحسین سے میری حوصلہ افزائی کی اور تنقید سے میری رہنمائی فرمائی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص الخاص عنایت ہے۔ جو میری ہر تخلیق نے عوام میں بےپناہ مقبولیت پائی۔ پڑھنے والوں نے میری ہر تحریر کا خوش دلی۔ تپاک اور خلوص سے خیر مقدم کیا۔ مجھے بےحد خوشی ہوئی۔

لیکن اس خوشی کے باوجود تشنگی کا احساس ہمیشہ ہی باقی رہا۔ مجھے ہمیشہ یہی محسوس ہوا۔ کہ میں نے جو کہنا تھا۔ نہیں کہہ پائی۔ جو لکھنا تھا نہیں لکھ سکی۔ بانو سپرد قلم کرنے کے بعد مجھے پوری تسکین میسر آئی ہے۔ تشنگی کا احساس باقی نہیں رہا۔ میں نے لکھا ہے؟ کیا کہا؟ یہ تو میرے کرم فرما پڑھ کر ہی جان سکیں گے۔ بہر حال مجھے ان کی رائے گرامی کا شدت سے انتظار رہے گا۔ ان کی داد سے حوصلہ بڑھے گا۔ ان کی تنقید سے اپنی خامیاں جان سکوں گی۔

تحریک پاکستان اور تقسیم ملک پر سینکڑوں تحریریں رقم ہو چکی ہیں۔ جوش' ولولے اور اتحاد کی ایمان افروز داستانیں بھی لکھی گئیں۔ اور ملک کے نام پر دی جانے والی زہرہ گداز قربانیوں کی حکایتیں بھی کہی گئیں۔ "بانو" کا موضوع اسی جوش ولولے' اتحاد اور قربانی کے خمیر سے اٹھا ہے۔ لیکن میری داستان ان سب سے الگ ہے۔

یہ اک سوچ ہے۔ اک پیغام ہے۔ اک ارادہ ہے۔

ہم نے پاکستان بنایا تھا۔ جس طرح بنایا تھا۔ مجھے فخر اور سعادت حاصل ہے کہ میں تحریک پاکستان کی عملی رکن تھی۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ میں جہاں کانگریس کی تقویت و سرگرمی خان برادران کی وجہ سے تھی۔ وہاں مسلم لیگ نے کس طرح قدم جمائے۔ مجھے معلوم ہے۔ میں نے زنانہ مسلم لیگ کی ہر ایکٹنڈ اسیکرٹری کی حیثیت سے کئی سال کام کیا۔ پاکستان کا نعرہ جن بنیادوں پر لگایا گیا تھا۔ اور جس طرح اسے سرحد کے گوشے گوشے تک پہنچایا گیا تھا۔ مجھے فخر ہے۔ کہ میں اس میں پیش پیش تھی۔ 1946ء کے الیکشن میں بھی مسلم لیگ کی

ادبی خادم کی حیثیت سے کام کیا۔ وہ جوشِ جہاد۔ وہ حق و باطل کا ٹکراؤ' وہ کفر و اسلام کا معرکہ میرے ذہن میں اب بھی تازہ ہے۔

شادی کے بعد میں انبالہ چلی گئی۔ اور جب 1947ء میں ملک کا بٹوارہ ہوا۔ تو آگ و خون کی جو قیامت ٹوٹی۔ اس کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ناول کے بیشتر واقعات شنیدہ نہیں دیدہ ہیں۔

وہ 21۔ اگست 1947ء کی ڈوبتی شام تھی۔ جب ہماری گاڑی ظلمت کدہ ہند سے سرزمین پاک میں داخل ہوئی۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ اندھیرا اچھل رہا تھا۔ لیکن ہماری آنکھوں میں سینکڑوں سورج چمک رہے تھے۔ ہر طرف نور ہی نور بکھرا نظر آ رہا تھا۔ ہم موت کی وادی سے نکل کر حیات کے سینے سے لپٹ رہے تھے۔

مجھے اب تک وہ بچہ یاد ہے۔ جو کسی کوارٹر نما مکان کے سامنے ریلوے لائن کے قریب کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لکڑی پر سبز رنگ کا کپڑا تھا۔ جسے قومی پرچم بنا کر وہ عقیدت سے لہرا رہا تھا۔

گاڑی مقدس سرزمین پر احترام سے رینگتی چلی آ رہی تھی۔ دل کی دھڑکنیں بے تاب ہوئی جا رہی تھیں۔ آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے۔ لبوں پر اپنے رب کے شکرانے کے الفاظ متحرک رہے تھے۔ بچے نے اپنا ساختہ ہلالی پرچم لہرایا...... "نعرہ تکبیر......" اس نے صدا بلند کی۔ "اللہ اکبر......" کی جوش' ولولے اور خلوص سے بھری آواز سے فرش و عرش مرتعش ہو گئے۔ پھر اس نے نعرہ لگایا...... "پاکستان......" اللہ غنی! زندہ باد کی جو صدائیں گاڑی سے گونجیں۔ جذبات کا جو ایمان افروز مظاہرہ اس نعرے کے جواب میں ہوا...... وہ گونج اب بھی میرے کانوں میں محفوظ ہے۔

لیکن...... دکھ اس بات کا ہے۔ کہ یہ سب باتیں اب خواب ہو گئیں۔ قوم کی سوچ بدل گئی ہے۔ کوئی ان خطوط پر نہیں سوچتا۔ جن پر سوچنا چاہیے تھا۔ وہ قوم بھٹک رہی ہے۔ جس کی راہیں چودہ سو سال پہلے متعین کر دی گئی تھیں۔ جنہیں ایک مکمل ضابطہ حیات ملا تھا...... ملک میں کیا ہو رہا ہے؟ قوم کس ڈھلان کی طرف جا رہی ہے۔؟ نئی نسل کا کیا رنگ ہے......؟ اسلام کے نام پر حاصل کی جانے والی مملکت میں اسلام کی کیا حالت ہے......؟ سب دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔

اس دکھ کو میں نے الفاظ میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ یہ دکھ چند دلوں کو بھی متاثر کر سکا۔ تو میں سمجھوں گی میں نے محنت وصول پائی۔

غفلت کسی طور اچھی نہیں۔ میں نے قوم کے اس احساس کو جھنجوڑنے کی سعی کی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ موجودہ نسل کو یہ بھی بتانے کی کوشش کی۔ کہ۔

وہ کیا گردوں تھا جس کا تو ہے اک ٹوٹا ہوا تارہ

http://www.rehanahmed.com